ماہنامہ
نئے افق
کراچی

خوفناک نمبر ۲

PDF

Naye Ufaq Digest May 2018
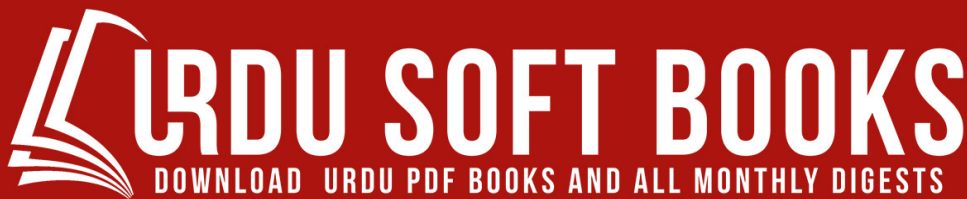
نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی **30** تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشاالله آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مدد گار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیرہ
اقبال بھٹی
گروپ ایڈیٹر
طاہر احمد قریشی
معتمدین
نور الدین

پاکستان (فی پرچہ)...........	50 روپے
پاکستان (سالانہ)...........	600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

جلد	42
شمارہ	04
مئی	2018

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchalpk.com/blog
editorufaq@aanchal.com.pk

NAEYUFAQ PUBLICATION

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتہ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74400 فون نمبرز 021-356203771/2
فیکس 021-356203773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

مشتاق احمد قریشی

کیا انتخابات ہوں گے؟

جوں جوں وقت گزر رہا ہے سیاسی میدان میں گہما گہمی بڑھتی جا رہی ہے اور عوام میں خوف پھیل رہا ہے جانے کیا ہونے جا رہا ہے سیاسی پہلوان خم ٹھونک کر میدان میں اترے ہیں ہر کوئی اپنی ڈفلی بجا رہا ہے تمام بڑی سیاسی جماعتیں پُرامید دکھائی دے رہی ہیں اس بار حکومت صرف ان کی ہی بنے گی بلاشرکت غیرے وہی حکومت ساز ہوں گے ان کے تمام مدمقابل منہ کے بل گریں گے یوں دکھ رہا ہے کہ لنکا میں سب ہی باون گز کے ہیں۔ میاں نواز شریف عدالتی کا لک ملے جانے کے باوجود بڑے پرامید ہیں ان کے مشیران کے مطابق عدالت کے فیصلے نے میاں نواز شریف کا حوصلہ بلند کر دیا ہے پہلے وہ دبے دبے بولتے تھے اب کھل کر بولنے لگے ہیں عوام ان کے قریب ہوتے جا رہے ہیں وہ دن دور نہیں جب عدالت کی سزا ہوا ہو جائے گی اور میاں نواز شریف عوام کے کندھوں پر سوار ہو کر مسند اقتدار پر جلوہ گر ہوں گے اب دیکھنا ہے کہ ہوتا ہے کیا کس کے سر ہما بیٹھتا ہے۔

دوسری طرف پٹے ہوئے سیاسی مہروں کی جماعت کے کپتان ہیں جن کا گمان ہے کہ آنے والے وقت کے وہی سکندر ہوں گے میاں صاحب کا پتہ انہوں نے صاف کر ہی دیا ہے ن لیگ کے غبارے میں ایسا پنچر کر دیا ہے کہ جس کی مرمت اب ممکن نہیں آنے والا وقت لیگیوں کے لیے مزید مصیبت لا رہا ہے نیب کے آنے والے فیصلے کی رہی سہی حیثیت بھی ختم کر دے گی پیپلز پارٹی پہلے ہی اپنی حیثیت کھو چکی ہے جو کچھ رہ گئی تھی وہ سینیٹ کے حوالے سے ہوا ہو گی اب صرف تحریک انصاف ہی وہ جماعت رہ جاتی ہے اگر وہ کھمبے کو بھی کھڑا کر دے تو وہ کامیاب ہی ہوگا جب کہ ان کے ایک ناراض رکن کا کہنا ہے کہ بلی کو خواب میں بھی چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں ان کے مطابق پختون خواہ نے گزشتہ الیکشن میں عمران خان کو ووٹ دے کر جو غلطی کی تھی اس کا نتیجہ انہیں مل چکا ہے نیا پاکستان تو وہ کیا بنائیں گے نیا پختون خواہ تک تو وہ بنا نہیں سکے اس بار تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ پختون خواہ بھی ان کے ہاتھوں سے نکلتا دکھائی دے رہا ہے خان صاحب جو وزارت عظمیٰ کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ خواب رہے گا خان صاحب میں صبر کی کمی ہے انہوں نے اپنے اردگرد پٹے ہوئے مہرے جمع کر لیے ہیں جو خود تو ڈوبیں گے ہی خان صاحب کو بھی لے ڈوبیں گے یہ جو تمام پٹے پٹائے سیاست دان ان کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گرد جمع ہیں کیا ان میں کوئی ایک بھی ایسا ہے جو اپنے لئے بندھے اصولوں سے ہٹ کر کچھ نیا کر سکے اگر وہ لوگ کچھ نیا کرنے والے ہوتے تو یوں اپنی جماعتوں کو نا چھوڑتے یہ سب کے سب بے پیندے کے بدن ہیں اِدھر سے اُدھر ہوتے رہتے ہیں وہی مثال ہے کہ جہاں دیکھی توا پرات وہیں گزاری ساری رات اقتدار کی ہوس میں مبتلا لوگوں کا ایک ٹولہ ہے خود عمران خان میں سیاسی بصیرت کی کمی ہے ان کی طبیعت آمرانہ ہے۔ بظاہر صلہ مشورہ بھی کرتے ہیں لیکن کرتے وہی ہیں جو ان کی مرضی ہوتی ہے یوں تو وہ زرداری کو برا کہتے رہتے ہیں لیکن ان کے پشت پناہوں نے انہیں سینیٹ کے چیئر مین کے انتخاب کے لیے جو کہا جیسا کہا وہ کرنا پڑا زرداری کو وہ چاہے جتنا برا کہیں لیکن اس نے خان صاحب کو گھٹنے ٹیکوا دیے زرداری جیسا بھی جو بھی ہے یہ ماننا پڑے گا وہ ایک ہوشیار فطین سیاست دان ہے آنے والے الیکشن کے بارے میں ان مخالفین کا خیال ہے کہ پیپلز پارٹی اتنی کامیابی حاصل نہیں کر پائے گی جتنی پچھلے الیکشن میں حاصل کر چکی ہے حالانکہ ابھی سینیٹ کے حالیہ الیکشن کے موقع پر بلوچستان کی بظاہر مضبوط لیگی حکومت کا جس طرح سے تختہ پلٹا وہ کسی سے چھپا نہیں پھر چیئر مین سینیٹ کو منتخب کرانا حکومت تمام تر برتری کے باوجود منہ دیکھتی رہ گئی کہنے والے کہتے ہیں کہ سیاست اسی کا نام ہے پیپلز پارٹی کے اکابرین لاکھ سیاست آشنا ہوں لیکن عوام کی ضروریات سے آشنا نہیں وہ سیاست صرف اپنے مفادات کے لیے کرتے ہیں انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ عوام کے مسائل بھی حل کیے جائیں اقتدار ہر قیمت ہر حال میں حاصل ہونا چاہیے اقتدار ملنے پر تمام اور ہر قسم کے نقصانات کا ازالہ ہو جاتا ہے اسی لیے جیت حاصل کرنے کے لیے انویسٹمنٹ کرنا پڑتی ہے اس کے بغیر کامیابی ممکن ہی نہیں ہوتی۔

وطن عزیز میں اقتدار کے حصول کے لیے نبرد آزما تمام ہی سیاسی جماعتوں خصوصاً تینوں بڑی اہم جماعتیں میدان میں آمنے سامنے آ چکی ہیں سیاسی دنگل شروع ہونے کو ہے کچھ سیاسی تجزیہ کاروں کا گمان ہے یہ سب سوچا سمجھا منصوبہ ہے پس پردہ قوت جس طرح چاہ رہی ہے ویسا ہی کھیل کھیلا جا رہا جلد دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو کر سامنے آ جائے گا کھلاڑی اور تماش بین سب کے سب دیکھتے رہ جائیں گے اللہ ہماری ہمارے وطن کی حفاظت فرمائے، آمین۔

گفتگو

اقبال بھٹی

عزیزان محترم ...... سلامت باشد۔

مئی کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے آپ اسے خوفناک نمبر 2 کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس میں بیشتر کہانیاں ایسی ہیں جو ہمارے لکھاریوں نے خوفناک نمبر کے لیے ارسال کی تھیں اور کسی وجہ سے خوف ناک نمبر کا حصہ نہیں بن سکیں سو وہ اب شامل اشاعت ہیں خوفناک نمبر کو ہمارے قارئین کی اکثریت نے توقع سے زیادہ پسند کیا جس کے لیے ہم شکر گزار ہیں اس نمبر کی کامیابی کا سہرا ہمارے لکھاریوں کے سر جاتا ہے جنہوں نے مختصر سے وقت میں ہم سے تعاون کرتے ہوئے اپنی تحریریں ارسال کیں جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی اپنا قلمی تعاون جاری رکھیں گے۔

ڈالر کے ریٹ میں اضافہ اور پاکستانی کرنسی میں گراوٹ نے جہاں ہر شعبہ کو متاثر کیا وہاں کاغذ بھی عنقا ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے تمام پرچوں نے اپنی قیمت میں اضافہ کر دیا ہے ایسے میں نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز واحد ادارہ ہے جس نے اپنے پرچوں کی قیمت میں اضافہ نہیں کیا اور بڑے عرصہ تک حالات کا تن تنہا مقابلہ کیا اور اپنے قارئین کو بوجھ سے بچائے رکھا، لیکن اب ایسا ممکن نہیں رہا اب ہمیں آپ سے مشورہ درکار ہے کہ آیا ہم پرچوں کے صفحات میں کمی کر دیں یا پھر قیمت میں اضافہ کر دیں ہم آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

تمام مصنفین و قارئین نوٹ فرمالیں کہ ماہنامہ نئے افق جولائی کا شمارہ ''ابن صفی نمبر'' ہوگا۔ جس میں شرکت کے لیے جلد از جلد اپنی نگارشات ادارہ کو ارسال کریں تاکہ پرچے کی بروقت اشاعت ممکن ہو سکے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ ماہ اپریل 2018ء کا شمارہ 24 مارچ کو نظروں کے سامنے آیا، حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کیونکہ یہ خوفناک نمبر تھا سرورق بھی خوفناک ہی تھا سب سے پہلے محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک پڑھی، وہ سابق وزیراعظم صاحب کو دماغ ٹھنڈا رکھنے کی تلقین کر رہے تھے لیکن وہ تو بقول شخصے کہ گرم توے پر بیٹھے ہوئے ہیں، یہ باتیں مشکل سے ہی ان کی سمجھ میں آئیں گی۔ خیر اس موضوع کو یہیں کلوز کرتے ہوئے آگے بڑھے تو اپنی من پسند محفل کو اپنا منتظر پایا۔ پہلا خط ہے جناب پرنس افضل شاہین کا آپ کا تحریر کردہ قطعہ لاجواب ہے آپ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ہٹ دھرمی سے نقصان ہی ہوگا۔ بہر حال بھائی یہاں اپنا دل جلانے والی بات ہے آپ کا تبصرہ قابل عذر اور قابل تعریف ہے میرا تبصرہ اور ذوق آگہی میں انتخاب پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ ایس ایس پری محفل میں خوش آمدید بھئی یہ کیا نام ہوا۔ پورا نام اور تفصیلی تبصرہ اگلے ماہ لکھو لاہور میرا آبائی شہر ہے وہاں نئے افق نہ ملنا حیرانگی والی بات ہے ایم حسن نظامی آپ کا خط مفصل اور اپنے اندر گہرائی لیے ہوئے ہے لگتا ہے کہانیوں کو دل سے پڑھ کر تبصرہ لکھا ہے میری کہانی ٹوٹی چوڑیاں پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ ریاض حسین قمر بھائی کیسے ہو؟ اس بار بھی آپ کا خط طویل اور مدلل ہے اس میں گہرائی بھی ہے اور لفظوں کی جادوگری بھی آپ اس طرح ڈوب کر تبصرہ لکھتے ہیں کہ قلم بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ میری تحریر کردہ تفتیشی کہانی ٹوٹی چوڑیاں کے متعلق آپ کے الفاظ پڑھ کر خوشی ہوئی محمد رفاقت صاحب حسب معمول واہ کینٹ جیسے خوب صورت شہر سے تشریف لائے اس بار آپ نے بڑے اچھے انداز میں خط تحریر کیا اور حساس دلوں کو جھنجوڑنے میں کامیاب ہو گئے میری کہانی آپ کے معیار اور پسند پر بھی پوری اتری جو میرے لیے باعث تقویت اور خوشی کا سبب ہے، شکریہ کلثوم شوکت آپ کو بھی محفل میں خوش آمدید آئندہ بہن ذرا تفصیلاً لکھنا حسین خواجہ شکر ہے آپ نے وقت نکالا اور تبصرہ ارسال کیا۔ آپ کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جب تک مزدوروں میں سے کوئی اوپر نہیں جائے گا انہیں مزدور کا درد محسوس نہیں ہوگا ویسے ایک بات ہے کہ ہم ایسے امیدواروں کو زیادہ ووٹ نہیں دیتے اور بار بار آزمائے ہوؤں کو

آزماتے ہیں اوران کی جھولی میں ستر ہزار سے نوے ہزار تک ووٹ ڈال دیتے ہیں میری کہانی ٹوٹی چوڑیاں پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔اب ذرا بات ہوجائے''ذوق آگہی'' اورخوش بوئے سخن کی ذوق آگہی میں اللہ کی شان فائقہ سکندر حیات لنگڑیال لوڈشیڈنگ راؤ تہذیب حسین تہذیب نیا پاکستان ایم حسن نظامی قبولہ شریف، انسان عبدالجبار رومی انصاری قصور اچھی باتیں پرنس افضل شاہین نمبر لے گئے باقی انتخاب بھی اچھا ہے خوش بوئے سخن بھی ہمیشہ کی طرح خوب سجی ہوئی ہے اس میں ریاض حسین قمر پرنس افضل شاہین ایم حسن نظامی اور محمد احمد رضا انصاری بازی لے گئے ویل ڈن، کیا مرشد کی یہ آخری قسط تھی کیونکہ آخر میں باقی آئندہ لکھا نظر نہیں آیا باقی کہانیاں مصروفیت کی وجہ سے ابھی پڑھ نہیں سکا اس لیے اب اجازت چاہوں گا جاتے جاتے ایک شعر۔

کشش ثقل سے بڑھ کر ہے محبت کی کشش
آسمان سے مہ و خورشید اتر آئے ہیں

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف سلام عرض امید ہے آپ اور نئے افق سے جڑے سبھی احباب بخیریت ہوں گے اپنا پرچہ بہار کی رنگینیوں میں جلوہ افروز ہوا اور من کے آنگن میں مسرتوں کے گل کھل اٹھے، میں آپ اور ایڈیٹر صاحب کی خوب صورت سلیکشن پر بے حد مشکور ہوں۔خوفناک نمبر کے حوالے سے سبھی تحریریں پر اسرار اور پر معنی پائیں۔جل پری، خبیث روحیں، لال موبتیاں، آسیب زدہ، دھندلے سائے، پیپل کا درخت، چیونٹیاں، خالی گھر، نقش زیر آب سبھی لکھاریوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ذوق آگہی کی خوب صورت کڑیاں بے حد معیاری اور بہترین پائیں۔خوش بوئے سخن کی شاعری، من کو بھا گئی اور دل بیکراں خوش ہوا، ساحر جمیل سید، مرشد کی دسویں کڑی پر ثابت قدم پائے۔دستک اور گفتگو بے حد اچھے سلسلے ہیں آپ نے سبھی احباب کو مل بیٹھنے اور دکھ سکھ شیئر کرنے کا اچھا پلیٹ فارم مہیا کیا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گھر ہی کے دستر خوان پر ہم اہل خانہ سے محو گفتگو ہوں، پرنس افضل شاہین کرسی صدارت قبول ہو، ایس ایس پری اور کلثوم شوکت کو گفتگو میں حصہ لینے پر ویلکم جی اب سدا آتے ہی رہنا اپنوں کی بزم میں ریاض بٹ، محمد رفاقت اور حسین خواجہ کو خصوصی سلام۔مشتاق احمد قریشی اور طاہر قریشی صاحب کو عمرہ اور خانہ خدا کی زیارت پر مبارکباد قبول ہو۔خداوند تعالیٰ ہمیں بھی اپنے گھر کی حاضری سے فیض یاب فرمائے آمین۔اب ج بجٹ قاعدہ بہت اچھا لگا۔بقیہ سبھی سلسلے کترنیں، لطائف اور معیاری اقتباسات بے حد پسند آئے بلاشبہ پرچہ خوفناک نمبر کے عین مطابق ترتیب دیا گیا اس کے لیے آپ اور سبھی لکھاری ساتھیوں کا بے حد شکریہ، خوش رہیے اور ہر طرف مسرتیں بکھیرتے رہیں۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ محترم جناب اقبال بھٹی صاحب اور نئے افق کے تمام اسٹاف کو میری طرف سے السلام علیکم، ماہنامہ نئے افق کا خوفناک نمبر واقعی خوفناک کہانیوں سے آراستہ ہے اس کے لیے میں آپ کے تمام اسٹاف کو بہت بہت مبارک باد دیتا ہوں۔اسے نئے افق کے بہترین رسالوں میں شمار کیا جاسکتا ہے سب ہی کہانیاں اچھی ہیں اور ان کے لکھنے والوں نے بہت محنت سے لکھی ہیں اس لیے میں سب کو مبارکباد دیتا ہوں۔جس میں خلیل جبار صاحب، محمد شعیب صاحب، سلمیٰ جیلانی صاحبہ، عنبرین اختر صاحبہ، سبین علی صاحبہ، عائشہ تنویر صاحبہ، نسترن فتح جی، زرین قمر صاحبہ، تفسیر عباس بابر صاحب، امین صدرالدین صاحب، مہتاب خان صاحبہ، عمارہ خان، وسیم بن اشرف صاحب، محمد عرفان راے صاحب، زیب سندھی آپ سب نے محنت سے کہانیاں لکھیں ایک بار پھر مبارک باد قبول ہو۔23 مارچ گزرا ہے سب پاکستانیوں نے اسے بڑے جوش وخروش سے منایا 1940ء میں پاکستان کی قرارداد پاس ہوئی اور سات سال کے عرصے میں دنیا کے نقشے پر پاکستان وجود میں آگیا یہ اس وقت کے لیڈر لوگوں کا کمال ہے اور آج کل کے لیڈر صرف اپنے ہی گھر کا خیال کرتے ہیں پاکستان کی طرف توجہ نہیں دیتے اگر یہ اس وقت کے لیڈر بن جائیں تو پاکستان

سات ماہ میں دنیا کا ایک عظیم ملک بن جائے اب دیکھو علاج باہر کے ملک میں ہوتا ہے پڑھائی کے لیے باہر لوگ جاتے ہیں اور تو اور نوکری کے لیے بھی باہر جانا پڑتا ہے یہاں بے روزگاری ان پانچ سالوں میں سب سے زیادہ ہوئی ہے قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں آئے دن پیٹرول کی قیمت بڑھ رہی ہے اور ڈالر پاکستان میں تاریخ کی بلند ترین سطح پر آ گیا ہے پھر بھی سب اچھا کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ کرپشن سے ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے اس کے لیے ہر پاکستانی کو مل کر کام کرنا ہوگا، ہر شخص اپنے آپ پاکستان کی ترقی کے لیے آگے بڑھے اور اپنے حصے کا کام کرے ان شاء اللہ بہت جلد ہم ایک عظیم ملک بن جائیں گے۔ آتے ہیں خطوط کی طرف تو جناب اس دفعہ بھی خط لکھنے والے کم ہی نظر آئے، پرنس افضل شاہین جناب خط پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ، ایس ایس پری لاہور سے حاضر ہوئی ہیں۔ ایم حسن نظامی صاحب قبولہ شریف سے ریاض حسین قمر صاحب آپ نے میرے خط کی تعریف کی اور میرے خیالات کو اپنے قلم سے اور آگے بڑھایا جس کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں محترم ذرہ نوازی کی کوئی بات نہیں ہم تو سب دوستوں کے تابعدار ہیں۔

ہم تو اپنے دوستوں کو دل میں سجا کے رکھتے ہیں
نہ جانے کیا بات ہے ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں

کلثوم شوکت صاحبہ اور حسین خواجہ صاحب کے خط بھی اچھے ہیں مبارک ہو، محترم ریاض بٹ صاحب نے میرے خط کی تعریف کی ان کا بھی بہت بہت شکریہ۔ اجازت آنے والے شمارے کا انتظار رہے گا۔

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ محترمی و مکرمی بھٹی صاحب سلامت رہیں، میگزین ملا اور خوفناک نمبر صحیح معنوں میں مزہ دے گیا ہر لحاظ سے چمک دمک برقرار رکھ کر اور قیمت کے لحاظ سے اتنا سستا اور مکمل میگزین اور کوئی بھی نہیں۔ فہرست دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا تبصرے زبردست ہیں باقی معاشرے میں جو عریانی اور فحاشی کا سیلاب آیا ہوا ہے اور سوسائٹی جو انحطاط پذیر ہے اس سے ریب کے کیس دیکھ لیں مسلمانوں کے دشمن لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں کہ مسلمانوں کو مذہب سے دور اس طرح لے جائیں کہ سوسائٹی میں عورتوں کی بھیڑ چال چلی جائے سب سے پہلے تو دوپٹہ ختم کیا گیا بالوں کو سامنے لے آئیں جو نہ ہونے کے برابر آگے پردہ کرتے ہیں پھر ٹخنے آدھی پنڈلی تک ٹانگوں کا لباس جن کو ٹی وی پر اور نمایاں کیا جاتا ہے اور یہ باتیں اوپر سے لے کر نچلی ترین سطح تک بلاتکلف امیر غریب یا متوسط طبقے کے اثر پذیر ہو چکی ہے کیا ہمارے مردوں کی عقل ختم ہو گئی ہے یا یہ مرد سوسائٹی کے دباؤ میں آ گئے ہیں سورۃ نور کا مطالعہ ہی کر لیں اللہ نہ صرف ہمیں عقل دے بلکہ مردوں کو اس پر عمل پیرا ہونے کی مکمل توفیق دے آمین ثم آمین ایک اور سوچ بھی گہری ہے کہ خدا کے لیے چند لمحوں کے لیے اپنی آمدنی کو چھلنی کریں کہ ایک لقمہ بھی حرام سب کے لیے حرام ہو جاتا ہے معاشرے میں شتر بے مہار بن کر ہم جانوروں سے بدتر زندگی گزارتے ہیں ہمیں کب عقل آئے گی اور کب ہمارا معاشرہ دنیا کے دوسرے معاشروں کی طرح ہوگا بے شک وہ مسلمان نہیں مگر ہم سے بہت بہتر ہیں۔ اللہ بہتری کرے آمین ثم آمین۔ میگزین میں مشتاق احمد قریشی کی دستک نے دل اور دماغ پر ہتھوڑے کی طرح دستک دی ہے۔ سکہ رائج الوقت میں نواز شریف کے لیے بڑی ہی گہری اور انمول تجویز ہے اور مشورے ہیں اللہ خیر کرے آمین۔ طاہر صاحب القہار کی تشریح اور فضائل لا کر ثواب در ثواب حاصل کر رہے ہیں، گفتگو کی محفل میں آ بیٹھے لکھاریوں کی بہار لگی ہوئی ہے۔ بھٹی صاحب نے محفل جمائی ہے وسیم بن اشرف کو جو کوفت اٹھانی پڑی ہم ساتھ ہیں دوسرے عمارہ خان کے کمپیوٹر کی شرارت کی وجہ سے وسیم بن اشرف سے کہیں زیادہ ذہنی جھٹکا لگا دوبارہ تحریر کرنا بھی جان جوکھوں کا کام ہے بہر حال اللہ ہمت دے آمین۔ امجد جاوید صاحب تو بہار کا ایک جھونکا ہیں ضرور تشریف لائیں ابراہیم جمالی رنگ رنگ کی ترجمہ کی ہوئی کہانیاں لائیں گے خوش آمدید اور محترم مشتاق احمد قریشی صاحب اور جناب طاہر احمد قریشی کو عمرہ کی مبارک باد اللہ ہم سب کو بھی اپنے گھر ضرور

بلائے آمین اب محفل کے ستاروں کی بات ہو جائے۔ پرنس افضل شاہین بہاول نگر سے رقم طراز ہیں بلکہ خوب لکھا ہے ہاں آپ سے ہاں ضرور ملاؤں گا کہ یہ ہمارے منچن آباد اور فورٹ عباس کے چہیتے لکھنے والے کہاں ہیں۔ منچن آباد کے پروفیسر شاذ صاحب کدھر ہیں اور دیگر لوگ بھی میری طرح ان صفحات پر جلوہ گر ہوں پلیز۔ ایس ایس پری تگ و دو اور بڑی محنت کے بعد جو چیز ملے اس کی قدر بھی بہت ہوتی ہے اور اس کی قدر و قیمت بھی بڑھ جاتی ہے اسی طرح ہر ماہ نئے افق کا مطالعہ کر کے تبصرہ کے ہم منتظر ہیں۔ ایم حسن نظامی جی تبصرہ خوب ہے اور بڑا سنجیدہ اور بھرپور لکھنے پر مبارک باد آپ کا خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی وجہ یہ کہ بڑے رواں اور ٹھنڈے مزاج سے لکھا گیا ہے ہمارے پرانے مہربان ریاض حسین قمر صاحب منگلا سے تشریف لائے ہیں اور بہترین غزل بھی عطا کی ہے حالات حاضرہ پر تبصرہ خوب ہے اور معاشرہ کی دکھتی رگ بھی خوب چھیڑی ہے ابن صفی کے ناولوں کے متعلق آپ نے زبردست لکھا ہے ہم آپ کی سو فیصد تائید کرتے ہیں اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی ہمارے پڑوس میں واہ کینٹ سے محمد رفاقت جی کا تبصرہ بھرپور تھا اور صادق الخیری کو بھی لکھ کر بھیجیں رفاقت جی کبھی راولپنڈی آنا ہو تو ضرور اطلاع دیجیے گا ہمارے قدردان، مہربان جناب ریاض بٹ صاحب کو بے حد سلام عرصے کے بعد آپ کا دل موہ لینے والا ایس ایم ایس ملا جواب دے نہیں سکا ان شاء اللہ جلد حاضر ہوں گا آپ کی تفتیشی کہانی خوفناک بھی ہو سکتی تھی اور آپ نمبر میں غیر حاضر اور بھائی سلیم اختر کی کہانی اس دفعہ بھی نہیں تھی بہت زبردست تبصرہ تھا بھرپور، مدلل، ہر چیز کو پرکھا ہوا تھا بٹ جی آپ کا ذوق آگہی میں "زبان" نے کئی سوچنے کے در وا کر دیے اور چھوٹے دو تبصرے کلثوم شوکت کچھ کا حوصلہ بڑھاتی ہوئی محسوس ہوئیں بھرپور تبصرہ کے ساتھ آئیں نا اور یہ حسین خواجہ صاحب دونوں ہی منچن آباد سے تشریف لائے ہیں چلیے مصروفیت کچھ کم ہوتی ہے تو امید ہے کہ ہر ماہ حاضر ہوا کریں گے باقی ہمارے بہت سے ساتھی کیوں حاضر نہیں ہوتے۔ کہانیوں میں خبیث روحوں نے دل موہ لیا باقی کہانیاں بھی خوفناک نمبر کو کامیاب بنانے میں کامیاب رہی ہیں جیسے جل پری، چونٹیاں، دھندلے سائے، ابراد ھی، وہ کون تھی کس کس کا لکھوں۔ صفحہ 124 تا 127 مشتاق احمد قریشی صاحب کی کاوشوں اور مختلف حیثیت سے اردو ادب کی خدمت کرتے ہوئے زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہیں ان کے کالم آج کل روزنامہ جنگ میں واقعی چشم کشا ثابت ہوتے ہیں بڑے ماہر کالم نگار اور تجزیہ نگار ہیں دونوں کا عمرہ بھی اللہ کریم قبول فرمائے اور ہمارے لیے دعائیں قبول فرمائے، آمین ثم آمین۔ خوفناک نمبر کی وجہ سے جواہر پارے شامل نہ ہو سکے اگلے ماہ انتظار رہے گا ذوق آگہی بھی سپاس گل کی صدارت میں خوب ترقی کر رہا ہے بڑے انمول قسم کی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں اسی طرح نوشین اقبال نوشی کا خوش بوئے سخن کی خوش بوئیں جہان میں پھیلتی ہیں معیار اور تحریریں بڑی زبردست ٹھیک ہوتی ہیں محمد اسلم جاوید صاحب کی منزل زبردست تھی۔ محمد اسلم جاوید تبصرہ کے ساتھ محفل میں آیا کریں مجھے تو ریاض حسین قمر اور آپ کی غزلوں کا انتظار رہتا ہے بہرحال مبارکباد۔ محترم جناب اقبال بھٹی صاحب آپ کی قیمتی تحریر سے عرصہ دراز سے محروم ہیں کیا آپ جلد حاضر ہوں گے باقی سب مجلس ادارت کو سلام دعائیں۔

محمد فرقان رومان...... چکوال۔ السلام علیکم اس دفعہ میں نے ابھی تک نئے افق اپریل کا خوف ناک نمبر نہیں خریدا کیونکہ چکوال گیا ہی نہیں ہوں پہلے پڑھتا تھا مگر اب دسویں کلاس کے پیپر ختم ہو چکے ہیں اس لیے سوچا پچھلے شمارے پر ہی تبصرہ کر ڈالوں، دستک میں نہیں پڑھتا کیوں کہ مجھے سیاست سے بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے گفتگو میں سب سے پہلے ریاض حسین قمر صاحب وارد تھے ان کا تبصرہ قابل داد ہے آگے اپنا نام دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا ریاض بٹ صاحب کے خط میں بڑی خوب صورت باتیں لکھی ہوئی تھیں بہت مبارک باد ریاض بٹ انکل محمد رفاقت، پرنس افضل شاہین، ایم حسن نظامی اور عبدالجبار رومی انصاری صاحبان کے تبصرے بھی جاندار ہے بشیر احمد بھٹی کی تجاویز اف (مائنڈ

مت کیجیے گا) اقرا جٹ اور فریدہ فری آپی بھی موجود تھیں فری آپی کی تو آنچل میں بھی شاعری پڑھنے کو ملتی رہتی ہے اقرا میں ''الغفار'' کی تفسیر بیان کی جارہی تھی سبحان اللہ سید بدر سعید کا انٹرویو پڑھ کر بہت مزہ آیا ان کا انٹرویو پڑھ کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمیرہ احمد، ہاشم ندیم، بانو قدسیہ اور اشفاق احمد ان کے پسندیدہ لکھاری ہیں اور یہ میرے بھی فیورٹ ہیں۔ مرشد اچھا جارہا ہے تمام کہانیوں کا پلاٹ تو بہت ہی اچھا ہوتا ہے مگر انداز تحریر مارڈالتا ہے۔ عمارہ خان کا ''وہ تیس دن'' کب شائع ہوگا؟

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر۔ اس بار اپریل کا نئے افق خوفناک نمبر 26 مارچ کو ملا اور 28 کو تبصرہ کررہا ہوں ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے سرورق کی مناسبت سے ایک قطعہ ہوجائے۔

میں نکلا شام شہر کو دل میں کچھ ارمان تھے
ایک طرف تھیں سبز جھاڑیاں ایک طرف ٹوٹے قبرستان تھے
پاؤں تلے ایک ہڈی آئی جس کے یہ بیان تھے
سنبھل کر چل رے چلنے والے کبھی ہم بھی انسان تھے

انکل جی دستک میں میاں نواز شریف کے بارے میں درست فرمارہے تھے کہ وہ الطاف حسین ثانی نہ بنیں اور پھونک پھونک کر قدم رکھیں اور عدلیہ اور اسٹیبلشمنٹ کے خلاف زہر نہ اگلیں تیس سال سے آپ سیاست میں ہیں اب ایسا کریں اس ملک کی جان چھوڑ دیں اور سیاست سے ریٹائرمنٹ لے لیں دوسروں کو بھی موقع دیں ہوسکتا ہے دوسرے والے ملک کے خیرخواہ ہوں اور ملک کو ترقی کی جانب گامزن کردیں میرے اس خط کی اشاعت تک نگراں وزیراعظم کا اعلان ہوچکا ہوگا ہماری دعا ہے نگراں وزیراعظم منصفانہ الیکشن کرائیں اور اپنے گھر جائیں اقرا میں اللہ تعالیٰ کے ایک اور بابرکت نام قہار کے بارے میں آپ بتارہے تھے کہ اس کے پڑھنے سے کتنی کتنی برکت ملے گی گفتگو میں آپ فرمارہے تھے کہ عمارہ ان کی کہانی وہ تیس دن ابھی شروع نہیں کی جاسکتی اس کی چند اقساط کمپیوٹر کی نذر ہوگئیں چلیں ہم اور انتظار کرلیتے ہیں ہماری دعا ہے مشتاق انکل اور طاہر بھائی کا عمرہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور آپ سے گزارش ہے کہ وہاں ہم سب قارئین کے لیے دعا فرمائیں اور میرے لیے اولاد کی نعمت کی دعا فرمائیں، بہت خوشی ہوئی کہ اس بار ناچیز کو کرسی صدارت پیش کی گئی بلکہ اس پر زیادہ حق ریاض حسین قمر بھائی کا ہوتا ہے اس بار صرف اور صرف آٹھ خطوط تھے رائٹر سے میری گزارش ہے اس میں بھرپور شرکت کیا کریں ایس ایس پری صاحبہ آپ کو پہلی انٹری پر خوش آمدید کہیں گے آپ کی پانچ ماہ کی محنت رنگ لے آئی آپ تو واقعی ادب شناس ہیں پہلے ہی خط میں میری بیگم تک پہنچ گئیں ایم حسن نظامی صاحب آپ کا خط بھی بھرپور ہوتا ہے ریاض حسین قمر صاحب میرا خط اور قطعہ پسند فرمانے کا شکریہ آپ کا تبصرہ بھی جاندار رہا محمد رفاقت صاحب میری ارشات پسند فرمانے کا شکریہ آپ کی مسلسل حاضری اچھی لگی ہے ریاض بٹ صاحب اور نئے افق لازم وملزوم ہیں لازم و ملزوم تو ہم سب بھی ہیں مگر یہ زیادہ ہیں کلثوم شوکت صاحبہ ہم آپ کو پہلی انٹری پر خوش آمدید کہتے ہیں آپ کو اور حسین خواجہ کو بتانا چاہوں گا کہ میری لاڈلی آپی فریدہ جاوید فری بیمار رہتی ہیں اس لیے وہ زیادہ دیر تک لکھ نہیں سکتیں۔ ورنہ تو انہوں نے بہت سے افسانے لکھے ہیں اور چند کتابیں بھی ان کی مارکیٹ میں آچکی ہیں انہوں نے درجن بھر ایوارڈ بھی حاصل کیے ہیں ادبی دنیا میں ان کا نام بہت معتبر ہے ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ ہماری آپی فریدہ جاوید فری کو مکمل صحت اور تندرستی عطا فرمائے آمین۔

اقرا جٹ...... منچن آباد۔ اہل پاکستان پر سلامتی ہو اہل مسلم پر سلامتی ہو۔ امید واثق ہے سب خیریت سے ہوں گے خوفناک نمبر کا ٹائٹل دیکھ کر بھائی بولے یہ بھوتوں والی کہانیاں پڑھتی ہے اس لیے چڑیل بنتی جارہی ہے انکل

مشتاق احمد قریشی کی دستک پر طاق طاق وا کیا اور حقیقت تو جانتا اللہ پاک ہمارے حکمرانوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین، ہماری پاک آرمی ہمارے ملک کا قیمتی سرمایہ ہے ہماری ہر دعا ہمارے وطن اور پاک آرمی کے لیے ہوتی ہے۔ پاک آرمی کے لیے لکھی گئی خوب صورت نظم

تیری خاطر جان بھی گنوا دیں گے
تیری خاطر جسم بھی گنوا دیں گے
تیری محبت میں گھر بار بھی لٹا دیں گے
تیری عزت پر حرف نہیں آنے دیں گے
اے پاک وطن

تیرے یہ جانباز سپاہی
آتش کو بر خاب بنا دیں گے
اے پاک چمن
تیری خاطر قوم کے یہ بہادر
اپنے خون کی ندیاں بہا دیں گے
ہر طوفان سے ٹکرا دیں گے
پورے عالم کو ہلا دیں گے
تیرے نام پر حرف نہیں آنے دیں گے (تخلیق: اقرا جٹ)

گفتگو میں انٹری دی انکل مشتاق اور انکل طاہر کو عمرہ کی مبارکباد (میں اک ننھی منی سی گڑیا ہوں مجھے نہیں پتا کون انکل ہے کون بھائی عورتوں کی طرح مائنڈ مت کریے گا ہاہاہاہا) بھائی پرنس تھینک یو اب ٹو کرار کھ دیں اتنی دیر سے اٹھایا ہوا ہے تھک جائیں گے (جسٹ کڈنگ) آپ کا تبصرہ با کمال تھا ایم حسن نظامی (انکل بھائی جو بھی سمجھ لیں) تھینکس اینڈ تبصرہ لا جواب تھا ریاض حسین قمر مولا جٹ بس میں نے آج تک ورڈ ہی سنا ہے اینڈ تھنگ اور یہ کیا ہم اور شوخ و چنچل واہ واہ کیا کہہ دیا اتنے زخم کھائے ہیں اگر ہنس کر نہ لکھیں تو ہر لفظ اشک بار لگے آپ کو سو ہم خود بھی خوش رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو ہمیشہ خوش رکھنا چاہتے ہیں دوسروں کو خوش دیکھ کر ہمیں بہت خوشی محسوس ہوتی ہے (جو کر نہیں سمجھ لینا بھئی، ہاہاہاہا) تبصرہ ونڈر فل محمد رفاقت تھینکس تبصرہ لا جواب ریاض بٹ تھینکس آپ کا تبصرہ فنٹاسٹک کلثوم شوکت جی ویلکم آپ اور منچن آباد سے کچھ تعارف کرائیں اپنا (چاہیں تو) تبصرہ نائس، حسین خواجہ ڈیئر برو پہلی بات کہ منچن آباد قصبہ نہیں ہے ضلع بہاولنگر کی ایک جانی پہچانی تحصیل ہے ایک دفعہ کی بات ہے میں ملتان ٹیسٹ دینے گئی تھی انہوں نے کہا کہ یہ منچن آباد کدھر ہے گاؤں ہے کیا میں نے کہا تحصیل ہے ضلع بہاولنگر کی مجھے بہت شدید غصہ آیا پھر میں نے آنچل، حجاب، خواتین، شعاع، کرن اور اب نئے افق کے مستقل سلسلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے اس لیے کہ ہمارے شہر منچن آباد کو ہر کوئی جانے کچھ دن پہلے بھائی لاہور گئے وہاں ایک لڑکے نے پوچھا کہاں سے بھائی نے کہا منچن آباد سے کہنے لگا او بھائی گریٹ آپ کے شہر سے ایک لڑکی ڈائجسٹوں میں لکھتی ہے اب تو منچن آباد جانا پہچانا ہے کون نہیں پہچانتا ہوگا بھائی کہتے ہیں مجھے بڑی خوشی ہوئی ہمارے منچن آباد والے بہت پر جوش ہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ کون سی لڑکی ہے جو ڈائجسٹوں میں گھومتی ہے (اور ہم پردہ نشین ہو کر بیٹھ گئے ہاہاہا) لائک کے لیے تھینکس برو آپ کا تبصرہ کمال تھا ہمارے شہر منچن آباد میں اسکولز، کالجز، اسپتال ہر چیز میسر ہے پھر بھی پتا نہیں کیوں لوگ منچن آباد کو اچھا نہیں جانتے (ہاں لوگ تھوڑے دو غلے، منافق ہیں بے وفا ہیں جن پر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں توجہ نہیں دیتی مجھے شہر مٹھن آباد سے بہت پیار ہے لوگوں سے نہیں کم از کم جب تک تو نہیں جب تک وہ بدل نہیں جاتے، القہار انکل طاہر قریشی نے دل میں خوف خدا کو جگا یا مرشد وڈر فل رہا جل پری زرین قمر ویلڈن مجھے تو ساری رات پریاں نظر آئیں، پراسرار فقیر، جلن، دھندلے سائے، پیپل کا درخت، چیونٹیاں، خالی گھر، نقش زیر آب، خبیث روحیں، لال موم بتیاں، آسیب زدہ، اپرادمی، انسان نما، کالا دائرہ، وہ کون تھی؟ تمام کے تمام خوفناک نمبر کے معیار پر پورا اتر رہے تھے میں تو ساری رات بھوتوں کے بیچ اور دوسری پریوں کے بیچ رہی (ہی ہی ہی ہی) ذوق آگہی سب کے انتخاب ایک دم سپر تھے خوش بوئے سخن سب کی نظمیں غزلیں لاجواب تھیں (ہمیں بھی جگہ دیں نوشین میڈم) یقین جانیں مجھے بہت خوشی ہوئی گفتگو میں سب حضرات نے دل کھول کر ویلکم کیا سب کے لیے ڈھیروں دعائیں میں نے تو بس ادیں انٹری دی تھی مگر اب آپ سب کی محبت نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا زندگی ہر پل امتحان ہے بغیر نقل لگائے محنت، لگن، جدوجہد سے پاس کریں اسی کے ساتھ اجازت اللہ حافظ۔

اپنے اپنے آشیانوں میں لوٹ رہے ہیں اتی
دن بھر کے یہ بھوکے بھٹکے معصوم پنچھی

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد جناب مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم خیر و عافیت اور نیک عاؤں کے ساتھ حاضر ہوں کچھ دن ہوئے شہر ضروری کام کے سلسلے میں جانا پڑا جب بک اسٹال پر پہنچا تو ماہنامہ نئے افق پریل کے تازہ پرچے سے اچانک ملاقات ہوگئی سرورق کوئی خاص نہیں تھا اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں پر نظر پڑی، ایسا وب صورت رسالہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے اس مہنگائی کے دور میں یہ ایک معیاری جریدہ ہے اس کے سارے سلسلے اپنی پنی جگہ پر بہترین ہیں غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ، آپ کے خلوص اور محبت سے سرشار ہو کر ہم آپ کو خط تحریر کرتے ہیں موسم آہستہ آہستہ بدل گیا ہے گرمیوں کا آغاز ہے ہر طرف مہنگائی ہے کافی دنوں سے آپ کو خط لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں بڑی مشکل سے وقت ملا اور یہ تحریر آپ کی نذر ہے ذرا آپ سرورق پر توجہ دیں یہ تو پرچے کی جان ہے سوچتا لکھ ہوں اور تحریر کچھ کر جاتا ہوں قارئین کے خط پڑھ کر پرچے کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے میں ایک بہت پرانا قاری ہوں میرے ساتھ بھرپور تعاون کرنے پر میں آپ کا بے حد مشکور ہوں نئے افق میں کچھ تبدیلیاں کریں تو بہتر ہوگا۔ اس بار کہانیاں اور غزلیں خوب تھیں دیگر سلسلے بھی اہمیت کے لائق تھے پرچے کا مقررہ تاریخ پر بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے خدا آپ کو اپنے نیک مشن میں کامیابی سے ہمکنار کرے بے شک آپ ہم سے دور ہیں مگر دل آپ کی یاد میں دھڑکتا ہے دل کو جس نام سے پکارو آخر وہ رنگین پھول ہی کہلائے گا کچھ غزلیں ارسال کر رہا ہوں قریبی شمارے میں جگہ دے دیں شرط آپ کا ہمارے ساتھ تعاون ہو، خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے ہمیشہ آپ کی زندگی میں رنگ برنگے پھول کھلتے رہیں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی اجازت چاہتا ہوں، نیک تمناؤں کے ساتھ، والسلام

عبدالجبار رومی...... قصور۔

خوفناک سرورق ہے
خوفناک حصار لیے
نئے افق خوفناک نمبر ہے
نئے رنگوں کا اسحار لیے

اس دفعہ نئے افق بہت لیٹ ملا اس لیے ٹھیک سے پڑھ نہیں پایا اور پھر ہم سے بہت زیادہ محبت کرنے والے ہمارے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

والد محترم عبدالستار انصاری 10 فروری کو ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے پیارے ابو جان کی جدائی ہمیں بہت ہی فیل ہوتی ہے اللہ تعالی ان کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی کی کھری کھری باتیں سکہ رائج الوقت بہت اچھی لگیں لیکن وہ کیا ہے کہ گرم گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے بس ایسا ہی کچھ حال ہے فیصلے تو آنے تھے آ گئے اب ان سے صبر کہاں ہو گفتگو کی سچائی اور غلطی پر معذرت اچھی بات ہے انکل مشتاق احمد قریشی اور بھائی طاہر احمد قریشی کو عمرہ پر روانگی مبارک ہو پرنس افضل شاہین کے مچلتے ہونٹ اچھے لگتے ہیں عمدہ تبصرہ ایس ایس پری کی انٹری خوب رہی اب کئی ماہ پاپڑ بیل لیے تو آئندہ ماہ پورا پورا تبصرہ لکھیے گا اچھا لگے گا ایم حسن نظامی نے بھی بہت اچھا لکھا سیاست پر بات کرتے ریاض حسین قمر کا بھرپور تبصرہ بھی عمدہ رہا محمد رفاقت بھائی اچھا لکھنے والے کو تو ضرور جگہ ملتی ہے آپ کا تبصرہ بہت اچھا ہوتا ہے ریاض بٹ بھائی آپ بھی بہت اچھا لکھتے ہیں اور میرا تبصرہ پسند کرنے کا بھی بہت شکریہ، ایک ہی شہر سے کلثوم شوکت اور حسین خواجہ کے تبصرے بھی بہت عمدہ ہے اسی شہر سے اقرا جٹ اس دفعہ نظم نہیں آئیں اقرا میں القہار پر خوب صورت باتیں اچھی لگیں غیرت مند مرشد نے آخر کار رجاب کو دشمنوں کے نرغے سے نکال ہی لیا حجاب کی قربت نے بھی مرشد کے دل کو اتھل پتھل کر دیا ہے تبھی تو اب وہ بلوچستان جانے سے گھبرا رہا ہے عمد[illegible] کہانی اپرادمی کو حساب ضرور دینا ہوگا خالی ہمسایہ گھر سے پراسراریت کے پردے فاش کرتی رونگٹے کھڑی کرنے والی کہانی زبردست ہے زاہد کی بیوی سلمٰی تو باہمت نکلی۔ مختصر کہانی پراسرار فقیر بھی ٹھیک رہی سپر ہائی وے کی دوشیزہ کی لفٹ نے ت[illegible] سرمد اور اس کی بیوی کو چکرا کے رکھ دیا اف اتنی دہشت انگیز اور خوفناک کہانی مجھے بھی ٹھنڈک میں پسینہ آ گیا واقعی پتا نہیں وہ پراسرار لڑکی کون تھی جب کنزہ کو آرام آ گیا تھا تو پھر کیا ضرورت تھی پھر سے پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھنے کی اللہ کے نیک بندے کریم بخش کی وجہ سے کالے دائرے کا حصار ٹوٹا تو طاہر بیگ بھی جگرال کے شیطانی چکر سے آزاد ہو گیا برائی سے دور اور نیکی کا درس دیتی کہانی کالا دائرہ اچھی لگی والسلام۔

ترتیب: طاہر قریشی

التواب

(توبہ قبول کرنے والا)

تواب: مبالغہ کا صیغہ توبہ سے مشتق ہے۔ لغت میں توبہ کرنے والے اور توبہ قبول کرنے والے دونوں کو "تواب" کہا گیا ہے۔ بندہ توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اس لئے اس کا استعمال اللہ تعالیٰ اور اُس کے بندے دونوں کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے لغوی معنیٰ 'پھر آنے والا' توبہ کرنے والا' معاف کرنے والا' توبہ قبول کرنے والا۔ جب یہ اسمِ تواب کسی بندے کی صفت کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی کثرت سے توبہ کرنے والا ہوں گے اور جب صفتِ الٰہی کے لئے استعمال ہو تو اس کا مطلب ہوا کہ ربّ التواب کثرت سے اپنے بندوں کی بار بار توبہ قبول فرمانے والا ہے۔

امام ابو سلیمان خطابیؒ فرماتے ہیں کہ "تواب وہ ہے جو اپنی بندوں پر مہربانی فرما کر ان کی توبہ کو قبولیت بخشے چاہے جتنی دفعہ توبہ دہرائی جاتی رہے اتنی ہی بار قبولیت کی تکرار ہو۔ (کتاب الاسماء والصفات۔ لغات القرآن مولانا عبدالرشید نعمانیؒ)

"تواب" اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظیم صفت ہے اللہ تعالیٰ بڑا ہی رحیم وکریم ہے وہ اپنے بندوں کی اپنی بداعمالی یا اپنی طرزِ زندگی پر اظہار ندامت وشرمندگی کو پسند فرماتا ہے جب بندہ اپنے کسی عمل یا طرزِ عمل پر ندامت محسوس کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور توبہ کی درخواست کرتا ہے تو اُس وقت اللہ کی صفتِ توابی زور پر آتی ہے اور وہ اپنے بندے کی درخواست کو قبول فرما لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے وقت جہاں اس میں بہت سی خاصیتیں جمع فرما دی ہیں اس میں ایک حس ایک صفت یہ بھی اس کی فطرت کا حصہ بنا دی کہ ہر قسم کے خطرات کے وقت اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے' اُسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے یا جس راہ پر چل رہا ہے وہ غلط ہے اللہ کے حکم کے خلاف ہے' اگر اللہ نے اسے اس احساس کی نعمت سے نوازا ہوتا ہے اور اس کے دل میں خوفِ الٰہی موجزن ہوتا ہے تو وہ فوراً ہی توبہ استغفار کر لیتا ہے اور اپنے رب سے رجوع کر لیتا ہے یہ احساس اللہ نے انسانی فطرت میں رکھا ہے' توبہ کی توفیق بھی اللہ ہی دیتا ہے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ترجمہ:۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔(البقرۃ۔۳۷)

قرآنِ کریم اس نظریے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں جو ہر حال میں انسان کو بھگتنا ہی ہوں گے۔ یہ نظریہ دراصل انسان کا خودساختہ ہے جو اس میں مایوسی پیدا کردیتا ہے۔ جبکہ قرآنِ حکیم اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور برائی کی سزا دینا خالص اللہ تبارک وتعالیٰ کا اختیار ہے۔ وہ ذاتِ عالی ہر چیز پر ہر ہر طرح سے قادرِ مطلق ہے' وہ ہماری بھلائی پر انعام یعنی جزا دے یہ کوئی ضروری نہیں یا نیکی وبھلائی کا لازمی طبیعی نتیجہ بھی نہیں' بلکہ یہ تو اللہ کا فضل ہے' چاہے وہ عنایت فرمائے یا نہ فرمائے۔ اسی طرح برائی پر وہ قادرِ مطلق سزا دینا چاہے تو دے نہ چاہے تو نہ دے۔ اللہ کا فضل اس کی رحمت وحکمت سے ہم رشتہ ہے۔ اللہ کی ایک صفت حکیم بھی ہے' وہ اپنے اختیارات کا قطعی اندھا استعمال نہیں فرماتا' بھلائی ونیکی پر جزا ضرور دیتا ہے بشرطیکہ خالص رضائے الٰہی کی نیت سے کی گئی ہو۔ ظاہری نمائشی نیکی پر نہیں' اسی طرح وہ سزا اس قصور وغلطی پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کی جائے جس کے پیچھے ندامت شرمساری کے بجائے ارتکاب جرم کی خواہش موجود ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس قصور پر معافی دیتا ہے جس کے بعد بندہ شرمندہ ونادم ہو اور آئندہ اپنی اصلاح پر آمادہ بھی ہو۔ اور بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعت کی روش اختیار کرلے۔

ترجمہ:۔ اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے سکھا اور ہماری توبہ قبول فرما' تو بڑا توبہ قبول فرمانے والا اور رحم وکرم کرنے والا ہے۔(البقرۃ۔۱۲۸)

یہ ایک ایسی دعا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلِ مومن کی پہلی تمنا کیا ہوتی ہے۔ عقیدہ اور نظریہ ہی ایک مومن کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ وہ اطاعت وبندگی کے تقاضے پورا کرنے میں لگ جاتا ہے اور دین اور کتاب وحکمت کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور ہر قسم کی گندگیوں' آلودگیوں سے پاک ہوجاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ہمیشہ ہر مخلصانہ دعا قبول ہوتی ہے۔

ترجمہ: اور اللہ ہی توبہ قبول کرنے میں اور رحمت کرنے میں کامل ہے۔(التوبہ۔۱۰۴)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ صفتِ عظیم ہے کہ وہ اپنے بندوں کی نہ صرف توبہ قبول فرماتا ہے بلکہ وہ اپنی صفتِ رحیمی وکریمی کے ذریعے انہیں معاف بھی فرمادیتا ہے۔ انسان غلطیاں کرتا رہتا ہے اس سے دانستہ اور نادانستہ گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں' انسان غلطی کرے اور اس کا احساس ہوجانے پر فوراً اپنی شرمندگی وندامت کا اظہار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے' اللہ بڑا ہی مہربان اور رحم وکرم کرنے والا ہے وہ اپنے بندے کی شرم وندامت سے کی گئی توبہ کو قبول فرما کر اسے معاف فرمادیتا ہے۔

فضائل:۔ جو شخص اس صفتِ مبارک کا ورد اپنا معمول بنالے اللہ تعالیٰ اس کے تمام کام سنوار دیتا ہے' اور اس کا نفس پر قابو رہتا ہے۔ اللہ اسے خوش حالی اور فراغت عطا فرماتا ہے۔

ایک بکس سے شروع ہونے والی کہانی ایک طالب علم کی کتھا وہ بکس میں چھپے راز کو آشکار کرنا چاہتا تھا وہ اپنی کلاس میٹ کے ساتھ ایک ایسے کھیل سے منسلک ہوگیا جو ٹی وی اسکرین یا کمپیوٹر کے بجائے حقیقت کی دنیا میں کھیلا جاتا ہے جہاں قدم قدم پر خوف اور موت آپ کا پیچھا کرتے ہیں جہاں شکست کا مطلب موت اور فتح کا مطلب زندگی ہے۔

ایک ایسا ناول جو آپ کی رگ رگ میں خوف بھر دے گا۔

معروف مصنف برین ہرمن کے مشہور و معروف ناول ''دی بکس'' کی تلخیص

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وہ محض لکڑی کا ایک چوکور بکس تھا لیکن اس کے لیے ایک پُر اسرار معمہ بنا ہوا تھا۔ البرٹ حیران تھا کہ اس کی لاک کار میں وہ کہاں سے آ گیا تھا اس کی بیرونی دیواروں پر عجیب و غریب لکھائی تھی جسے سمجھنے سے وہ قاصر تھا اور وہ بکس ہزار کوشش کے باوجود کھولنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اس چکر میں اس نے دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے بھی چھوڑ دی تھی۔ اس دس انچ قطر کے چوکور بکس میں الٹنے پلٹنے پر کوئی چیز آواز پیدا کرتی تھی لیکن البرٹ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کیا ہوسکتا ہے بکس پر تین سمتوں میں چاقو کی مدد سے کھودی گئی لکھائی تھی اور ایک سمت نقشے کی طرح کوئی تصویر بنی تھی۔

''ارے تم ابھی تک اس عجیب و غریب بکس میں الجھے ہوئے ہو؟'' اس کے روم میٹ ڈیرک نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنی کار کی چابیاں بے پروائی سے میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' البرٹ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں کوئی غلطی سے تمہاری کار میں یہ ڈال گیا ہوگا۔'' ڈیرک نے بے پروائی سے کہا۔

''پتہ نہیں کیوں یہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔'' البرٹ نے کہا۔

''کیا تم نے کیری کو دیکھا ہے؟'' اس نے اپنی دوست کے بارے میں پوچھا جو چار لڑکیوں کے ساتھ ان کے ہاسٹل کی سامنے والی قطار میں رہتی تھی اور اس سے بہت مانوس تھی۔

''نہیں۔'' البرٹ نے جواب دیا وہ تین ہفتے سے اس کے ساتھ اس کے کمرے میں مقیم تھا ان دونوں کی دلچسپیاں الگ الگ تھیں۔ البرٹ کمپیوٹر سائنس میں دلچسپی رکھتا تھا اور ڈیرک کو بزنس سے لگاؤ تھا۔ البرٹ کو کتابیں پڑھنا پسند تھا اور ڈیرک کو باہر گھومنا۔

البرٹ اب تک بہت سے لوگوں کو اس بکس کے بارے میں بتا چکا تھا لیکن کوئی بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور ہر کسی کا یہی خیال تھا کہ کوئی غلطی سے اس کی کار میں وہ بکس رکھ گیا تھا۔ البرٹ کا دل کئی بار چاہا کہ وہ اس بکس کو توڑ کر اس کی پُراسراریت سے پردہ اٹھائے لیکن دوسرے ہی لمحے اس خیال سے وہ رک گیا کہ ممکن ہے یہ بکس کسی اور کے لیے اہم ہو اور اس کی اس حرکت سے کسی کو نقصان پہنچ جائے۔ بکس کی ایک سمت تین لیٹر تین لائنوں میں اوپر سے نیچے کی طرف لکھے تھے۔

TZ

VII

100ST

البرٹ کے لیے انہیں سمجھنا مشکل تھا وہ یقین سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ لکھائی الفاظ میں ہے یا گنتی میں۔ چنانچہ اگر وہ لکھائی اس بکس کے راز کو جاننے کے لیے کوئی اشارہ تھا تو البرٹ اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ دوسری سمت موجود لکھائی اس کے لیے مزید پریشان کن تھی جو پانچ لائنوں میں لکھی گئی تھی جن میں سے پہلے چار مکمل الفاظ تھے لیکن پانچویں لائن میں صرف تین حروف لکھے تھے۔

HELP

COME

TOGETHER

YESTERDAY

G,N and J

اس لکھائی سے بھی البرٹ کچھ سمجھنے سے قاصر تھا بکس کی تیسری سمت میں سات حروف لکھے تھے۔

BRANDYR

اسے لگا جیسے وہ کوئی نام ہو Brandy R وہ ایک برینڈی آر کو جانتا بھی تھا وہ اس کی لیب پارٹنر اور اس سے ایک سال سینئر تھی اس کی عمر تقریباً بیس سال تھی جب کہ وہ بہ مشکل انیس سال کا تھا۔ برینڈی بہت خوب صورت تھی اور دیکھنے سے اپنی عمر سے چھوٹی لگتی تھی۔ البرٹ نے یہ بکس اسے بھی دکھایا تھا لیکن اس کا جواب بھی یہی تھا۔

''ممکن ہے یہ بکس کسی اور برینڈی آر کا ہو میرے لیے تو یہ غیر مانوس ہے۔''

البرٹ نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کا کھانا لامی ہال میں کھائے گا وہ جگہ اسے پسند تھی اور اس کے ریسٹ ہاؤس بورڈنگ سے قریب تھی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی اس نے ریسیو کیا تو دوسری طرف سے نسوانی آواز سنائی دی۔

''ہیلو البرٹ؟''

''میں بات کر رہا ہوں۔''
''میں برینڈی ہوں تمہاری لیب پارٹنر۔''
''ہائے۔''
''کیا تمہیں بکس کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟'' برینڈی نے پوچھا۔
''نہیں ابھی تک تو نہیں۔'' البرٹ نے جواب دیا۔
''آج جب میں کیمپس سے واپس آ رہی تھی تو میری کار میں بھی مجھے کچھ ملا ہے۔'' برینڈی نے کہا اور البرٹ کا دل تیزی سے دھڑکا۔
''تمہیں کیا ملا ہے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔
''تم لامی ہال میں ہو؟'' برینڈی نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔
''ہاں۔''
''کس فلور پر؟''
''سیکنڈ فلور پر۔''
''میں بیس منٹ میں سیکنڈ فلور کے لاؤنج میں آ رہی ہوں تم وہیں میرا انتظار کرو۔''
''او کے!'' البرٹ نے جواب دیا اور برینڈی نے خدا حافظ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ البرٹ حیران تھا کہ ابھی وہ باکس کے بارے میں معلومات جمع کر رہا تھا کہ برینڈی کو بھی کچھ مل گیا اس نے سوچا ممکن ہے برینڈی کو ملنے والی چیز کی بدولت انہیں مل کر معلومات جمع کرنے میں آسانی ہو۔

ٹھیک بیس منٹ بعد برینڈی لاؤنج میں پہنچ گئی تھی جہاں البرٹ اس کا منتظر تھا وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر شکوک وشبہات کے تاثرات صاف پڑھے جا سکتے تھے۔
''اگر تم نے مجھ سے کوئی مذاق کیا ہے تو مجھے یہ پسند نہیں یا تم جانتے ہو کہ ایسے قوانین بھی موجود ہیں جو کسی کی کار کا لاک توڑنے پر لاگو آتے ہیں۔'' برینڈی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور البرٹ کو لگا جیسے برینڈی نے اس کے سر پر ہتھوڑا کھینچ مارا ہو وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا برینڈی اس پر شک کر رہی ہے۔
''اگر یہ کوئی مذاق ہے تو ہم دونوں کو اس کا شکار بنایا جا رہا ہے۔'' البرٹ نے کہا اور برینڈی مسکرا کر صوفے سے پشت لگا کر بیٹھ گئی تھی اس کے چہرے کے تاثرات اچانک تبدیل ہو گئے تھے اور وہ خاصی پرسکون نظر آنے لگی تھی۔ لاؤنج میں لوگ بیٹھے باتوں میں مصروف تھے برینڈی کے آنے کے بعد دو لڑکے اور ایک لڑکی مزید لاؤنج میں آئے تھے۔
''میں سمجھ سکتا ہوں۔''
''دراصل میں خوف زدہ ہو گئی ہوں کہ جب میں کلاس میں تھی تو کوئی میری کار میں داخل ہوا۔''
''ہاں......اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔''
''جو کچھ مجھے ملا ہے وہ بہت واہیات ہے بالکل بے کار......اسے تو پھینک دینا چاہیے۔'' برینڈی نے کہا۔
''تمہیں کیا ملا ہے؟'' البرٹ نے پوچھا اور برینڈی نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے ایک براؤن چمڑے کا چھوٹا سا پرس نکالا جس میں سے ایک چابی نکال کر البرٹ کی طرف بڑھا دی۔
''یہ ایک چابی ہے۔'' برینڈی نے کہا اور البرٹ بغور اسے دیکھنے لگا اس کو لگا جیسے وہ اس بکس ہی کی ہے جو اسے اپنی کار سے ملا تھا۔ اس نے معنی خیز نظروں سے برینڈی کی طرف دیکھا وہ بھی شاید اس کا مطلب سمجھ گئی تھی کیونکہ اس کی نظروں میں حیرت کے آثار تھے۔ البرٹ نے دیکھا چابی پر ALBERTC لکھا تھا۔
''البرٹ کروس!'' برینڈی نے زیر لب کہا۔
''یہ اتفاق تو نہیں ہو سکتا۔'' البرٹ نے کہا مجھے جو بکس ملا ہے اس پر تمہارا نام لکھا ہے اور تمہیں جو چابی ملی ہے اس پر میرا نام لکھا ہے۔''
''کیا تم بکس لائے ہو؟''
''ہاں۔'' البرٹ نے کہا اور اپنے بیگ سے بکس نکال لیا پھر اس نے بکس کو سامنے میز پر رکھا تھا اور چابی کی مدد سے اسے کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بکس ایک ہی کوشش میں کھل گیا تھا۔
''مجھے بھی یہ اپنی کار میں سے ملی تھی۔'' برینڈی نے کہا۔
''کیا تمہاری کار بھی لاک تھی؟''
''ہاں میری کار بھی لاک تھی۔'' برینڈی کے لہجے میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

حیرت تھی۔

"اس بکس کے اوپر لکھی ہوئی ایک تحریر کا معمہ تو حل ہوگیا ہے یعنی برینڈی آر۔" یہ تمہارے لیے لکھا تھا اور بکس کی چابی مجھے تم سے ملی ہے۔" البرٹ نے کہا۔

"ہاں اور دوسری تحریر جو الفاظ پر مشتمل ہے یعنی yesterday,together, come, help یہ مشہور گیت ہے جو GNJ کا بینڈ گاتا ہے۔" برینڈی نے کہا۔

"اس بکس کا کور کھولو اس میں کیا ہے؟" برینڈی کے کہنے پر البرٹ نے کور کھولا تھا لیکن بکس میں موجود چیزوں کو دیکھ کر ان دونوں کو مایوسی ہوئی تھی۔ اس میں چند بے کار چیزیں تھیں۔ ایک ٹوٹی ہوئی دھات کا زنگ آلود ٹکڑا' ایک تانبے کا پرانا بٹن' کالے رنگ کا ایک گندا سا پرس اور ایک سلور کی جیبی گھڑی' بہت پرانی تھی اور جس کی شاید کوئی قیمت نہیں تھی۔

"یہ سب کیا ہے؟" برینڈی نے حیرت سے کہا۔

"ان چیزوں کا کیا مطلب ہے؟" البرٹ نے گھڑی اٹھا کر دیکھا اس پر G کا لفظ کندہ تھا اور وہ بکس کی دوسری چیزوں کی طرح گندی تھی ان چیزوں پر مٹی جمی ہوئی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں کام نہیں کر رہی تھیں وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ ان چیزوں کے ساتھ بکس میں ایک پتھر بھی رکھا تھا۔

"ان چیزوں کا مقصد میری سمجھ میں تو نہیں آیا۔" برینڈی نے کہا۔

"یہ سب کاٹھ کباڑ ہے۔" البرٹ نے بھی مایوسی سے کہا۔

"کسی نے ہم سے مذاق کیا ہے؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" برینڈی نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔

"میں جا رہی ہوں...... اگر اس سلسلے میں کوئی خاص بات پتہ چلے تو مجھے بتانا۔"

"ٹھیک ہے۔" البرٹ نے کہا پھر برینڈی کے جانے کے بعد وہ واپس اپنے کمرے کی طرف گیا تھا لیکن کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ ڈیرک وہاں موجود ہوگا۔ اور وہ مزید بور ہونے کے موڈ میں نہیں تھا چنانچہ واپس پلٹ آیا تھا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے یونیورسٹی کے میوزک ہال کی طرف چل پڑا تھا وہ کچھ وقت سکون سے گزارنا چاہتا تھا۔

میوزک ہال کے کیفے ٹیریا میں اس نے رات کے کھانے کے طور پر ایک چیز برگر اور چپس کھائے تھے۔ وہ حیران تھا کہ برینڈی کتنی آسانی سے سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی تھی اور ان چیزوں کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی جب کہ اس کی فطرت اسے اکسا رہی تھی کہ اس بکس اور چابی کے راز سے پردہ اٹھائے اس نے ایک بار پھر بکس کی چیزوں کو نکال کر ان کا جائزہ لیا تھا دھات کا ٹکڑا اسے کسی چاقو کے پھل سے مشابہہ لگا تھا جو چاقو سے ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے سب چیزیں پھر واپس بکس میں رکھ کر بکس بیگ میں رکھ لیا تھا اور کیفے ٹیریا سے نکل گیا تھا وہ بکس پر لکھے Help, come together,yesterday کے بارے میں سوچ رہا تھا جو تین گیت تھے اور beathes گروپ نے گائے تھے لیکن البرٹ نے کبھی نہیں سنے تھے۔

یونیورسٹی کی میوزک بلڈنگ کیمپ کے دوسری جانب تھی جو آٹھ منزلہ تھی اور کیوب کی شکل میں بنی تھی۔ جہاں یونیورسٹی کے آدھے سے زیادہ رہائشی طالب علم رہتے تھے۔ بلڈنگ کے سامنے کی جانب بڑا سا سائن بورڈ لگا تھا جس پر gaggers hall لکھا تھا البرٹ بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوا اندر ہال کی ایک دیوار پر ایک سفید بالوں والے سوٹ میں ملبوس شخص کا پورٹریٹ لگا تھا جس کی مونچھیں بھی سفید تھیں۔ پورٹریٹ کے نیچے اس کا نام لکھا تھا۔

GNJ "George Nicholon Juggers" البرٹ نے زیر لب پڑھا اس نے بکس کا دوسرا راز بھی معلوم کر لیا تھا۔ اب اسے اگلے معمے سے پردہ اٹھانا تھا پھر اس نے پوری بلڈنگ کا چکر کاٹ لیا تھا لیکن اسے کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آئی تھی۔ پھر جب وہ واپس پلٹ رہا تھا تو کسی چیز نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔ کوئی چیز تھی جس نے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا شاید وہ کوئی ہلکی سی آواز یا سرگوشی تھی جسے سن کر وہ مڑا تھا پہلے تو اسے کچھ نظر نہیں آیا لیکن پھر اس کی نظریں ایمر جنسی بٹن پر جم گئی تھیں جو سارے کیمپس میں جگہ جگہ لگے ہوئے تھے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وہ لال رنگ کے بٹن جگہ جگہ نصب تھے اور ان کا تعلق ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کے سیکورٹی ہیڈ کوارٹرز سے تھا کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں ایک بار بٹن دبانے سے پولیس حادثے کے مقام پر پہنچ سکتی تھی۔ بٹن کیمپس میں درجنوں جگہوں پر لگے تھے سب پر الگ الگ نمبر درج تھے جو ان کے اسٹیشن کے حساب سے تھے وہ خاص بٹن جس نے البرٹ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی بارہ نمبر کا بٹن تھا یعنی وہ نمبر "IZ" نہیں تھا بلکہ "12" تھا البرٹ کا تجسس مزید بڑھا اس لمحے اس کی نظریں جو کرہال میں لگے بڑے سے گھڑیال میں رومن میں نمبر لکھے تھے پھر اچانک نمبر 12 بٹن کے سامنے کھڑے اس کی نظریں گھڑیال کے سینٹر سے ایک سیدھی لکیر میں سات کے ہندسے "VII" کو پار کرتی ہوئی نیچے کنکریٹ کے سفرش پر آ ئیں جہاں دھات کی بڑی سی چادر لگی تھی جس کے نیچے سرنگ میں جانے کا راستہ تھا جو سرنگ اس عمارت کے نیچے موجود تھی۔ البرٹ اس دھات کی چادر کے قریب گیا جہاں اسے اگلا اشارہ بھی نظر آ گیا "1005T" اس دھات کی چادر پر اس نمبر کی مہر لگی ہوئی تھی وہ حیران تھا کہ کتنی جلدی اس نے باکس کے کئی رازوں سے پردہ اٹھا لیا تھا پھر وہ واپس لامی ہال کی طرف جاتے ہوئے بار بار پلٹ کر پیچھے میوزک بلڈنگ کی طرف دیکھ رہا تھا اور اسے ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہو۔

اس رات سونے سے پہلے البرٹ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ باکس پر بنے نقشے کی مدد سے اس سرنگ کا جائزہ ضرور لے گا جو اپنے تمام اشاروں سے رہنمائی کرتی اسے اپنے دروازے تک لے گئی تھی اس کا ذہن بار بار کہہ رہا تھا کہ یوں اچانک باکس اور چابی کا مل جانا اور پھر بکس پر لکھی تحریر کی مدد سے سرنگ کا پتہ چلنا اور باکس پر بنے نقشے کی مدد سے بھی اسے اس راز کے اور پردے اٹھانے کا موقع مل سکتا تھا۔

اگلے روز اس نے بازار سے کچھ ضروری سامان خریدا جو سرنگ میں اترنے کے لیے ضروری تھا اس نے سرچ لائٹیں اور ان کی کچھ اضافی بیٹریاں خریدیں، رسی اور دوسرا ضروری سامان بھی لیا اور پھر بریںڈی کو فون کر کے بلا لیا۔

"میں چاہتا ہوں تم بھی مہم پر میرے ساتھ چلو۔"

البرٹ نے پرجوش انداز میں کہا۔

"مہم پر؟" بریںڈی نے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔

"ہاں...... یہ ایک طرح کی مہم ہی ہوگی...... تمہیں پتہ ہے مجھے بچپن سے ایسے معمے اور مہمات حل کرنے کا شوق ہے۔"

"ہوں...... ہوگا...... لیکن مجھے نہیں۔"

"دیکھو...... بہت مزہ آئے گا...... اگر بکس پر بنا ہوا نقشہ صحیح ہے تو یقیناً وہاں کوئی بڑا سرپرائز ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"ہاں...... یا کوئی بڑا خزانہ تمہارا منتظر ہوگا۔" بریںڈی نے مذاق اڑایا۔

"تم دیکھنا...... ایسا ہی ہوگا......" البرٹ نے کہا اور بکس پر بنے ہوئے نقشے کی طرف اس کی توجہ دلائی۔

"دیکھو اس میں لائنوں کی مدد سے سرنگیں دکھائی گئی ہیں جو یونیورسٹی کی عمارت سے لے کر میوزک بلڈنگ، گیس پلانٹ، پولیس اسٹیشن کے علاقوں میں زمین کے نیچے بچھی ہوئی ہیں اور ان میں سے مزید لکیریں ذیلی سرنگوں کی نشاندہی کر رہی ہیں یوں سمجھو یہ بھول بھلیاں ہیں وہاں اس نقشے کی مدد سے اپنی منزل تک پہنچنا ایک مہم سر کرنے کی طرح ہی ہوگا۔"

"تم تو پاگل ہو گئے ہو...... بھلا شہر کے نیچے بچھی ہوئی یہ سرنگیں جو شہر کے گندے اور بے کار پانی کو نکالنے کے لیے بنی ہیں یا گیس لائنیں، بجلی اور ٹیلی فون کی لائنیں ان میں کون سا خزانہ ہو سکتا ہے۔" بریںڈی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"تم میری بات نہیں سمجھو گی تمہیں کیا پتہ کتنا مزہ آئے گا۔" البرٹ نے کہا۔

"یہ سروس سرنگیں سارے شہر میں جال کی طرح بچھی ہوئی ہیں اور پاور پلانٹ تک جاتی ہیں جو شہر سے باہر ہے۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔"

"اوہ...... کون جانے وہاں ہماری خوش قسمتی ہماری راہ دیکھ رہی ہو۔" البرٹ نے کہا اور پھر بریںڈی کی طرف دیکھنے لگا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"تم میرے ساتھ چلوگی نا؟" اس نے پوچھا۔
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" برینڈی نے قطعی لہجے میں کہا۔
"وہاں اگر کوئی بہت بڑا خزانہ بھی چھپا ہے نا پھر بھی مجھے کوئی پروا نہیں ہے...... میں نہیں جاؤں گی۔"
"میں تو کچھ سامان بھی لے آیا ہوں میں تمہارے لیے یہ سرچ لائٹ لایا تھا۔"
"نہیں بابا نہیں...... میرے جانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔"
"ٹھیک ہے...... مجھے اکیلے جانے میں بھی کوئی پرابلم نہیں ہے وہاں نیچے اندھیرے میں تنہا ڈرنے والا نہیں وہ اتنی گہرائی میں ہیں کہ وہاں سے شاید کسی کی چیخیں بھی اوپر نہ آسکیں اور کسی کو پتہ نہ چلے کہ کوئی نیچے ہے۔"
"ہاں...... تمہیں یاد ہے دو سال پہلے دو اسٹوڈنٹس غائب ہوگئے تھے جواب تک نہیں ملے۔"
"نہیں میں نے تو نہیں سنا۔" البرٹ نے کہا۔
"اور کچھ عرصہ پہلے ایک شخص کا قتل بھی ہو چکا ہے اس کی لاش قریب ہی جھاڑیوں سے ملی تھی۔"
"اچھا...... لیکن ضروری تو نہیں کہ وہ سرنگوں کی وجہ سے مرے ہوں۔"
"تمہیں پتا ہے انہیں بھی ایسا ہی پراسرار بکس ملا تھا۔" برینڈی نے بتایا البرٹ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔
"البرٹ ...... تم اچھے لڑکے ہو...... تم ان زمین دوز سرنگوں سے دور رہنا۔" برینڈی نے پھر سمجھایا۔
"میں نے یہ سامان خریدنے پر اچھی خاصی رقم خرچ کی ہے اور اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ نیچے سرنگوں میں کوئی خطرناک چیز ہے۔"
"لیکن یہ تو سوچو کسی نے ہمیں یہ بکس کیوں دیا ہے کوئی کیوں ہمیں وہاں بھیجنا چاہتا ہے؟"
"کچھ بھی ہو لیکن میں ضرور جاؤں گا۔" البرٹ نے قطعی لہجے میں کہا۔
"تم مجھے سرنگ کے منہ تک چھوڑنے تو آؤگی نا......؟" اس نے برینڈی سے پوچھا۔
"نہیں...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے اگر تم جانا نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن کم از کم تمہیں پتہ تو ہوگا کہ میں نیچے سرنگوں میں گیا ہوا ہوں اور اگر میں جلد واپس نہ آیا تو میری مدد تو کرسکوگی۔"
"تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟"
"مجھے یقین ہے ایسا ہوگا نہیں لیکن پھر بھی کم از کم پتہ تو ہوگا۔" البرٹ نے دوبارہ کہا۔
دوسرے روز علی الصبح البرٹ نیلی جینز اور لمبی شرٹ پہنے سرنگ کے دروازے پر جیگر ہال پہنچ گیا تھا اس کا ہرے رنگ کا بیگ اس کے کاندھے سے لٹک رہا تھا جس میں اس کا سامان موجود تھا کچھ ہی دیر میں برینڈی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے بھی بلو جینز اور بلو شرٹ پہنی ہوئی تھی اور پیروں میں ٹینس شوز تھے اس کا پرس بھی اس کے کاندھے پر لٹک رہا تھا ابھی اس سڑک پر لوگوں اور گاڑیوں کی آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی البرٹ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔
"ارے تم آگئیں؟" اس نے کہا۔
"ہاں میں نے سوچا کہ مجھے تمہاری بات مان ہی لینا چاہیے پھر میں نہیں چاہتی تھی کہ تم اکیلے ان سرنگوں میں اترو۔"
"ٹھیک ہے۔" البرٹ نے کہا اور سرنگ میں داخل ہونے کے راستے سے دھات کی چادر ہٹائی جو دراصل اس کا دروازہ تھا ہلکی سی آواز ہوئی تھی لیکن اطراف میں کوئی موجود نہیں تھا البرٹ نے برینڈی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا اور سرنگ میں داخل ہوگیا تھا۔ برینڈی بھی اس کے ساتھ نیچے اتر گئی تھی اور دروازہ بند کردیا تھا۔ نیچے جانے کے بعد البرٹ نے سرچ لائٹ آن کرلی تھی جس سے اندر روشنی ہوگئی تھی اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بکس کی وہ سمت اوپر کی طرف ہی رکھی تھی جس پر نقشہ بنا ہوا تھا کہ سرنگ میں آگے بڑھنے میں اسے آسانی ہو۔ سرنگ میں دیواروں کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی cables کے تار پھیلے ہوئے تھے۔ سرنگ اس کے دائیں بائیں دونوں سمتوں میں پھیلی ہوئی تھی وہ جس لوہے کی سیڑھی سے نیچے اترے تھے اس کے قریب ہی ایک بڑا سا بکس لگا تھا جس میں مختلف بٹن لگے ہوئے تھے۔ سرنگ کے اندر دور دور تک

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بس کیبلز اور سائے نظر آ رہے تھے۔ اور کافی فاصلے سے کہیں سے بھاری مشینری کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے آس پاس نادیدہ چیزیں رینگ رہی ہوں یا اس کے پیروں سے چمٹ رہی ہوں۔ سرنگ کی دیواریں اسے اپنے گرد گھیرا تنگ کرتی محسوس ہو رہی تھیں اسے اپنے اطراف کی چیزیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں اس کا سارا انحصار اپنی محسوس کرنے کی حسیات پر تھا جن پر خوف سا طاری ہو گیا تھا۔

"یہاں بہت ٹھنڈ ہے۔" برینڈی نے کہا۔

"میں جب بہت چھوٹی تھی تب میں نے اپنے کزنز کے ساتھ اپنی دادی ماں کے تہہ خانے میں کچھ وقت گزارا تھا وہاں اس سے بھی زیادہ ٹھنڈ تھی ہم بچوں کو اکثر وہاں جانے سے منع کیا جاتا تھا لیکن ہم آنکھ بچا کر وہاں جاتے تھے وہاں چھپ کر کھیلنے میں ہمیں بہت مزہ آتا تھا اب اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔"

"چلو تو اب اپنی مہم کا آغاز کرتے ہیں۔" البرٹ نے اپنے بیگ سے اسپرے پینٹ کین نکالا اور برینڈی کی طرف بڑھا دیا۔

"اب ہمیں یہ استعمال کرنا ہے تم سرنگ کی دیوار پر اس سے جگہ جگہ تیر کا نشان بناتی جانا کہ ہمیں واپسی کا راستہ ڈھونڈنے میں آسانی ہو اور ہم کھو نہ جائیں۔" البرٹ نے کہا۔

"اچھا آئیڈیا ہے۔" برینڈی نے پینٹ اسپرے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا پھر انہوں نے سرنگ میں آگے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ہمیں کتنی دور تک چلنا ہوگا؟" برینڈی نے پوچھا۔

"یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے' نقشہ بھی بہت پرفیکٹ بنا ہوا نہیں ہے۔" البرٹ نے کہا۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں سرنگ میں لوہے کی ویسی ہی سیڑھیاں نظر آئی تھی جیسی ایک سیڑھی سے وہ سرنگ میں اترے تھے یہ سیڑھیاں تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد لگی ہوئی تھیں کچھ دور جانے کے بعد ایک سرنگ کے فرش میں ایک چوکور سوراخ تھا جس سے ایک اور لوہے کی سیڑھی نیچے جا رہی تھی۔

"میرا خیال ہے ہمیں نیچے جانا ہوگا۔" البرٹ نے کہا۔

"تمہیں یقین ہے؟" برینڈی نے پوچھا۔

"ہاں۔" البرٹ نے کہا پھر وہ سوراخ سے نیچے اتر گیا تھا اور برینڈی نے بھی اس کی تقلید کی تھی وہ سرنگ پہلی والی کے مقابلے میں خاصی تنگ تھی انہیں گھٹنوں کے بل جھک کر چلنا پڑ رہا تھا اور سرنگ میں ہر طرف پانی بھی موجود تھا اور جگہ جگہ گڑھے تھے جن میں پانی بھرا ہوا تھا کبھی کبھی عجیب سا شور سنائی دے رہا تھا جو پانی کے گرنے یا بہنے کی آواز تھی بھی کبھی ایسی آوازیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں جیسے بھوکے کیڑے مکوڑے ان کی طرف بڑھ رہے ہوں کچھ دیر بعد وہ ایک کشادہ سرنگ میں آ گئے تھے جہاں سرنگ کے فرش میں ایک پائپ لگا ہوا تھا اور کچھ مشینوں کے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں یہاں خاصی گرمی تھی یہاں پر لائٹیں بھی روشن تھیں اور سرنگ کا فرش خشک تھا پھر جلد ہی نقشے نے ان کی رہنمائی ایک اور سرنگ کی طرف کی تھی وہ سیدھے ہاتھ کی طرف مڑے تھے اور پھر ایک تنگ سی سرنگ میں داخل ہو گئے تھے اور کچھ دیر بعد ایک زنگ آلود سیڑھی سے مزید نیچے اتر گئے تھے اب انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ان کا رابطہ بیرونی دنیا سے ٹوٹ چکا تھا ان سرنگوں میں ایک پریشان کن بات یہ تھی کہ ان میں جگہ جگہ مکڑیوں کے بڑے بڑے جالے لگے تھے جن میں طرح طرح کی مکڑیاں موجود تھیں مکڑیوں کے ان بڑے بڑے جالوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے بدروحوں نے سفید چادریں اوڑھ رکھی ہو۔

"یوں لگتا ہے یہ سرنگیں ہمیشہ یونہی چلتی رہیں گی ان کا کوئی آخری سرا نہیں ہے۔" برینڈی نے کہا۔

"میں جانتا ہوں یہ شہر اتنا بڑا نہیں ہے لیکن اب تک ہم خاصا سفر کر چکے ہیں لیکن ان کا اختتام نہیں ہو رہا ہے مجھے یوں لگ رہا ہے کہ دائرے میں گھوم رہے ہیں۔"

"تم نے کبھی شہروں کے نیچے موجود ایسی سرنگوں کی پراسرار داستانیں سنی ہیں؟ میں نے سنی ہیں۔" برینڈی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ البرٹ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

"بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ سرنگیں بھی آسیب زدہ ہیں۔" برینڈی نے کہا۔

"واقعی؟" البرٹ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں' ان کے بارے میں بڑی کہانیاں مشہور ہیں چڑیلوں' بھوتوں اور جادو کی..... خوفناک اور پراسرار کہانیاں۔"

"یہ سب بکواس ہے۔"

"نہیں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس شہر کو آباد کرنے والے ایک وچ کرافٹ کی صورت میں یہاں موجود ہیں اور لوگوں نے انہیں دیکھا بھی ہے۔" برینڈی نے خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ یہ سب جھوٹی کہانیاں ہیں میں ان پر یقین نہیں کرتی تھی۔"

"بعض اوقات ایسی داستانوں کے پیچھے تھوڑی بہت سچائی بھی ہوتی ہے۔" البرٹ نے کہا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جا رہے تھے اور اب تک کئی منزل نیچے اتر چکے تھے۔

"میرے والدین ایک بار مجھے بتا رہے تھے کہ جتنا پرانا یہ شہر ہے اس کی سرنگیں بھی اتنی ہی پرانی ہیں۔" برینڈی نے کہا۔

"کوئی نہیں جانتا وہ یہاں کیسے موجود ہیں۔"

"یہاں سے واپس جانے کے بعد میں تم سے وہ پراسرار کہانیاں سننا چاہوں گا۔" البرٹ نے کہا اور برینڈی مسکرا دی۔ سرنگ کے آخر میں انہیں ایک اور گیٹ نظر آیا جو دوسرے گیٹوں کے مقابلے میں بڑا تھا اور کھلا ہوا تھا جیسے ان کا منتظر ہو۔ گیٹ کے دوسری طرف ایک چھوٹا کمرہ تھا جس میں کاٹھ کباڑ پڑا تھا جس میں بچے ہوئے سوڈے کے ڈبے' سگریٹس کے ٹکڑے' دھات کی مڑی ہوئی پتیاں' یہاں دیواروں میں سوراخ بھی تھے جو چھ سے سات انچ چوڑے تھے جیسے ان میں پائپ نصب ہوں اور اس کے سامنے کی دیوار میں ایک بغیر ہینڈل کا دروازہ تھا۔

"یہ دروازہ کدھر جاتا ہے؟" برینڈی نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جاسکتا کیونکہ نقشہ میں ان کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے ہوسکتا ہے کہ یہ بھی کسی اور تہہ خانے میں جانے کا راستہ ہو۔" البرٹ نے کہا پھر اس نے بائیں جانب دیکھا جہاں ایک زنگ آلود زینہ لگا تھا جو اوپر جانے کا راستہ تھا اور اس کے قریب ہی ایک اور کھلا ہوا دروازہ ان کا منتظر تھا۔

"اس وقت صبح کا ایک بج رہا ہے۔" البرٹ نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم منزل کے قریب ہی ہیں چلو آگے چلیں۔" پھر وہ کھلے ہوئے دروازے سے گزر کر آگے بڑھ گئے تھے۔

"تمہارا کیا خیال ہے ہمیں یہاں کون سا خزانہ ملنے والا ہے؟" برینڈی نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔"

"تم تصور بھی نہیں کرسکتے؟ تمہارا خیال کیا کہتا ہے؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"ہوسکتا ہے ہمیں یہاں ڈاکوؤں کا چھپایا ہوا کوئی خزانہ مل جائے۔" برینڈی نے کہا اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پرس سے اپنا سیل فون نکالا تھا۔

"اوہ...... یہاں کوئی سگنلز نہیں آرہے ہیں۔" اس نے کہا اور فون واپس پرس میں ڈال دیا۔

"ہمارے اور سگنل ٹاور کے بیچ میں بہت زیادہ فاصلہ اور کنکریٹ ہے شاید اسی وجہ سے سگنل یہاں تک نہیں پہنچ رہے۔" البرٹ نے کہا وہ ایک نئی سرنگ میں داخل ہو رہے تھے۔

"نقشے کے مطابق اب ہم دائیں جانب مڑیں گے اور پھر بائیں جانب پھر ہمارے سفر کا اختتام ہوگا۔" البرٹ نے بتایا وہ جس سرنگ سے گزر رہے تھے اس میں چار چار انچ پانی بھرا ہوا تھا۔

"یہ گندا پانی ہے' اس میں سانپ' بچھو اور چوہے ہوں گے میں اس میں نہیں اتروں گی۔" برینڈی نے کہا۔

"لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے منزل قریب ہے۔"

"اچھا۔" برینڈی نے کہا اور ناگواری سے پانی میں اتر گئی۔ آگے جا کر وہ بائیں جانب مڑے تھے ان کے سامنے پھر ایک سرنگ تھی لیکن وہ دونوں کو نا مڑتے ہی ایک جگہ ساکت کھڑے رہ گئے تھے کیونکہ اس سرنگ کا اختتام ایک دیوار پر ہو رہا تھا جہاں سے سرنگ بند تھی اور کہیں جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

"کہیں ہم غلط راستے پر نہیں آگئے؟" البرٹ نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم' نقشہ تمہارے پاس ہے۔" برینڈی نے کہا خوف سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا خوف اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اسے بچپن کی سنی ہوئی ساری خوفناک کہانیاں ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں ان چڑیلوں کی جو سرنگوں میں زندہ انسانوں کو نوچ نوچ کر کھا جاتی ہیں اور زندہ انسان ان کے ایک ایک لقمے پر کرب سے گزرتے ہیں۔ وہ خوف زدہ آنکھوں سے البرٹ کو دیکھ رہی تھی جو اپنے ہاتھوں کی مدد سے دیوار کو دھکے دے رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ اسے دھوکا دے کر وہاں نہیں لایا تھا کہ اس کی عزت سے کھیل سکے۔ اچانک البرٹ کے دھکا دینے سے اس دیوار سے کچھ پتھر الگ ہو کر نیچے لڑھک گئے اور برینڈی کے قدموں میں آ گرے اب وہ غیر یقینی انداز میں البرٹ کو دیکھ رہی تھی۔

"تم نے یہ کیسے کیا؟"

"میں نہیں جانتا؟"

"کیا یہ دھوکا دینے کے لیے بنائی گئی تھی...... ایک کچی دیوار؟"

"ہاں...... یہ تو بالکل کچی ہے۔"

"تمہیں پتہ تھا کہ یہ کچی دیوار ہے؟"

"نہیں...... مجھے پتہ نہیں تھا۔" البرٹ نے کہا اور دیوار کو دھکے دے کر مزید توڑنے لگا پھر وہ ایک فٹ کا سوراخ بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس میں سر ڈال کر دوسری طرف کا جائزہ لینے لگا تھا۔

"وہاں کیا ہے؟" برینڈی نے اس سے پوچھا لیکن جواب دینے کے بجائے البرٹ رینگتا ہوا دوسری طرف چلا گیا تھا برینڈی نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

دوسری طرف دس فٹ چوڑا اور آٹھ فٹ لمبا کمرہ تھا جہاں کوئی لائٹ کا کنکشن نہیں تھا۔ دو دروازے سائڈوں کی دیواروں میں تھے' کھڑکیاں تھیں یا صرف وہی سوراخ تھا جس سے گزر کر برینڈی اور البرٹ ادھر آئے تھے۔

اس کمرے میں پانچ مجسمے کھڑے تھے اور وہ اسی گرے اسٹون کے بنے ہوئے تھے جن سے یہ کمرہ بنایا گیا تھا۔ دو مجسمے اس دیوار کے ساتھ ہی کھڑے تھے جس سے البرٹ اور برینڈی اندر آئے تھے ایک ایک مجسمہ سائڈوں کی دیواروں کے درمیان میں کھڑا تھا وہ تقریباً آٹھ فٹ لمبے تھے اور مرد کے مجسمے تھے ان کے کپڑے جسم سے چپٹے ہوئے بنائے گئے تھے اور ان کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی دکھائی گئی تھی جس سے ان کی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں ان کے ہاتھ' پاؤں اور ان کی انگلیاں ان کے جسم کے حساب سے بہت لمبی تھیں ان کی درمیانی انگلی البرٹ کے بازو کے برابر تھی ان کی پشتیں دیوار کی جانب اور چہرے کمرے کے درمیان کی سمت تھے وہ بالکل سیدھے کھڑے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی کی نگرانی کر رہے ہوں ایک کونے میں پانچواں مجسمہ کھڑا تھا جس کا چہرہ نہیں بنایا گیا تھا وہ بھی گرے اسٹون کا تھا وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا اس کے ہاتھ اس کے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" برینڈی نے حیرت سے کہا البرٹ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا وہ کمرے کا جائزہ لے رہا تھا اسے حیرت تھی اس کمرے میں مکڑیوں کے جالے نہیں تھے مجسمے صاف تھے ان پر ریت کا نام بھی نہ تھا۔

"یہ سچ مچ کے انسان لگتے ہیں دیکھو ان پر جو جھریاں پڑی ہیں ان کی نسیں تک بنی ہوئی ہیں۔" برینڈی نے حیرت سے کہا۔

"ارے دیکھو ان کے تو فنگر پرنٹس تک بنے ہیں۔" برینڈی خوف سے پیچھے کھسکتے ہوئے بولی اسے یوں لگا جیسے ابھی کوئی مجسمہ آگے بڑھ کر اسے پکڑ لے گا۔

"تمہارا کیا خیال ہے انہیں کس نے بنایا ہوگا؟" برینڈی نے پوچھا۔

"کچھ پتہ نہیں۔" البرٹ نے جواب دیا۔

"بھلا ان کا اس سرنگ میں کیا کام؟"

"پتہ نہیں۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم کسی میوزیم کے تہہ خانے میں آ گئے ہوں؟" برینڈی نے اچانک کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" البرٹ نے کہا اس کی نظر سائڈ کی دیواروں میں بنے راستے پر تھیں جہاں سے سرنگیں آگے تک چلی گئی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" برینڈی نے پوچھا۔

"اب کس راستے پر جائیں یہاں سے آگے صندوق کا نقشہ رہنمائی نہیں کرتا۔" البرٹ نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا کریں...... کسی ایک راستے کو تو اختیار کرنا ہوگا۔" برینڈی نے جواب دیا۔

''ہوسکتا ہے یہ دونوں راستے کسی ایک جگہ ہی جا رہے ہوں؟'' برینڈی پھر بولی۔

''مگر مجھے اس میں شک ہے۔'' البرٹ نے راستوں پر سرچ لائٹ سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا اس کا سر اور سرچ لائٹ دائیں سے بائیں آہستگی سے حرکت کر رہے تھے وہ بغور ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا لیکن ایک چیز اس نے مس کردی تھی وہاں دیوار کے ساتھ کچھ تھا جو اسے نظر نہیں آیا تھا اس کی نظروں سے بچ گیا تھا پھر فلیش لائٹ کی روشنی بیٹھے ہوئے مجسمے کے سیدھے ہاتھ پر پڑی تھی جس کی درمیان کی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی۔

البرٹ نے قریب جا کر جائزہ لیا تو وہ واقعی ٹوٹی ہوئی تھی لیکن وہ حیران تھا کہ اگر وہ ٹوٹی تھی تو اس کا ٹوٹنے والا حصہ وہاں کیوں نہیں تھا اس نے مجسمے کے قریب زمین سے ریت ہٹائی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا پھر اس نے دائیں جانب والی سرنگ کے فرش پر روشنی ڈالی وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ اس نے بائیں جانب والی سرنگ کے فرش پر روشنی ڈالی اور اسے وہاں گرے اسٹون کی ٹوٹی ہوئی انگلی نظر آئی وہ سرنگ میں اتر گیا اور انگلی اٹھا کر واپس کمرے میں آ گیا۔ برینڈی بڑے انہماک سے دوسرے مجسموں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کمرے میں موجود مجسموں میں ایک خاص بات تھی کہ وہ سب ننگے اجسام تھے اور ان کی نسیں، جھریاں، اور چہروں کے تاثرات تک محسوس کیے جاسکتے تھے۔

البرٹ نے ٹوٹی ہوئی انگلی مجسمے کی انگلی سے جوڑی لیکن اب بھی اس کا ایک حصہ اور باقی تھا کیونکہ وہ اپنی جگہ سیدھی بیٹھ نہیں رہی تھی البرٹ نے پھر اطراف کا جائزہ لیا اور پھر اسے اچانک بکس کا خیال آیا جو اس کے بیگ میں تھا اس نے بکس نکال کر اس میں موجود چیزوں میں گرے کلر کا اسٹون کا ٹکڑا نکالا اور وہ واقعی اس انگلی ہی کا حصہ تھا کیونکہ اب البرٹ نے اسے درمیان میں رکھ کر جوڑا تو انگلی پوری ہوگئی تھی وہ حیران تھا کہ وہ ٹکڑا اس بکس میں کیوں رکھا گیا تھا۔

''یہ تو گیم بورڈ ہے۔'' البرٹ نے کہا۔

''کیا؟''

''وہ بکس میں موجود چیزیں میرے خیال میں کسی معمے کا حصہ ہیں...... اگر میں اس معمے کو حل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو سرنگوں کے راز سے پردہ اٹھانا آسان ہوگا لیکن ایک چیز کو بھول گیا ہوں۔ مجھے پہلے ایک گیم بورڈ کا پتہ لگانا ہوگا جس پر یہ ساری چیزیں اپنی جگہوں پر بٹھائی جاسکیں اور میرا خیال ہے یہ وہی جگہ ہے یہ ایک بڑا گیم بورڈ ہے۔'' البرٹ نے کہا اور بائیں جانب والی سرنگ کی طرف فلیش لائٹ ڈال دی۔

''ہمیں ادھر ہی جانا چاہیے جہاں سے ہمیں ٹوٹی ہوئی انگلی کا حصہ ملا ہے۔'' البرٹ نے کہا اور بائیں جانب والی سرنگ کی طرف بڑھا۔ برینڈی بھی اس کے ساتھ آگے بڑھی تھی البرٹ نے بکس سے نکالا ہوا اسٹون واپس بکس میں رکھ لیا تھا اور اس کے ساتھ دوسرا پتھر بھی تھا اس نے اسپرے پینٹس بھی برینڈی کے ہاتھ سے لے کر بیگ میں ڈال لیا تھا۔ برینڈی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی کہ وہ کس مہارت سے اتنی تیزی سے معمے حل کرتا جا رہا تھا اور بالکل جھجک نہیں رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اسے پہلے سے سب کچھ معلوم ہو اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگتی ہوئی واپس چلی جائے لیکن وہ بہت دور آ چکی تھی اور اکیلے اس تاریک سرنگ میں واپسی کا سفر اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ البرٹ کے ساتھ رہنے پر مجبور تھی اور اس کو بھی تجسس تھا کہ یہ حیران کن اور پراسرار سفر کہاں ختم ہوتا ہے۔

اگلی سرنگ بہت چھوٹی تھی یہاں انہیں جھک کر چلنا پڑ رہا تھا اور پھر وہ سرنگ ایک کشادہ کمرے میں کھلی تھی جو بیس فٹ چوڑا اور بیس فٹ اونچا تھا یہ کمرہ بھی کالے پتھر سے بنا ہوا تھا وہاں بھی دیواروں کے ساتھ بغیر چہرے والے ننگے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔

''ان مجسموں کا کیا مقصد ہے؟'' برینڈی بڑبڑائی۔

''کچھ تو ہوگا جو انہیں یہاں رکھا گیا ہے۔'' البرٹ نے کہا اسے محسوس ہوا کہ اس نے بائیں جانب کی دیوار کے پاس کچھ محسوس کیا ہے جیسے کمرے میں موجود سایوں کے درمیان کوئی لیٹا ہوا ہو۔ جیسے کوئی ان کا انتظار کر رہا ہو یا انہیں دیکھ رہا ہو۔

''جس نے بھی یہ مجسمے یہاں رکھے ہیں ان کے لیے خاصے اہم ہوں گے۔'' برینڈی نے کہا۔

البرٹ بغور ان کا جائزہ لے رہا تھا اسے ان میں سے ایک بات حیرت زدہ کردینے والی لگی وہ سب ایک دوسرے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سے مختلف تھے اچانک اسے برینڈی کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی کہ ان سرنگوں میں کچھ ایسی بھی ہیں جو زمانہ قدیم سے تعلق رکھتی ہیں۔ البرٹ کو جھرجھری سی آئی اور اس نے سوچا کہ وہ کتنی قدیم سرنگوں میں کھڑا ہے جن کے بارے میں شاید کوئی جانتا بھی نہ ہو اب انہیں جگہ جگہ مردانہ مجسمے رکھے مل رہے تھے۔

''آخر ان کا مقصد کیا ہے؟'' برینڈی نے پوچھا۔

''یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ممکن ہے ان کی حیثیت دیوار پر لگی ایک تصویر سے زیادہ نہ ہو یا پھر یہ اپنے بنانے والے کے لیے اہمیت رکھتے ہوں۔'' البرٹ نے کہا۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ تاریک سرنگوں کی بھول بھلیوں میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ البرٹ کو بار بار احساس ہو رہا تھا جیسے ان دونوں کے علاوہ بھی وہاں کوئی موجود ہے وہ مجسموں کے درمیان موجود اندھیروں کو بغور دیکھ رہا تھا ان اندھیروں کو ان کی فلیش لائٹ بھی پوری طرح روشن نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں کچھ ہے کچھ ایسا جو ان مجسموں سے بڑا ہے اور بہت طاقت ور ہے۔ پھر ایک جگہ مجسموں کے درمیان اندھیرے میں موجود سائے اور گہرے ہونے لگے اور جیسے ہی البرٹ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا وہ سائے آپس میں مل کر ایک شکل اختیار کرنے لگے اور پھر جیسے ہی ایک بڑا چہرہ اس کے سامنے آیا اس کی خوفناک چیخ نکل گئی۔

برینڈی بھی البرٹ سے چند قدم پیچھے ڈری سہمی کھڑی تھی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں اور ان کے سامنے کسی نامعلوم عورت کا بہت بڑا چہرہ موجود تھا چہرے سے مشابہہ وہ مجسمہ بھی گرے اسٹون کا بنا ہوا تھا اس کے چہرے پر موجود جو تاثرات تھے انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ کسی کرب میں مبتلا ہو وہ مجسمہ اتنی مہارت سے بنایا گیا تھا کہ اس کی جلد پر مساموں کے نشان بھی محسوس کیے جا سکتے تھے اس کی آنکھیں ایسے چمک رہی تھیں جیسے ان میں آنسو جھلملا رہے ہوں۔ اس کی آنکھوں پر پلکیں بھی فنکار کی ہنرمندی کا منہ بولتا ثبوت تھیں جنہیں بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا اس کا منہ ایسے کھلا ہوا تھا جیسے اس نے چیخ مارنے کے لیے کھولا ہو جس سے اس کے دانت بھی جھانک رہے تھے اس کی زبان کے مساموں کو بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ زبان پر بھی آنکھوں جیسی چمک موجود تھی۔ البرٹ نے اندازہ لگایا کہ اس کا منہ ایک دروازہ ہے جو کسی کمرے میں کھلتا ہے اس کے ٹانسلو کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''حیرت انگیز۔'' البرٹ بڑبڑایا۔

''کیا یہی وہ ہے جس کے لیے اتنے مردوں کے مجسمے بنائے گئے ہیں؟'' برینڈی نے کہا۔

''شاید...... میں نہیں جانتا۔''

''یہ بالکل حقیقت لگتی ہے۔''

''ہاں۔'' البرٹ نے چہرے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا پھر اس نے کھلے ہوئے منہ کے اندر روشنی ڈالی تھی۔

''اوہ میرے خدا......'' بے ساختہ برینڈی کے منہ سے نکلا تھا جب وہ البرٹ کے ساتھ اس منہ میں داخل ہوئی تھی وہ ایک کمرہ تھا اور وہاں ایک عورت کا مجسمہ موجود تھا جو ٹھیک ان کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ فرش پر لیٹی ہوئی پوزیشن میں تھا اس کے قریب ہی ایک مرد کا مجسمہ موجود تھا وہ دونوں بالکل اصل لگ رہے تھے۔ البرٹ نے پورے کمرے میں نظریں دوڑائیں وہاں ہر طرف ایسے ہی مجسمے موجود تھے اس کے برابر والے کمرے میں انہیں پچاس سے زیادہ مجسمے نظر آ رہے تھے جو ایک دوسرے سے لڑنے کی پوزیشن میں تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے سے کچھ چھین رہے ہوں لیکن جو چیز وہ چھیننا چاہتے ہوں وہ ان سے بہت بلند ہے۔ اس خیال کے آتے ہی البرٹ نے چھت کی طرف دیکھا جہاں ایک عورت کا مجسمہ تھا جس کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا البرٹ نے حیرت سے برینڈی کی طرف دیکھا۔

''یہ سب کیا ہے البرٹ؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' البرٹ نے کہا اسی وقت اسے محسوس ہوا جیسے ان مجسموں کے درمیان کوئی مجسمہ حرکت کر رہا ہو لیکن جب اس نے بغور اس سمت کا جائزہ لیا تو کچھ نہیں تھا اچانک فلیش لائٹ البرٹ کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی اور بند ہوئی تھی کمرے میں مکمل اندھیرا پھیل گیا تھا انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے اطراف میں وہی مجسمے اکٹھے ہو گئے ہوں۔ برینڈی خوف سے البرٹ سے چمٹ گئی تھی اور دونوں ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے تھے

کمرے میں عجیب طرح کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی چیز وہیں رینگ رہی ہو اور نہایت خوف کے باوجود نہ جانے کیسے دونوں کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور وہ سو گئے تھے۔

البرٹ کی آنکھ کھلی تو ہر طرف اندھیرا تھا کمرے میں بہت زیادہ ٹھنڈ تھی اور اس کے جسم کے نیچے فرش بہت ٹھنڈا تھا وہ چند لمحے تو سوچتا رہا کہ وہ کہاں ہے اور پھر اسے جیسے ہی یاد آیا کہ وہ سرنگوں کی بھول بھلیوں میں ہے وہ اٹھ بیٹھا تھا پھر اسے بریندی کا خیال آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آ گیا تھا کہ اسے اچانک نیند کیسے آ گئی تھی وہ اندھیرے میں بریندی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھ گیا تھا کہ ایک سایہ ان مجسموں کے درمیان سے نکل کر ان کی طرف آیا تھا اور ان پر جھک گیا تھا اس کے بعد انہیں کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

البرٹ ہمت کر کے کھڑا ہوا کمرے میں اس کی اور بریندی کی سانسوں کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ وہاں اکیلے ہیں اس نے اندھیرے میں فرش کو ٹٹول کر لائٹ ڈھونڈنا چاہی اسی وقت اس کی آنکھ میں کوئی پتھر چبھا اور اسے شدید تکلیف ہوئی پھر اس کی پشت سے بھی کوئی چیز ٹکرائی تھی اور اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اب بھی پتھر کے مجسموں میں گھرا ہوا تھا وہ جہاں تھا وہیں رک گیا اور سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اندھیرے میں کسی حد تک دیکھ سکتا ہے اسے کمرے کے دروازے میں ہلکی سی روشنی کی چمک نظر آئی اور وہ اس طرف بڑھنے لگا اس نے اپنے ایک ہاتھ سے اپنے چہرے کے اس حصے کو چھپایا ہوا تھا جس طرف کی آنکھ زخمی ہوئی تھی وہ چلتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا وہاں کوئی مجسمہ نہیں تھا اس کمرے سے باہر راستہ دو سمتوں میں جا رہا تھا ایک سیدھے ہاتھ کو جو ایک دیوار پر جا کر ختم ہو رہا تھا اور دوسرا بائیں جانب جو دور کارنر تک چلا گیا تھا اور وہ ہلکی سی لائٹ اسی سمت سے آ رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا لائٹ والی سمت گیا پھر وہ کارنر سے مڑا تو وہ راستہ مزید آگے جا کر سیدھے ہاتھ کو مڑ گیا تھا جہاں لائٹ پہلے سے زیادہ روشن تھی وہ مزید آگے بڑھا اچانک اس کا پاؤں فرش پر پڑے کسی دھات کے ٹکڑے سے ٹکرایا اور ایک شور پیدا ہوا وہ جہاں تھا وہیں رک گیا اسے ڈر تھا کہ وہ آواز کسی چیز نے سنی ہو گی اور اب کوئی اسے پکڑنے آ جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ جھکا اور اس نے پیروں کے پاس زمین کو ٹٹولا اس کے ہاتھ کسی چھوٹی دھاتی چیز سے ٹکرائے اور اس نے اسے اٹھا لیا وہ بریندی کا چشمہ تھا وہ حیران رہ گیا کہ بریندی کا چشمہ وہاں کیسے آ گیا تھا یہ ایسا ہی تھا کہ جیسے اس کے ہاتھ سے فلیش لائٹ گری تھی اور غائب ہو گئی تھی۔

البرٹ نے آگے جاتے ہوئے ایک بار مڑ کر پیچھے دیکھا جہاں سے وہ آیا تھا اسے بریندی کا خیال آیا تھا لیکن پھر اس نے سوچا تھا کہ وہ جلدی واپس آ جائے گا اور اتنی سی دیر میں بریندی کو کچھ نہیں ہو گا وہ محفوظ ہی ہو گی لیکن پہلے وہ فلیش لائٹ حاصل کرنا چاہتا تھا اسے احساس ہو رہا تھا جیسے اندھیرے میں کوئی کھڑا اسے گھور رہا ہو۔ خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی تھی کوئی اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھ رہا تھا اور اس کے کمزور پڑنے کا منتظر تھا۔

وہ چند قدم آگے بڑھا اور بائیں جانب مڑا جہاں روشنی زیادہ تیز تھی بیس قدم کے فاصلے پر اس کی فلیش لائٹ پڑی تھی اس نے جھک کر وہ اٹھا لی اور سامنے کی طرف روشنی ڈالی آگے راستہ بند تھا اس سرنگ میں عجیب بھول بھلیاں تھیں مختلف راستے مختلف سمتوں میں لے جاتے تھے اور کوئی بھی راستہ کسی بھی مقام پر بند ہو جاتا تھا وہاں سے پھر نیا راستہ ڈھونڈنا ہوتا تھا اب یہ فلیش لائٹ اسے اس راستے تک لائی تھی اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ پتہ لگائے کہ یہ راستہ آگے اسے کہاں لے جاتا ہے حالانکہ وہ خوف زدہ تھا اور اسے بریندی کے پاس واپس جانا تھا۔

وہ فلیش لائٹ لے کر وہاں سے پلٹ گیا اسے احساس تھا کہ وہ وہاں اکیلا نہیں ہے اور اس خیال سے ہی اسے خوف سے جھرجھری آ گئی تھی وہ جانتا تھا کہ اس کی فلیش لائٹ کو بھی اسی نادیدہ ہستی نے کوریڈور میں اتنی دور پہنچایا تھا اور اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

''البرٹ۔'' اچانک اسے بریندی کی آواز سنائی دی وہ جاگ گئی تھی اور اسے اپنے پاس موجود نہ پا کر آوازیں دے رہی تھی۔

''البرٹ تم کہاں ہو؟''

میں یہاں ہوں برینڈی [illegible] اور تیزی سے کمرے میں داخل ہوگیا۔ برینڈی فرش پر دوزانو جھکی بیٹھی تھی۔ سردی سے اس کا جسم کانپ رہا تھا اور فرش پر اپنی عینک تلاش کر رہی تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اس کی آنکھوں میں خوف اور آنسو تھے جو بہہ کر اس کے گالوں تک آگئے تھے اس کے سامنے اس کی سرچ لائٹ پڑی تھی جو ٹوٹ چکی تھی۔

"البرٹ۔"

"البرٹ کیا یہ تم ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"میرے قریب آؤ۔" اس نے کہا اور البرٹ اس کے قریب ہوگیا وہ اس سے چمٹ گئی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے البرٹ، یہ کیا معمہ ہے؟" برینڈی سسک رہی تھی اور البرٹ کی آنکھیں کمرے کے دروازے پر اور کان کاریڈور سے آنے والی کسی ممکنہ آواز پر لگے تھے اس کا دھیان اب بھی اس نامعلوم ہستی کی طرف تھا جس کی موجودگی کو اس کی چھٹی حس نے محسوس کیا تھا۔

"آخر ہم یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟" برینڈی نے روتے ہوئے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا...... پہلے تو میں اپنی پرتجسس طبیعت کی وجہ سے کر رہا تھا لیکن اب ہم ایسا کرتے رہنے پر مجبور ہیں...... ہم بے اختیار ہیں...... واپسی بھی ممکن نہیں۔"

"میرے کپڑے کس نے پھاڑے ہیں؟" اس نے اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نہیں جانتا...... میرے کپڑے بھی جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے ہیں آنکھ پر بھی کوئی چیز لگی ہے وہ زخمی ہے۔" البرٹ نے بتایا۔

"مجھے یہاں خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں میں نے ہی تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔" البرٹ نے شرمندگی سے کہا۔

"تم شرمندہ ہو؟ حیرت کی بات ہے...... میں نے تمہیں سمجھایا تھا نا؟" برینڈی نے کہا اور البرٹ اٹھ کر باہر جانے لگا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"...... باہر کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔" البرٹ نے جواب دیا۔

"باہر......؟" البرٹ ہم زمین کے کئی سو فٹ نیچے ہیں...... تم باہر کا جائزہ لینا چاہتے ہو؟"

"میرا مطلب ہے اس کمرے سے باہر کا۔" البرٹ نے وضاحت کی وہ برینڈی کی طرف پشت کیے کھڑا تھا وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی حماقت پر زور زور سے روئے لیکن وہ برینڈی کے سامنے ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہاں ان کے ساتھ تیسرا جو کوئی بھی موجود ہے وہ ان کے سامنے نہیں آنا چاہتا وہ لائٹ سے دور رہتا ہے۔ انہوں نے اب تک جتنی بھی بھول بھلیوں میں سفر کیا تھا ان کی فلیش لائٹ تھوڑا سا علاقہ ہی روشن کرتی باقی سرنگ تاریک رہتی تھی اسی تاریکی میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا جو کچھ بھی تھا وہ ان کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا اور اس نے خود کو پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔

"تمہارے کپڑے کیسے پھٹے؟" البرٹ نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی۔"

"اور میں بھی نہیں جانتا کہ میرے کپڑوں کا یہ حال کیسے ہوا ہے؟"

"جب کمرے میں ہم مجسموں کے درمیان تھے اور فلیش لائٹ گرنے سے اندھیرا ہوگیا تھا تو میں نے کچھ دیکھا تھا۔" البرٹ نے کہا۔

"کیا؟ تم نے کیا دیکھا تھا؟"

"پتہ نہیں میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتا۔ جب میں اٹھا تو اندھیرا تھا میں نے دروازے سے آتی روشنی دیکھی تو اس کے تعاقب میں گیا باہر تمہاری عینک پڑی تھی وہ میں نے اٹھالی...... میری فلیش لائٹ اور بھی دور پڑی تھی میں وہ بھی لے آیا لیکن مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔"

"تم مجھے اپنے ساتھ یہاں کیوں لائے تھے؟"

"اس لیے کہ یہاں آنے میں تمہارا بھی آدھا حصہ تھا تم بھول گئیں چابیاں تمہیں ملی تھیں جن سے بکس کھلا تھا۔" البرٹ نے اسے یاد دلایا۔ برینڈی اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"تم جانتی ہو میں ایک کمپیوٹر سائنس کا اسٹوڈنٹ ہوں

سو اس معمے کو حل کرنے سے زیادہ میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔" البرٹ نے کہا۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ تمہارا منصوبہ تھا۔" برینڈی نے وضاحت کی۔

"تو کیا تم سمجھتی ہو میں تمہیں یہاں کسی مقصد کے تحت لایا ہوں؟" البرٹ نے کہا۔ برینڈی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں یہ سب ہوگا ورنہ میں خود بھی نہیں آتا...... تم کیا چاہتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"اب جب یہ سب کچھ ہو چکا ہے اب تم کیا چاہتی ہو؟ تم مجھ پر بھروسا نہیں کرتیں تو بتاؤ کہ میں کیا کروں...... تم کیا چاہتی ہو؟" برینڈی اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں فلیش لائٹ چاہیے! یہ لو۔" مجھے یہاں چھوڑ دو...... تم جاؤ۔"

"تمہیں یہاں چھوڑ دوں!" برینڈی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں جاؤ...... اس کمرے سے باہر...... سرنگوں کے راستے تم واپس جاسکتی ہو جو ایک بھول بھلیوں سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ میں صرف وہ جانتا ہوں جو بکس سے مجھے پتہ چلا میں نے وہی کیا میں اس معمے کو حل کرنا چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ہمارے ساتھ یہ سب ہوگا جو ہو رہا ہے مجھے چاہئے تھا کہ میں مصیبت کے اس پنڈورے کو پھینک ہی دیتا۔"

"میں اکیلی واپس جانا نہیں چاہتی۔"

"میں نے محسوس کیا ہے کہ یہاں ہمارے علاوہ بھی ہمارے ساتھ کوئی ہے۔" میں قسم کھا سکتا ہوں کہ کوئی ہے جو نظر نہیں آتا اور وہی ہماری چیزیں غائب کر رہا ہے میں تمہیں یہاں کوئی نقصان پہنچانے بھی لایا تھا اور نہ کسی کو تمہیں نقصان پہنچانے دوں گا میرا خیال ہے میری وجہ سے تمہارا خاصا نقصان ہو چکا ہے۔

"نہیں تم نے مجھ سے زبردستی نہیں کی میں اپنی مرضی سے آئی ہوں...... میں بھی اس معمے کو حل کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"میں جانتی ہوں میں تم پر یقین رکھتی ہوں اگر میں تم پر یقین نہ کروں گی تو اس کا مطلب ہے کہ میں ان بھول بھلیوں میں اکیلی بھٹک جاؤں گی۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔" البرٹ نے کہا۔

"دراصل پہلے تمہیں بکس ملا جو تم نے مجھے دکھایا پھر تم نے ہی اس کی چیزوں سے پردہ اٹھایا اور اس معمے کو حل کرنے کے بارے میں سوچا تم مجھے یہاں لائے اور اب جب میری آنکھ کھلی تو میرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ فلیش لائٹ غائب تھی اور چشمہ غائب تھا اور تم بھی نہیں تھے میں سمجھی تم مجھے اس حال میں چھوڑ گئے ہو۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا برینڈی۔"

"مگر میں نے ایسا ہی سوچا تھا میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا ہے۔"

"تمہاری فلیش لائٹ ٹوٹ گئی ہے تم میری لے لو۔" البرٹ نے لائٹ اسے دے دی۔

"اور یاد رکھو ہمارے ساتھ جو کوئی بھی ہے اگر وہ ہمیں مارنا چاہتا ہے تو میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔"

"ہوسکتا ہے وہ صرف ہم سے کھیل رہا ہو؟" برینڈی نے کہا۔

"ممکن ہے؟" البرٹ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں پتہ ہے صرف ہمارے کپڑے ہی نہیں پھٹے بلکہ میرا بیگ اور بکس بھی غائب ہیں۔" البرٹ نے بتایا تو برینڈی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"اوہ...... اور میرا پرس بھی غائب ہے۔" برینڈی نے کہا۔

"میرا بٹوہ بھی نہیں ہے۔" البرٹ نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔

"ایسا کرو میں آگے چلتا ہوں تم مجھے فالو کرو اور لائٹ لے کر میرے پیچھے آؤ۔"

"اوکے۔" برینڈی نے کہا اور آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ دونوں کمرے سے باہر آنے کے بعد بائیں جانب

چل پڑے تھے پھر تقریباً سو گز تک چلنے کے بعد [illegible] تھا جس سے مڑنے کے بعد بیس گز کے فاصلے پر ایک اور کمرہ ملا تھا جس میں داخل ہوتے ہوئے ان کی نظریں ایک اور مجسمے پر پڑی تھیں اور بریںڈی کی چیخ نکل گئی تھی وہ بھی پہلے جیسے مجسموں جیسا مجسمہ تھا جس کے چہرے پر ناک، کان، منہ غائب تھا وہ مجسمہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اس کا سپاٹ چہرہ چھت کی طرف اٹھا ہوا تھا اور اس کا جو ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا تھا۔ اس میں البرٹ کا بیگ اور بریںڈی کا پرس لٹک رہا تھا۔

"تم وہیں کھڑی رہنا۔" البرٹ نے بریںڈی سے کہا جو اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی اور خود آہستہ آہستہ مجسمے کے اس ہاتھ کی طرف بڑھا تھا جس میں اس کا بیگ لٹک رہا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ بیگ اور پرس اس کے ہاتھ سے اتارے گا تو کوئی خوفناک حادثہ رونما ہو جائے گا اس نے ڈرتے ڈرتے بڑی احتیاط سے اپنا بیگ اور پرس اتارا تھا لیکن کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔ دیواروں میں سے تیز دھار والے چاقو نہیں نکلے تھے۔ کوئی لوہے کا گولہ لڑھکتا ہوا ان کی طرف نہیں آیا تھا۔ جیسا کہ انڈیانا جونز کی فلم میں دکھایا گیا تھا یہ سب کچھ بہت مختلف تھا اس نے بیگ اور پرس اتار کر ان کی چیزیں چیک کی تھیں تو ان کے چہرے پر اطمینان نظر آیا تھا۔

"سب چیزیں پوری ہیں۔" بکس اب بھی بیگ میں موجود تھا۔ بریںڈی کا پرس اور اس میں چابی موجود تھی۔ البرٹ نے بیگ اپنے کاندھے پر ڈالا اور بریںڈی کا پرس اس کی طرف بڑھایا پھر اس نے مڑ کر دوبارہ مجسمے کی طرف دیکھا تھا اور آگے بڑھ گیا تھا۔ بریںڈی نے اس کی تقلید کی تھی وہ کچھ دور گئے تھے کہ انہیں ڈھلان میں ایک اور سرنگ ملی تھی جس میں شفاف پانی کھڑا تھا البرٹ چند لمحے کچھ سوچتا رہا تھا۔ اور پھر اس نے مڑ کر پیچھے کی جانب دیکھا تھا جس راستے سے وہ لوگ یہاں تک آئے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" بریںڈی نے پوچھا۔

"جس کسی نے بھی ہماری چیزیں لیں اور کپڑے پھاڑے ہیں وہ اب تک اس راستے پر نہیں آیا۔" البرٹ نے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"[illegible] یہ پانی بالکل صاف اور ٹھہرا ہوا ہے اس کا مطلب ہے ابھی یہاں سے کوئی نہیں گزرا۔"

"تمہیں یقین ہے؟" بریںڈی نے پوچھا لیکن البرٹ خاموش رہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" بریںڈی نے پوچھا۔

"وہ جو کوئی بھی ہے وہ ہمارے پیچھے ضرور آئے گا۔" البرٹ نے کہا اور ایک بار پھر پیچھے اندھیرے کی طرف دیکھا اچانک اس کے دماغ میں ایک آئیڈیا آیا تھا۔

"تم یہاں رکو...... میں ابھی واپس آتا ہوں۔" البرٹ نے کہا اور واپس اسی راستے پر چل دیا جس سے چل کر وہ دونوں یہاں تک آئے تھے۔ بریںڈی نے اس کی تقلید کرنے میں دیر نہیں کی تھی اور اس کے پیچھے دوڑی تھی وہ وہاں اکیلے کھڑے رہنا نہیں چاہتی تھی جب وہ واپس اس کمرے تک پہنچے جہاں مجسمہ بیٹھا ہوا تھا تو البرٹ نے اپنے بیگ سے کلر اسپرے کا ڈبہ نکالا اور اسے کھول کر ڈھلان میں رکھ دیا تھا بریںڈی اس کا آئیڈیا سمجھ گئی تھی اگر کوئی بھی اندھیرے میں وہاں سے گزرتا تو اس سے ٹکرا سکتا تھا اور ٹکرانے سے وہ ڈبہ لڑھک کر نیچے پانی میں گرتا جس کی آواز سے وہ لوگ ہوشیار ہو جاتے کہ کوئی ان کے پیچھے اس راستے پر آرہا ہے وہ بغور البرٹ کو یہ سب کرتے دیکھ رہی تھی۔

"چلو...... کیا تم تیار ہو؟" البرٹ نے بریںڈی کا ہاتھ پکڑ کر ڈھلان میں پانی کی طرف کھینچا۔

"پانی میں جانے کے لیے؟" بریںڈی نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"لیکن یہ تو بہت ٹھنڈا ہوگا؟"

"کوئی بات نہیں؟ میں پہلے پانی میں اتروں گا۔" البرٹ نے کہا اور پھر اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ بریںڈی بھی اس کے بعد پانی میں اتر گئی تھی جو بہت ٹھنڈا تھا فلیش لائٹ اس کے ہاتھ میں تھی جس میں شفاف پانی چھلک رہا تھا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک اس میں چلتے رہے تھے۔ پانی آہستہ آہستہ اوپر ان کے کندھوں تک آ گیا تھا اور پھر وہ اس کے دوسری طرف اتر گئے تھے جہاں انہوں نے اپنے بیگ اور پرس کھول کر چیزوں کا جائزہ لیا تھا۔ بریںڈی کے پرس میں موجود لائٹر اور سگریٹ خراب ہو گئے تھے اسی وقت انہیں کلر

اسیرے کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی تھی [illegible]
میں گم کرنے کی آواز بھی آئی تھی۔

"البرٹ......" برینڈی نے چونک کر البرٹ کو مخاطب کیا تھا۔

"چلو...... یہاں سے جلدی آگے چلو کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔" البرٹ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے سرنگ میں آگے بڑھتے ہوئے انہیں کئی مقامات پر ہڈیاں نظر آئی تھیں لیکن وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ یہ ہڈیاں انسان کی ہیں یا جانوروں کی لیکن ان کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر ایک سرنگ میں انہیں ایک اور کمرہ ملا تھا جس میں چند مجسمے تھے ان کے چہرے غائب تھے لیکن وہ خون زدہ اور زخمی دکھائے گئے تھے ان کے جسم میں گولیوں کے سوراخ تھے کسی کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی اور کسی کے خراشیں اور زخم تھے لگتا تھا کہ وہ کسی جنگ کے بعد بچنے والے جسم ہوں۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" برینڈی نے پوچھا۔

"ہمیں بغیر رکے آگے بڑھنا ہے برینڈی۔" البرٹ نے کہا۔

"یہ دیکھو اس مجسمے کے ہاتھ میں کیا ہے؟" برینڈی نے ایک جانب اشارہ کیا تو البرٹ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک اور مجسمہ تھا جس کے ہاتھ پر ایک کپڑا لٹک رہا تھا البرٹ نے آگے بڑھ کر وہ اتار لیا اور بغور اسے دیکھنے لگا وہ کوئی پرانا کوٹ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" برینڈی نے پوچھا۔

"لگتا ہے یہ کسی فوجی کا جنگ میں جانے والا کوٹ ہے۔" البرٹ نے کوٹ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"تم یقین سے کہہ سکتے ہو؟"

"اس کے بٹن دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے۔" البرٹ نے کہا اور برینڈی نے قریب آ کر اس کوٹ کے بٹنوں کا جائزہ لیا وہ تانبے کے بنے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک کم ہے شاید ٹوٹ کر کہیں گر گیا ہے۔" البرٹ نے کہا۔

"اور تمہیں پتہ ہے وہ کھویا ہوا بٹن وہی ہے جو میرے پاس بکس میں موجود ہے۔" البرٹ نے کہا اور کوٹ کو واپس مجسمے کے ہاتھ پر ٹانگ دیا۔

"تم اسے اپنے پاس نہیں رکھو گے؟" برینڈی نے

"نہیں، میرا خیال ہے ہمیں اسے یہیں چھوڑ دینا چاہیے ممکن ہے جب ہم باہر جانے کے لیے واپس آئیں تو اس سے ہمیں راستہ پہچاننے میں آسانی ہو۔" البرٹ نے کہا اور وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔

کافی دور تک ایک سرنگ میں چلنے کے بعد وہ پھر ایک کمرے میں پہنچے تھے جہاں چار مجسمے موجود تھے۔ یہ مجسمے پہلے مجسموں کی طرح گرے اسٹون ہی کے بنے ہوئے تھے لیکن ان کے ہاتھوں پر پرندے بنے تھے جن کے رنگ سیاہ تھے کسی مجسمے کے ہاتھ پر صرف کالے پر بنے ہوئے تھے۔

"دیکھو البرٹ ایک اور نشانی...... تمہیں جو بکس ملا ہے اس میں ایک کالا پر موجود ہے وہ یقیناً اس جگہ کی نشاندہی کرتا ہے۔" برینڈی نے کہا۔

"ہاں، لیکن اس کا مقصد کیا ہے ہم اب تک کئی نشانیاں دیکھ چکے ہیں لیکن معمے کا حل سمجھ نہیں آتا۔ آخر ہماری اتنی جدوجہد کا حاصل کیا ہے اب تک ساری نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں سوائے ایک نشانی کے اور وہ ہے دھات کا ایک پرانا ٹکڑا جو کسی چاقو کا ٹوٹا ہوا حصہ لگتا ہے۔"

"ہاں...... تم ٹھیک کہتے ہو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم کسی خطرناک کھیل کا حصہ بن گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جیسے آج کل نئے نئے اور خوف ناک گیم ایجاد ہو چکے ہیں۔ بلو وہیل، کلرسی وغیرہ یہ بھی ایسا ہی ایک گیم ہے جس میں ہم رفتہ رفتہ موت کی طرف بڑھ رہے ہوں۔"

"میں تمہاری بات اب بھی نہیں سمجھا۔" برینڈی نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"دیکھو بلو وہیل میں یہ ہوتا ہے نا کہ کھیلنے والا اس کا طابع ہو جاتا ہے ایک معمول بن جاتا ہے اور اسے جو حکم دیا جاتا ہے وہ اسے بجا لاتا ہے چاہے اونچائی سے چھلانگ لگانا ہو یا اپنے جسم کو کسی تیز دھار آلے سے زخمی کرنا لیکن وہ اپنی دنیا اور اپنے ماحول میں سانس لے رہا ہوتا ہے اس کے گرد اس کے دوست احباب موجود ہوتے ہیں جو اس کی مدد کر سکتے ہیں لیکن ہم اس وقت یہاں ان بھول بھلیوں کے گیم میں نہ اپنے ماحول میں ہیں نہ آزاد ہیں اور نہ اپنے

دوستوں یا احباب کے درمیان ہیں ہمیں ڈری ہوئی صورت حال میں معمے کو حل کرتے ہوئے ہر مشکل کا مقابلہ کرنا ہے یہ کھیل بھی خطرناک ہے اس میں ہمیں زخم لگتا ہے تو خون بہتا ہے تکلیف ہوتی ہے یہ کوئی خیال نہیں بلکہ حقیقت ہے۔'' البرٹ نے کہا۔

وہ باتیں کرتے ہوئے ایک اور کمرے میں داخل ہوگئے تھے اس کمرے میں صرف ایک مجسمہ کھڑا تھا اسے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ مرد کا مجسمہ ہے یا عورت کا' انسان کا ہے یا کسی اور مخلوق کا لیکن اس کے ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ بریندی کے ہاتھ کمرے میں خود بخود اٹھنے لگے۔ اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا وہ کمرے میں کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب حرکت کر رہی تھی اب اسے اندازہ ہوا کہ کمرے کے درمیان رکھے ہوئے مجسمے کے علاوہ کمرے میں اور بھی مجسمے تھے جو دیواروں کے ساتھ رکھے ہوئے تھے اور قدرے اندھیرے میں تھے اسے ان کی طرف دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا اچانک اندھیرے میں اس کے سامنے ایک عورت نمودار ہوئی جو دوزانو بیٹھی ہوئی تھی اس کے چہرے پر کرب نمایاں تھا اور اس کے سامنے کوئی چیز کھڑی تھی جو بڑی اور جانور جیسی تھی بریندی کو اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

''بریندی تم ٹھیک ہو؟'' البرٹ نے اس سے پوچھا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے میرا خیال ہے یہ کمرہ ٹھیک نہیں ہے یہاں مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔''

''تم خوف کو اپنے اوپر حاوی مت ہونے دو۔'' البرٹ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''خود پر قابو رکھو۔''

''اوکے۔''

''اور محتاط بھی رہو۔''

''میں محتاط ہوں۔'' بریندی نے کہا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے خطروں نے اسے سب طرف سے گھیرا ہوا ہو۔ اسے اپنے پیروں کے نیچے فرش بہت ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا اس کے اطراف دھندلے سائے تیر رہے تھے جنہیں وہ آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس کی چھٹی حس محسوس کر رہی تھی اسے لگا جیسے البرٹ نے اسے چھوا ہو۔ شاید وہ اس کا خوف کم کرنے کے لیے اسے احساس دلا رہا تھا وہ اس کے ساتھ ہے اس کا دوست ہے۔

اچانک بریندی کو محسوس ہوا جیسے کوئی چیز اس کے راستے میں حائل ہوگئی ہو وہ چلتے چلتے رک گئی وہ جو بھی تھا قد میں اس سے چھوٹا تھا۔ بریندی قسم کھا سکتی تھی کہ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن صرف سائے سائے تھے جو چاروں طرف چکرا رہے تھے وہ ان سے نظر نہیں ہٹا سکتی تھی لیکن وہ چیزیں دھوئیں کی طرح گہری سرمئی تھیں اچانک اس کے ذہن میں ایک منظر بنا وہ سخت دوپہر تھی سورج آسمان پر چمک رہا تھا اور وہ صحرا میں تھی وہ ایک جگہ رک گئی وہ جانتی تھی کہ وہ کبھی کسی صحرا میں نہیں گئی تھی پھر اس کے ذہن میں اس منظر کا ابھرنا کیا معنی رکھتا تھا۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟'' البرٹ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' بریندی نے جواب دیا اور ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا اسے اپنے ذہن کے پردے پر مختلف چیزیں نظر آ رہی تھیں اور خوف ناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں یہ سب اسے اپنا تصور لگ رہا تھا لیکن ایسا نہیں تھا یہ سب کچھ البرٹ کو محسوس نہیں ہو رہا تھا وہ سب کچھ بریندی کے لیے اصل حقیقت کی طرح تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک مجسمے کے قریب آ گئی وہاں اسے احساس ہوا کہ کچھ دھندلے چہرے اسے گھور رہے ہیں اور ساتھ ساتھ خوف سے چیخ رہے ہیں اسے بھی اپنی رگوں میں خوف سرایت کرتا محسوس ہوا۔

''البرٹ۔'' اس نے آواز دی۔

''میں یہاں ہوں۔'' البرٹ نے کہا اور بریندی کے شانے پکڑ کر اسے اپنی طرف موڑا۔

''یوں لگتا ہے راستہ بند ہے۔'' بریندی نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم پیچھے ہٹ جاؤ۔'' البرٹ نے مشورہ دیا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتی۔''

''بریندی ...... یہ صرف پتھر کے مجسمے ہیں ...... بے جان اور یہ کمرہ سب طرف سے بند ہے ہم اس کے دوسری طرف نہیں جا سکتے۔''

''میں بہت خوف زدہ ہوں۔'' بریندی نے کہا۔

''تم بہت بہادر ہو...... میں جانتا ہوں تم اگلا مرحلہ بھی طے کر سکتی ہو...... میں نے اپنی زندگی میں تم سے زیادہ بہادر

دلیر لڑکی نہیں دیکھی......تم یہ کرسکتی ہو۔" البرٹ نے اس کی ہمت بندھائی لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے پھر بھی آخری مرحلے میں قدم رکھ لینے کے بعد واپس نہیں جانا چاہتا تھا وہ اس کھیل کو آخر تک کھیلنا چاہتا تھا وہ خود مجسموں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں تم یہ کرسکتی ہو تمہارے سامنے پتھر کے مجسمے ہیں جو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" البرٹ نے اسے پھر سمجھایا۔

"ٹھیک ہے۔" برینڈی نے کہا وہ پھر مڑی اور چلنا شروع کردیا پھر اندھیرے میں دو مجسموں کے پیچھے اسے چوکور سا روشن مگر مدھم حصہ نظر آیا۔

"شاید مجھے دروازہ مل گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"غور سے دیکھو۔" البرٹ نے کہا اور برینڈی نے اپنے پرس سے اپنا چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگالیا اسی وقت اس کا پاؤں ایک مجسمے سے ٹکرایا تھا اور اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا تھا۔

"آؤچ۔" اس نے زور سے کہا۔

"کیا ہوا؟" البرٹ نے پوچھا برینڈی نے اپنی ٹانگ کا وہ حصہ چھوا جہاں تکلیف ہورہی تھی اور پھر اپنی انگلیاں اپنی آنکھوں کے سامنے کیں اس کے ہاتھ میں خون لگا ہوا تھا۔

"اوہ......مجھے زخم لگا ہے۔" برینڈی نے کہا۔

"کیا؟"

"میں کسی مجسمے سے ٹکرائی تھی شاید یہ اس کا نتیجہ یا کوئی اور چیز مجھے لگی ہے تم بھی احتیاط رکھنا۔"

"اوکے۔" البرٹ نے کہا اور برینڈی پھر دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"ہم قریب پہنچ گئے ہیں۔"

"محتاط رہو۔" البرٹ نے کہا اور اسی وقت برینڈی نے آنکھوں سے چشمہ اتار کر اس دروازے کی طرف بغور دیکھا اور دوسرے ہی لمحے پلٹ کر البرٹ سے چمٹ گئی۔

"اوہ البرٹ میں دیکھ نہیں سکتی......میں خوف زدہ ہوں۔" اس نے کہا تب البرٹ نے بھی اس دروازے کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کمرے سے باہر جانے کا دروازہ نہیں تھا بلکہ وہ دروازہ ایک اور کمرے میں کھلتا تھا جس میں ان کی آنکھوں کے سامنے کمرے کے فرش سے آدمی عورت باہر نکلی ہوئی تھی اور کمرے میں موجود چار مرد اسے مارنے کی کوشش کررہے تھے وہ نہ تو مجسمے تھے نہ ہی ان کے ذہن کا کوئی تصور وہ حقیقت تھی البرٹ کے بھی خوف سے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"میں گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔" برینڈی نے کہا وہ رو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے اس جگہ کی پراسراریت اب میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی......سوائے اس کے کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے......ٹھیک ہے ہم واپس چلتے ہیں۔"

"واپسی پر راستے کو تم لیڈ کرو گے۔" برینڈی نے کہا۔

"میں نہیں کرسکتا۔"

"لیکن میں بھی نہیں کرسکتی......میں بہت خوف زدہ ہوں۔" برینڈی نے کہا پھر وہ دونوں واپسی کے لیے مڑے تھے اور اس بار البرٹ اس مجسمے سے ٹکرایا تھا جس سے کچھ دیر پہلے برینڈی ٹکرائی تھی اس کی بھی ٹانگ میں زخم لگا تھا اور اس سے خون بہنے لگا تھا لیکن وہ بھاگنا نہیں چاہتا تھا اگر وہ ایسا کرتا تو وہ اپنا کنٹرول کھوسکتا تھا اور اگر کنٹرول کھودیتا تو ان کی موت یقینی تھی۔ چنانچہ وہ چلتا رہا اس نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں تاکہ اطراف کے خوف ناک مناظر اسے مزید خوف زدہ نہ کرسکیں۔ فلیش لائٹ اب بھی برینڈی کے ہاتھ میں تھی۔ البرٹ ایک مجسمے سے دوسرے مجسمے کو محسوس کرتے ہوئے ایک سیدھ میں چل رہا تھا۔ وہ اور برینڈی کئی بار ان مجسموں سے ٹکرائے تھے اور زخمی ہوئے تھے اسے واپسی کا راستہ یاد نہیں تھا اور اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ دائرے میں حرکت کررہا ہو۔ جیسے وہ دونوں اس کمرے میں قید ہوگئے ہوں۔

"کیا ہم باہر کی جانب جارہے ہیں؟" برینڈی نے پوچھا۔

"مجھے باہر کا راستہ نہیں مل رہا۔" البرٹ نے جواب دیا۔

"ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" برینڈی نے سسکتے ہوئے کہا۔

"بس اپنی آنکھیں بند رکھنا اور یاد رکھنا کہ یہاں کوئی چیز تمہیں نقصان نہیں پہنچاسکتی......میں باہر نکلنے میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"اوہ......جلدی کرو البرٹ۔" برینڈی نے کہا پھر البرٹ نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولی تھیں اور کمرے سے نکلنے کا دروازہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر موجود تھا وہ اس سے صرف پانچ یا چھ فٹ کے فاصلے پر تھا لیکن درمیان میں ایک بہت بڑا مجسمہ موجود تھا جیسے راستہ روکے کھڑا ہوا ہے یوں لگا جیسے وہ جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہو۔ اس نے برینڈی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور ہمت کر کے ایک قدم آگے بڑھایا پھر دوسرا بڑھایا اسے یوں لگا اس کے قدموں کے نیچے فرش نہ ہو اور اس کے گھٹنوں سے جان نکل گئی ہو۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا اور چند قدم تیز اٹھائے وہ ہر حال میں برینڈی کو اس عذاب سے نکال لے جانا چاہتا تھا۔

البرٹ نے اپنی آنکھیں دروازے کی طرف اور دھیان واپسی پر لگایا ہوا تھا وہ مجسموں کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن اسے احساس تھا کہ وہ اس کے چاروں طرف موجود ہیں جو موت، خون اور خوف کی صورت میں اس کے وجود پر چھا جانا چاہتے ہیں وہ جانتا تھا کہ یہ چیزیں اور ان کا تصور باقی ساری زندگی اس کے خوابوں اور دماغ پر چھایا رہے گا۔ آخر کار وہ برینڈی کے ساتھ اس خوف ناک کمرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے برینڈی کے کانپتے ہوئے جسم کو ہاتھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور اپنے پیچھے موجود خوف کے سایوں سے آگے نکل گیا تھا۔

"وہ خوفناک سائے بھی غائب ہو گئے ہیں۔" برینڈی نے کہا۔

"Game over" البرٹ بڑبڑایا۔

باہر آنے کے بعد البرٹ نے برینڈی کو نیچے اتارا تھا اور اسے کھڑے ہونے میں مدد دی تھی اور تب ہی برینڈی کی نظر اس کے دائیں پاؤں پر پڑی تھی۔

"اوہ تمہارا گھٹنا زخمی ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں میں بھی اس مجسمے سے ٹکرایا تھا جس سے تم ٹکرا کر زخمی ہوئی تھیں۔" البرٹ نے جواب دیا اور برینڈی نے نیچے اپنے دائیں پاؤں کا جائزہ لیا اس کے پاؤں پر بھی تین جگہ زخم لگے ہوئے تھے لیکن وہ معمولی زخم تھے جب کہ البرٹ کے پاؤں میں لگنے والا زخم گہرا تھا اور اس سے خون بہہ کر نیچے تک چلا گیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں......اب خون نہیں نکل رہا ہے۔" البرٹ نے جواب دیا۔

"اب یہاں سے جلدی واپس چلو۔" برینڈی نے خوف زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم اس معمے کو حل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔" برینڈی نے کہا۔

"کیا مطلب......؟"

ہم یہ بھی نہیں جان سکے کہ ہمیں بکس اور چابی کس نے دی، کیوں دی، وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ اور ہمارے یہاں تک لانے کا مقصد کیا تھا؟"

"اب ان باتوں پر مت سوچو اس وقت یہاں سے ہمارا واپس نکل جانا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔" البرٹ نے کہا۔

"جب ہم آخری کمرے میں تھے تو تم نے کچھ دیکھا تھا؟" برینڈی نے البرٹ سے پوچھا۔

"ہاں، میں نے دیکھا تھا۔"

"کیا تم نے وہ خوف زدہ کر دینے والے مجسمے دیکھے تھے؟"

"ہاں، کچھ کچھ۔"

"جب میں نے انہیں دیکھا تو مجھے بہت خوف محسوس ہوا تھا یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اصلی ہوں۔"

"ہاں، مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔"

"میں اب اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتی۔"

"وہ دونوں جس سرنگ سے گزر رہے تھے اس میں ایک لوہے کا زنگ آلود زینہ نظر آ رہا تھا جو اوپر کی طرف جا رہا تھا وہ دونوں اس کی طرف بڑھے تھے۔ برینڈی نے فلیش لائٹ سے اوپر سوراخ میں روشنی ڈالی تھی۔

"پچھلی بار میں آگے چل رہی تھی اب تمہاری باری ہے۔" اس نے فلیش لائٹ البرٹ کو دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم میرے قریب ہی رہنا۔" اس نے برینڈی سے کہا۔

"میری فکر مت کرو۔" برینڈی نے کہا پھر وہ دونوں سیڑھیوں سے اوپر جانے لگے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"البرٹ!" برینڈی نے اسے پکارا۔

"ہاں کیا بات ہے؟"

"ہمیں جو کوئی بھی یہاں لایا ہے اگر وہ نہیں چاہتا کہ ہم یہاں سے واپس جائیں تو کیا ہوگا؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"کیا وہ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔"

"مجھے اس بارے میں کوئی آئیڈیا نہیں لیکن میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں واپس اس سرنگ میں نہیں جاؤں گا۔" البرٹ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

سیڑھیوں سے اوپر جانے کے بعد پھر ایک سرنگ میں داخل ہو گئے تھے اچانک البرٹ کو کچھ آوازیں سنائی دیں اور وہ ایک جگہ رک گیا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" برینڈی نے جلدی سے پوچھا لیکن البرٹ نے کوئی جواب نہیں دیا اور سرچ لائٹ سے اطراف کا جائزہ لینے لگا اسے ایک بار پھر آوازیں سنائی دی تھیں جیسے کوئی چیز حرکت کر رہی ہو لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ شور کس چیز کا ہے۔

"کیا ہے؟ کیا محسوس کر رہے ہو؟" برینڈی نے پھر پوچھا۔

"کچھ نہیں...... شاید میرا وہم ہو۔" البرٹ نے کہا لیکن اس کا وہم نہیں تھا وہاں نیچے بہت سے ذی روح تھے۔

"البرٹ!" برینڈی نے سرگوشی کی۔

"بس چلتی رہو۔" البرٹ نے کہا۔

"مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟" برینڈی نے کہا اور البرٹ نے پھر سرچ لائٹ سے چاروں طرف روشنی ڈالی۔

"البرٹ مجھے خوف زدہ مت کرو...... تم کیا تلاش کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں...... شاید میرے اوپر ابھی تک خوف کا اثر ہے۔" البرٹ نے کہا۔

"میں نروس ہو رہا ہوں۔" پھر وہ ایک نئی سرنگ میں داخل ہو گئے تھے اور برینڈی نے محسوس کیا تھا کہ وہ اکیلی ہے اس نے پلٹ کر دیکھا تو البرٹ سرنگ سے پیچھے کی جانب اندھیرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"البرٹ چلو...... وہاں کیا کر رہے ہو؟" برینڈی نے اسے آواز دی۔

"شش...... تم نے کچھ سنا؟" البرٹ نے اس سے پوچھا وہ پلٹ کر اس کے قریب آ گئی تھی اور خود بھی کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی پھر اسے کسی کے چلنے کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی البرٹ بھی اندھیرے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ آواز کہاں سے آ رہی تھی لیکن وہاں بہت گہرا اندھیرا تھا اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن آواز آہستہ آہستہ تیز ہوتی ہوئی قریب آ رہی تھی۔

"بھاگو!" برینڈی نے آگے بھاگتے ہوئے کہا اور البرٹ بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا اب بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں انہیں اپنے پیچھے سنائی دے رہی تھیں وہ بھاگتے ہوئے سرنگ سے نکل کر کھلے حصے میں آ گئے تھے۔ جہاں ٹھنڈا پانی جمع تھا وہ بھاگتے ہوئے اس میں داخل ہو گئے اس راستے سے وہاں پہلے گزر چکے تھے وہ دونوں تیزی سے پانی تیرتے ہوئے دوسرے کنارے تک آ گئے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ کوئی سیاہ خطرناک چیز ان کے تعاقب میں ہے۔ دوسرے کنارے پر پہنچنے پر ان کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا انہوں نے فلر کا ڈبہ وہاں سے اٹھایا جو وہ جاتے ہوئے چھوڑ گئے تھے اور آگے بڑھ گئے تھے۔ پانی میں دور دور تک کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔

"بغیر رکے آگے بڑھتی رہو برینڈی۔" البرٹ نے ہدایت کی تھی اور برینڈی اس کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ گئی تھی کافی دور جانے کے بعد وہ سانس لینے کے لیے رکے تھے۔

"تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ چیز ابھی تک ہمارا پیچھا کر رہی ہے؟" برینڈی نے پوچھا۔

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی سانپ ہو...... وہ سانپ کے پھنکارنے جیسی آواز تھی۔" برینڈی نے کہا اور وہ عجیب بلا ہو جسے پہلے کبھی کسی نے نہ دیکھا ہو؟"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔" البرٹ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

پھر کئی کمروں اور سرنگوں کی بھول بھلیوں سے واپس جاتے ہوئے وہ اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھے جہاں سے انہوں نے سفر کا آغاز کیا تھا ایک کونا مڑتے ہی ان کے سامنے وہ جگہ آ گئی تھی جہاں بریندی نے کلر سے نشان بنانے کا آغاز کیا تھا لیکن ایک چیز دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے تھے جن سیڑھیوں سے وہ اس سرنگ میں اترے تھے ان کے قریب ہی البرٹ کا بیگ رکھا تھا جو بھول بھلیوں میں وہ کہیں چھوڑ آیا تھا وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے بھلا وہ بیگ کون لا سکتا تھا یہ سوال دونوں ہی کے ذہن میں ابھرا تھا۔

''البرٹ؟'' بے ساختہ بریندی کے منہ سے نکلا۔

''میں بھی حیران ہوں۔'' البرٹ نے سرنگ کے دونوں جانب دیکھتے ہوئے کہا وہاں کچھ بھی نہیں تھا اس نے جھک کر اپنا بیگ اٹھایا اور اس میں موجود چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔

''اس میں سب چیزیں موجود ہیں۔'' البرٹ نے کہا۔

''البرٹ۔'' بریندی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے عجیب انداز میں اسے پکارا اور اس نے پلٹ کر دیکھا اس کے سامنے بریندی کے قریب ایک شخص کھڑا تھا جس کے چہرے پر نقوش نہیں تھے اس کا قد چھ فٹ سے زیادہ تھا اس کا چہرہ پتلا اور سپاٹ تھا اس پر ناک' منہ اور آنکھیں نہیں تھیں اس کے ہونٹ نہیں تھے۔ آنکھوں کی جگہ گہرے سوراخ تھے اس کے سر پر بال نہیں تھے اور نہ ہی جسم پر کپڑے تھے۔ البرٹ اسے دیکھ کر خوف سے پیچھے کھسکا تو وہ شخص مزید اس کے قریب آ گیا۔ بریندی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی وہ کسی جانور کی طرح رینگ رہا تھا پھر وہ البرٹ کے قریب آ کر رک گیا تھا پھر اس نے البرٹ کا ہاتھ تھاما تھا اور اس میں کچھ رکھ دیا تھا۔

''تمہارا انعام؟'' اس نے رک رک کر کہا تھا لیکن اس کا منہ کھلا نہیں تھا پھر وہ چلتا ہوا واپس گیا تھا اور غائب ہو گیا تھا اس کے غائب ہوتے ہی البرٹ نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا تھا اس کے ہاتھ پر لیدر کا ایک پرانا بٹوہ رکھا تھا وہ اس بٹوے سے دوہرے سائز کا تھا جو بریندی کو ملا تھا اور جس میں کسی نے اسے چابی دی تھی وہ بہت بھاری تھا البرٹ نے فلیش لائٹ بریندی کو تھما دی اور بٹوے کو کھول کر اپنی ہتھیلی پر الٹ دیا۔

''واؤ۔'' بے اختیار بریندی کے منہ سے نکلا۔

البرٹ کے ہاتھ پر پچیس سونے کے سکے تھے جو بہت قدیم نظر آ رہے تھے ان سکوں کی ایک سطح سپاٹ تھی اور دوسری جانب کوئی سمبل بنا تھا جسے البرٹ پہچان نہیں سکا تھا البرٹ کو ان پرانے سکوں کی حالت کا اندازہ نہیں تھا لیکن اس کے اندازے کے مطابق وہ خاصے قیمتی تھے۔

''چلو یہاں سے فوراً نکل چلو۔'' البرٹ نے سکوں کو واپس بٹوے میں رکھتے ہوئے کہا پھر بریندی فوراً ہی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر گئی تھی اور البرٹ سرنگ میں اس جانب دیکھتا رہا تھا جدھر سے وہ آئے تھے اور جس سمت میں وہ عجیب الخلقت شخص غائب ہوا تھا۔

باہر البرٹ کی کار وہاں موجود تھی جہاں اسے البرٹ نے چھوڑا تھا وہ دونوں تیزی سے کار کی طرف بڑھ گئے تھے البرٹ اطراف کا جائزہ لیتا رہا تھا اس وقت صبح ہو رہی تھی اور سڑک پر کوئی موجود نہیں تھا۔

''مجھے یہ واقعہ ساری عمر نہیں بھولے گا۔'' بریندی نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ میری زندگی کا خطرناک ترین معمہ تھا یہ کھیل وہ تھا جو کسی کمپیوٹر یا ٹی وی اسکرین پر نہیں بلکہ حقیقت کی دنیا میں کھیلا گیا جس میں ہارنے پر موت اور جیتنے پر زندگی ملتی ہے۔'' البرٹ نے بریندی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' بریندی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ ہمیں فتح نصیب ہوئی ہے ہم اس گیم کے آخری اسٹیج تک پہنچ کر واپس آنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور نتیجے میں زندگی ملی ہے...... میں اگر یہ گیم نہ کھیلتا تو شاید تم سے اتنی قربت نہ محسوس کرتا جواب کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ اب جدا رہنا ممکن نہیں کم از کم میں سمجھتا ہوں کہ تم میری زندگی کا ضروری حصہ بن گئی ہو۔'' البرٹ نے کہا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ بریندی نے مسکرا کر اس کے کاندھے سے سر لگا دیا تھا۔

ناگ کتھا

سلیم اختر

کیا ناگ سو سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد واقعی میں اپنی شکل بدل لیتے ہیں کیا یہ حقیقت یا صرف کہانیاں ہیں کہ سانپوں کی بھی کوئی دنیا ہوتی ہے ایک ایسے شخص کی کتھا جس کی ملاقات سانپوں کے بادشاہ سے ہوگئی تھی۔
قدم قدم پر سنسنی بکھیرتی ایک عجیب و غریب کہانی جسے پڑھتے ہوئے آپ وقت کا احساس کھو دیں گے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

یہ 1974 کی بات ہے۔ جب میں خانیوال سے
ن بذریعہ ریل گاڑی جایا کرتا تھا۔ خانیوال میں محدود
ستوں کے باعث مجھے داخلہ نہ مل سکا تھا۔ اس لیے مجبوراً
، ملتان میں داخلہ لینا پڑا تھا۔ میں تھرڈ ایئر کا طالب علم
۔ روزانہ تیس میل دور بذریعہ ٹرین جانے کا طویل
لرام سامنے آیا تو میں بہت ہی دلبرداشتہ ہوا۔ چونکہ گرمی
یا سردی روزانہ صبح چار بجے اٹھ کر جانا پڑتا تھا۔ لیکن اب
چتا ہوں کہ اگر میں ملتان میں داخلہ نہ لیتا اور ریل گاڑی
سفر نہ کرتا تو شاید مجھے زندگی کے یہ ہزاروں تجربات
ل نہ ہوتے جواب حاصل ہیں۔ ان دو سال کے سفر
، دوران میں نے ہزار ہا واقعات دیکھے اور سنے بھی۔
ب اقسام کے لوگوں سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا
کتنے ہی عجیب و غریب قسم کے واقعات سننے میں آئے۔
ملتان جانے کے لیے صبح چار بجے گاڑی ملتی تھی۔ اس
بعد سات بجے ملتی تھی۔ سات بجے والی گاڑی ملتان نو
، پہنچتی تھی۔ اس لیے اس گاڑی سے کالج جانے کا
مطلب پہلے دو پریڈ کا نقصان تھا۔ چار بجے والی گاڑی
بعض اوقات دو تین گھنٹے میں پہنچتی تھی۔ چونکہ راستے میں
کراسنگ بہت ہوتے تھے۔ یہ گاڑی اصل میں ریل کار
تھی۔

دسمبر کے دن تھے۔ میں ریل کار میں سیٹ پر دبکا بیٹھا تھا اور کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانک رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک معزز قسم کے بزرگ جن کی صحت قابل رشک تھی۔ بیٹھے تھے۔ کوٹ میلا رام کے اسٹیشن پر گاڑی کراسنگ کے باعث ٹھہر گئی۔ میں نے اکثر لوگوں سے سنا تھا کہ کوٹ میلا رام میں سانپ بہت زیادہ ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میرے ذہن میں دوستوں کے ساتھ آج کل چلی ہوئی بحث تازہ ہوگئی۔ جن کا اصرار تھا کہ سانپ ایک پر اسرار نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کہ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا تھا کہ سانپ بھی کوئی پراسرار شے ہے۔

میں کافی دیر سوچتا رہا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ جو بزرگ میرے ساتھ بیٹھے ہیں۔ کافی معمر ہیں اور تعلیم یافتہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان سے سوال کیا جائے۔ چونکہ ان کے پاس عمر کا تجربہ بھی تھا لہٰذا میں نے فوراً ان سے مخاطب ہو کر سوال کر دیا۔

”چچا میاں! اگر گستاخی نہ ہو تو میں آپ سے ایک سوال کر سکتا ہوں؟“

وہ جیسے چونک گئے ہوں۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور نہایت سلیس اردو میں...... جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا تعلق یا تو دہلی سے ہے یا لکھنو سے...... مجھ سے کہا۔

”برخوردار کیا بات ہے؟“

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ سانپ واقعی کوئی پراسرار شے ہے؟" میں نے کہا۔

میرے اس سوال پر وہ اور زیادہ چونک گئے اور میں نے ان کے چہرے پر ایک رنگ سا آتا دیکھا جو غالباً خوف کا رنگ تھا یا نہ معلوم ایسا لگتا تھا کہ میں نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ بولے۔

"برخوردار تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟"

میں نے ان کو دوستوں کے ساتھ ہونے والی روزانہ بحث کی تفصیل سنائی۔ تو پھر وہ بولے۔

"واقعی سانپ ایک پراسرار شے ہے۔"

اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ چونکہ ان کی بزرگی اور نہایت مہذب لہجہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ نہایت وثوق سے کہہ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اگر مناسب خیال کریں تو مجھے بتائیں؟"

انہوں نے کافی پس و پیش کے بعد جو داستان سنائی وہ ان کی اپنی آپ بیتی تھی اور اس درجہ حیرت ناک تھی کہ میں کئی روز تک اس بات پر شک کرتا رہا کہ میں نے واقعی یہ کہانی اس شخص سے سنی ہے جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ بہرحال ان کی کہانی اس طرح تھی جو میں ان کی زبانی لکھ رہا ہوں۔

❁ ...... ❁ ...... ❁ ...... ❁

"میرا نام عجائب خان ہے۔ میں آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔ میں تحصیل دار کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوا ہوں اور اب اپنی موت کا انتظار کر رہا ہوں جو یقینی طور پر سانپ کی شکل میں ہوگی۔"

"میرا تعلق دہلی سے ہے۔ میرے والد وہاں تجارت کرتے تھے۔ ہمارا شمار نہایت معزز گھرانوں میں ہوتا تھا۔ میں بچپن ہی سے الگ تھلگ رہنے کا عادی تھا۔ دوستوں کی فہرست بھی مختصر تھی۔ میرے دو ہی مشاغل تھے ایک تو کتب

بنی اور دوسرا بانسری بجانا۔ مطالعہ سے فارغ ہو کر میں اکثر شہر سے باہر نکل جاتا اور کھیتوں میں کسی پلیا پر بیٹھ کر بانسری بجایا کرتا تھا۔ چونکہ مجھے بانسری سے دیوانگی کی حد تک پیار تھا۔ اس لیے میں نہایت ماہرانہ انداز میں بانسری بجاتا تھا۔ جو ہندو میری بانسری کی آواز سنتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ میری بانسری میں بھگوان بولتا ہے۔ ایک دن میں حسب معمول اسی طرح سائیکل پر باہر نکل گیا اور ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بانسری بجانی شروع کر دی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر بانسری بجا رہا تھا۔ مجھے قطعی ہوش نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس کوئی دوسری شخصیت بھی ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں تو دیکھا ایک نہایت ہی ضعیف شخص میرے پاس بیٹھا تھا۔ جو لباس سے جوگی یا سپیرا معلوم ہوتا تھا اس نے مجھ سے کہا۔

"بیٹا تمہاری بانسری سن کر مجھے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کیا تم مجھے روزانہ بانسری سنا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"بابا میں تقریباً روزانہ یہاں آتا ہوں آپ روزانہ سن لیا کرنا۔" میرا جواب سن کر بوڑھا جوگی بہت خوش ہوا اور کل آنے کا وعدہ کر کے واپس چلا گیا۔

اگلے تین دن تک میں روزانہ اسی جگہ جاتا۔ تو بوڑھا مجھے منتظر ملتا۔ میں بانسری بجاتا اور وہ سن کر جھومنا شروع کر دیتا۔ ایک دن حسب معمول بانسری بجا کر خاموش ہوا تو وہ بوڑھا کہنے لگا۔

"بیٹے! تم نے مجھے بانسری سنا کر اور میری بات مان کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں کچھ انعام دوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیسا انعام بابا؟ اللہ کا شکر ہے۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔"

بوڑھا ہلکا سا مسکرایا اور بولا۔

"یہ وہ انعام ہوگا بیٹے جو کروڑوں روپے لگا کر بھی تم حاصل نہیں کر سکتے۔" اب میری رگ تجسس پھڑکی اور میں نے کہا۔

"تو بابا پھر وہ انعام دے دو۔"

بابا نے کہا۔ "اس کے لیے ضروری ہے کہ تم تین دن اور رات مسلسل میری کٹیا میں گزارو۔ اگر انعام کی خواہش ہو تو کل اسی وقت آ جانا۔"

یہ کہہ کر بوڑھا اپنی کٹیا میں چلا گیا جو قریب ہی نہر کے کنارے پر بنی ہوئی تھی۔ میں سوچوں میں گم واپس گھر آ گیا۔ اگلے دن میں نے والد صاحب کو بتایا کہ میں تعلیمی سلسلے میں ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں۔ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی اور میں وقت مقررہ پر بابا کی کٹیا پر پہنچ گیا۔ بابا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا۔

"تم پہلے شخص ہو جسے میں یہ علم سکھانے جا رہا ہوں۔ مگر اس کے لیے کچھ شرائط ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کون سی؟" تو بولا۔

"پہلی شرط تو یہ ہے کہ یہ علم تم کسی اور کو نہیں سکھاؤ گے اور دوسری یہ کہ تم آئندہ بانسری نہیں بجاؤ گے۔"

دوسری شرط بہت کڑی تھی مگر میں ہر حال میں اس علم کو سیکھنا چاہتا تھا۔ جو کروڑوں روپے کے بدلے میں بھی نہ مل سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ہاں کر دی۔ بوڑھا مجھے اپنی کٹیا کے اندر لے گیا۔ کٹیا میں داخل ہوتے ہی میں اچھل پڑا۔ وہاں بہت سے خوفناک سانپ پھن اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ میرا استقبال کر رہے ہوں۔

بابا میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "بے فکر رہو۔ یہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ان کو معلوم ہے کہ تم میرے دوست ہو۔"

میں حیرت کے سمندر میں ڈوبا جا رہا تھا اور سانپ باری باری میرے قدموں سے لپٹ رہے تھے۔ جیسے وہ میری تعظیم کر رہے ہوں۔ میرا دل خوف سے بیٹھا جا رہا تھا۔ میں نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ بابا نے مجھے ایک چٹائی پر بیٹھنے کو کہا۔ میرے بیٹھتے ہی تمام سانپ کونوں میں جا کر لیٹ گئے۔ جیسے انہیں چین مل گیا ہو۔ بابا نے مجھے ایک کٹورا دیا جس میں کوئی سیال شے تھی۔ اس نے مجھے اسے پینے کو کہا۔ میں اسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اس کے پینے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے اندر بے پناہ طاقت آ گئی ہو اور میری ذہنی قوت زیادہ ہی بڑھ گئی ہو۔ اس کے بعد بابا نے مجھے ایک عمل بتایا جو میں نے تین ہزار مرتبہ پڑھنا تھا۔ یہ غالباً اسی سیال شے کا اثر تھا کہ میں نے اپنے اندر بالکل تھکان محسوس نہ کی اور وہ عمل

پڑھنا شروع کردیا۔ اس کے بعد وہ [illegible] عمل [illegible] غرض یہ کہ اسی طرح تین دن گزر گئے۔ اس دوران مجھے وہی سیال شے پینے کو ملتی تھی۔ جس کا ذائقہ بھی بہت عمدہ ہوتا تھا جب تین دن گزر گئے تو بابا نے مجھے مبارک باد دی اور کہا۔

"بیٹا اب تم اس بات پر قادر ہو گئے ہو کہ تم جب چاہو سانپوں کے بادشاہ کو طلب کر سکتے ہو اور جو حکم چاہو اسے دے کر اس پر عمل کرا سکتے ہو۔"

"میں سانپوں کی زبان کیسے سمجھ سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

اس پر بابا مسکرایا اور ایک سانپ کی طرف دیکھا۔ جو آہستہ آہستہ رینگ کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس نے ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ میرے کانوں میں سرگوشی کی ہو کہ۔

"آپ میری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔"

میں حیران رہ گیا۔ میں نے سامنے بیٹھے ہوئے سانپ کی طرف دیکھا تو اس نے پھن کو ذرا سا خم کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب میں سانپوں سے ہم کلام ہو سکتا ہوں۔ مجھے اس بات سے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ میری یہ مسرت بابا کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"بیٹا تم خوش قسمت ہو کہ اب سانپوں کا بادشاہ تمہارا دوست ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا تم اپنے اس عمل سے دوستی کا کبھی ناجائز فائدہ مت اٹھانا اور دوسرا یہ یاد رکھنا کہ تمہاری موت کسی سانپ کے ڈسنے ہی سے واقع ہوگی۔ جس طرح انسانوں کی دنیا میں حاکم کے باغی پائے جاتے ہیں اسی طرح سانپوں کی دنیا میں بھی بادشاہ کے باغی ہوتے ہیں اور ایسا ہی کوئی باغی تمہاری موت کا باعث بنے گا۔"

میں نے بابا کا شکریہ ادا کیا اور اسے یقین دلایا کہ میں اس کی ہدایات پر عمل کروں گا۔

اس پر بابا مسکرایا اور میری طرف دیکھا۔ اچانک میں نے سوال کیا۔

"بابا مجھے کیسے یقین ہو کہ اب میں سانپوں کا بادشاہ ہوں۔"

بابا نے میری طرف دیکھا۔ اس بار مجھے اس کی [illegible] آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک محسوس ہوئی اور ویسی ہی سرسراتی ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"کیا تمہیں اب بھی ہماری دوستی پر شک ہے؟"

میں نے چونک کر دیکھا تو بابا غائب تھا اور میرے سامنے لاتعداد سانپوں کا لشکر موجود تھا۔ ان کے درمیان بہت بڑا سانپ تھا اور یہ آواز اسی کی تھی۔ اس سانپ کے پن پر ایک سنہری رنگ کا ایک بالشت کا سانپ بیٹھا تھا۔ اسی کی آواز کی سرسراہٹ میں نے اپنے کانوں میں سنی تھی۔ اس کے ساتھ پھر میرے کانوں میں سرگوشی ہوئی۔

"تم تین دن تک ہمارے مہمان رہے ہو اور اب ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہے گی۔"

میں نے انتہائی حیرانی کے عالم میں بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ جس پر بادشاہ نے اپنی زمرد کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر لشکر کو کوچ کرنے کا حکم دیا۔ آناً فاناً سب سانپ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں اسی جگہ کھڑا تھا اور کٹیا غائب تھی۔ میں حیران تھا کہ خدا کی اس کائنات میں کیا عجائبات ہیں۔ میں وہ عمل سیکھ کر واپس گھر لوٹ آیا۔ اب چونکہ میں بانسری تو بجا نہیں سکتا تھا۔ اس لیے تمام توجہ میں نے تعلیم پر مرکوز کر دی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁ ...... ❁
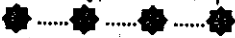
ہماری گاڑی اب ملتان سے صرف چھ میل دور تھی اور عجائب صاحب غالباً کوئی مزید بات سنانے کو بے تاب تھے وہ پھر بولے۔

"تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نائب تحصیل دار بھرتی ہو گیا۔ اور میری تعیناتی بھٹنڈہ کے مقام پر ہو گئی۔ یہ جگہ اس زمانے میں انگریزوں کی فوجی چھاؤنی تھی۔ فوج شہر سے باہر بارکوں میں مقیم تھی۔ بھٹنڈہ میں چند دن گزارنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ فوجی چھاؤنی میں ہر روز دو تین سپاہی سانپ کے کاٹنے سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ انگریز کمانڈر اپنے سپاہیوں کی ناگہانی اموات پر جھنجلا اٹھتا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اس بلا سے نجات ملے۔ اس سلسلہ میں اس نے جوگیوں اور سپیروں کو بلایا مگر اس کے باوجود وارداتیں جاری تھیں۔ کوئی سپیرا کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر تنگ آ کر انگریز کمانڈر نے اعلان کر دیا کہ جو شخص ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائے گا۔ اسے بھاری

انعام دیا جائے گا۔

میں نے لوگوں کی زبانی یہ تمام حالات سنے تو میں نے خلق خدا کو اس مصیبت سے نجات دلانے کا ارادہ کر لیا۔ انعام سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا کیونکہ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ میں انگریز کمانڈر سے ملا اور اسے بتایا کہ میں اس مصیبت سے فوجیوں کو نجات دلا سکتا ہوں۔ کمانڈر بہت خوش ہوا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اس نیک کام میں دیر نہ کروں۔ میں نے کہا کہ کل شام چار بجے ایک کھلے میدان میں انتظام کیا جائے اور شہر کے معزز لوگوں کو وہاں مدعو کیا جائے تاکہ سب لوگ دیکھ لیں کہ اس مجرم سانپ کو میں کس طرح سزا دوں گا۔ اس سے میرا مقصد اپنی مشہوری نہیں ہے بلکہ خلق خدا کی خدمت ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کیسے کیسے اسرار ہیں۔ جو نظر انسانی اور عقل انسانی سے بعید ہیں۔

چنانچہ انگریز کمانڈر نے میری یہ تجویز فوراً قبول کر لی۔ اس نے اگلے دن شہر کے باہر کھلے میدان میں انتظام کیا۔ میدان میں ایک شامیانہ لگایا گیا۔ جس کے اندر ایک تخت بچھا تھا۔ اس کے روبرو خوب صورت سا قالین تھا۔ اس تخت کے ساتھ میری کرسی تھی اور اس سے تقریباً بیس گز پیچھے عمائدین شہر اور دیگر افسران تھے۔ تخت پر ایک کونڈا ابھرا ہوا رکھا تھا۔ جو سرخ رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ تخت کے آگے دورویہ قطاروں میں دور تک بے شمار چھوٹے کونڈے رکھے گئے تھے۔ جو دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ جب سب لوگ اپنی نشستیں سنبھال چکے تو میں نے اپنے عمل کا آغاز کیا۔

جوں جوں میں عمل پڑھتا اور کرتا جا رہا تھا۔ جنگل کی جانب سے سانپوں کی آمد شروع ہوگئی۔ اور وہ تمام سانپ نہایت مہذب انداز میں کونڈلی کے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھنے لگے تھے۔ چند ہی منٹوں میں وہاں سانپوں کا مجمع لگ گیا۔ یہ مجمع بالکل ویسا ہی تھا۔ جو میں نے بادشاہ سے پہلی ملاقات کے وقت دیکھا تھا۔ ان کے درمیان ایک بڑا سا سانپ تھا۔ جس کے پھن پر بادشاہ بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا سانپ تخت کے قریب آ گیا اور وہاں آ کر رک گیا۔ بادشاہ نے ایک جست لگائی اور تخت پر پڑے ہوئے کونڈے کے نزدیک آ کر اپنی دم پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ وہاں موجود سب لوگ دم بخود تھے اور حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

میں نے بادشاہ کی نظروں سے نظریں ملا کر اس کی آمد کا شکریہ ادا کیا تو میرے کانوں میں وہی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔

"میرے دوست تم نے ہمیں کیوں یاد کیا ہے؟"

"بادشاہ سلامت! مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ ایک سانپ روزانہ ہماری فوج کے بے گناہ لوگوں کو ہلاک کر دیتا ہے اور دو تین آدمی روزانہ مر جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں خوف کی فضا قائم ہوگئی ہے۔ آپ ہمیں خوف سے نجات دلائیں۔" میں نے جواب دیا۔

یہ سن کر بادشاہ نے بڑے سانپ کی جانب دیکھا۔ جس کے پھن پر وہ سوار تھا اور پھر مجھے اپنے کانوں میں وہی پراسرار سرسراہٹ سنائی دی۔ جس میں غصہ کی آمیزش تھی۔

"جاؤ اسے تلاش کرو۔"

بڑے سانپ نے دوسرے سانپوں کی جانب دیکھا اور پھر وہ سانپ تیزی سے رینگتے ہوئے جنگل کی جانب روانہ ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد بادشاہ نے پھر میری طرف دیکھا تو میں نے اسے بتایا کہ "میں نے لوگوں کو اس لیے اکٹھا کیا ہے کہ لوگ قدرت کے سربستہ رازوں کو بھی جان لیں اور مان لیں کہ قدرت کے کارخانے میں کیا کیا عجائبات ہیں۔"

بادشاہ نے میرا حال پوچھا اور کہا کہ وہ اکثر مجھے یاد کرتا ہے۔ ہماری یہ گفتگو صرف نظروں اور پراسرار سرسراہٹ کی صورت میں ہو رہی تھی۔ جس کا لوگوں کو علم نہ تھا وہ تو بس گنگ سے بیٹھے تھے اور انگریز کمانڈر کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جنگل کی سمت سانپ برآمد ہوئے۔ ان کے درمیان ایک سانپ تھا۔ سب سانپ پھر سے کونڈوں کے قریب بیٹھ گئے اور مجرم سانپ تخت کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ میرے کانوں میں بادشاہ کی سرسراہٹ ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اب تم اس سے سوال کر سکتے ہو۔"

میں نے مجرم سانپ کی جانب دیکھا تو اس کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ مگر میں انتقام کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آگ میں جل رہا تھا۔"

"کیسا انتقام؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔" وہ اور اس کی مادہ درخت کی کھوہ میں رہتے تھے۔ایک شام جب مادہ باہر پھر رہی تھی تو ایک فوجی نے اسے ہلاک کر دیا۔اس کی موت نے مجھے بے قابو کر دیا۔ اور میں نے اس فوجی کو ڈس کر ہلاک کر دیا اور پھر میرا انتقام طویل ہو گیا اور میں نے مزید فوجیوں کو ڈسنا شروع کر دیا۔"

"یہ تو سراسر زیادتی تھی۔ایک مجرم کی سزا دوسروں کو کیوں ملے۔تم نے ایک بڑا جرم کیا ہے۔لہٰذا اب اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" میں نے غصہ کے عالم میں کہا۔

سانپ نے اپنا سر خم کر دیا۔تو بادشاہ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"دوست چونکہ اس کا جرم ثابت ہو گیا ہے لہٰذا اب اسے سزا دی جائے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے اس سانپ کی طرف پھنکار ماری۔ جس سے مجرم سانپ کے جسم کو آگ لگ گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا۔میں نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ وہ ہماری طرف سے دودھ کا نذرانہ قبول کریں۔ میں نے کونڈے سے رومال ہٹا دیا۔ بادشاہ نے اس میں سے چند گھونٹ پیئے۔اس عرصہ میں دوسرے سانپوں نے بھی اپنے کونڈے خالی کر دیئے تھے۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" بادشاہ نے کہا۔اور جست لگا کر بڑے سانپ کے پھن پر جا بیٹھا۔اس عرصہ میں وہ دودھ جو بادشاہ نے چھوڑا تھا۔ایک دم خشک ہو گیا۔اور کونڈا پگھل کر راکھ بن گیا۔ میرے کانوں میں پھر بادشاہ کی آواز کی سرسراہٹ ہوئی۔

"میرے دوست ہم چلتے ہیں۔ ہماری تمام نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔اس کونڈے کی راکھ کو صرف تم ہاتھ لگانا اور اسے سنبھال کر رکھنا یہ بہت کام کی چیز ہے۔"

میں نے اظہار ممنونیت کے طور پر اس کی طرف دیکھا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔اور پھر چند منٹوں کے بعد میدان صاف تھا۔تمام سانپ جا چکے تھے۔

❁ ...... ❁ ...... ❁ ...... ❁
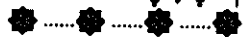
جب عجائب صاحب نے کہانی ختم کی تو گاڑی ملتان اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ مجھے تو اپنا ہوش نہیں تھا۔ یہ شکر ہے کہ گاڑی یہاں سے آگے نہیں جاتی تھی۔ میں نے عجائب صاحب سے کہا کہ" وہ مجھے اور واقعات سنائیں اور اس راکھ کے بارے میں بتائیں کہ وہ اب کس کے پاس ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر کا پتہ دے دیا اور کہنے لگے کبھی فرصت ہو تو وہاں آ جانا۔ میں تمہیں بہت سی باتیں سناؤں گا۔"

یہ کہہ کر عجائب صاحب رخصت ہو گئے اور میں کالج چلا آیا۔ دو تین روز کے بعد جب اس واقع کا طلسم ٹوٹا تو پھر مجھے عجائب صاحب کا خیال آیا۔اور ایک دن میں ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ان کے گھر کے سامنے لوگ جمع تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ تو جو جواب مجھے ملا اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

"کہ کل رات عجائب صاحب کو ایک زہریلے سانپ نے کاٹ لیا تو وہ زندگی ہار گئے۔"

میرے کانوں میں عجائب صاحب کی آواز گونجتی سنائی دی۔" کہ میری موت سانپ کے کاٹنے سے واقع ہو گی۔"

❁ ...... ❁ ...... ❁ ...... ❁

جب میں واپس آنے کے لیے پلٹا تو اچانک میری نظر مجمع میں کھڑے ایک پراسرار بوڑھے شخص پر پڑی۔ جن کے بدن پر جوگیوں جیسا لباس تھا۔اچانک اس نے میری جانب دیکھا تو اس کی زمرد جیسی چمکدار آنکھوں میں مجھے نمی نظر آئی۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے میں سمندر میں ڈوب رہا ہوں۔ جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں اسٹیشن پر تھا۔ یہ واقعہ اب بھی مجھے حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ وہ جوگی کون تھا؟ کیا میں بھی سانپوں کے بادشاہ کا رشن کر چکا ہوں؟" اور کیا میری موت بھی؟

❁

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پراسرار گھر

وسیم بن اشرف

اس بستی کا قصہ جہاں لوگ "کالی موت" مرتے تھے۔ ایک شیطانی طاقت جس نے تمام لوگوں پر سایہ کر رکھا تھا اور دو محبت کرنے والے جو وہاں نووارد تھے۔

ایک ایسے گھر کا ماجرا جو شیطانی قوتوں کے زیر اثر تھا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وکیل صاحب نے اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے سلیم اور اس کی بیوی کو غور سے دیکھا۔ پھر انہوں نے اپنی کھردری اور کرخت آواز میں وصیت نامہ پڑھنا شروع کیا۔

"...... میں کلیم شیرازی ولد جمیل شیرازی اپنے اکلوتے بھائی سلیم شیرازی کو اس کی ذہانت اور اچھے کردار کی بدولت اپنے تمام تر اثاثوں کا وارث قرار دیتا ہوں۔ وہ اس تمام رقم اور جائیداد کا مالک ہوگا جو میں مرتے وقت چھوڑوں گا۔ میرا ایک بنگلہ جو کہ "احمد نگر" میں "شیرازی ہاؤس" کے نام سے موجود ہے وہ بھی اسی کی ملکیت ہوگا"۔

سلیم شیرازی نے اپنے قریب ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی نعیمہ کو ایک نظر دیکھا جو عجیب سی نظروں سے وکیل صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ ان دلکش الفاظ کے پیچھے کوئی حقیقت بھی ہے یا نہیں؟

"تاہم تم کوئی زیادہ توقعات مت رکھو" وکیل صاحب نے مشورہ دیا۔ "تمہارا بھائی کسی لحاظ سے بھی امیر آدمی نہیں تھا"۔

سلیم شیرازی نے اپنے بھائی سے کچھ زیادہ توقعات رکھی بھی نہیں تھیں۔ کیونکہ اس کے بھائی کلیم نے کبھی اپنے بزنس یا شیئرز کے بارے میں کسی خط میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ سلیم شیرازی کی امیدیں اور دلچسپی تو صرف بنگلے تک محدود تھی۔

"شیئرز اور دیگر دولت والی بات فضول ہے"۔ وکیل صاحب نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"لیکن ان کا ایک بنگلہ تو واقعی ہوا کرتا تھا" سلیم شیرازی نے کہا۔

"وہاں بنگلہ ہوگا۔ لیکن برامت ماننے۔ اسے بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ مجھے اس کے متعلق کچھ علم ہے کہ وہ کس حالت میں ہے۔ تمہارا بھائی بہت سادہ طبیعت کا آدمی تھا اور میرے خیال میں وہ کفایت شعاری کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا"۔

"ہمارا رہن سہن بھی خاصا سادہ ہے" نعیمہ نے آہستگی سے کہا۔

"کیا آپ بھی اس بنگلے میں قیام کرنے کے متعلق سوچ رہی ہیں؟" وکیل نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ میرا خیال ہے ہم وہیں مستقل قیام کریں گے"۔ نعیمہ نے جواب دیا۔ "لیکن تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ نام تو اس کا "شیرازی ہاؤس" ہے لیکن دراصل وہ ایک کاٹیج نما گھر ہے۔ اس میں صرف دو کمرے ہیں۔ ایک بیڈروم اور دوسرا ڈرائنگ روم" وکیل صاحب نے کاغذوں کے ایک بنڈل سے میز کو بجاتے ہوئے بتایا۔

سلیم شیرازی اپنی زندگی کی تلخ کہانی اور اپنے مسائل وکیل صاحب سے بیان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ وکیل صاحب کو یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے بھائی کی موت نے درحقیقت ان کا ایک مسئلہ ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ اس قدرتی سانحے کا فائدہ اس کے نقصان سے زیادہ تھا۔ یہ بنگلہ اسے نعمت غیر مترقبہ کے طور پر بڑے مناسب وقت پر ملا تھا۔ آنکھوں میں بہت معمولی سی خرابی کے سبب اسے وقت سے بہت پہلے ریٹائر کر دیا گیا تھا اور اسے پنشن اتنی کم ملتی تھی کہ وہ زندگی بھر نعیمہ کو ایک گھر فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بھائی کی غیر متوقع موت نے انہیں ایک چھوٹے سے گھر کا مالک بنا دیا تھا۔ خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ اس چھوٹے سے گھر میں وہ اپنی بڑی بڑی خواہشات کی تکمیل کر سکتے تھے۔

"ہم کل سویرے والی گاڑی سے وہاں کے لئے روانہ ہوں گے" سلیم شیرازی نے وکیل کو بتایا۔ وکیل صاحب نے چند ضروری کاغذات پر دستخط کروانے کے بعد بنگلے کی چابی اس کی طرف بڑھا دی۔ "وکیل صاحب! کیا آپ کو اندازہ ہے کہ میرے بھائی کی موت کس طرح واقع ہوئی؟" سلیم نے اچانک پوچھا۔

"کیوں؟"

"جب میں نے آخری بار انہیں دیکھا تو وہ ہر طرح سے تندرست اور ہشاش بشاش تھے" سلیم نے کہا۔

"احمد نگر سے موصول ہونے والی رپورٹ میں ان کی موت کی وجہ ہارٹ فیل ہونا لکھا ہے۔ وہ دل کے مریض تھے"۔

"لیکن حیرت ہے...... اس بارے میں انہوں نے کبھی مجھے کچھ نہیں لکھا اور پھر وہ تو بیل کی طرح مضبوط تھے" سلیم نے کہا۔

"بیل کا بھی ہارٹ فیل ہو جانا بعید از امکان نہیں ہے"

وکیل صاحب نے ہنس کر کہا۔ پھر کچھ خیال آتے ہی فوراً چہرے پر سنجیدگی اور تاسف طاری کرتے ہوئے بولے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"اگر چہ یہ سانحہ ایک دوسرے صوبے میں رونما ہوا ہے تاہم میں اس علاقے کے ڈاکٹر سے تفصیلی اطلاعات منگوانے کی کوشش کروں گا۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا۔ اس دردانگیز واقعے سے قطع نظر میں ایک بار پھر تم دونوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔"

دونوں نے وکیل صاحب کو آداب کیا۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر اٹھ کر باہر آ گئے۔ نعیمہ نے تازہ ہوا میں گہرا سانس لیا' ان دنوں "احمد نگر" کا موسم یقیناً خوشگوار ہوگا" سلیم نے خیال ظاہر کیا۔ ذاتی گھر کے تصور سے ہی نعیمہ کی سبزی مائل آنکھوں میں بھی چمک سی آ گئی۔

"شیرازی ہاؤس...... واہ کس قدر خوبصورت اور باوقار نام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک خوب صورت رہائش گاہ ہو گی۔" اس نے خوابناک لہجے میں کہا۔

"شیرازی ہاؤس سے کچھ زیادہ توقعات وابستہ نہ کرو تو بہتر ہے۔ کلیم بھائی بہت مختصر وسائل کے آدمی تھے۔ حیرت ہے انہوں نے ایک گھر کیسے بنالیا"

"شیرازی ہاؤس خواہ کس قدر ہی معمولی کیوں نہ ہو تمہیں اس جگہ سے محبت ہونی چاہیے" نعیمہ نے سخت لہجے میں کہا اور سلیم اس تصور سے کسی قدر اداس سا ہو گیا کہ اس جگہ سے اس کے بھائی کی وابستگی رہی ہے۔ وہ بھائی جو اس کی شادی میں بھی شرکت نہ کر سکا تھا۔ شاید یہ قسمت کا فیصلہ تھا کہ کلیم کبھی نعیمہ کو نہ دیکھ سکے۔

انہوں نے وہ رات دارالحکومت کے ایک ہوٹل میں گزاری۔ یہ ہوٹل صدر بازار کی ایک پرسکون گلی میں تھا جہاں انہوں نے خود کو دنیا کے ہنگاموں سے بہت دور اور ایک دوسرے کے بہت قریب محسوس کیا۔ صبح کو سلیم نے تجویز پیش کی کہ ایک دو ہفتے یہاں مزید قیام کیا جائے۔ ان کا کمرہ خوابوں اور ارمانوں کی تکمیل کا طلسم کدہ بن گیا تھا اور ان کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس خوبصورت اور رومان پرور ماحول کو اتنی جلدی خیر باد کہہ دیں۔ لیکن دور مضافاتی علاقے میں ان کا بنگلہ ان کا منتظر تھا۔ جہاں اس سے بھی زیادہ سکون اور تنہائی میسر آنے کی توقع تھی۔ اور جہاں رہنے سے وہ ہوٹل میں ہونے والے اخراجات سے بھی بچ سکتے تھے۔ یوں بھی ان کے لئے سب سے زیادہ اہم چیز پیسہ تھی۔ انہیں ہر قیمت پر پیسہ بچانا تھا۔ اپنے مستقبل کے لئے...... اور اسی لئے خواہش کے باوجود انہوں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور احمد نگر روانہ ہو گئے۔

جب ٹرین نے دارالحکومت سے باہر مغربی علاقے میں سفر شروع کیا تو راستے کی خوبصورتی کا نظارہ کرتے ہوئے سلیم کو احساس ہوا کہ انہوں نے دارالحکومت چھوڑنے کا فیصلہ درست کیا تھا۔ نعیمہ نے بھی وہ رسالہ جو وہ پڑھ رہی تھی بند کر کے کھڑکی سے جھانکنا شروع کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ تھی۔ ہر چند لمحوں بعد وہ مڑ کر ایک نظر سلیم پر بھی ڈال لیتی تھی۔ گہری خاموشی کے باوجود ان کے درمیان باتیں ہو رہی تھیں۔

جب ٹرین احمد نگر پل پر سے گزری تو گاڑی کے پہیوں سے پل پر پیدا ہونے والی گڑگڑاہٹ سے سہم کر نعیمہ نے سلیم کا ہاتھ تھام لیا۔ اسی لمحے ساتھ والی سیٹ پر رکھی ٹوکری میں موجود بلی بھی میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ یہ بلی جس کا نام موتی تھا نعیمہ اپنے ساتھ شیرازی ہاؤس لے جا رہی تھی اس کا خیال تھا کہ گھر چونکہ کافی عرصے سے خالی رہا ہے اس لئے وہاں چوہے وغیرہ ہوں گے جن کا موتی بخوبی صفایا کر دے گی۔

ٹرین لکڑی کے ایک پلیٹ فارم پر رکی جہاں اسٹیشن کی عمارت صرف ایک کمرے پر مشتمل تھی جس پر "احمد نگر" کا بورڈ آویزاں تھا۔ سلیم شیرازی اور نعیمہ پلیٹ فارم پر اتر آئے۔ ان کے اترتے ہی گاڑی چل پڑی اور جلد ہی بل کھاتی ہوئی پہاڑی سلسلوں میں گم ہو گئی۔ سلیم اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا۔ اس کمرے کے دو حصے کئے گئے تھے۔ ایک حصے میں کھڑکی تھی جو غالباً "بکنگ ونڈو" کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ سلیم نے دوسرے حصے کے دروازے پر دستک دی۔ "کوئی ہے یہاں......؟" اس کی آواز کا جواب دور کسی پرندے کی چیخ نے دیا۔ اس کے بعد پھر وہی بیکراں خاموشی چھا گئی۔ عجیب لاوارث قسم کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نظر نہ آتا تھا۔

نعیمہ پلیٹ فارم پر کھڑی ہو کر اسٹیشن سے قصبے کو جانے والی سڑک پر نظریں دوڑانے لگی۔ یہ تنگ سی سڑک بھی راستے میں نظر آنے والی دوسری سڑکوں کی طرح پہاڑیوں کے گرد بل کھاتی ہوئی غائب ہو جاتی تھی۔

"جانم! ہمیں غالباً قصبے تک پیدل چلنا پڑے گا" سلیم شیرازی نے مایوسی سے کہا۔

"کیا قصبہ یہاں سے کافی دور ہے؟" نعیمہ نے پوچھا۔

سلیم نے جیب سے نقشہ نکال کر دیکھا...... "ہاں...... کئی

میل دور" اس نے بتایا۔
"لیکن سامان کا کیا ہوگا؟"
"مجبوری ہے اسے یہیں چھوڑنا پڑے گا" سلیم نے جواب دیا۔ انہوں نے صندوق وغیرہ ایک طرف شیڈ میں رکھ دیئے۔ "گاؤں پہنچ کر اسے منگوالیں گے۔" سلیم نے کہا۔
نعیمہ نے بلی والی ٹوکری اٹھالی اور سلیم نے نہایت ضروری سامان کا ایک ہلکا سا صندوق۔ پھر دونوں گاؤں کی طرف چل پڑے۔ راستے میں بھی انہیں کوئی شخص چلتا پھرتا یا کوئی سواری نظر نہیں آئی۔ حتیٰ کہ کھیتوں میں بھی کوئی کام کرنے والا نہیں ۔ یہ ویرانی سلیم کی رگ و پے میں رچی جارہی تھی۔ حالانکہ وئی تو ہم پرست آدمی نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں سر پر چمکتے رج کے باوجود اسے اپنی ہڈیوں میں سردی کی لہریں دوڑتی ئی محسوس ہورہی تھیں۔
جب وہ دو پہاڑیوں کے گرد موڑ کاٹ چکے۔ تب سورج روشنی میں خاصے فاصلے پر کوئی چیز سونے کی طرح چمکتی ئی دکھائی دی۔ یہ دو تین فرلانگ کے فاصلے پر واقع مسجد کا رتھا جس پر کسی بہت عقیدت مند نے سنہرا رنگ پھیر دیا ۔ نعیمہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ منزل اب بالکل سامنے ا۔
"چلو بھئی ذرا پانچ منٹ کو ستالیں" سلیم نے طویل س لے کر کہا۔ اور ذرا سا ستانے کے لئے قبرستان کی ار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ یہی وہ قبرستان تھا جہاں اس کا ئی کلیم دفن تھا۔ چند لمحے کے بعد وہ قبرستان میں داخل ئے۔ ایک قبر ابھی تازہ تھی۔ زمین کے سینے پر کسی گھاؤ کی ح۔ ابھی اس کی سطح سخت نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس پر کتبہ ب ہوا تھا۔ لیکن سلیم کو پورا یقین تھا کہ اسی قبر کی تہہ میں اس ھائی ابدی نیند سورہا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے قبر کے قریب کھڑے رہے۔ لفظوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔
"جانے بھائی جان اچانک کس طرح مر گئے؟" یہ سوال سلیم کے ذہن میں رنج اور دکھ سے زیادہ چبھ رہا تھا۔
سورج غروب ہونے والا تھا۔ اس لئے وہ دونوں تھکے تھکے قدموں سے آگے چل پڑے۔ بستی شروع ہونے سے پہلے ڈھلان کے آخر میں ایک چائے خانہ تھا۔
"میں اندر جاکر شیرازی ہاؤس کا "محل وقوع" معلوم کرتا ہوں۔ اور شاید یہیں سے سامان منگوانے کا بھی کچھ بندوبست ہوسکے۔ تم یہیں ٹھہرو اور ہاں کسی اجنبی سے بات کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" سلیم نے کہا اور چائے خانے کی طرف بڑھا۔ نعیمہ باہر ہی کھڑے ہوکر سورج کی الوداعی کندنی کرنوں کا نظارہ کرنے لگی۔
سلیم اندر داخل ہوگیا۔ کمرہ نیچی چھت کا تھا اور اس کی دیواریں دھوئیں سے سیاہ پڑ چکی تھیں۔ سلیم نے نیم تاریکی میں ادھر ادھر دیکھا۔ چند لوگ ٹوٹی پھوٹی میزوں کے قریب بیٹھے تھے۔ موسم کی حدت سے جھلسے ہوئے چہرے والا ایک بوڑھا شخص پاؤں گھسیٹتا ہوا ایک کونے سے نکل کر سلیم کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ سلیم اس سے کچھ پوچھتا چائے خانے میں موجود لوگوں نے اٹھ اٹھ کر باہر جانا شروع کردیا۔ چند لمحوں میں چائے خانہ بالکل خالی ہوگیا۔ دفعتاً چائے خانے کے عقبی دروازے سے چوڑے چکلے شانوں والا ایک بھاری بھرکم آدمی اندر داخل ہوا اور کاؤنٹر کے پیچھے آ گیا۔ جہاں سلیم کھڑا تھا۔
"تم نے سب لوگوں کو بھگا دیا....." چوڑے شانوں والے نے ناگوار لہجے میں کہا۔
"مجھے افسوس ہے لیکن میں نے ایسی تو کوئی حرکت نہیں کی تھی جو انہیں یہاں سے جانے پر مجبور کردیتی" سلیم نے کہا۔ تھکا دینے والے ٹرین کے سفر، ویران ریلوے سٹیشن اور گرد آلود راستے کے تجربوں کے بعد یہ عجیب وغریب استقبال سلیم کے لئے بہت تکلیف دہ بھی تھا اور حیران کن بھی۔
"میں یہاں اجنبی ہوں" سلیم شیرازی نے صلح کن لہجے میں کہا۔ وہ اس اجنبی جگہ پر جلد از جلد چند لوگوں سے تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا۔
"تبھی سب لوگ چلے گئے ہیں۔ وہ اجنبیوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے۔ بہرحال پسند تو وہ مجھے بھی نہیں کرتے لیکن میں تیس سال سے یہاں ہوں"
"میں کلیم شیرازی کا بھائی ہوں" سلیم نے بتایا۔
"اوہ کلیم شیرازی! وہ تو مر چکے ہیں"
"ہاں...... مجھے معلوم ہے۔ میرا نام سلیم شیرازی ہے"۔
موٹا تازہ آدمی پہلے کسی قدر ہچکچایا۔ پھر کاؤنٹر کا تختہ ہٹا کر قریب آ گیا۔ "تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ میرا نام رحمان ہے" اس نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں کچھ زیادہ خوشگوار انداز میں خوش آمدید نہیں کہا لیکن

خیر۔

"اب تم آئے ہو تو تمہیں ایک پیالی چائے پی لینی چاہیے۔" رحمان کا انداز اب مکمل دوستانہ ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے چائے کی ایک پیالی بھر کر اس کی طرف بڑھائی۔ سلیم کو شدید پیاس لگی تھی لیکن وہ باہر نعیمہ کو زیادہ دیر انتظار میں کھڑا رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"پہلے یہ پی لو، پھر جاؤ...... میں خود تمہیں زیادہ دیر روکنا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے اپنے گاہکوں کی ضرورت ہے......" رحمان نے کہا۔

سلیم نے ایک سانس میں پیالی خالی کر دی۔

"تمہارے بھائی کی موت کا مجھے افسوس ہے" رحمان نے کہا۔ "میرے خیال میں تم بنگلے کے سلسلے میں آئے ہو گے"

"ہاں"

"کیا تم وہاں رہنا چاہتے ہو؟"

"کیا کوئی ایسی وجہ ہے کہ میں وہاں نہیں رہ سکتا؟" سلیم نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اسے فروخت کر کے چلا جاتا"۔

"لیکن کیوں...... میرا بھائی بھی تو وہیں رہتا تھا"

"اور وہیں وہ مر گیا"

تب سلیم نے دوبارہ اپنے تکلیف دہ سفر اور اپنی بڑی بڑی خواہشوں کے متعلق سوچا۔ اس نے اپنے ذاتی گھر کے خواب کی تکمیل کے لئے اس قدر تکلیف اٹھائی تھی اور یہاں کا دیہاتی، سادہ سا ماحول اسے ترغیب دے رہا تھا کہ اس پرفضاء مقام پر زندگی بسر کرنا خاصا خوشگوار ہے۔ وہ محض یہاں کے فرسودگی پسند لوگوں کی وجہ سے واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔

"مجھے امید ہے کہ ہم اس گھر کو سجانے اور سنوارنے کے بعد وہاں ایک پرسکون زندگی گزار سکیں گے" سلیم نے کہا۔

"ہاں شاید" رحمان نے کہا۔

"میری بیوی بھی میرے ساتھ ہے"

کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔

"کیا تم بنگلے تک میری رہنمائی کر سکتے ہو......؟" بالآخر سلیم نے یہ سکوت توڑا۔

تم آسانی سے اسے ڈھونڈ لو گے۔ "شیرازی ہاؤس" دو میل بعد سڑک کے اختتام پر بائیں جانب ایک پہاڑی پر واقع ہے"

"اوہ مزید دو میل......" یہ سن کر ہی سلیم کا دل ڈوب گیا۔ لیکن اب وہ واپس جانے کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کیا کوئی چھکڑا نہیں مل سکتا کہ ہم اسٹیشن سے اپنا سامان منگوا سکیں...... ہم کرایہ ادا کر دیں گے"

"بے شک تم کرایہ ادا کر سکتے ہو مگر یہاں کوئی بھی کسان اسٹیشن تک نہیں جائے گا" رحمان نے چائے کی پیالی دھوتے ہوئے کہا۔

سلیم نے اب بھی اپنی مستقل مزاجی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا اور باہر آ گیا۔ نعیمہ سبزے کی ایک روش پر بیٹھی تھی۔

"یہ تو معلوم ہو گیا کہ بنگلہ کہاں ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہاں تک بھی پیدل چلنا پڑے گا" سلیم نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ نعیمہ نے خاموشی سے ہلکی والی ٹوکری اٹھائی اور وہ دونوں آگے چل دیئے۔ یہ بستی جس پر سے وہ گزر رہے تھے ایک اجاڑ اور غیر مہذب سی بستی تھی۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف لمبی لمبی جھاڑیاں اور گھاس پھونس پھیلا ہوا تھا۔ جو پھیلتے اندھیرے میں اپنا سبز رنگ کھو رہا تھا۔ سورج ڈوبنے کے خدشے سے سلیم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ تھوڑے سے احتجاج کے بعد نعیمہ بھی تیز تیز چلنے لگی۔ بالآخر وہ پہاڑی کے قریب پہنچ گئے...... بنگلہ قدرے بلند پر درختوں کے درمیان واقع تھا۔

"آخر کار ہم پہنچ ہی گئے......" سلیم نے طویل سانس لی جو تھکن سے بوجھل تھی۔

"گھر تو بالکل میرے خیالوں کے مطابق ہے" نعیمہ نے دور سے بنگلے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ سلیم کو یقین نہیں تھا کہ بنگلہ واقعی نعیمہ کے خیالوں کے مطابق ہے۔ غالباً وہ اس کی دلجوئی کے خیال سے ایسا کہہ رہی تھی۔ بنگلے کے قریب پہنچتے پہنچتے وہ بچوں کی طرح خوشی سے دوڑنے لگے۔

بنگلے کے دروازے پر گلاب کے پودے تھے جن پر پھول اور کلیاں مہک رہی تھیں۔ یہاں ہوا بھی قدرے خوشگوار اور بنگلے پر ویرانی کا راج تھا۔ اس کے باوجود وہ انہیں خوش آمدید کہہ رہا تھا اور یہ استقبال راستے کی دشواریوں کے بعد خاصا سہانا تھا۔ سلیم نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا اور دروازے کو دھکیلا۔ معمولی سی مزاحمت کے بعد دروازہ چرچرا کر کھل گیا۔ کمرے کے اندر سامان اور فرنیچر کی حالت دیکھ کر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

انہیں ایک لمحے کے لئے رک جانا پڑا...... ایک میز الٹی پڑی تھی اور اس کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کرسیاں بھی ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ کھڑکوں کے پردے تار تار تھے۔ میز پوش پھٹا پڑا تھا۔ دیوار گیر الماری کے دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ سلیم نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اگلی دیوار کے قریب چولہا الٹا پڑا تھا۔ اس کا ڈھکن کھلا تھا اور قالین پر دھوئیں کی سیاہی جمی ہوئی تھی۔ تمام برتن ریزہ ریزہ ہوئے پڑے تھے۔

اگلے کمرے سے تنگ سیڑھیاں نیم دائرے کی شکل میں خوابگاہ تک جا رہی تھیں۔ سلیم نے باقی ماندہ جگہ کا معائنہ وہیں کھڑے ہو کر کر لیا۔ پھر وہ اور نعیمہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ مدھم روشنی میں سلیم نے نعیمہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ "جانم!" اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "مجھے واقعی افسوس ہے" بلاشبہ اس بدترین استقبال پر اسے نعیمہ سے معذرت طلب کرنی چاہیے تھی۔ یقیناً یہاں آنے کی بہتر صورت یہ ہوتی کہ پہلے وہ خود یہاں آ کر چند ضروری کام نمٹا جاتا اور پھر نعیمہ کو لے کر یہاں آتا۔ لیکن اس کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ تو جلد از جلد "شیرازی ہاؤس" پہنچ کر از سر نو زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ فوج سے ریٹائرمنٹ نے اس کی زندگی کو بہت ویران کر دیا تھا اور اسی لمحے وہ ایک نئے قصبے میں بسنے کے خیال سے بہت خوش تھا۔ اس نے فوراً احمد نگر کا رخ کیا تھا۔

نعیمہ نے اس سے علیحدہ ہو کر آستینیں چڑھائیں اور بیگ سے برش نکال کر زمین پر بیٹھ گئی۔ "ہمارے گھر کو صفائی کی ضرورت ہے" اس نے کہا۔ سلیم کو اس کے رویے سے بے حد مسرت ہوئی۔ اور اپنے معذرت خواہانہ الفاظ کو بھول کر جیکٹ اتار کر وہ بھی صفائی کے لئے تیار ہو گیا۔ وہاں انہیں ایک آئل لیمپ بھی مل گیا۔ توڑ پھوڑ مچانے والے کی نظر غالباً اس پر نہیں گئی تھی۔ اس لئے اس کا شیشہ محفوظ تھا۔ نعیمہ صفائی کرنے لگی اور سلیم ان چیزوں کو ٹھونکنے پیٹنے لگا جو معمولی مرمت سے کسی حد تک قابل استعمال ہو سکتی تھیں۔ ایک گھنٹے میں انہوں نے خاصا کام نمٹا لیا۔

"میں اب چائے خانے میں جا کر ضرورت کی چند چیزیں خریدنے کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہوں۔ سامان منگوانے کے لئے بھی ایک کوشش اور کر دیکھوں...... اور میرا خیال ہے مجھے یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ آخر بنگلے کا ساز و سامان کس نے اس قدر بیدردی سے برباد کیا ہے" سلیم نے کہا۔

"تم جاؤ ضرور...... لیکن خدارا اس اجنبی جگہ پر کسی سے لڑنے جھگڑنے کی کوشش نہ کرنا" نعیمہ نے اسے سمجھایا۔

"میں احتیاط کروں گا" سلیم نے کہا اور جیکٹ پہن کر باہر نکل گیا۔ رات سرد تھی لیکن وہ اپنی دھن میں مگن تھا۔ اسے راستے بھولنے کا خطرہ بھی نہیں تھا کیونکہ فوج میں ملازمت کی بدولت سمتوں کے تعین کی حس اس میں خاصی تیز تھی۔

چائے خانے کی کھڑکیاں اب روشن تھیں اور اندر سے قہقہوں اور باتوں کی بلند آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔ لیکن جیسے ہی سلیم اندر داخل ہوا وہاں پھر وہی پہلے کا سا سناٹا چھا گیا جس کا تجربہ سلیم کو ایک مرتبہ پہلے بھی ہوا تھا۔ اس نے چائے خانے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ وہ سب اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہے۔

"کسی شخص نے میرے بھائی کے بنگلے کا سارا سامان تباہ کر دیا ہے"۔ سلیم نے اس ناگوار سکوت کو توڑا۔ وہ جواب کا انتظار کرتا رہا مگر سب یونہی بیٹھے رہے جیسے کسی نے اس کی بات سنی ہی نہ ہو یا اس نے کوئی غیر ملکی زبان بولی ہو۔

"میں یہاں اجنبی ہوں" سلیم نے نرمی سے کہا۔ "اور میں چاہتا ہوں کہ انسانیت کے ناتے مجھ سے دوستانہ سلوک کیا جائے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم سب لوگ مجھے دشمن تصور کرتے ہو۔ اگر تم میں سے کسی شخص کا میرے بھائی سے جھگڑا تھا تو وہ سامنے آ جائے۔ اس کا فیصلہ رسم و رواج کے مطابق کیا جا سکتا ہے"

دفعتہً رحمان ایک گوشے سے نمودار ہوا۔ وہ غالباً اب تک کی صورت حال سے لاعلم تھا۔ "آؤ بھائی سلیم شیرازی۔ میں نے تمہارا سامان منگوا لیا ہے۔ بوڑھا خلیل خان اسے اسٹیشن سے لے آیا ہے" اس نے ایک خمیدہ کمر بوڑھے کی طرف اشارہ کیا جو چمنی کے پاس بیٹھا تھا۔ "تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اسے کس قدر زحمت ہوئی ہوگی"

اس سے پہلے کہ سلیم بوڑھے خلیل خان کا شکریہ ادا کرتا۔ وہ غصیلے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے کچھ دیر پہلے کئے ہوئے سوال کے جواب میں بولا۔

"ہم میں سے کسی نے تمہارے بنگلے کے ساز و سامان کو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہاتھ نہیں لگایا۔"

"تب آخر وہ کس طرح برباد ہو گیا۔" سلیم نے پوچھا۔

"یہ مجھے معلوم نہیں...... میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ گاؤں کے لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں کر سکتا اور میں ایسے آدمی کا کوئی کام کرنا قطعاً پسند نہیں کرتا جو الزام تراشی کرتا ہو۔"

بوڑھا خلیل خان مزید ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد سلیم کاؤنٹر کی طرف بڑھا جہاں رحمان موجود تھا۔ "دیکھو تم نے دوبارہ میرا چائے خانہ خالی کر دیا ہے۔ لگتا ہے تم میرے کاروبار کا بیڑا غرق کر دو گے۔" رحمان نے کہا۔

سلیم نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ "اس میں میرا کیا قصور...... میں بھی تمہارا گاہک ہوں۔ ایک پیالی چائے مجھے دو۔ اور ہاں ایک پیالی میری طرف سے تم خود پی لو۔"

رحمان نے اس کی پیشکش تو قبول کر لی لیکن اپنے چہرے سے کوئی خوشگوار تبدیلی ظاہر نہیں ہونے دی۔ مگر اس کی پروا کئے بغیر اپنے اصل موضوع پر آ گیا۔

آخر بنگلے کا سامان کس نے تباہ کر دیا۔" اس مرتبہ اس نے رحمان سے پوچھا۔

"میں ان دیہاتیوں کی عادت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ اس بنگلے میں گھسنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔ خصوصاً تمہارے بھائی کی موت کے بعد...... یہ غالباً خانہ بدوشوں کی حرکت ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ یہاں کھانے پینے کی چیزوں کے لئے کوئی دکان ہے......؟" سلیم نے پوچھا۔

"کیا تم دارالحکومت سے اپنے ہمراہ کچھ نہیں لائے؟"

"افسوس کہ میں نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا کیونکہ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ میرا واسطہ کس قسم کی بستی سے پڑنے والا ہے۔"

"تب شاید تمہیں تقریباً چوبیس گھنٹے محض دھول پھانکنی پڑے۔ یہاں پیچھے کی طرف ایک پنساری کی دکان ہے وہاں دیکھ لو۔ شاید خوش قسمتی سے کچھ چیزیں موجود ہوں۔ میں تمہیں اپنا چھکڑا دیتا ہوں۔ اپنا سامان بھی لیتے جاؤ۔ کیا تم گھوڑے کو ہانک لو گے؟"

"میرا خیال ہے میں ہانک لوں گا......"

"یہ ایک مریل سا گھوڑا ہے۔ اسے زیادہ مارنا مت۔ میں تمہیں ایک لالٹین بھی دیئے دیتا ہوں" اس سے پہلے کہ سلیم کوئی سوال کرتا رحمان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ"۔

☆..........................☆

سلیم کے واپس آنے سے پہلے نعیمہ نے ممکن حد تک گھر کی حالت بدل لی تھی۔ تاہم تباہی اور بربادی کے بعض پختہ نقوش ابھی تک برقرار تھے اور ساز و سامان میں کوئی خاص ترتیب پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے کپڑے نہایت گندے ہو چکے تھے لیکن سامان آنے سے پہلے وہ لباس بھی تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔ اس تمام تر بدحالی کے باوجود اسے خوشی تھی۔ اپنے ذاتی گھر کی خوشی! گھر...... یہ لفظ اس کے نزدیک دنیا بھر کے لفظوں سے خوبصورت تھا۔

نعیمہ نے سیاہ کیتلی اٹھائی اور پانی لینے نیچے نل کی طرف چل دی۔ جب وہ باہر نکلی تو گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چاند پہاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا تھا اور جھاڑیوں کے صرف تاریک سائے نظر آ رہے تھے۔ پانی کا نل گھر کے سامنے ہی تھا۔ اس نے کیتلی بھری اور واپس آنے لگی۔ دفعتہً اس نے گھر کے دروازے کے قریب ایک سائے کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ وہیں رک گئی۔ "سلیم" اس نے پھنسی پھنسی خوف زدہ آواز میں پوچھا۔

سائے نے لنگڑاتے ہوئے آگے قدم بڑھایا۔ اس کے قدموں کی آہٹ اس کے وجود سے زیادہ دہشت انگیز تھی۔

"کون ہو تم......؟" نعیمہ تقریباً کانپنے لگی۔

"میرا نام ڈاکٹر امجد ہے......" سائے نے پرسکون لہجے میں کہا...... "شاید تمہیں علم ہو۔ میں یہاں نزدیک ہی رہتا ہوں۔ اس بنگلے کے عقب میں...... پہاڑی کے دوسری طرف۔"

"نہیں...... ہمیں کوئی علم نہیں۔" نعیمہ نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں...... یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔" نووارد نے اسی پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ اس سے زیادہ اطمینان کے ساتھ وہ گھر کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ "میں کسی کی تلاش میں ہوں مسز سلیم!" اس کے چہرے سے کرختگی نمایاں تھی۔

"کیا تم نے کسی کو یہاں دیکھا ہے؟"

"نہیں......" نعیمہ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی کہ شاید

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وہ ایک طرف ہٹ کر اس کے لئے راستہ چھوڑ دے گا لیکن وہ اس سے پہلے ہی گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ کمرے میں اس طرح ادھر ادھر مرمت شدہ فرنیچر اور پردوں کے پیچھے دیکھ رہا تھا گویا کوئی وہاں چھپا بیٹھا ہو۔

نعیمہ نے کیتلی نیچے رکھ دی۔ "ڈاکٹر امجد کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے"۔

دفعتہً ڈاکٹر امجد نے نعیمہ کی جانب بڑی غمناک نظروں سے دیکھا۔ "بدقسمتی سے مجھے اس بات کا کوئی تجربہ نہیں کہ ہر شخص سچ ہی بولتا ہے۔ مسز سلیم میری اپنی بیٹی بھی اکثر مجھ سے جھوٹ بولتی ہے۔" اس کا لہجہ دکھ سے بوجھل تھا۔

"تو...... کیا تم اپنی بیٹی کی تلاش میں ہو؟" نعیمہ نے کسی قدر نرمی سے پوچھا۔

"ہاں...... وہ میرے لئے ایک مصیبت بن گئی ہے"

"اگر وہ مجھے نظر آئی تو میں ضرور اسے بتادوں گی کہ تم اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔" نعیمہ نے ہمدردی سے کہا۔

"یہ تو اسے خود ہی معلوم ہو جائے گا" اس نے تھکے تھکے انداز میں کندھے جھٹکے۔ "بہرحال میں معذرت خواہ ہوں مسز سلیم"

"تمہیں میرے نام کا علم کیسے ہوا جب کہ میں اور میرا شوہر ابھی چند گھنٹے قبل یہاں آئے ہیں" نعیمہ نے چونک کر پوچھا۔

"اگرچہ میں گاؤں والوں کی مصروفیات میں حصہ نہیں لیتا لیکن حالات کا مجھے علم رہتا ہے۔ اور میری قوت مشاہدہ بھی خاصی بہتر ہے۔"

"کیا تم میرے شوہر کے بھائی کلیم شیرازی کو جانتے ہو......؟" نعیمہ نے اچانک پوچھا۔

ڈاکٹر امجد ہچکچایا۔ "نہیں...... مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا......"

"ان کی موت یہاں حال ہی میں واقع ہوئی ہے"

"ہاں...... مجھے ان کی موت کا علم ہے"

"کیا تمہیں معلوم ہے ڈاکٹر کہ وہ کیسے ہلاک ہوئے؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"میرا خیال ہے وہ تمہارے ہی زیر علاج تھے"

"میرے زیر علاج......؟" ڈاکٹر پریشان سا ہو گیا۔ پھر وہ بڑے بردبارانہ انداز میں مسکرایا۔

"نہیں مسز سلیم...... وہ کبھی میرے زیر علاج نہیں رہا۔ شب بخیر پھر ملاقات ہو گی......" اس نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ نعیمہ دروزے میں کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ رات کے اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ واپس پلٹی۔ کمرہ باہر کی نسبت خاصا گرم تھا۔ نعیمہ نے تنہائی کا خوف ذہن سے جھٹکنے کیلئے ادھر ادھر کی باتیں سوچنا شروع کر دیں۔

صبح وہ اور سلیم مل کر ڈاکٹر امجد کا گھر تلاش کر لیں گے۔ شاید اس کی بیٹی اچھی دوست ثابت ہو سکے۔ اس کے علاوہ بھی وہ آس پاس کے لوگوں سے دوستی بڑھانے کی کوشش کریں گے...... وہ خریداری اور سیر و تفریح کے لئے باہر جایا کرے گی۔ لوگوں سے میل جول بڑھائے گی۔ اور اس قصبے کی عورتوں سے تعلقات پیدا کر کے اپنی تنہائی کو دور کرے گی۔

پھر وہ دعا کرنے لگی کہ سلیم جلد گھر آ جائے۔

☆......☆

گھوڑا بوڑھا تھا مگر مشقت پسند تھا۔ وہ اس کہنہ مشق مسافر کی طرح جسے راستے کے نشیب و فراز کا بخوبی علم ہو اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ سلیم نے مطمئن ہو کر باگیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ رات خاموش اور تاریک تھی۔ کبھی کبھار کوئی نرم پتھر پہیوں تلے آ کر چیخ جاتا یا پھر قصبے میں کوئی کتا بھونک اٹھتا۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی آواز نہ تھی جو رات کے سناٹے کو مجروح کر سکتی۔

اچانک گھوڑا رک گیا اور منہ اٹھا کر اس طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے کوئی آواز سننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سلیم کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ دور کہیں مدھم سروں میں ایک اجنبی سی طرز کی موسیقی ابھر رہی تھی۔ یہ موسیقی نہ تو مشرقی تھی اور نہ مانوس معلوم ہوتی تھی۔ اس دور دراز علاقے میں یہ اجنبی موسیقی حیران کن تھی۔

سلیم خاموش بیٹھا رہا۔ موسیقی کی لہریں رفتہ رفتہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ موسیقی رقص کی معلوم ہوتی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر غیر مانوس تھی۔ دفعتہً ایک کتے نے نہیں بڑے خوف زدہ انداز میں بھونکنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی

گھوڑے نے بھی زمین پر ٹاپیں مار کر ہنہنانا شروع کر دیا۔ یکبارگی وہ پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور سلیم چھکڑے سے نیچے جا گرا۔ یہ سب کچھ خوف زدہ کر دینے والی باتیں تھیں لیکن سلیم اپنے آپ کو سنبھال کر بڑی حوصلہ مندی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی وہ کچھ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ کوئی شخص اس پر جھپٹا۔ اور اس کے دونوں کندھے گرفت میں لے کر اسے نیچے گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن سلیم کو قابو میں کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس نے ایک جھٹکے میں حملہ آور کو نیچے گرا دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا اس کا گلا دبوچ لیا۔ دونوں کچھ دور تک زمین پر لڑھکتے چلے گئے۔ جھاڑیوں سے آگے جہاں چاندنی پہنچ رہی تھی۔ سلیم نے زرد روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والا ایک خوبصورت مگر شکستہ حال چہرہ تھا۔ حادثات زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو جانے والے بدقسمت شہزادوں کا سا۔ سلیم نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی کیونکہ اس کے اندازے کے مطابق اس نوجوان نے حملہ تو ضرور کیا تھا مگر وہ کوئی خطرناک شخص معلوم نہیں ہوتا تھا۔

"کتنے خطرناک آدمی ہو تم...... مجھے مارنے ہی لگے تھے"۔ نوجوان نے اس کی گرفت سے نکل کر کہا۔ اپنے انداز گفتگو سے وہ بالکل احمق نظر آتا تھا۔

"میں تمہیں مارنے لگا تھا یا تمہارا ارادہ مجھے مار ڈالنے کا تھا" سلیم نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "اب تم مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو۔ اور مجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟"

"میں نے اپنا دفاع کیا تھا" نوجوان نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے کہا۔ اس جواب سے سلیم نے اندازہ لگایا کہ وہ پاگل نہیں تو نیم پاگل ضرور ہے"

"میں پوچھتا ہوں تم ہو کون؟" سلیم نے سختی سے کہا۔

"ہا...... ہا...... ہا...... تم مجھے نہیں جانتے۔ حالانکہ میں تمہیں جانتا ہوں...... تم کلیم شیرازی کے بھائی ہو...... کلیم جسے ان لوگوں نے قتل کر دیا جس طرح دوسرے بہت سے انسانوں کو قتل کیا ہے...... میرا نام محمود ہے۔ لوگ مجھے پاگل محمود کہتے ہیں" نوجوان کا جواب بے ربط تھا۔

"قتل کر دیا" سے تمہاری کیا مراد ہے؟" سلیم سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا تمہیں علم نہیں کہ وہ مر چکا ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"وہ تو مجھے علم ہے لیکن قتل......"

"یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ کتنے آدمیوں کی شرارت تھی" محمود نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"لیکن وہ تھے کون......؟"

"میں نہیں جانتا لیکن تم ان کی آوازیں سن سکتے ہو" محمود نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ اس کی باتیں ایسی تھیں کہ اس کی تمام تر دیوانگی کو نظر انداز کر کے سلیم بھی خاموش ہو کر کان لگا کر کوئی انجانی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہاں کوئی آواز نہ تھی۔ سوائے اس مدھم مدھم اجنبی موسیقی کے جو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی اور بالآخر وہ بھی معدوم ہو گئی۔

سلیم نے محسوس کیا کہ اب وہ زیادہ دیر اس سناٹے میں اس دیوانے سے مغز نہیں کھپا سکتا اس لئے وہ جانے کے ارادے سے چھکڑے کی طرف مڑا۔

"سنو......" محمود نے اسے روک لیا" کیا تم مجھے ایک پیالی چائے اور بسکٹ کھلا سکو گے؟" اس نے بڑے ملتجیانہ لہجے میں پوچھا۔ اس کے شکستہ حال چہرے کے ہر نقش سے بھوک جھانک رہی تھی۔ اس لمحے وہ سلیم کو بے حد قابل رحم محسوس ہوا۔

"آؤ...... میرے ساتھ آ جاؤ۔ تم ہمارے پہلے مہمان ہو گے"

"مہمان؟"

"ہاں...... میں اور میری بیوی تمہارے میزبان ہوں گے"

محمود کا کملایا ہوا چہرہ کھل گیا۔ اور وہ بڑی سعادت مندی سے اس کے ساتھ چھکڑے پر آ بیٹھا۔ پانچ منٹ کے سفر کے بعد سلیم اپنی دنیا تک واپس پہنچ گیا۔ نعیمہ نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ اندر آ کر سلیم نے محمود کا تعارف نعیمہ سے کروایا۔ نعیمہ انہیں کمرے میں بٹھا کر سامان لے کر ان کے لئے کھانا بنانے کچن میں چلی گئی۔

کھانے کی میز پر محمود بغیر کسی تکلف کے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اور نعیمہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتی رہی۔ نہ جانے وہ بے چارہ کب سے بھوکا تھا۔

"اچھا تو محمود......" سلیم نے کھانا ختم کرتے ہوئے بات شروع کی۔

"کھانا بہت عمدہ تھا" محمود نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔

"ہم انتظار کر رہے ہیں کہ تم ہمیں کچھ حقائق بتاؤ گے۔"

سلیم نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اچھا......" محمود نے اس انداز سے کہا گویا اسے اس بات سے مایوسی ہوئی ہو کہ سلیم ابھی تک اصل موضوع کو نہیں بھولا۔

"نعیمہ صاحبہ کیا اور چائے مل سکے گی؟"

نعیمہ نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھانی چاہی لیکن سلیم نے اسے روک دیا...... "نہیں...... جب تک تم ہمیں وہ باتیں نہیں بتاؤ گے جو تمہیں معلوم ہیں، اس وقت تک چائے نہیں ملے گی......"

محمود نے برا سا منہ بنایا اور سنجیدہ ہو کر بیٹھ گیا۔ "کیا پہلے میں تمہیں اپنے متعلق کچھ بتاؤں...... لیکن نہیں۔ اس کی بھلا کیا اہمیت ہے" اس نے پردرد لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "لیکن شاید اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے کہ جو کچھ میں بتاؤں گا وہ کوئی فرضی کہانی نہیں ہوگی"

"ہاں...... ہاں، تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہتے جاؤ" نعیمہ نے اس کی ہمت افزائی کی۔

"شکریہ......لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں اور آپ بھی سمجھ رہے ہوں گے۔ کیونکہ میں اکثر اوقات بے تکی باتیں کرتا رہتا ہوں۔ دراصل اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے نہ جانے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ میں شاید اداکاری کرتا ہوں لیکن درحقیقت میں بے حس اور دنیا کے معاملات سے بے نیاز نہیں ہوں۔ میں بہت حساس ہوں اور ہر اچھائی اور برائی کو بھی سمجھتا ہوں"۔ اس کا سر میز پر جھک گیا اور کچھ توقف کے بعد اس نے آہستگی سے کہا "یہ جگہ برائیوں کا گھر ہے۔"

سلیم نے نعیمہ کی طرف دیکھا۔ وہ محمود کی گفتگو انہماک سے سن رہی تھی لیکن اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

"یہاں برائیوں اور شیطانی طاقتوں نے ڈیرے ڈال لئے ہیں لیکن دس سال پہلے جب میں یہاں آیا تھا اس وقت یہ ایک اچھی جگہ تھی۔ یہاں کے لوگ خداترس اور مہربان تھے۔ اس وقت میری عمر شاید پندرہ سال تھی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

"پھر وہ تشدد پسند لوگ یہاں آ گئے"

"کون لوگ آ گئے......؟" سلیم نے چونک کر پوچھا۔

"پلیز مجھے بات کرنے دو۔" محمود نے ہاتھ اٹھا کر کہا...... اور دوبارہ اپنی داستان حیات کی طرف آ گیا۔

"میرے والدین کو مجھ سے بڑی امیدیں تھیں۔ وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے میری تعلیم کیلئے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا ہوا تھا۔ لیکن میں انتہائی نالائق ثابت ہوا۔ میں پڑھنے لکھنے کا سارا وقت مضافات میں آوارہ گردی کر کے گزارتا تھا"۔ بیتے دنوں کی یادوں نے اس کے چہرے پر معصوم سی خوشی کی چمک بکھیر دی تھی۔ اس نے ایک نظر کمرے میں چاروں طرف دیکھا اور جلد ہی اس کے چہرے پر اداسی لوٹ آئی۔

"لیکن اب میں یہ سب کچھ بھول چکا ہوں۔" اس نے گویا خود سے مخاطب ہو کر کہا۔ سلیم بے چین تھا کہ وہ اصل موضوع کی طرف آئے۔ کمرے پر مکمل سکوت طاری تھا۔ دفعتہً سڑک کی طرف سے چند مدھم مدھم سی آوازیں سنائی دیں۔ سلیم نے توجہ سے سننے کی کوشش کی۔ یہ اسی موسیقی کی آواز تھی جو سلیم نے راستے میں سنی تھی۔

"خاتون...... کیا تم یہ آوازیں سن رہی ہو؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں نعیمہ سے پوچھا۔ نعیمہ نے دور سے آتی ہوئی اجنبی سی موسیقی کی مدھم آواز سنی اور نہ جانے کیوں اس کے جسم میں سردی کی لہر سی دوڑ گئی۔ "یہ کس قسم کی موسیقی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"موت کی موسیقی ہے؟" محمود نے جواب دیا۔

"کیا مطلب......؟"

"میں نے یہ موسیقی اس رات سنی تھی جب تمہارے بھائی کی موت واقع ہوئی تھی۔" محمود نے ہزیانی سے انداز میں کہا اور تیزی سے اٹھ کر باہر جانے کے لئے لپکا۔

"تم پوری بات بتائے بغیر نہیں جا سکتے۔" سلیم نے اسے پکڑ لیا۔ محمود کے چہرے پر ایسا اذیت ناک کھنچاؤ پیدا ہو گیا جیسے کوئی غیبی طاقت اسے باہر کی طرف کھینچ رہی ہو۔ اور سلیم کے پکڑ لینے سے اس کی جان ایک مہلک کشمکش میں مبتلا ہو گئی ہو۔ سلیم نے گھبرا کر اپنی گرفت نرم کر دی اور محمود شور مچاتا ہوا خود کو چھڑا کر کمرے سے نکل کر دوڑتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔

"سلیم مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" نعیمہ نے چند لمحے کے سکوت کے بعد کہا۔ سلیم کو افسوس ہو رہا تھا کہ وہ کیوں محمود کو ساتھ لے آیا اور اگر لے ہی آیا تھا تو مکمل بات سنے بغیر اسے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کیوں جانے دیا۔ کلیم کی موت کس طرح واقع ہوئی؟ یہ سوال ابھی اپنی جگہ باقی تھا۔

اگلا دن تھکا دینے والا تھا کیونکہ گزشتہ رات کے واقعات کا بوجھ سلیم کے ذہن پر بدستور تھا۔ نعیمہ کھانا پکانے اور صفائی وغیرہ کرنے میں مصروف ہوگئی اور سلیم بستر پر ہی لیٹا اونگھتا رہا۔ شام ڈھل چکی تھی جب نیم غنودگی کے عالم میں سلیم نے کچھ عجیب سی آوازیں سنیں جیسے کوئی فریادی انداز میں چلا رہا ہو۔ سلیم نے محسوس کیا کہ شاید یہ اس کے نیم غنودگی کے خوابوں کا ہی کوئی حصہ ہے لیکن جلد ہی اسے آنکھیں کھولنا پڑیں۔ گیٹ پر شاید کوئی کتا بھونک رہا تھا۔

سلیم اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ کھڑکی کے شیشے سے باہر پھیلی ہوئی نیم تاریکی میں سے ایک ڈراؤنا چہرہ اندر جھانک رہا تھا۔ سلیم نے سانس روک کر اپنے آپ کو ہر طرح کے حملے کے لئے تیار کرتے ہوئے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ ڈراؤنے چہرے والا سایہ نما انسان لڑکھڑاتا ہوا دہلیز پر آ کر ڈھیر ہوگیا۔ سلیم اسے گھسیٹ کر کمرے میں لایا۔ نعیمہ بھی دوسرا لیمپ اٹھا کر وہاں پہنچ چکی تھی۔ اس نے اس خوفناک چہرے پر روشنی ڈالی۔

"اوہ...... یہ تو ہمارا مہمان محمود ہے" سلیم نے چونک کر کہا۔ محمود کا چہرہ اس طرح سیاہ پڑ چکا تھا جیسے اس نے پلاسٹک ماسک پہن رکھا ہو۔ سلیم نے اس کا کالر پکڑ کر ہلایا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں خوفناک حد تک سکڑ گئی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے اس کا منہ کھلا اور صرف ایک دردناک سی پھنسی پھنسی آواز نکل کر رہ گئی۔

"شاید یہ مر گیا......" سلیم نے تاسف سے کہا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے ابھی زندہ ہے" نعیمہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب جھک گئی۔ محمود کے لب آہستگی سے ہلے۔ شاید وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نعیمہ نے کان لگا کر سنا۔

"ڈاکٹر......ڈاکٹر......" وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" سلیم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر امجد......" محمود ٹوٹتی آواز میں بڑبڑایا۔

"نزدیک ترین ڈاکٹر وہی ہے" نعیمہ نے سلیم کو بتایا۔

"پہاڑی کے پچھلی طرف اس کا بہت بڑا سا مکان ہے" سلیم ڈاکٹر امجد کو بلانے کے لئے چل دیا۔ مکان اسے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جلد ہی مل گیا۔ وہ اونچے اونچے پرانے درختوں اور گنجان جھاڑیوں میں اس طرح چھپا ہوا تھا کہ شاید روشنی کی کوئی کرن اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس کی کھڑکیوں سے بھی کسی قسم کی روشنی نہیں آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کوئی ذی روح رہتا ہی نہیں۔ سلیم نے دروازے پر دستک دینا چاہی تو وہ ہاتھ لگاتے ہی کھل گیا۔ سامنے سیڑھیوں پر ایک لیمپ روشن تھا جس کی بیمار روشنی میں سیڑھیاں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے قبرستان میں ترتیب سے قبریں بنی ہوئی ہوں۔

"ڈاکٹر امجد......" سلیم نے پکارا مگر اس کی آواز سناٹے میں گونج کر رہ گئی۔ وہ اندر ہال تک چلا گیا۔ وہاں بھی ویرانی کا راج تھا۔ اگر محمود کی زندگی کا سوال نہ ہوتا تو شاید سلیم واپس چلا جاتا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگا۔ دفعتہً اس کے عقب میں ایک آواز گونجی...... "کون ہو تم اور منہ اٹھائے کہاں چلے جا رہے ہو......؟" سلیم آواز کی سمت مڑا...... ایک مضبوط جسم کا آدمی ہال سے نکل کر اس کی طرف آ رہا تھا۔ اپنے انداز سے وہ گھر کا مالک معلوم ہوتا تھا۔

"میرے گھر میں ایک آدمی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے" سلیم نے کہا۔

"تو پھر میں کیا کروں......؟" اس شخص نے سنگدلانہ لاتعلقی سے کہا۔

"میرا خیال ہے میں اپنا مطلب واضح نہیں کر سکا......" سلیم نے کہا۔

"تمہارا مطلب بڑی اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ تمہارے گھر میں ایک آدمی مر رہا ہے...... لیکن اس سے میرا کیا تعلق...... مسٹر سلیم؟"

"کیا تم ڈاکٹر نہیں ہو؟"

"ڈاکٹر تو میں ہوں...... لیکن پی ایچ ڈی والا ڈاکٹر ہوں۔ اس لئے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا......"

سلیم مایوس ہو کر واپس جانے کے لئے مڑا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ڈاکٹر امجد یہاں کا پرانا باشندہ ہونے کی حیثیت سے اس مصیبت میں اس کا کچھ تو ہاتھ بٹا سکتا ہے۔ اس نے کہا۔

"ڈاکٹر امجد...... آپ اسے صرف دیکھنے کے لئے ہی میرے ساتھ چلے چلیں کیونکہ میں اور میری بیوی یہاں نئے نئے آئے ہیں۔ ہمیں نہ تو دواؤں وغیرہ کے متعلق ہی کچھ معلومات ہیں اور نہ اپنے گرد رہنے والوں کے بارے میں۔ اس صورت میں ایک اجنبی کا ہمارے گھر میں قریب المرگ ہونا ہمارے لئے زیادہ پریشان کن ہے......" سلیم نے اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر امجد نے گہرا سانس لیا۔ گویا سوچ میں پڑ گیا ہو......

"میرا خیال ہے اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے" سلیم صرف پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مزید کیا کہے۔

"بہر حال......" ڈاکٹر امجد نے تقریباً آمادگی سے کہا......

"یہ سمجھ لو کہ بیماریوں کے بارے میں میرا علم انتہائی محدود ہے" اتنا کہہ کر وہ سلیم کے ساتھ چل پڑا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ میں سے ہوتے ہوئے وہ بنگلے تک پہنچ گئے۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ڈاکٹر امجد نے محمود کا معائنہ کیا...... "ہم دیر سے پہنچے ہیں......" اس نے محمود کی اکڑی ہوئی ٹانگ کو جنبش دیتے ہوئے کہا...... "یہ برف کی طرح یخ ہو چکا ہے"

"کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اسے کیا ہوا ہے......؟" سلیم نے پریشان ہو کر پوچھا" اور اس کے چہرے پر یہ سیاہی کیسی پھیل گئی ہے......؟"

"میں صرف یہ جانتا ہوں......" ڈاکٹر امجد نے تیز و تند لہجے میں کہا کہ "یہ بھی انہی پراسرار لوگوں کا شکار ہوا ہے۔ اس معاملے کا تعلق مجھ سے ہے اور اس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست بھی میں خود کروں گا"

"براہ کرم ہمیں بھی اس معاملے کے متعلق کچھ بتائیں......" سلیم نے کہا۔

"میں ان لوگوں کو جانتا ہوں اور ان کے طریق کار کو بھی...... لیکن یہ معاملہ آپ مجھ پر ہی چھوڑ دیں۔ اس بارے میں مجھ سے یا کسی اور سے بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں" ڈاکٹر امجد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور جانے کے لئے مڑا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

رات کے سناٹے میں وہ دونوں دھڑکتے دلوں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ان کے سامنے ایک یخ بستہ لاش پڑی تھی جس کا چہرہ سیاہ ہو چکا تھا۔

"ڈارلنگ......" نعیمہ نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔ اور اس سے پہلے کہ سلیم اسے بازوؤں میں لے کر حوصلہ دیتا ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا اور سرد ہوا کے جھونکے کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ساتھ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ یہ سیاہ فام نسل کا ایک تنومند شخص تھا۔ اس کے سیاہ چہرے پر ساکت اور سفید آنکھیں ہر قسم کے تاثر سے عاری تھیں۔ نعیمہ خوفزدہ ہو کر سلیم کے قریب ہو گئی۔

"میرا نام مالے ہے اور میں ڈاکٹر امجد کا خادم ہوں" نووارد نے پرسکون لہجے میں کہا۔ اس نے ایک لمحے توقف کیا۔ پھر ان دونوں کی طرف ایک نظر دیکھ کر جھکا اور محمود کی لاش کندھے پر ڈال کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

☆..............................☆

پاگل محمود کے جنازے میں صرف تین افراد تھے۔ سلیم، نعیمہ اور رحمان۔ سلیم، رحمان کو نعیمہ سے متعارف کرا چکا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی مدد سے محمود کا تابوت قبر میں اتارا۔ قبر پر چند پتھر رکھے اور اس کی مغفرت کی دعا کر کے واپس روانہ ہو گئے۔

"رحمان صاحب...... آپ کے علاوہ بھی محمود کے کچھ دوست ہوں گے۔ انہوں نے اس کے جنازے میں شرکت کیوں نہیں کی؟" نعیمہ نے راستے میں پوچھا۔

"اس لئے کہ وہ کالی موت مرا ہے۔" رحمان گویا خود سے مخاطب ہو کر بڑبڑایا۔

"کالی موت......؟ کیا مطلب؟" نعیمہ اور سلیم نے بیک زبان پوچھا۔ سلیم کی نظروں میں محمود کا چہرہ گھوم گیا جو مرتے وقت بالکل سیاہ پڑ گیا تھا۔ اور اسے اپنے سوال کا جواب خود بخود مل گیا۔ اسی اثناء میں وہ رحمان کے گھر کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

"آیئے...... آپ دونوں کچھ دیر میرے ہاں رک کر ستالیں" رحمان نے پیشکش کی۔

"مجھے تو گھر جا کر کھانا وغیرہ تیار کرنا ہے" نعیمہ نے معذرت کی۔ سلیم اکیلا ہی رحمان کے ساتھ ٹھہر گیا۔

نعیمہ گھر واپس آئی تو دروازہ کھلا تھا۔ وہ اسے مقفل نہیں کر سکے تھے کیونکہ تالا خراب تھا اور شاید اسی خرابی سے فائدہ اٹھا کر پہلے کسی نے سازوسامان تباہ کر دیا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ پورا کمرہ گل وگلزار ہو رہا تھا۔ ہر چیز پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ گلاسوں اور پیالیوں کو بھی کسی نے گلدان کی جگہ استعمال کیا تھا۔ اور ان میں پھول سجا دیئے تھے۔ کمرہ ان پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

نعیمہ ابھی کمرے میں گھوم پھر کر پھولوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ نعیمہ نے مڑ کر دیکھا۔ انیس بیس سال کی ایک سنولائے ہوئے چہرے والی، پھولوں جیسی نرم و نازک سی لڑکی ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری اٹھائے نیچے آ رہی تھی۔

"اچھا ہوا کہ میں نے آپ کے آنے سے پہلے ہی اپنا کام ختم کر لیا تھا......" لڑکی نے اسی طرح معصومیت سے کہا۔ گویا نعیمہ ہی اسے اس کام پر لگا گئی تھی۔

"لیکن تم ہو کون......؟" نعیمہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کو یہاں آ کر کچھ خوشگوار حالات کا سامنا نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ شاید ان پھولوں کی خوشبو میں آپ کی ناخوشگوار یادیں دب جائیں......" لڑکی کے لہجے میں خلوص تھا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم ہو کون؟......" نعیمہ نے اپنا سوال دہرایا۔

"میرا نام مونا ہے...... مونا امجد۔ میں آپ کے پڑوس میں رہتی ہوں"

"اوہ...... ہاں میں تمہارے والد سے مل چکی ہوں"

باپ کے ذکر پر لڑکی کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ "کیا واقعی......؟" اس نے سہمے سہمے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں...... رات وہ تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے"

"اچھا......" لڑکی کی گرفت پھولوں کی ٹوکری پر نرم پڑ گئی۔

"بہرحال...... تم بیٹھو...... میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔ میرا نام نعیمہ سلیم ہے۔ یہ تو غالباً تم جانتی ہی ہو گی" نعیمہ نے کہا۔

"کوئی کمرہ رہ تو نہیں گیا" مونا نے پوچھا۔

"نہیں...... شکریہ! تم نے نہایت خوشبودار پھول جمع کئے ہیں"

"اچھے ہیں نا......؟" وہ خوش ہو کر بولی "میرے پاپا کو پھول لگانے کا بہت شوق ہے"

"تم ابھی تک کھڑی کیوں ہو...... بیٹھ جاؤ نا" نعیمہ نے کہا۔

"نہیں...... میں بیٹھوں گی نہیں...... دراصل میں آپ کو آج رات اپنے ہاں کھانے پر آنے کی دعوت دینے آئی تھی"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مونا نے بتایا۔

نعیمہ کو اس نامہربان بستی میں اس قسم کی نوازش کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ ”ہمیں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ دوستی کا آغاز کر کے خوشی ہوگی۔“ نعیمہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”شکریہ..... بس اب میں چلتی ہوں۔“ مونا باہر نکل گئی۔

لیکن پھر فوراً ہی نعیمہ نے اس کے واپس آنے کی آہٹ سنی۔ وہ دائیں کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا سنولایا ہوا چہرہ پھیکا اور تاریک سا ہو گیا تھا جیسے وہ دیر تک تیز دھوپ میں بیٹھ کر آئی ہو۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر امجد اندر داخل ہوا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو مونا.....؟“ ڈاکٹر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”میں معافی چاہتی ہوں پاپا.....“ مونا نے بالکل بچوں کی طرح سر جھکا کر انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

”تم مجھ سے اجازت لئے بغیر گھر سے کیوں نکلیں.....؟“

”کیا ایک بیس سال کی لڑکی کو گھر سے باہر قدم رکھنے کے لئے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے؟“ نعیمہ نے احتجاج کیا۔

”تم ہمارے معاملات میں مداخلت مت کرو مسز سلیم۔“ ڈاکٹر امجد نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔ ”تمام معاملات ایسے نہیں ہوتے جیسے وہ بظاہر نظر آتے ہیں۔“

”میں معذرت خواہ ہوں، اگر میری مداخلت آپ کو ناگوار گزری ہے۔ بہر حال میں آپ کی ممنون ہوں کہ آپ نے ہمیں کھانے کی دعوت بھجوائی۔“ نعیمہ نے نرمی سے کہا۔ یہ سن کر ڈاکٹر امجد کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مونا کی طرف دیکھا۔

”پاپا پلیز.....“ مونا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انجانی التجا کی۔ غالباً ڈاکٹر امجد کو دعوت کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا اور دعوت مونا نے صرف اپنی ہی خواہش پر دی تھی۔

”خیر..... خیر ٹھیک ہے.....“ ڈاکٹر امجد نے گویا بادل نخواستہ کہا اور مونا کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔ کس قدر فاصلے ہیں باپ بیٹی کے درمیان..... ان کے جانے کے بعد نعیمہ نے سوچا۔

☆.............................☆

رحمان نے چائے کی پیالی سلیم کی طرف بڑھائی۔ پھر وہ دونوں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ یہ کمرہ جس میں وہ بیٹھے ہوئے تھے کسی جہاز کے کیبن سے مشابہ تھا۔ کارنس پر ایک بوتل میں ننھے ننھے جہاز تیر رہے تھے۔ ایک طرف طاق میں چند کتابیں رکھی تھیں۔ کھڑکی میں آرائش کی خاطر چند رنگین سمندری پتھر رکھے ہوئے تھے۔

”میرے بھائی سے پہلے کتنے افراد کالی موت کا شکار ہو چکے ہیں..... پاگل محمود کی طرح.....؟“ سلیم نے گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

”صرف چند آدمی.....“ رحمان نے آہستگی سے کہا۔

”تمہارے خیال میں انہیں درحقیقت کس نے مارا ہے؟“ سلیم نے پوچھا۔

”کیا مطلب.....؟ کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسانی طاقت ان کی موت کی ذمہ دار ہے؟“

”تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے ہو رحمان..... میں ایک پیشہ ور سپاہی ہوں، مجھے کتنے ہی عجیب و غریب حالات کا سامنا کرنا پڑے لیکن اگر میں انہیں نہ سمجھ پاؤں تو میرا ذہن ان کی توجیہہ اور وضاحت چاہے گا۔“

”میں ایک پیشہ ور ملاح تھا۔ میں نے پوری دنیا کی سیاحت کی ہے اور ایسے ایسے حیرتناک واقعات کا سامنا کیا ہے کہ ان کی تشریح اور وضاحت دلائل کے ساتھ ممکن ہی نہیں ہے۔“ رحمان نے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے جادو وغیرہ.....؟“

”ہاں وہی کچھ..... جسے جادو کہا جا سکتا ہے“ رحمان نے جواب دیا۔

”تو کیا تم کالی موت کو بھی جادو وغیرہ میں شمار کرتے ہو؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا اور جاننا بھی نہیں چاہتا کیونکہ مجھے اپنی بھی فکر ہے۔ میں بڑے ارمانوں سے اس جگہ آ کر آباد ہوا تھا۔ اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ میں کالی موت مروں“

”یعنی تم ڈر گئے ہو.....“

”ہاں..... میں زندگی میں پہلی مرتبہ خوفزدہ ہوا ہوں“

”تب تو مجھے افسوس ہے۔ مجھے تم سے اس موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”نہیں..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن میں کچھ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بھی نہیں کر سکتا۔"

"کوئی بات نہیں...... مجھے اس کا قطعاً افسوس نہیں ہے۔" سلیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ گھر پہنچا تو نعیمہ گھر میں اس کی منتظر تھی۔ "سناؤ رحمان سے کیا کیا باتیں ہوئیں......؟" اس نے سلیم کے گلے میں بانہیں ڈال کر زندگی سے بھرپور ایک بوسہ لیتے ہوئے پوچھا۔

سلیم نے اسے اپنی اور رحمان کی گفتگو کے متعلق بتایا۔

"ہر چیز پراسرار اور الجھی ہوئی ہے اور واقعات سے زیادہ یہاں کے لوگ پراسرار ہیں۔" اس کے خاموش ہونے پر نعیمہ نے کہا اور پھر اسے مونا کی آمد، اس کے پھولوں کے شوق اور شام کے کھانے کی دعوت کے متعلق بتایا۔

"خوب۔" سلیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں ڈاکٹر امجد جیسے پڑھے لکھے آدمی سے کھانے کی میز پر دوستانہ ماحول میں گفتگو کرنے سے شاید کچھ مسائل ہمارے ذہن میں صاف ہو سکیں۔"

انہوں نے فیصلہ کیا کہ رات کو ڈاکٹر امجد کے ہاں ضرور جائیں گے۔

☆..........☆

ڈاکٹر امجد کا گھر غیر معمولی حد تک گرم تھا۔ جب وہ کھانے کی میز پر پہنچے تو مونا غائب تھی۔ "ڈاکٹر کیا مونا ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہو گی۔" نعیمہ نے پوچھا۔

"نہیں...... وہ ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھائے گی۔" ان کے میزبان کے چہرے پر سخت گیری آ گئی۔ "اسے اس کی نافرمانی کی سزا کے طور پر میں نے تنہائی میں کھانا کھانے کا حکم دیا ہے۔"

کھانے کی میز پر سکوت چھا گیا۔ وہی سیاہ فام ملازم مالے جو محمود کی لاش اٹھانے آیا تھا، کھانا لگا رہا تھا۔ ڈاکٹر امجد کے سامنے شراب کی ایک بغیر لیبل والی بوتل پڑی تھی۔ اس نے اس میں سے ایک گلاس بھر کر سلیم کی طرف بڑھایا۔ "مجھے امید ہے کہ تم اسے پسند کرو گے۔ یہ انگور کی نہیں چاول کی شراب ہے" اس نے کہا۔ سلیم نے گلاس تھامنے میں قدرے تامل کیا۔

"سوچ میں نہ پڑیئے مسٹر سلیم...... یہ زہر آلود نہیں ہے۔" ڈاکٹر امجد قدرے طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ زہر کے نام پر سلیم کی نظروں میں پاگل محمود کا سیاہ چہرہ گھوم گیا۔ لیکن تکلفاً اس نے شراب کا گلاس تھام لیا۔ مالے ان کے سامنے گرم گرم ڈشیں رکھ رہا تھا۔ کمرے کی فضاء پر عجیب سی خاموشی اور تناؤ چھایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر امجد کی گفتگو میں کوئی خلوص اور گرمجوشی نہیں تھی اور کھانے کی دعوت دینے والی اصل میزبان مونا کو کھانے میں شریک ہونے سے ہی روک دیا گیا تھا۔ غرض کہ یہ ایسا گھر ہرگز نہیں تھا جہاں مہمان بننا کوئی خوشگوار بات ہو۔

کھانے کے اختتام پر سلیم کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ مالے اور ڈاکٹر امجد غیر محسوس اشاروں میں آپس میں کچھ باتیں کرتے ہیں اور ان کا تعلق محض مالک اور نوکر کا تعلق محسوس نہیں ہوتا۔

"میرا خیال ہے کہ کافی لائبریری میں پی جائے" کھانے سے فارغ ہو کر ڈاکٹر امجد نے کہا۔ وہ لوگ اٹھ کر لائبریری کی طرف چل دیئے۔ ہال سے گزرتے ہوئے سلیم نے ایک گوشے میں خاموش کھڑی ایک مغموم سی لڑکی کو دیکھا۔ وہ ندامت آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"مونا...... یہ ہیں تمہارے مہمان......" ڈاکٹر امجد نے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"شکریہ پاپا......" لڑکی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا اور ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھ آئی۔ اس کے چلنے سے کمرے میں بھینی بھینی مہک سی پھیل گئی۔

"سلیم...... یہ مونا ہے......" نعیمہ نے سلیم سے اس کا تعارف کرایا۔ اس نے سلیم سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ گداز اور گرم تھا۔

"مونا...... میرا خیال ہے تم انہیں اپنا چڑیا گھر دکھانا پسند کرو گی......" ڈاکٹر امجد نے اسے مخاطب کیا اور مونا کے چہرے کی مسکراہٹ خوف کے پردے میں چھپ گئی۔ گویا ڈاکٹر امجد نے اسے کوئی نہایت کٹھن کام سونپ دیا ہو۔

"غالباً مسٹر سلیم کو تو جانوروں سے کوئی دلچسپی نہیں...... البتہ آپ شاید عام خواتین کی طرح انہیں دیکھنے میں دلچسپی رکھتی ہوں۔" ڈاکٹر امجد نے نعیمہ سے کہا۔

"ہاں...... میں انہیں دیکھنا پسند کروں گی۔" نعیمہ نے کہا اور اجازت طلب نظروں سے سلیم کی طرف دیکھا۔ سلیم اسے ایک لمحے کے لئے بھی تنہا چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا لیکن آداب کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اپنی ناگواری کو چھپائے رکھنا

پڑا۔ وہ ڈاکٹر امجد کے ساتھ لائبریری کی طرف چل دیا۔ مالے نے حسب معمول خاموشی کے ساتھ لائبریری کا دروازہ کھولا کافی کی ٹرے میز پر رکھی اور اسی خاموشی سے باہر چلا گیا۔

"تم اب بے تکلفی سے گفتگو کر سکتے ہو۔" ڈاکٹر نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سلیم نے کرسی پر بیٹھ کر سرسری نظر سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ کمرہ لائبریری کے بجائے ایک چھوٹا سا میوزیم معلوم ہوتا تھا۔ الماریوں میں تھوڑی سی کتابیں تھیں ان کے علاوہ پورا کمرہ نوادرات سے بھرا پڑا تھا۔

"ڈاکٹر...... معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کافی سفر کیے ہیں......" سلیم نے کہا۔

"ہاں...... اور میرا خیال ہے تمہیں بھی یہاں سے کہیں اور کے لئے سفر اختیار کرنا چاہیے مسٹر سلیم...... کیا میں تمہیں میجر سلیم کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟"

"کیپٹن سلیم......" سلیم نے تصحیح کی۔ "کیا اس مشورے کی کوئی معقول وجہ ہے......"

"احمد نگر کی زمین بڑی حاسد ہو گئی ہے" ڈاکٹر نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "خصوصاً جب تم کسی کام سے طویل عرصہ کے لئے شہر جاؤ گے تو نعیمہ کے لئے تنہا یہاں رہنا مناسب نہ ہوگا"

"لیکن آپ نے خود اپنی جوان بیٹی کی موجودگی میں اس جگہ کا انتخاب کیا ہے" سلیم نے کہا۔

"کبھی میں بھی اسے ناپسند کرتا تھا۔" ڈاکٹر امجد نے سرد آہ بھر کر کہا "لیکن اب یہ جگہ میری مجبوری بن چکی ہے۔ تمہیں یہاں کوئی دوست بنانے کی کوشش سے بھی پرہیز کرنا ہوگا۔ ورنہ تمہاری بیوی کو کسی قسم کا حادثہ پیش آ سکتا ہے"

"اب تک تو میرا ارادہ یہاں سے جانے کا ہرگز نہیں ہے۔" سلیم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"لیکن اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا تو اس کے بعد تم پچھتانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکو گے"

"مثلاً کس قسم کا حادثہ......؟" سلیم نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کوئی جواب دیتا نعیمہ اور مونا کمرے میں داخل ہوئیں۔

"آؤ ادھر بیٹھ جاؤ تم دونوں۔" ڈاکٹر امجد نے کرسیاں ان

خاص اہتمام کیوں نہیں کرتیں۔ میرا خیال ہے انہیں موسیقی سے ضرور دلچسپی ہوگی" پھر وہ سلیم اور نعیمہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "مونا کو موسیقی سے بہت دلچسپی ہے۔ خصوصاً وہ ستار بہت اچھا بجاتی ہے"

"بہت خوب۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کیونکہ ہم اچھی موسیقی شوق سے سنتے ہیں۔" سلیم نے سر ہلایا۔

مونا نے ایک گوشے میں رکھا ہوا ستار اٹھایا اور کمرے کے درمیان قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ نظروں ہی نظروں میں اس نے اجازت طلب کر کے ستار کے تار چھیڑے۔ رفتہ رفتہ ایک انوکھی سی موسیقی کمرے میں ابھرنے لگی۔ لمحہ بہ لمحہ مونا کی انگلیوں کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اس کی آنکھیں خمار آلود ہوتی جا رہی تھیں۔ ان خمار آلود آنکھوں شانوں پر بکھرے ہوئے کھلے سیاہ بالوں اور ملاحت آمیز سانولے چہرے کے ساتھ شانے سے ستار ٹکائے وہ کسی دیومالائی کہانی کا کردار لگ رہی تھی۔ موسیقی کی ترتیب جوں جوں واضح ہوتی جا رہی تھی سلیم ایک عجیب سی بے چینی میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے جسم میں سردی کی لہریں سی اترتی جا رہی تھیں۔ اس نے اپنے ذہن کو ٹٹول کر اس کیفیت کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کی اور تب اسے یاد آیا کہ بالکل ایسی ہی موسیقی اس نے اس رات سنی تھی جس سے اگلی صبح محمود مر گیا تھا۔ اور جسے اس نے موت کی موسیقی کہا تھا۔ سلیم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ مونا کے عقب میں دروازے میں مالے کھڑا تھا۔ اور اس کے سیاہ فام چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ پراسرار خوفناک اور معنی خیز مسکراہٹ! موسیقی اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی اور مونا پر جنونی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ عین اس وقت ڈاکٹر امجد نے زور سے زمین پر پاؤں مار کر اس موسیقی کا سحر توڑ دیا۔ "بند کرو اسے" وہ دہاڑا۔

ستار کے تاروں پر مونا کی انگلیوں کی جنبش رک گئی۔ مونا نے آنکھیں کھول کر روٹھی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے اس وقت گردوپیش کا کوئی احساس نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ میں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس وقت اس مونا سے قطعی مختلف تھی جو اپنے باپ کا نام سن کر ہی سہم جاتی تھی۔ ڈاکٹر امجد نے اس کے ہاتھ سے ستار چھین کر ایک طرف پھینک دیا۔ مونا نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور اس انگڑائی

میں نشے اور انتہا مدہوشی کا کچھ ایسا غلبہ تھا کہ سلیم نے ایک لمحہ کے لئے سوچا کہ اگر نعیمہ ساتھ نہ ہوتی تو وہ یقیناً سونا کو بازوؤں میں بھر لیتا۔

"میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔" ڈاکٹر امجد نے درشتگی سے کہا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے مونا نے اس کی توقعات اور پسندیدگی کے خلاف کوئی سنگین حرکت کی ہو۔ غالباً جب اس نے مونا کو موسیقی سنانے کے لئے کہا تھا تو اس کی مراد وہ دھن ہرگز نہیں تھی جو مونا نے سنانا شروع کر دی تھی۔ باپ کی ڈانٹ سن کر مونا خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔ وہ غالباً کسی نزدیکی کمرے میں ہی گئی تھی کیونکہ چند لمحوں بعد ہی سلیم نے اس کی مدھم مدھم سسکیوں کی آواز سنی۔ وہ غالباً اپنی توہین اور دل شکستگی کے احساس سے رو رہی تھی۔

"ڈاکٹر...... مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے گھر میں مہمان کی حیثیت سے تمہارے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ ورنہ اس وقت تم نے بہت نازیبا حرکت کی ہے۔" سلیم نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ خاموش رہو۔" ڈاکٹر نے سرد مہری سے کہا۔ سلیم کا دل چاہا کہ ٹھوکریں مار مار کر اس شخص کا چہرہ مسخ کر دے۔

"آؤ نعیمہ ہم چلیں......" سلیم نے نعیمہ کا ہاتھ پکڑا اور کسی قسم کے رسمی جملوں کے تبادلے کے بغیر وہ دونوں کمرے سے نکل آئے۔ ڈاکٹر بھی کمرے سے نکل کر اس طرف بڑھ گیا جدھر سے مونا کی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

وہ دونوں اپنے گھر واپس آ گئے۔

"تمہیں اس کو مونا کے ساتھ ایسا سلوک کرنے سے روکنا چاہیے تھا۔" نعیمہ نے سلیم سے کہا۔

"غصہ تو مجھے بہت آ رہا تھا۔ لیکن وہ اس کا اپنا گھر تھا اور مونا اس کی اپنی بیٹی۔ میں کوئی سخت قدم کیسے اٹھا سکتا تھا" سلیم نے کہا۔

"غالباً وہ مونا کے کمرے کی طرف اسے مارنے کے ارادے سے جا رہا تھا۔" نعیمہ نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"شاید......" سلیم نے کہا۔ "وہ ایسا ہی درندہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اپنی جوان بیٹی پر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہ کرتا ہو۔"

"سلیم......" نعیمہ نے دوسرا لیمپ جلاتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ میں وہاں تمام وقت ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرتی رہی۔"

"اور میں بھی......" سلیم نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "وہ گھر۔ وہ ملازم۔ وہ فضاء۔ وہاں کی ہر شے پراسرار تھی۔"

"اور وہ جانور بھی جو مونا مجھے دکھانے کے لئے لے گئی تھی۔" نعیمہ نے بتایا۔ "ان میں قابل دید یا انوکھی چیز تو کوئی بھی نہیں تھی" وہ سب چوہے، پرندے اور چھوٹے چھوٹے جانور تھے جو ایک ہی پنجرے میں ٹھونس دیئے گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ عارضی طور پر ایک چھوٹا موٹا چڑیا گھر بنانے کی کوشش کی گئی ہے"۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب لیٹے اس ناخوشگوار دعوت کے بارے میں سوچتے رہے۔ پھر سلیم اسے اپنی اور ڈاکٹر کی گفتگو کے متعلق بتانے لگا کہ کس طرح اس نے جلد از جلد احمد نگر چھوڑنے کا مشورہ دیا اور کسی انجانے مگر متوقع حادثہ سے ڈرایا۔

"ارے" اچانک گفتگو کے دوران نعیمہ کو کچھ خیال آیا۔ وہ اٹھ کر سامنے پڑی ہوئی ٹوکری کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی جس میں وہ رات کو موتی کو بند کر دیتی تھی۔ لیکن اب اس وقت موتی ٹوکری میں نہ تھی۔ ان دونوں نے سارا گھر دیکھ ڈالا لیکن بلی پورے گھر میں کہیں بھی نہیں تھی......

☆..........☆

علی الصبح گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلیم دروازے کی طرف لپکا کہ شاید کوئی دیہاتی ان کی بلی کو کہیں پھرتے پا کر پکڑ لایا ہو۔ یا اس کے متعلق کوئی اطلاع دینے آیا ہو لیکن دروازے پر رحمان ایک بھاری بھرکم ٹوکرے کے ساتھ موجود تھا جس میں کھانے پینے کی چیزیں، سبزیاں اور پھل وغیرہ تھے۔

"میں صرف یہ چیزیں چھوڑنے ہی نہیں آیا ہوں۔" رحمان نے کہا۔

"بلکہ یہ بتانے بھی آیا ہوں کہ خوف کے جن اثرات نے مجھ پر غلبہ پا لیا تھا انہیں ذہن سے جھٹک کر میں نے اس گاؤں میں رونما ہونے والے پراسرار واقعات کی تہہ تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم میری مدد کرو گے"

"ہمیں کیا کرنا ہوگا اور کب؟" سلیم نے پوچھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"ہم دونوں نہیں...... پہلے صرف میں کچھ کروں گا۔ تم آدھی رات کے بعد چائے خانے پہنچ جانا۔" رحمان نے واپس روانہ ہوتے ہوئے کہا۔ انہوں نے یہ گفتگو دروازے میں کھڑے کھڑے ہی کی تھی۔ نعیمہ اس وقت باورچی خانے میں تھی۔

سلیم جب سے یہاں آیا تھا پہلی بار کوئی ہاتھ اس کی طرف تعاون کے لئے بڑھا تھا اور وہ اس موقع سے ہر حال میں فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ رحمان اس علاقے کا پرانا باشندہ تھا اور اس کا ساتھ سلیم کے لئے خاصا مفید ہو سکتا تھا۔ سلیم نے نعیمہ کو بھی رات کے پروگرام کے متعلق بتایا۔

"کیوں نہ میں بھی ساتھ چلوں" نعیمہ نے کہا۔

"ہرگز نہیں...... کیونکہ ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ رحمان کیا کرنا چاہتا ہے اور مجھے اس کی کیا مدد کرنا ہوگی۔" سلیم نے کہا۔

"تم دروازے کھڑکیاں احتیاط سے بند کر کے سونا اور میری آواز کے بغیر دروازہ نہ کھولنا۔" اس نے ہدایت کی۔

سلیم جب گھر سے نکلا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ وہ بارش میں بھیگتا ہوا چائے خانے تک پہنچا اور عقبی دروازے پر آہستگی سے دستک دی۔ دروازہ رحمان نے ہی کھولا۔

"اندر آ جاؤ" اس نے سرگوشی کی۔ اندر تاریکی تھی۔ رحمان نے کھڑکی بند کرنے کے بعد احتیاط سے لیمپ روشن کیا۔ تب سلیم نے دیکھا کہ چائے خانے کے عین وسط میں ایک میز پر محمود کی لاش رکھی تھی۔ وہی چہرہ جس کے نقوش کسی انجانی اذیت سے مسخ ہو کر رہ گئے تھے اور وہی سیاہ پڑی ہوئی رنگت......!

"یہ یہاں کیسے آ گیا؟" سلیم نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"میں اسے کھود کر نکال لایا ہوں۔ وہ رہا کھدائی کا سامان" رحمان نے ایک کونے میں رکھے ہوئے بیلچے اور کدال کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن کیوں......؟ یہ تو نہ صرف قانونی طور پر جرم ہے بلکہ مذہبی طور پر بھی مناسب نہیں۔"

"ہمیں اپنے مشاہدے کی ابتداء اسی سے کرنی ہے۔" رحمان نے سکون سے کہا۔ "اب مجھے اس سے دو دو ہاتھ کرنے دو" پھر اس نے سلیم کی مدد سے محمود کی لاش کو اس طرح اٹھایا کہ وہ میز پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھے ہوئے آدمی کی پوزیشن میں آ گئی۔ اس میں خاصی طاقت صرف ہوئی۔ پھر رحمان نے اس کی گردن اس طرح خم کی کہ اس پر روشنی پڑنے لگی۔ "یہ دیکھو" رحمان نے اشارہ کیا۔ سلیم جھک کر دیکھنے لگا۔ محمود کی گردن پر دو ننھے ننھے گول زخموں کے نشان تھے جو اس کی سیاہ پڑی ہوئی رنگت سے بھی زیادہ سیاہ تر تھے۔ اس کے دانت بھی یوں سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے جیسے مرنے سے پہلے اس کی گردن کسی درندے کے جبڑے میں رہی ہو۔ سلیم نے بغور ان نشانات کا مشاہدہ کیا اور لاش کو دوبارہ میز پر لٹا دیا۔

"یہ کس جانور کے دانتوں کے نشان ہو سکتے ہیں۔ اور کیا وہ اس علاقے میں پایا جاتا ہے......؟" سلیم گویا خود سے مخاطب ہو کر بڑبڑایا۔

اس دوران رحمان نے الماری سے برانڈی کی بوتل نکال کر دو گلاس بھر لئے تھے۔ ایک اس نے سلیم کی طرف بڑھایا۔ میرا خیال ہے تمہیں ایک نظر اپنے بھائی کی لاش بھی دیکھ لینی چاہیے۔ اس کے بعد ہم کسی امکان پر غور کریں گے" رحمان نے کہا۔

"نہیں......" سلیم بے اختیار جھرجھری لے کر بولا "یہ تصور ہی اس کیلئے خوفناک تھا۔

"ہمیں ایسا کرنا پڑے گا۔ پراسراریت کا جال توڑنے کے لئے اور شاید اپنے دفاع کے لئے بھی" رحمان نے اصرار کیا۔ "چلو چل کر میں محمود کی لاش کو دفن کرتا ہوں اور تم اپنے بھائی کی لاش نکالو"

سلیم کو بادل نخواستہ اٹھنا پڑا۔ انہوں نے محمود کی لاش کو ہاتھ گاڑی پر رکھا اور قبرستان کی طرف چل دیئے۔ بارش ابھی تک ہو رہی تھی اور یہ ان کے حق میں اچھا تھا کیونکہ ان کے قدموں کے نشانات ساتھ ہی ساتھ مٹتے جا رہے تھے۔ محمود کی تدفین کے بعد انہوں نے قبر کھود کر کلیم شیرازی کی لاش بھی نکال لی۔ سلیم کی توقع کے مطابق کلیم کے چہرے پر بھی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔

"اس کا منہ اس طرف موڑ دو" رحمان نے بیتابی سے کہا۔ سلیم نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے بھائی کا سر پکڑ کر گھمایا۔ رحمان نے ٹارچ نیچے کر کے کلیم کی گردن پر روشنی ڈالی۔ "میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ رحمان نے سرد آہ بھری۔ کلیم کی گردن پر بھی وہ دو سوراخ نما زخم موجود تھے۔

"میں نے ہندوستان میں کنگ کوبرا کے ڈسے ہوئے

ایک آدمی کے جسم پر اس طرح کے نشان دیکھے تھے" سلیم کو یاد آیا۔

"لیکن اس علاقے میں کنگ کوبرا نہیں پایا جاتا۔ قطعی ناممکن" رحمان نے وثوق سے کہا۔

"لیکن پھر آخر یہ کیا ہے...... کس چیز نے میرے بھائی کو اس حالت تک پہنچایا۔ سلیم نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بہتر ہے تم گھر واپس چلے جاؤ۔ تمہاری بیوی پریشان ہو رہی ہوگی۔ باقی کام تم مجھ پر چھوڑ دو" رحمان نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ سلیم گھر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نعیمہ کی تنہائی کا خیال آتے ہی اس کے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ اس کا ذہن ایک عجیب نامعلوم سے بوجھ کی وجہ سے شل ہو کر رہ گیا تھا۔

نعیمہ کے گرمجوش استقبال، اس کے بانہوں کے گداز اور ہونٹوں کی نرمی نے اس میں زندگی کی حرارت کا احساس دوبارہ جگایا اور وہ گویا قبرستان کی تاریکی اور سرد ہواؤں کے طلسم سے نکل کر اپنی دنیا میں واپس آ گیا۔ نعیمہ اس کے لئے گرم گرم کافی بنا لائی۔ دفعتہً سلیم کی نظر مینٹل پیس پر رکھے ہوئے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پڑی۔ "یہ کاغذ کیسا ہے ڈارلنگ......؟" سلیم نے پوچھا۔

"یہ آج دروازے کے نیچے سے پھینکا گیا تھا۔ اس سے پہلے کسی نے تمہیں پکارا تھا مگر میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ کیونکہ تم موجود نہیں تھے"

سلیم نے کاغذ اٹھا کر دیکھا۔ بڑی مختصر سی عبارت تھی۔

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آ جایئے اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے"

"مونا"

اس نے نعیمہ کو یہ پیغام دکھایا...... مدد طلب کرنے کے لئے اس نے مجھے ہی کیوں منتخب کیا......؟" اس نے کسی قدر تشویش سے کہا۔

"یہاں ایسا اور کون ہے جس سے وہ مدد کے لئے کہہ سکتی۔" نعیمہ نے جواب دیا۔

"میں جا کر دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟" سلیم نے اپنا گیلا کوٹ دوبارہ کندھے پر ڈال لیا۔

"تم تنہا ہو سلیم اور معلوم نہیں حالات کی نوعیت کیا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے تمہارے جانے سے" نعیمہ نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"لیکن مجھے جانا چاہیے۔ ایک کمزور اور معصوم لڑکی کو میری مدد کی ضرورت ہے" سلیم دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ نعیمہ تشویش آمیز نظروں سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔

☆..........................☆

سلیم کے پاؤں کیچڑ میں لت پت تھے اور وہ ڈاکٹر امجد کے گھر کی عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اندر جانے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر اسے عقبی دیوار میں ایک باقاعدہ دروازہ نظر آ گیا جو غالباً کئی سال سے کھولا نہیں گیا تھا۔ اس دروازے ہی میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو بند نہیں تھی۔ سلیم اس راستے سے اندر کود گیا۔ اب اس کے سامنے ایک تنگ راہداری تھی جس کی دیواروں کا پلستر ادھڑا ہوا تھا اور اس میں دونوں طرف کمروں کی قطاریں تھیں...... وہ کمروں کے دروازے ہاتھ سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک کمرے کا دروازہ ذرا سے دباؤ سے کھل گیا۔ اور گرم ہوا سلیم کے چہرے سے ٹکرائی۔ یہ بغیر روشندانوں اور کھڑکیوں والا کمرہ تھا۔ اور اس کی فضاء میں نمی اور جانوروں کی مخصوص بو رچی ہوئی تھی۔ سلیم چوکنا ہو گیا یہاں کسی ذی روح کے سانس لینے کی آواز بھی محسوس ہو رہی تھی۔

شاید یہ ڈاکٹر امجد کا حنوط شدہ سانپ رکھنے والا کمرہ ہے۔ اس نے سوچا اور چند لمحے کے انتظار کے بعد ہمت کر کے ماچس کی تیلی جلائی اور اسے سر سے اونچا کر کے کمرے میں جھانکا۔ اندر مختلف جانوروں کے پنجرے تھے، کچھ دیواروں کے ساتھ رکھے تھے۔ کچھ فرش پر اور کچھ چھت پر بھی لٹک رہے تھے۔ ان پنجروں میں چوہے، خرگوش، گلہریاں اور دوسرے چھوٹے جانور بند تھے۔ مدھم مدھم روشنی میں ایک لمحے کے لئے ان کی ننھی ننھی خوف زدہ آنکھیں بلور کی طرح چمکیں اور وہ اپنے تنگ پنجروں میں ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ ان میں کوئی سانپ نہیں تھا۔

شاید یہ سانپوں کے لئے خوراک کا کام دیتے ہوں۔ سلیم نے سوچا۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ اس گھر میں سانپ ضرور موجود ہیں۔ تیلی کی دم توڑتی ہوئی روشنی میں اس نے دو خاص چیزیں دیکھیں۔ ایک بغلی کمرے کا دروازہ اور دوسرے نعیمہ کی ننھی بلی "موتی" جو دوسرے جانوروں کی طرح ایک

پنجرے میں بند تھی۔ سلیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ یہاں کیسے پہنچ گئی لیکن فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کمرے میں گرمی بھی تھی اور اندھیرا بھی۔ اس نے دوسری تیلی جلائی۔ یہاں دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے شیلف تھے اور ان میں چینی ماسک، جاپانی گڑیاں، قیمتی مشرقی نوادرات، افریقہ کے جنگلی قبائل کی مخصوص طریقے سے سکھائی ہوئی کھوپڑیاں، حنوط شدہ جانور اور موٹی موٹی کتابیں بھری پڑی تھیں۔ اس کمرے میں ایک دوسرے کمرے کی زرد چوکھٹ والی کھڑکی کھلتی تھی اور سلیم کی نظر جیسے ہی اس کھڑکی پر پڑی وہ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ کھڑکی کے دوسری طرف ایک خوفناک کنگ کوبرا پھن اٹھائے جبڑے کھولے نظر آ رہا تھا۔ سلیم جلتی ہوئی تیلی انگلیوں میں دبائے الٹے قدموں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف واپس ہونے لگا۔ زہریلا ناگ اپنی جگہ بے حس و حرکت رہا۔

دروازہ بند کر کے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ آگے بڑھا۔ مکان کا کوئی سرا نہیں مل رہا تھا اور سلیم کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس حصے میں پھر رہا ہے۔ مونا شاید گھر کے وسط میں کہیں اپنے باپ کے کمرے میں قید تھی۔ ایک اور کمرے کا دروازہ اسے کھلا ملا۔ اس میں کہیں اوپر سے لکڑی کا ایک زینہ بھی نیچے تک آ رہا تھا۔ ”مونا“۔ اس نے دبی دبی آواز میں کہا۔ لکڑی کے زینے پر ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ ہوئی جیسے کوئی اوپر والی سیڑھی پر آیا ہو۔ یہ ایک تاریک ہیولا تھا۔ قدموں کی مدھم مدھم چاپ کے ساتھ یہ ہیولا سیڑھیاں اترنے لگا۔ دفعتاً چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور کسی کھڑکی سے چاندنی چھن چھن کر کمرے میں پھیلنے لگی۔ ہیولا جو سیڑھیوں سے اتر کر کمرے کے وسط میں پہنچ چکا تھا روشنی میں آ گیا۔

یہ مونا تھی۔ لیکن اسے یقین نہ آیا کہ وہ مونا کو ہی دیکھ رہا ہے۔ اس کے بال سختی سے سر کے ساتھ چپٹے ہوئے تھے اور سر ہی کا ایک حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ جیسا کہ عموماً پانی میں غوطہ لگانے کے بعد ہو جاتے ہیں اور کھال چتکبری ہو چکی تھی۔ چہرہ سیاہ پڑ چکا تھا اور اس پر دو گول گول چھوٹی سرخ آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایک خوفناک پھنکار کے ساتھ اس نے منہ کھولا اور دو نوکیلے دانتوں کے درمیان سے اس کی پتلی لمبی اور دو شاخہ زبان باہر کو لپکی۔ سلیم چیخیں مارتا ہوا باہر کو بھاگا لیکن ناگن اس پر جھپٹ چکی تھی۔ اس کے دانتوں کا نشانہ سلیم کی گردن تھی مگر اس کے بھاگ اٹھنے کی وجہ سے یہ نشانہ خطا ہو گیا۔ اور سلیم نے گردن سے چند انچ نیچے اپنے کندھے میں کوٹ کو چھیدتے ہوئے دو نشتروں کی سی چبھن محسوس کی۔ وار ہلکا مگر زہریلا تھا۔ اس کے رگ و پے میں درد کی ٹیس کے ساتھ سیال آگ سی دوڑنے لگی۔ زہریلی ناگن اپنے تیز حملے کے جوش میں اب بھی کمرے میں بل کھا رہی تھی۔ وہ گرتا پڑتا باہر بھاگا۔ اس کے حافظے میں ہر چیز دھندلا رہی تھی۔ اور ٹانگیں لحہ بہ لحہ اپنی طاقت کھو رہی تھیں۔

جیسے تیسے وہ اس شیطانی گھر سے نکل آیا۔ باہر کی شدید سردی نے ایک لمحے کے لئے اسے سہارا دیا۔ اور اس کا خون جو سیال آتش کی طرح کھولتا ہوا اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا اس خون کی اذیت کچھ کم ہوئی۔ لمبی سانسیں لے کر وہ زندگی کے تار کو ٹوٹنے سے بچانے کی جدوجہد کرتا ہوا اپنے گھر کی طرف مشینی انداز میں بڑھنے لگا۔ اس کا ذہن اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا اور وہ بغیر کسی ارادے کے محض ایک حیوانی جبلت کے تحت گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب وہ اپنے گھر کے دروازے سے ٹکرایا تو اسے احساس نہیں تھا کہ اس کے جسم کا کون سا حصہ حرکت کر سکتا ہے اور کون سا حصہ حرکت کرنے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ اس نے نعیمہ کی دھندلی دھندلی شکل دیکھی جو شاید رو رہی تھی۔

”چاقو...... ایک تیز دھار چاقو......“ یہ شاید اس کی اپنی آواز تھی مگر وہ اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ ”زخم کھرچ ڈالو...... اس کے اردگرد گہرائی تک گوشت کاٹ دو...... خدا کے لئے اسے کاٹ دو......“ یہ بھی اس کی اپنی آواز تھی مگر کس قدر بھیانک اور پھٹی پھٹی......!

پھر اس نے اپنے کندھے میں ان دو دانتوں سے زیادہ تیز دھار اور زیادہ تکلیف دہ چیز پیوست ہوتے محسوس کی۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف گاڑھے سرخ سیال کا سمندر تھا اور وہ اس میں غوطے کھا رہا تھا۔ بلبلا رہا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا مگر اس گاڑھے سرخ سیال نے اس کی ناک منہ اور کان بند کر دیئے تھے۔

”وہ مونا نہیں ہو سکتی“ وہ بڑبڑایا۔ اس کے پٹھے سن ہوتے جا رہے تھے۔ ”مونا ابھی تک قید ہے...... مونا“ وہ بڑبڑائے جا رہا تھا آہستہ آہستہ اس کے حواس پر مکمل تاریکی چھا گئی......!

☆......☆

نعیمہ، سلیم کے قریب ہی [illegible]
تھا۔ اور اب اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ اس کی بڑبڑاہٹ بھی بند ہو چکی تھی۔ نعیمہ کے ذہن میں ان گنت سوالات تھے جواب ذرا سا سکون میسر آنے پر ایک بار پھر اسے بے چین کر رہے تھے۔ سلیم پر کیا گزری.....؟ کیا وہ مونا تک پہنچ سکا تھا؟ کیا مونا کو اب بھی مدد کی ضرورت ہے.....؟ یا اسے جو گزند پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا ہے.....؟

جب سورج کی روشنی کمرے میں داخل ہوئی تو سلیم پھر سوتے میں بڑبڑانے لگا۔ ”مونا..... مونا.....“ وہ کہہ رہا تھا۔ اسی اثناء میں دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ نعیمہ نے بیڈروم کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ نیچے رحمان کھڑا تھا۔

”مجھے سلیم سے ملنا تھا“ رحمان نے کہا۔

”میں نیچے آتی ہوں“

نعیمہ اسے ساتھ لے کر بیڈروم میں آئی۔ ”آپ خود دیکھ لیں کہ سلیم کو کیا ہو گیا ہے.....“

رحمان نے گہری نظروں سے سلیم کو دیکھا ”یہ عام نیند تو نہیں ہے“ اس نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔ نعیمہ نے آہستگی سے سلیم کا سر دوسری طرف کر کے اس کے کندھے پر موجود سیاہی مائل زخم کو دکھایا۔

”یہ ڈاکٹر کے گھر کب گیا تھا؟“ رحمان نے اچانک پوچھا۔

”پچھلی رات..... لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ امجد کے گھر گیا تھا“ نعیمہ نے تعجب سے پوچھا۔

”ایسا حادثہ اسی پراسرار گھر میں پیش آ سکتا ہے۔ لیکن وہ آخر وہاں گیا کیوں تھا؟“ رحمان نے پوچھا۔ نعیمہ نے اسے مونا کے پیغام کے متعلق بتایا۔ ”اور میرا خیال ہے اسے اب بھی مدد کی ضرورت ہے“ نعیمہ نے کہا۔ ”میں اس کے پاس جانا چاہتی ہوں“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن رحمان نے اس کا راستہ روک لیا۔ ”آپ کو احساس ہونا چاہیے کہ آپ کا شوہر بستر پر بے ہوش پڑا ہے اور اسے مونا سے زیادہ توجہ اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ آپ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ گھر سے قدم نہ نکالیں“ رحمان کے لہجے میں بردباری بھی تھی اور سختی بھی۔ نعیمہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ رحمٰن باورچی خانے میں جا کر بڑی مستعدی سے دو پیالی کافی بنا لایا۔ میرا خیال ہے آپ کو اس کی ضرورت ہے۔ رحمان نے ایک پیالی

[illegible] بڑھائی
کافی پی کر نعیمہ کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ ”غالباً آپ نے کافی میں کچھ ملایا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں یہی آپ کے لئے بہتر تھا۔“ رحمان نے اطمینان سے کہا۔

”میں جا کر قصبے میں ڈاکٹر کو پیغام بھجواتا ہوں۔ یا شاید مجھے خود ہی جانا پڑے“ اس نے ایک چھوٹا سا سٹول اٹھا کر نعیمہ کے پیروں تلے رکھ دیا تا کہ وہ آرام سے نیم دراز ہو سکے اور خود باہر چل دیا۔

جب نعیمہ کی آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر کھانا پکانے کے لئے چولہا جلایا اور واپس آ کر ایک بار پھر سلیم کو دیکھا۔ اس کی نبض ٹھیک چل رہی تھی۔ اور وہ اب بھی گہری نیند میں تھا۔ نعیمہ پھر مونا کے متعلق سوچنے لگی اور سوچتے سوچتے اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ مونا کی مدد کے لئے پہنچنے کا فیصلہ!

درختوں اور جھاڑیوں سے گزرتی ہوئی وہ ڈاکٹر کے گھر تک پہنچی اور صدر دروازے سے بچتی ہوئی اسی کھڑکی سے اندر چلی گئی جس سے سلیم گھر کے اندر گیا تھا۔ تاریک اور سنسان راہداری میں غیر مرئی شیطانی سائے رقص کرتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی آگے بڑھی۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھلا دیکھا۔ اس میں قطار در قطار خالی پنجرے پڑے تھے لیکن انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک ان میں جانور موجود تھے۔ نعیمہ ایک اور دروازے کی طرف بڑھی جس کے نیچے سے روشنی آتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دروازے میں ذرا سی درز پیدا کر کے ایک آنکھ سے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ کمرے کے وسط میں اسے ایک اونچی کرسی کی پشت دکھائی دی۔ عین اسی لمحے اس کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی شخص اٹھا۔ وہ ڈاکٹر امجد تھا۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ بڑے تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر اس کونے کی طرف بڑھا جہاں تک نعیمہ کی نظر نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہاں پر اس نے جھک کر کچھ اٹھایا۔ اور جب وہ واپس پلٹا تو نعیمہ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں قدیم جاپانی طرز کی خمدار وزنی ننگی تلوار تھی۔ تلوار لے کر وہ بغلی دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

یقیناً وہ تلوار لے کر معصوم مونا کی طرف گیا ہے۔ نعیمہ نے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سوچا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ ڈاکٹر امجد کے پیچھے پیچھے اس نے بھی بغلی دروازہ کھولا۔ کمرہ خالی تھا۔ البتہ یہاں سے ایک تنگ سا راستہ گھوم کر کہیں جا رہا تھا۔ ڈاکٹر یقیناً اسی راستے سے گیا تھا۔ اس راستے کا دروازہ ایک بیڈروم میں کھلتا تھا اور یہاں چوہوں کی مخصوص بو آ رہی تھی۔ ایک طرف بستر پر کوئی جسم ساکت پڑا تھا۔ ایک خوبصورت، برہنہ نسوانی جسم...... اس کا چہرہ غالباً تکیے کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ لیکن نعیمہ نے پہچان لیا۔ یہ مونا تھی۔ شاید ڈاکٹر امجد اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اور مونا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ نعیمہ ڈوبتے دل کے ساتھ اس کے قریب پہنچی اور اسے ہلانے جلانے کے لئے اس کے جسم کو ہاتھ لگایا۔ اور یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئی کہ جہاں اس نے ہاتھ لگایا تھا وہاں سے کھال کھچ کر رہ گئی تھی۔ درحقیقت یہ کوئی جسم نہیں تھا۔ صرف ایک خول تھا۔ خالی انڈے کی طرح۔ جیسے کوئی سانپ اپنی کینچلی اتار کر چھوڑ گیا ہو۔ اور تب نعیمہ کو یہ بھی احساس ہوا کہ مونا کا سر تکیے کے نیچے نہیں چھپا تھا بلکہ سر موجود ہی نہیں تھا۔

نعیمہ خوفزدہ نظروں سے نسوانی جسم کی شکل کے اس خول کو دیکھتی ہوئی الٹے قدموں واپس ہوئی۔ وہاں سے وہ ہال میں پہنچ گئی۔ ہال کی سیڑھیوں کے اختتام پر ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اس میں داخل ہوئی تو آگے پتھر کی سیڑھیاں مزید گہرائی میں جا رہی تھیں۔ ان سیڑھیوں کا اختتام ایک چھوٹے سے تہہ خانے میں ہوا جو تین طرف سے دیواروں سے بند تھا اور سامنے چوتھی دیوار کی جگہ نامعلوم حد تک تاریک خلاء تھا۔ تہہ خانے کی چھت بہت نیچی تھی۔ سامنے والے خلاء میں ایک تالاب تھا جو غالباً سیال گندھک سے بھرا ہوا تھا کیونکہ یہاں شدید گرمی اور گندھک کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اور تالاب سے دھوئیں کی پتلی پتلی لکیریں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ سیال کی سطح پر کھولتے پانی کی سی سوں سوں جیسی آواز کے ساتھ چھوٹے بڑے بلبلے بن بن کر ٹوٹ رہے تھے۔ لیمپ کی تھرتھراتی روشنی میں نعیمہ نے دیکھا کہ ڈاکٹر امجد اپنی خون آشام تلوار لئے وہاں موجود تھا۔ وہ کوئی خوفناک قدم اٹھانے کے لئے تیار نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیروں کے قریب کمبل میں کوئی جسم لپٹا پڑا تھا۔ دفعتہً ڈاکٹر جھکا اور اس نے بجلی کی سی تیزی سے وہ کمبل ہٹا کر ایک طرف پھینک دیا...... ہلکی سی کراہ بلند ہوئی اور جسم نے کروٹ لے کر سر گھمایا اور ایک نظر ڈاکٹر کی طرف دیکھا...... یہ مونا تھی۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں غنودگی تھی۔ جیسی عموماً پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اور نعیمہ کے لئے حیرت ناک بات یہ تھی کہ برہنہ نعیمہ کی کھال سبز اور چتکبری تھی اور لیمپ کی روشنی میں چمک رہی تھی۔

ڈاکٹر امجد نے تلوار بلند کی۔ یقیناً وہ مونا کی گردن اس کے تن سے جدا کرنے والا تھا۔ دفعتہً نعیمہ کے عقب سے بھاگتے ہوئے قدموں کے ساتھ کسی کی غیض وغضب سے چنگھاڑتی آواز بلند ہوئی۔ نعیمہ سہم کر تاریک گوشے میں دیوار کے ساتھ چپک گئی۔ آنے والا مالے تھا اور دیوانوں کی طرح شور مچاتا آندھی کے جھونکے کی طرح اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا اور ڈاکٹر پر جھپٹ پڑا۔ ڈاکٹر کی تلوار مونا کے سر سے ایک انچ کے فاصلے سے گزر گئی اور فرش سے ٹکرا گئی۔ مالے اس سے لپٹ پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی تلوار مضبوطی سے تھامنا چاہی لیکن مالے نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا آئل لیمپ اس پر کھینچ مارا۔ لیمپ لڑھکتا ہوا دور چلا گیا اور اس سے تیل نکل کر پتھریلے فرش پر پھیلنے لگا۔ وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ڈاکٹر قدآور اور جسیم آدمی تھا اور مالے اس کے مقابلے میں خاصا پستہ قد لیکن اس وقت اس کے جسم میں شاید شیطانی روحیں حلول کر گئی تھیں کہ وہ ڈاکٹر کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ڈاکٹر کا خون پی جانا چاہتا ہو لیکن بالآخر ڈاکٹر نے اسے قابو کر لیا۔ اس نے اسے دونوں ٹانگوں کے درمیان دبا کر اس کی گردن اپنی کلائی کے حلق میں پھنسالی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے مالے کو کسی بڑے فٹ بال کی طرح گندھک کے تالاب کی طرف اچھال دیا۔ مالے کی کربناک چیخ بلند ہوئی اور وہ تالاب کی گہرائی میں غائب ہو گیا۔ یہاں گندھک کی سطح پر دھوئیں کی لکیریں کچھ اور کثیف ہوگئیں اور دوسرے ہی لمحے وہاں صرف دائرے اور کچھ نئے بلبلے تیرتے رہ گئے۔

فرش پر پھیلتے تیل نے آگ پکڑ لی تھی اور یہ آگ رفتہ رفتہ گندھک کے تالاب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دھوئیں کے مارے نعیمہ کو سانس لینا دوبھر ہو گیا اور جب اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنی کھانسی پر قابو نہیں رکھ سکے گی تو وہ پلٹ کر واپس بھاگی۔ وہ ہال سے نکلنے ہی والی تھی کہ کسی نے اس کا بازو پکڑ کر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پیچھے سے کھینچ لیا۔

"معاف کرنا نعیمہ....." یہ ڈاکٹر امجد تھا جو اسے قریباً کھینچتا ہوا اسی کمرے میں لے گیا جہاں وہ دعوت والے دن بیٹھے تھے اور مونا سے موسیقی سنی تھی۔ ڈاکٹر نے دروازہ بولٹ کر کے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ نعیمہ نے تہہ خانے میں بلند ہونے والے شعلوں کے متعلق سوچا اور چیخ کر بولی۔ "آگ تھوڑی دیر میں یہاں تک پہنچ جائے گی۔"

"آرام سے بیٹھ جاؤ" ڈاکٹر نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ یا اسے آگ کی کوئی فکر نہیں تھی۔ "کیا تم جانتی ہو کہ نیچے کیا تھا اور وہ سب کچھ کیوں ہو رہا تھا جو غالباً تم نے چھپ کر دیکھ ہی لیا ہے" ڈاکٹر امجد نے تھکے تھکے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ اس کے کندھے ایک بار پھر کسی غیر مرئی بوجھ سے جھک گئے تھے۔ "وہ میری بیٹی مونا تھی جسے میں قتل کرنا چاہ رہا تھا"

"مونا....." نعیمہ نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ حالانکہ اس نے خود اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ لیکن بیڈ روم میں اس کی کھال کے بغیر سر والے خول اور تہہ خانے میں اسے سبز چتکبری کھال میں موجود پا کر اس کا خیال تھا کہ اصل مونا کو ٹھکانے لگایا جا چکا ہے اور یہ اس کی شکل و شباہت کے ساتھ کوئی شیطانی روح ہے۔

"ہاں وہ مونا تھی لیکن ایسی معصوم اور پیاری لڑکی نہیں جیسی تم اسے سمجھتی رہی ہو۔ وہ تو انسانیت کی پیروڈی ہے..... تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا..... میری بیٹی..... آہ میرے خدا....." بے ربط الفاظ اس کے حلق میں اٹکنے لگے اور آواز رندھ گئی۔ پھر سرخ سرخ آنسو بھری آنکھوں سے اس نے کتابوں کے شیلفوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ دنیا خونخوار وحشیوں کا جنگل ہے" ڈاکٹر کی دھندلائی ہوئی آنکھیں گویا ماضی کی گزرگاہوں میں بھٹکنے لگیں۔ "اس کی ماں اسے جنم دیتے ہی مر گئی تھی۔ میں نے ہی اسے پالا اور وہ میری زندگی کی واحد خوشی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے دنیا کی کوئی چیز پیاری نہیں تھی۔ اور وہ جانتے تھے کہ میں اپنی بیٹی سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ اس لئے انہوں نے مجھے سزا دینے کے لئے میری بیٹی کو ہی ذریعہ بنایا....."

"وہ کون.....؟" نعیمہ نے پوچھا۔

"میں تمہیں شروع سے بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں علم الارواح کا ڈاکٹر ہوں اور میری ریسرچ کے مخصوص موضوعات مشرق بعید کے مذاہب رہے ہیں۔ میں نے ہندوستان، جاوا، ساٹرا اور بورنیو کا سفر کیا ہے۔ افریقہ کے گھنے اور تاریک جنگلوں سے گزرا ہوں۔ ایسی ایسی قوموں کے درمیان دن گزارے ہیں جن کے متعلق آج کی دنیا کے مہذب لوگ کچھ بھی نہیں جانتے۔ مثلاً افریقہ کے آدم خور قبیلے یا بورنیو کے سانپ پرست لوگ..... دنیا صرف یہ جانتی ہے کہ آدم خوروں یا سانپ پرستوں کا وجود ہے لیکن یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ ان کی روایات کیا ہیں۔ وہ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی مذہبی اقدار کیا ہیں اور کوئی یہ سب کچھ جان بھی نہیں سکتا کیونکہ وہ لوگ اسے ہرگز پسند نہیں کرتے ہیں کہ کوئی ان کے بارے میں جان لے..... اور ان کے متعلق یہ سب کچھ جان کر کوئی زندہ واپس نہیں آ سکتا اور اگر زندہ واپس آ جائے تب بھی ان کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ ان کی ہر بات ہر روایت ایک راز ہے۔ جس کی وہ حفاظت کرتے ہیں۔ ان سب جگہوں پر گھومنے پھرنے کے دوران مونا میرے ساتھ رہی۔ میں نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کیا اور اس ہنس مکھ بچی نے بھی کبھی اپنی پیشانی پر بل نہیں آنے دیا۔ کبھی کسی بے آرامی کی شکایت نہیں کی" ڈاکٹر امجد اپنی کرسی میں کچھ اور سست گیا۔ "بورنیو کے سانپ پرست قبیلے کے مطالعے کا جان لیوا کام مکمل کر کے میں ملایا آ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ بدبختی میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ ملایا میں قیام کے دوران مونا غائب ہو گئی۔ میں نے اعلیٰ حکام اور اپنے احباب کے علاوہ بااثر حلقے میں واویلا برپا کر دیا اور تب مجھے بتایا گیا کہ ملایا میں بچوں کا غائب ہو جانا کوئی نئی بات نہیں ہے اور اس پر وہ لوگ زیادہ تشویش میں بھی مبتلا نہیں ہوتے کیونکہ بچوں کو اغوا کرنے والے عموماً وہ لوگ ہوتے تھے جو بھوک کے ہاتھوں تنگ آ کر چھوٹے موٹے بے ضرر جرائم پر اتر آتے تھے۔ عموماً وہ چھوٹی موٹی رقم وصول کر کے بچوں کو کوئی گزند پہنچائے بغیر رہا کر دیا کرتے تھے۔ میں بھی خاموش ہو کر ایسے ہی کسی مجرم کے مطالبے کا انتظار کرنے لگا لیکن چند دن بعد مونا بغیر کسی مطالبے اور بغیر کسی اطلاع کے میرے پاس واپس پہنچ گئی۔ اس کچھ یاد نہیں تھا کہ اسے کون لوگ لے گئے تھے اور اتنے دن وہ کہاں رہی اور بظاہر اسے کوئی گزند نہیں پہنچایا گیا تھا۔ لیکن آہ..... درحقیقت وہ پہلے والی مونا نہیں رہی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھی...... وہ انہی زہریلے لوگوں میں سے ایک ہے جو اپنے رازوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جن کا میں مجرم تھا۔ انہوں نے اپنا انتقام لے لیا تھا۔" ڈاکٹر اس طرح بولے جارہا تھا جیسے نعیمہ کی بجائے کسی ان دیکھی ہستی سے مخاطب ہو۔

"تب پھر پراسرار واقعات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ مونا جہاں ہوتی وہاں لوگ کالی موت کا شکار ہونے لگتے۔ جونہی مجھے صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوا۔ میں نے اس دور افتادہ ویران اور گرم علاقے کا رخ کیا۔ گنجان آبادی میں مونا کی غیر انسانی طاقتوں کا راز فاش ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ سرد علاقوں کا موسم اس کی جان لے سکتا تھا۔ یہاں میں نے اس کے لئے اس گھر میں خصوصی انتظامات کئے۔ تہہ خانے میں گندھک کا تالاب بنوایا جو گھر کو ہمیشہ گرم رکھتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں اس کے وجود کو غیر انسانی طاقتوں سے پاک کرسکوں گا لیکن میرا علم، میرا تجربہ، میری کوششیں سب کچھ بیکار رہا۔ وہ ہر موسم سرما کے آغاز پر کینچلی بدلتی، چھوٹے موٹے جانور کھا جاتی، سردی سے بچتی اور گرم جگہ پر گہری نیند سویا کرتی۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ انسانیت کو اس کے ضرر سے بچانے کے لئے میں دل پر پتھر رکھ کر اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کردوں لیکن مالے آڑے آ گیا۔ وہ بھی درحقیقت انہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ اور شاید رنگو سے ہی میرے پیچھے لگا تھا۔ ملایا میں قیام کے دوران اس نے میرے پاس ملازمت حاصل کی اور پھر مونا کے مسئلہ پر مستقلاً مجھے بلیک میل کرنے لگا۔ ظاہر ہے کہ میں اپنی بچی مونا کا راز فاش ہوجانا برداشت نہیں کرسکتا تھا اور وہ اس راز سے واقف تھا۔ وہ مونا کی حفاظت کرتا تھا۔ کیونکہ مونا کا مستقل طور پر ان شیطانی طاقتوں کے زیر اثر رہنا ہی ان کا انتقام تھا۔ آج بھی وہ مونا کو بچانے کے لئے جان پر کھیل گیا۔ لیکن اب وہ آگ میں بھسم ہوکر مرجائے گی اور یہی اس کے لئے بہتر ہے" ڈاکٹر امجد نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

آگ کی بو اب لائبریری تک آ پہنچی تھی۔ نعیمہ دروازے کی طرف بڑھی لیکن ڈاکٹر نے پھر اس کا بازو پکڑ لیا۔ تمہیں یہیں ٹھہرنا ہوگا نعیمہ۔

"شعلے یہاں تک پہنچ چکے ہیں ڈاکٹر امجد کیا تم چاہتے ہو کہ ہم اسی بند کمرے میں جل کر مرجائیں" نعیمہ نے ہاتھ

"شعلے...... ہاہاہا...... ہاں یہ شعلے مونا کو حرارت پہنچائیں گے...... وہ گرمی کو پسند کرتی ہے نا......" ڈاکٹر نے عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ یقیناً وہ دماغی توازن کھوچکا تھا۔

"لیکن اتنی زیادہ آگ میں تو وہ مرجائے گی۔ آؤ اسے بچائیں" نعیمہ نے نفسیاتی طور پر اس کے پدرانہ جذبات ابھارنے کی کوشش کی کہ شاید اسی طرح وہ کمرے سے نکلنے پر آمادہ ہوجائے۔

"مرجائے گی...... ہاہاہا...... ہم دونوں بھی اسی کے ساتھ مریں گے" اس نے دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی نعیمہ کا بازو دوبارہ پکڑ کے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ پھر خود اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ شاید وہ تہہ خانے کی طرف جارہا تھا۔ نعیمہ نے باہر تالے میں چابی گھومنے کی آواز سنی۔ معلوم نہیں ڈاکٹر امجد چابی ساتھ ہی لے گیا تھا یا تالے میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ڈاکٹر کی حیرت زدہ آواز سنی۔

"مونا......" ساتھ ہی ڈاکٹر نے ایک زوردار سسکاری لی اور اس کے بعد دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ چند ثانیے بعد دوبارہ قفل میں چابی گھومی۔ اور دروازہ کھول کر مونا اندر داخل ہوئی۔ اندر آ کر اس نے دروازہ بند کردیا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح بے جان تھا۔ اور سبز چمکیلی کھال میں لپٹا ہوا اس کا جسم لہرا رہا تھا۔

نعیمہ خوفزدہ ہوکر پیچھے ہٹی اور مونا اس میز کے گرد چکر کاٹنے لگی جس کے ساتھ نعیمہ کھڑی تھی۔ دفعتاً دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔

"میں یہاں ہوں...... اندر" نعیمہ زور سے چیخی" مجھے بچاؤ" دروازہ اور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ پھر کھڑکی پر بھی ضربیں پڑنے لگیں اور دوسرے ہی لمحے اس کا شیشہ جھناکے سے ٹوٹ کر فرش پر آ گرا۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کھڑکی میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ سلاخوں کے دوسری طرف نعیمہ نے رحمان کا چہرہ دیکھا۔ دروازے کی طرف غالباً سلیم تھا۔

مونا اب بھی اس کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ پھر اس کا جسم ٹوٹے ہوئے اسپرنگ کی طرح اچھلا۔ نعیمہ نے اس کے جبڑوں سے دوشاخی زبان کو لپکتے دیکھا۔ وہ اس کے حملے سے

بچنے کے لئے اچھلی اور شیلف سے ٹکرا کر گری۔ لیکن دونو کیلے دانت اس کے کندھے میں اتر چکے تھے۔ نعیمہ کے منہ سے چیخ نکلی۔

اپنے کامیاب حملے کے بعد مونا وسط میں فرش پر کھڑی جھوم رہی تھی۔

"آہ......سردی......" اچانک مونا نے کہا۔ اس کی آواز چوہے کی چیں چیں سے مشابہہ تھی۔ ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے سرد ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔

نعیمہ کے کندھے میں تکلیف ضرور تھی مگر صرف اتنی جتنی دو بڑے کانٹے چبھنے سے ہوتی ہے۔ اور بس......زہر کے جسم میں سرایت کرنے کی کوئی علامت اس نے محسوس نہیں کی۔ پھر اس نے دیکھا کہ مونا سردی سے سکڑ کر جلیبی کی سی شکل اختیار کر کے فرش پر بیٹھ چکی تھی۔ نعیمہ کانپتی ٹانگوں سے اٹھی اور دوڑ کر دروازے کا بولٹ گرا دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سلیم کے بازوؤں میں تھی۔ دھوئیں کے کثیف مرغولے اور شعلوں کی سرخ زبانیں کمرے میں لپک آئیں۔ آگ یہاں تک پہنچ چکی تھی۔

سلیم اس کا ہاتھ پکڑ کے باہر کی طرف بھاگا۔ بھاگتے وقت اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تا کہ مونا باہر نہ نکل سکے۔ دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر انہوں نے ڈاکٹر امجد کو مردہ پڑے دیکھا۔ اس کا چہرہ سیاہ ہو چکا تھا۔ مونا نے اپنے باپ کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ان پراسرار لوگوں کا انتقام پورا ہو چکا تھا۔

سلیم اس کا ہاتھ پکڑے بھاگنے لگا۔ اور ان کے عقب میں رحمان بھاگ رہا تھا۔ وہ لوگ لکڑی کے زینے کی طرف بڑھے۔ زینے کی ریلنگ آگ پکڑ چکی تھی۔ دھواں اس کے پھیپھڑوں میں گھستا جا رہا تھا اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ گرتے پڑتے وہ صدر دروازے تک پہنچے اور باری باری اس کی چھوٹی کھڑکی سے باہر نکلے۔

"جلد از جلد عمارت سے دور نکل چلو......یہ کسی بھی لمحے ڈھیر ہو سکتی ہے" رحمان نے کہا۔ وہ اپنے بنگلے کی طرف دوڑ پڑے۔ کچھ دور جا کر انہوں نے پلٹ کر آتش زدہ عمارت کی طرف دیکھا۔ شعلے کھڑکیوں سے نکل رہے تھے اور بڑے بڑے تختوں اور شہتیروں سے چٹخ چٹخ کر گرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں یہاں تک پہنچ رہی تھیں۔

"تم وہاں تک کیسے پہنچے سلیم......" نعیمہ نے اس کے سینے میں دبک کر روتی آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔

"اس کے لئے تمہیں رحمان کا ممنون ہونا چاہیے۔ یہ ہمارے ہاں پہنچا اور تمہیں موجود نہ پا کر سمجھ گیا کہ تم کہاں گئی ہو۔ تب اس نے مجھے جگایا اور ہم اس طرف بھاگے" سلیم نے کہا۔

آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ اب اس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

"سلیم...... اس نے مجھے ڈس لیا تھا لیکن میں ابھی تک......میرا مطلب ہے سوائے کندھے میں تکلیف کے مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا......" نعیمہ نے اپنا شانہ سہلاتے ہوئے کہا۔

"تم تک پہنچنے سے پہلے وہ اپنے باپ کو ڈس چکی تھی اور ایک ناگن ایک وقت میں دو ڈنک نہیں مار سکتی۔ اپنے ڈنک میں دوبارہ زہر جمع کرنے کے لئے اسے کچھ وقت درکار تھا" سلیم نے جواب دیا۔

"اوہ......" وہ جھرجھری لے کر اس کے اور قریب ہو گئی۔

اور پھر عمارت ایک زوردار آواز کے ساتھ ڈھیر ہو گئی۔ اور بڑی بڑی چنگاریاں چاروں طرف ہوا میں اڑنے لگیں۔

"اب ہم سکون سے یہاں رہ سکیں گے۔ ہے نا سلیم......؟" نعیمہ نے شعلوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یقیناً......" رحمان نے کہا۔

"کیونکہ اس شیطانی طاقت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور مجھے تو یہ خوشی ہے کہ میری زندگی میں ہی کالی موت کا معمہ حل ہو گیا"

فلک بوس شعلوں کی دور دور تک پھیلتی روشنی میں نشیب کی طرف سے بستی کے لوگ ٹولیوں کی صورت میں اس طرف آتے نظر آرہے تھے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ریاض بٹ

محترم ریاض بٹ کا شمار نئے افق کے پرانے لکھاریوں میں ہوتا ہے آپ بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ دیہات کے پس منظر میں قارئین کے لیے تفتیشی کہانیاں لکھتے ہیں ان کی تحریروں میں اپنی مٹی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے ان کی تحریروں میں نقار بولتے باتیں کرتے محسوس کرتے ہیں زیر نظر کہانی میں انہوں نے پر اسراریت کا تڑکا دینے کی کوشش کی ہے امید ہے قارئین کو ان کا یہ انداز پسند آئے گا۔

خانہ بدوشوں کی ایک لڑکی قتل ہوگئی تھی۔ اور اس وقت میں اور دو سپاہی ان کی جھگیوں میں موجود تھے۔ یہ جھگیاں تعداد میں تقریباً چالیس تھیں اور ہمارے تھانے سے صرف دو فرلانگ کے فاصلے پر تھیں۔

لڑکی بھرپور جوان اور خوب صورت تھی۔ عمر بیس سال ہوگی۔ میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ یہ ان کی بیٹی ہے۔ رنگ گورا اور نین نقش میں جنس مخالف کے لیے بڑی کشش تھی۔

میں نے بغور اور باریک بینی سے لاش کا معائنہ کیا۔ تو یہ بات واضح ہوئی کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ گردن پر انگلیوں کے نشان واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ اور لگتا یہ تھا کہ اس کا گلا کہیں اور گھونٹ کر لاش کو یہاں پھینک دیا گیا ہے۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ جو غلط بھی ہوسکتا تھا۔ لاش جھگیوں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر پڑی تھی۔ ارد گرد کی زمین پکی تھی۔ وہاں کھرے بہت سے تھے۔ ان میں سے لاش یہاں پھینکنے والے کا کھرا ڈھونڈنا ناممکن تھا۔ اس لیے کھرے اٹھانے کے متعلق سوچنا وقت کے ضیاع کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اگر میرا اندازہ صحیح تھا تو۔

اس وقت میرے ساتھ سپاہی سکندر اور عمران تھا۔ ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں نے سپاہی سکندر کو لاش کا پوسٹ مارٹم کروانے کے لیے بھیج دیا۔ اور خود ان خانہ بدوشوں کے مکھیا کی جھگی میں ڈیرہ لگالیا۔

مکھیا یا سردار چالیس بیالیس سالہ ایک فربہ اندام سانولے رنگ کا بندہ تھا۔ وہ گرمیوں کے دن تھے۔ اس نے دھوتی کے اوپر سفید رنگ کا کرتہ پہنا ہوا تھا۔ نام اس وقت میرے ذہن میں نہیں آرہا۔ بہر حال کہانی سنانے کے لیے اسے مراد کہہ لیتے ہیں۔

"ہاں تو مراد صاحب یہ کیسے ہوگیا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب میں تو خود حیران ہوں کہ شکیلہ کے ساتھ یہ کیا ہوگیا۔ اچھی بھلی رات کو اپنی جھگی میں سوئی تھی۔ صبح اس کی لاش ملی۔ آگے بڑھنے سے پہلے کچھ باتوں کی وضاحت کردوں۔ لاش خود سردار کی دریافت تھی۔ وہ صبح چہل قدمی کے لیے اس طرف جاتا تھا۔ اس نے لاش دیکھ کر شکیلہ کی ماں فیروزہ بیگم کو بتایا اور پھر یہ بات ساری جھگیوں میں پھیل گئی۔ اور یوں مرد و زن اس طرف دوڑ پڑے۔ اور انہوں نے کھروں کا ستیاناس کردیا۔

سردار کو شکیلہ کی ماں فیروزہ بیگم کی زبانی پتہ چلا تھا کہ شکیلہ رات کو جھگی میں سوئی تھی۔

"مراد صاحب آپ سیانے بیانے بندے ہیں۔ مجھے تو یہ بات ہضم نہیں ہورہی۔ کہ لڑکی رات جھگی میں سوئی اور صبح......"

"جناب جو بات میرے علم میں آئی وہ میں نے آپ کو

بتادی ہے۔" مراد نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ ذرا جا کر شکیلہ کی ماں کو بھیج دیں۔ میں اس سے اکیلے میں بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔"

جب شکیلہ کی ماں فیروزہ بیگم میرے سامنے آئی تو میں حیران رہ گیا۔ وہ بھی گورے چٹے رنگ کی ایک بیالیس سالہ خوب صورت عورت تھی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مرہی گئی ہو۔ بہرحال وہ میرے سوالوں کے جواب دینے کے قابل نہیں تھی۔ اس کا سر ڈول رہا تھا اور ہونٹوں سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ فیروزہ بیگم مجھے تمہاری بیٹی کے مرنے کا بہت دکھ ہے۔ میں تمہاری بیٹی کو تو واپس نہیں لاسکتا۔ قاتل کو پکڑ کر قرار واقعی سزا ضرور دلواؤں گا۔

اس نے میری طرف زخمی نظروں سے دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔

میں نے اسے فارغ کر دیا۔ اس وقت میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ لاش صبح تقریباً چھ بجے دریافت ہوئی تھی اس وقت وہ اپنی جھگی میں سوئی ہوئی تھی۔

اس کے بعد میں نے کچھ اور مرد وزن سے بھی سوال وجواب کیے تھے۔ لیکن اس کی قریبی سہیلی کے علاوہ کسی سے کوئی قابل ذکر بات معلوم نہ ہوسکی۔ ان باتوں کا ذکر بعد میں آئے گا۔ تھانے میں واپس آ کر میں روزمرہ کے کاموں میں الجھ گیا اور وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا۔

اگلے دن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ جس کے مطابق مقتولہ کی موت رات دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ وجہ گلا گھونٹنا ہی لکھا تھا۔ اگر میرے اندازے کے مطابق مقتولہ کا کہیں اور گلا گھونٹ کر لاش کو یہاں پھینکا گیا تھا تو معاملہ اور بھی پراسرار ہو جاتا تھا۔ رپورٹ میں دو اور انکشافات بھی تھے۔ جن کو راز میں رکھتے ہوئے میں آگے کی کہانی سناتا ہوں۔

لاش لینے مراد اور تین چار اور بندے آئے بیٹھے تھے۔

ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں نے لاش ان کے حوالے کردی۔ سردار مراد نے جاتے جاتے ایک بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"تھانیدار صاحب ہم غریب لوگ ہیں۔ کیا ہم آپ سے یہ توقع رکھیں کہ آپ قاتل کو پکڑ کر قانون کے حوالے کردیں گے؟" میں اس کے لہجے میں چھپے خدشے کو سمجھ گیا تھا۔ اس لیے تسلی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ اطمینان رکھیں۔ اگر قاتل کوئی بڑا آدمی بھی ہوا۔ تو میں اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا۔"

لیکن چند لمحے میں نے توقف کیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کے تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ آپ نے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی مجھے بتانی ہے۔ یعنی جونہی کوئی نئی بات معلوم ہو۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔ ظاہر ہے اس وقت میں یہی کرسکتا تھا۔

ہمارے تھانے کی حدود میں گاؤں فرید کوٹ بھی آتا تھا۔ وہاں کا موجودہ چوہدری بڑا رنگین مزاج تھا لیکن میری معلومات کے مطابق اس کی یہ ساری رنگین مزاجی گاؤں سے باہر تھی اور جب سے اس کی شادی گاؤں سجاول کے چوہدری اللہ دتے کی بیٹی رخسانہ سے ہوئی تھی وہ سدھر گیا تھا۔ اس کے باپ چوہدری رفاقت کو فوت ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔

فرید کوٹ کے موجودہ چوہدری کا نام نزاکت تھا۔ گورا چٹا گھبرو تھا۔ اچانک مجھے دفتر کے داخلی دروازے میں سپاہی طوفان خان کی شکل نظر آئی۔ یہاں یہ بات بتادوں کہ یہ شکیلہ والے واقعے کے چھ دن بعد کی بات ہے۔ اس نے اطلاع دی کہ چوہدری نزاکت صاحب آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے سپاہی سے کہا۔ میں ذرا یہ کاغذ نمٹالوں اسے پندرہ منٹ بعد بھیج دینا۔

پندرہ منٹ بعد وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں یہ بات بھی بتادوں کہ اس سے پہلے میری دو ملاقاتیں ہوچکی تھیں۔ ایک دفعہ وہ ویسے مجھے ملنے آگیا تھا جب کہ دوسری بار وہ ایک چوری کی رپورٹ درج کروانے آیا تھا۔ بقول اس کہ اس کی ماں کا موتیوں والا ہار گم ہوگیا تھا اس نے ایک گھریلو ملازمہ پر شک ظاہر کیا تھا۔

میں نے حویلی میں جاکر اس سے پوچھ گچھ کی تھی۔ وہ مسکین سی عورت تھی۔ خوب صورت تھی اور ابھی جوان تھی۔ اس نے مجھے رو رو کر یقین دلایا تھا کہ وہ ایسی حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نے اسے سوچنے کے لیے دو دن دے دیے تھے اور چوہدری نزاکت اور اس کی ماں نرگس بیگم کو کہا آیا تھا کہ وہ خود تھانیدار بننے کی کوشش نہ کریں یعنی اسے تنگ نہ کریں۔ جب انہوں نے معاملہ میرے ہاتھ میں دے دیا ہے تو ذرا صبر سے کام لیں۔ دراصل مجھے اندر خانے کہانی کچھ اور نظر آرہی تھی۔ اس لیے میں اسے تھانے لے کر نہیں آیا تھا۔ ان دنوں ابھی نزاکت کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے اگلے دن چوہدری نزاکت نے آکر بتایا تھا۔

"تھانیدار صاحب موتیوں والا ہار مل گیا ہے۔ میں اپنی رپورٹ واپس لینے آیا ہوں۔"

میں نے محرر کو بلا کر اس کی طرف سے ایک تحریر لکھوائی تھی۔ جس کا نفس مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

"میں چوہدری نزاکت باہوش وحواس یہ اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی نوکرانی کوثر پروین پر جو شک موتیوں والے ہار کے سلسلے میں لکھوایا تھا وہ غلط فہمی کی بنیاد پر تھا۔ کیونکہ ہار مل گیا ہے۔ اس لیے میں اپنے ہار کی گمشدگی کی رپورٹ واپس لیتا ہوں۔" میں نے نیچے اس کے دستخط لے لیے تھے اور محرر کو یہ حکم دیا تھا کہ ریکارڈ میں لگالے۔

ایسے چوہدریوں کے سلسلے میں ہمیں بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔ یہ بعض اوقات تھانیداروں کے لیے مصیبت بن جاتے تھے۔ بہرحال بعد میں خفیہ ذرائع سے اس کے متعلق تحقیقات کروانے پر یہ بات پتہ چلی تھی کہ وہ رنگین مزاج ہے۔ میرے خیال میں ذہین قارئین ساری بات سمجھ گئے ہوں گے۔ اب مخبر کی تازہ رپورٹ کے مطابق وہ سدھر گیا تھا۔ میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے پریشانی نظر آئی۔ جب وہ کافی دیر نہ بولا تو مجھے ہی گفتگو کا آغاز کرنا پڑا۔

"چوہدری صاحب لگتا ہے اس بار کوئی بہت زیادہ قیمتی چیز چوری ہوگئی ہے۔"

"اوہ تھانیدار صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔ اس بار مجھے ایک بڑی پریشانی آپ کے پاس لائی ہے۔" میں نے

دیکھا کہ اس کے ماتھے پر [illegible] کی لکیریں ابھر آئی ہیں۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "شروع ہو جائیں میرا وقت بہت قیمتی ہے۔"

"تھانیدار صاحب جب انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اسے اللہ بھی یاد آتا ہے اور اپنے گناہ و کوتاہیاں بھی...... میں اپنا مسئلہ یا حالات بتانے سے پہلے اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی نوکرانی کوثر پروین پر صرف اس وجہ سے شک لکھوایا تھا کہ وہ میرے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ پھر جب وہ میرے اشاروں پر چلنے کے لیے راضی ہوگئی تو میں نے چپکے سے ہار کو دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا۔" وہ خاموش ہوگیا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ میں کچھ بولوں لیکن میں نے بولنا فضول سمجھتے ہوئے نظریں اس کے چہرے پر گاڑھ دیں۔ کیونکہ اونٹ خود ہی پہاڑ کے نیچے آ گیا تھا۔ اس نے بات دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

"آج کل ہماری حویلی میں کچھ پراسرار سے واقعات ہو رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہماری زندگی تلخ ہوگئی ہے بلکہ میری بیوی مجھ سے لڑ جھگڑ کر میکے جا بیٹھی ہے۔"

پھر جو تفصیل اس نے بتائی۔ وہ میں اپنی زبان میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ تقریباً تین دن پہلے جب اس کی بیوی رخسانہ اپنے میکے سے واپس آئی تو اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس وقت چوہدری نزاکت اپنے باغ والے ڈیرے پر گیا ہوا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کی بیوی اس کی ماں سے تیز تیز باتیں کر رہی تھی اور بار بار اس کا ذکر کر رہی تھی۔

چوہدری نزاکت کو دیکھتے ہی رخسانہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"وہ آ گئے ہیں...... اب آپ خود ہی ان سے پوچھ لیں۔ میں تو اب ایک پل بھی یہاں نہیں رہوں گی۔" پھر وہ پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"ماں جی کیا معاملہ ہے یہ رخسانہ کیوں انگاروں پر لوٹ رہی ہے؟" چوہدری نزاکت نے ماں سے پوچھا۔

"نزاکت میں نے تمہاری شادی اس لیے کی تھی کہ تم غلط راہوں سے لوٹ آؤ۔ لیکن لگتا ہے تمہارے اندر گھسا ہوا شیطان ابھی نکلا نہیں ہے۔" اس کی ماں نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماں جی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" چوہدری نزاکت واقعی حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کیا چکر ہے۔

"دیکھو نزاکت مجھے سچ سچ بتا دو کہ رات تمہارے کمرے میں کون عورت تھی؟"

"عورت ...... ماں جی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ خدارا کھل کر بات کریں۔"

"تو میرے بھولے بادشاہ یہ دیکھو۔ انہوں نے سونے کی انگوٹھی کی ڈبی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کو کھول کر دیکھو تو تمہیں اپنا کرتوت نظر آ جائے گا۔"

چوہدری نزاکت نے ڈبی کو کھول کر دیکھا تو ایک بڑا سا بال اس کے اندر پڑا ہوا پایا۔ اس نے جب بال کھول کر دیکھا تو یہ ایک تقریباً دو فٹ لمبا زنانہ بال تھا۔ ابھی وہ حیران و پریشان نظروں سے اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کی ماں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تمہاری بیوی رخسانہ کو یہ بال تمہارے تکیے پر پڑا ملا تھا۔ جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ رات کوئی عورت تمہارے کمرے میں تھی۔"

چوہدری نزاکت نے بال کو لپیٹ کر دوبارہ ڈبی میں رکھ دیا۔ چند لمحے سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔

"ماں جی مجھے آپ کی قسم ہے۔ جو غلطیاں مجھ سے ہوگئی تھیں۔ ان کی میں نے صدق دل سے معافی اپنے رب سے مانگ لی تھی۔ یعنی توبہ کر لی تھی۔ اس کے بعد میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے اس کے متعلق سوچا بھی نہیں۔"

"پھر نزاکت یہ سب کیا ہے؟ بال کہاں سے آیا ہے۔" اس کی ماں نے تشویش بھری آواز میں کہا۔

"میں خود حیران ہوں۔ ماں جی بہرحال آپ پریشان نہ ہوں میں رخسانہ سے جا کر بات کرتا ہوں۔" پھر وہ اپنے کمرے میں گیا تھا۔ اس کی بیوی رخسانہ اپنی چیزیں اور کپڑے ایک سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ وہ بہت غصے میں ہے۔

چوہدری نزاکت نے دروازہ بند کیا اور اپنی بیوی کے پاس جا کر اسے بازو سے پکڑا اور پلنگ پر بیٹھا کر خود بھی پاس بیٹھ گیا۔

"دیکھو رخسانہ کسی بدگمانی اور شک کو دماغ میں جگہ نہ دو۔

جب سے تم میری رفیق حیات بنی ہو۔ میں نے اپنی سب غیر نصابی سرگرمیاں ختم کردی ہیں۔" یہ سب کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھنے کی کوشش کی لیکن بڑی بےدردی سے رخسانہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولی۔

"میں یہاں نہیں رہوں گی۔ جس بندے کو باہر کا کھانا کھانے کی لت پڑ جائے اسے گھر کا کھانا پسند نہیں آتا۔"

"رخسانہ میری بات کا یقین کرو۔"

قصہ مختصر یہ کہ رخسانہ پر چوہدری نزاکت کی کسی بات کسی صفائی اور منت سماجت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ اپنے میکے چلی گئی۔ حتیٰ کہ جب چوہدری کی ماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے بھڑک کر کہا۔

"ہم کوئی کمی کمین نہیں ہیں کہ چپ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ یا تو آپ اس عورت کو میرے سامنے لائیں یا پھر میں خود فیصلہ کروں گی۔"

وہ بھی چوہدری اللہ دتے کی بیٹی تھی۔ جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ گاؤں سجاول میں اس کی بڑی دہشت تھی لیکن چوہدری نزاکت کے ناک پر مکھی بیٹھ چکی تھی اور وہ اس وقت بھیگی بلی بنا میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"ابھی تو ایک ماہ اور کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔"

"مجھے یقین ہے اور یہ یقین مجھے آپ کے لہجے نے دلایا ہے کہ آپ سچ بول رہے ہیں کہ آپ نے گناہوں سے توبہ کرلی ہے لیکن پھر یہ سب کیا ہے؟"

"میں اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ بالوں والی کا سراغ لگائیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی بڑی واردات ہو جائے۔" بڑی واردات میں نے زیر لب دہرایا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کھل کر بات کریں کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اس بات کے پیچھے ہمارے کسی دشمن کا ہاتھ ہے۔"

"ایسا آپ کا کون دشمن ہے؟ اور دشمنی کی وجہ؟"

"میرا چچا زاد بھائی شجاعت۔ اپنے والا یعنی میرے چچا کے مرنے کے بعد وہ یہ کہنے لگا ہے کہ تائے نے میل ملاپ کر کے ہماری کچھ زمینیں اپنی زمینوں میں ضم کرلی تھیں اور کاغذوں میں ہیرا پھیری کی ہے۔"

"اچھا......" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس سے سوال کیا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال میں چونکہ وہ لالچی بندہ ہے۔ اس لیے وہ ہماری زمینیں ہتھیانا چاہتا ہے اور ویسے ہی ہمیں رعب میں لانا چاہتا ہے۔"

"لیکن یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی کہ وہ ایسی حرکت کیوں کرے گا۔" دراصل مجھے یہ بات واقعی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ میرے خیال میں چوہدری نزاکت کسی مصلحت کے تحت یا خوامخواہ اپنے کزن کی بات کو اس مسئلے سے منسلک کر رہا تھا۔

بہرحال میں نے کسی قسم کی کوئی رپورٹ درج نہیں کی اور اسے یہ کہہ کر رخصت کردیا کہ میں دیکھوں گا۔ اس معاملے میں کیا کرسکتا ہوں؟ یہ مجھے ان کا کوئی گھریلو معاملہ لگتا تھا اور بال والا معاملہ علیحدہ تھا۔ میرے پاس شکیلہ والا کیس تھا اور مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ کی دو باتیں الجھا رہی تھیں۔

لیجیے وہ دو باتیں میں آپ کو اب بتا دیتا ہوں۔

رپورٹ میں ایک تو یہ تھا کہ وہ تین ماہ کی حاملہ تھی اور دوسرے وہ مرتے وقت کسی خواب آور دوائی کے زیر اثر تھی۔

اس بات کی وضاحت تو میں پہلے کرچکا ہوں کہ میرا شک یہ تھا کہ جہاں اس کی لاش ملی تھی وہاں اس کا گلا نہیں گھونٹا گیا تھا بلکہ گلا گھونٹنے کے بعد لاش کو وہاں لاکر پھینکا گیا تھا۔ اب یہ بات بھی سن لیں کہ اس کی قریبی سہیلی نگہت عرف نگو نے بتایا تھا کہ شکیلہ نے اس کو یہ تو بتایا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتی ہے لیکن اس کا نام وغیرہ نہیں بتایا تھا البتہ یہ بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ عنقریب رشتہ مانگنے آئیں گے یہ اس کے مرنے سے ایک مہینے پہلے کی بات تھی۔

یہ اندازہ تو میں نے لگا لیا تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے اپنی جھوٹی محبت کے جال میں شکیلہ کو پھنسا کر اسے برباد کردیا تھا اور اب ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا اور اب اس کے شادی کے اصرار پر اسے قتل کردیا تھا کیونکہ ایسے کئی کیس میرے پاس آئے تھے۔ یہ اسی شام کی بات ہے کہ میں نے سپاہی سکندر کو ساتھ لیا اور جھگیوں میں پہنچ گیا۔

ہم سادہ کپڑوں میں تھے۔ میں نے سردار کھیا کی جگی میں ڈیرہ لگالیا اور مقتولہ کی ماں فیروزہ بیگم کو وہیں بلالیا۔ اور سردار کو باہر بھیج دیا۔ اس کی حالت ویسی ہی تھی میں نے ادھر ادھر کے چند سوال کرنے کے بعد اس سے کہا۔

"بی بی اپنے آپ کو سنبھالو میں نے قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوئے قاتل کو پکڑنا ہے اور اسے سزا دلوانی ہے۔"

"اب کیا فائدہ ..... تھانیدار صاحب میرا تو سب کچھ برباد ہوگیا۔ میرا جینے کا سہارا چھن گیا۔"

"دیکھو بی بی اگر قاتل اور مجرموں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہاں جنگل کا قانون ہر طرف نظر آئے گا۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تھانیدار صاحب آپ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔"

"کیا یہ بات تمہارے علم میں تھی کہ مقتولہ یعنی تمہاری بیٹی کسی کی محبت میں گرفتار تھی؟"

"نہیں تھانیدار صاحب؟ لیکن یہ بات آپ کو کیسے پتہ چلی؟"

"ہمارے اپنے ذرائع ہیں تم اس بات کو چھوڑو۔"

پھر میں نے مناسب الفاظ میں اسے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے متعلق بتادیا۔ وہ حیران ہوکر میری طرف دیکھنے لگی۔

"بات یہاں تک بڑھ چکی تھی اوہ میرے خدا۔" اس نے سر پکڑلیا۔

میں نے کوئی بات نہ کی اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے سر اٹھایا اور گویا ہوئی۔

"تھانیدار صاحب آپ قانون کے محافظ ہیں۔ جو چاہیں کرسکتے ہیں میری آپ سے ایک التجا ہے۔ مرنے والی مرگئی ہے لیکن میں ابھی زندہ ہوں اور میں نے یہاں رہنا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں واقعی حیران تھا کہ یہ بی بی کیا کہہ رہی ہے؟

"آپ بے شک تفتیش کریں لیکن یہ بات ظاہر نہ کریں کہ گناہ کا پودا شکیلہ کے بطن میں پل رہا تھا۔"

"لیکن فیروزہ بیگم یہ کیسے ممکن ہے؟ پھر جب مقدمہ چلے گا تو ہر بات عدالت میں زیر بحث آئے گی۔ وکیل حضرات تو بال کی کھال اتارتے ہیں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب میں وقت سے پہلے مرجاؤں گی۔ بڑی مشکل سے یہاں سر چھپانے کو جگہ ملی تھی۔" اچانک اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو یہ میں نے کیا کہہ دیا؟ لیکن بات اس کے منہ سے نکل چکی تھی اور منہ سے نکلی بات اور تیر کمان سے نکل کر واپس نہیں آتا۔ اس وقت فیروزہ بیگم مجھے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی کیفیت میں نظر آئی۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"بی بی جو کچھ تمہارے دل میں ہے بلا جھجک اور اس اعتماد کے ساتھ کہہ ڈالو کہ یہ باتیں مجھ تک محدود رہیں گی۔"

"تھانیدار صاحب میں آپ کو اپنی کہانی سنا دیتی ہوں پھر یہ بات بھی آپ جان جائیں گے کہ میں کیوں شکیلہ کے معاملے میں آپ کو راز داری برتنے کے لیے کہہ رہی تھی۔" میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھر اس کی کہانی لفظ بہ لفظ میرے کانوں میں ٹپکنے لگی۔

"میں ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ یعنی تین بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ ہمارا گھرانہ نہ تو زیادہ آزاد تھا اور نہ زیادہ تنگ نظر۔ میٹرک کرنے کے بعد میں نے ضد کرکے کالج میں داخلہ لے لیا۔ حالانکہ بھائی اس بات کے مخالف تھے۔ اس وقت مجھے ان کی باتیں زہر لگتی تھیں۔ میں آزادانہ ماحول میں قدم رکھ چکی تھی۔ بس اسٹاپ پر آتے جاتے میں نے محسوس کیا کہ ایک خوب صورت لڑکا مسلسل میری طرف دیکھتا رہتا ہے۔ وہ بہت خوب صورت تھا۔ ایسا حسن مردوں میں بہت کم ہوتا ہے۔ میں کسی رومانی ناول کی طرح اپنی کہانی کو لمبا نہیں کروں گی بلکہ مختصر بیان کروں گی۔ ویسے ایک بات ضرور کروں گی کہ ان دنوں میں رومانی ناول بہت پڑھتی تھی اور میرا دل بھی اس نادانی کی عمر میں یہ چاہتا تھا کہ مجھے بھی کوئی چاہے۔ بہرحال وہ لڑکا وجاہت میرے دل میں اتر گیا۔ اب میں چاہنے لگی کہ وہ مجھ سے بات کرے۔ آخر ایک دن میری مراد بر آئی۔ اس دن کالج میں میرا پہلا پریڈ خالی تھا۔ یہ بات میں نے محسوس کرلی تھی کہ وہ بس اسٹاپ پر میرے پہنچنے سے پہلے آجاتا تھا۔ اس دن ایک تو میں گھر سے ذرا پہلے نکلی۔ دوسرے میں نے بس میں بیٹھنے کی بجائے

پیدل ہی کالج کی طرف چلنا شروع کردیا۔تھوڑی دور آ کر میں نے بڑے سلیقے سے پیچھے دیکھا تو وجاہت کو اپنے پیچھے آتا پایا۔میں اور تھوڑا آگے جا کر وہاں واقع ایک پارک میں چلی گئی۔اس وقت پارک میں اکا دکا لوگ تھے۔میں نے ایک بنچ پر بیٹھ کر اشارے سے اسے اپنے قریب بلالیا۔آج میں سوچتی ہوں تو مجھے حیرانگی اور شرمندگی ہوتی ہے کہ ان دنوں مجھے کیا ہوگیا تھا؟یہ شاید بالی عمر کا تقاضہ تھا۔وہ شاید خوشی اور حیرانگی کے ملے جلے تاثرات لیے میرے پاس آیا۔میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تم میرا پیچھا کیوں کررہے تھے؟''

''وہ جی جی میں ......میں تو......'' وہ ہکلانے لگا۔مجھے اس وقت ہنسی تو بہت آئی مگر میں نے بظاہر غصے سے کہا۔

''کیا بکری کی طرح میں میں لگا رکھی ہے۔سیدھی طرح بات کرو۔''

''دراصل میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

''اچھا تم دل کے ہاتھوں مجبور ہو اور میں اپنے ہاتھوں میں آنے والی کھجلی سے مجبور ہوں۔'' پھر میں نے اپنے ہاتھ اپنے پاؤں میں پہنے ہوئے سینڈل کی طرف بڑھائے۔

''دیکھیں آپ اگر اپنے سینڈلوں کو میرے سر پر آزمانا ہی چاہتی ہیں تو میرا سر حاضر ہے۔'' پھر اس نے سر جھکالیا۔اس وقت مجھے اس پر بے تحاشا پیار آیا۔اس کے بعد چل سو چل والی بات ہوئی۔پھر ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔کبھی کبھی ہم سینما دیکھنے بھی چلے جاتے تھے اور میں ان دنوں بہانے بنانے میں ماہر ہوگئی تھی۔ایک دن اس کے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے اس نے مجھے منت سماجت کرکے اپنے گھر بلالیا۔میں نادان وہاں چلی گئی اور انتہائی میں اس دن میری بربادی کی داستان رقم ہوگئی۔جب طوفان گزر گیا تو ہم ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔اس نے مجھے رخصت کرتے ہوئے تسلی دی کہ وہ بہت جلد اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیجے گا۔ہماری جب بھی ملاقات ہوتی تھی میں اس کو یاد دلاتی تھی کہ وہ اپنے والدین کو بھیجے۔اس طرح ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔اب مجھے اپنے اندر تبدیلی محسوس ہونا شروع ہوگئی تھی۔اس سے ملاقات ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔تو میرے اندر خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔اور اس وقت تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔جب مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ باہر ملک اپنے ماموں کے پاس چلا گیا ہے۔اب مجھے احساس ہوا کہ یہ میں نے کیا کرلیا؟اب کس کو اور کس طرح اپنے وجود کے اندر پلنے والے ایک اور وجود کے متعلق بتاتی؟دن رات سوچوں کی سولی پر ٹنگی رہتی۔کسی کل چین نصیب نہیں تھا۔اس وقت ریڈیو پر یہ گانا نیا نیا بجنے لگا تھا۔

''کس منہ سے تیرا نام لوں دنیا کے سامنے۔آئے گا کون ریت کی دیوار تھامنے۔''

میں اکثر تنہائی میں یہ گانا سنتے ہوئے روتی تھی لیکن رونے دھونے کا وقت گزر چکا تھا۔میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر کالج جانا بھی چھوڑ دیا۔آخر سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ خودکشی ہی میرے مسئلے کا حل ہے۔ایک رات میں اپنے کمرے کے پچھلے دروازے سے نکل گئی۔میری منزل ریلوے لائن تھی۔وہاں پہنچتے پہنچتے آدھی رات ہوگئی۔یہ جھگیاں اس وقت وہاں نہیں تھیں۔جہاں میں گئی تھی۔مجھے پتہ تھا کہ رات ایک بجے وہاں سے ایک پسنجر ٹرین گزرتی تھی لیکن ابھی میں ریلوے لائن تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ پیچھے سے آکر کسی نے مجھے پکڑ لیا۔میں ڈر گئی۔اچانک پکڑنے والا میرے سامنے آگیا اور بولا۔

''ڈرو نہیں میں انسان ہوں بھوت نہیں ہوں۔''

''تم جو کوئی بھی ہو مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔مجھے جانے دو۔میں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے دلیری سے کہا۔

''زندگی اتنی سستی نہیں ہے کہ اس کا خاتمہ کرلیا جائے۔'' وہ بولا۔

''میری زندگی بہت سستی ہوگئی ہے۔مجھے مت روکو۔پھر میں رونے لگ گئی۔وہ تسلی دلاسہ دیکر مجھے ایک جھگی میں لے گیا۔یہ سردار کی جھگی تھی۔یعنی موجودہ سردار کے باپ کی۔اس کے اصرار پر میں نے ساری بات اسے بتادی۔اپنی رام کہانی اس کے گوش گزار کردی۔وہ بولا۔

''ہمارے دل بہت کشادہ ہیں۔تمہاری دنیا کے لوگوں کی طرح تنگ نہیں ہیں۔تم خودکشی کا خیال دل سے نکال دو۔میں کل ہی تمہاری شادی نادر سے کروادوں گا۔ہم خانہ بدوش لوگ ہیں۔جلد ہی یہاں سے ڈیرہ اکھاڑ کر کہیں دور جاکر ڈیرہ لگالیں گے۔''

''تھانیدار صاحب نادر وجاہت کی طرح خوب صورت

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نہیں تھا۔ لیکن دل کا بہت خوب صورت تھا۔ اس نے جب تک وہ زندہ رہا مجھے کبھی کوئی طعنہ نہیں دیا۔ کبھی مجھے میرا ماضی یاد نہیں کروایا۔ دو سال پہلے اس کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے شکیلہ کو بھی باپ بن کر پالا تھا۔ شکیلہ کی پیدائش کے بعد میرے اندر کوئی ایسی خرابی ہوگئی کہ میں دوبارہ ماں نہ بن سکی۔" وہ خاموش ہوگئی۔ اس کی کہانی عبرت اثر تھی۔ ان لڑکیوں کے لیے سبق آموز ہے جو نادانی میں ایسے قدم اٹھا بیٹھتی ہیں۔ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ وہ کس لیے چاہتی تھی کہ شکیلہ کی کہانی عام نہ ہو۔ میں نے اسے کہا۔

"دیکھو بی بی میں پکا وعدہ نہیں کر سکتا۔ البتہ میری حتیٰ الامکان یہ کوشش ہوگی کہ پردہ پوشی کی جائے۔"

"ٹھیک ہے تھانیدار صاحب۔" لیکن چند لمحے اس نے کچھ سوچا پھر بولی۔

"جب تک قاتل اور میری شکیلہ کا مجرم نہیں پکڑا جاتا آپ تین ماہ والی بات صرف اپنے تک رکھیں۔ آپ کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں نا؟" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے یہ میرا تم سے پکا وعدہ ہے۔" میں بوجھل دل لیے وہاں سے سپاہی سکندر کے ساتھ واپس تھانے میں آ گیا۔ اس وقت رات کے دس بج گئے تھے۔ فیروزہ بیگم کی کہانی سنتے ہوئے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ صبح جب میں تیار ہو کر تھانے میں اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تو مجھے اطلاع دی گئی کہ پنڈ سجاول کے چوہدری اللہ دتہ صاحب آئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کچھ دیر کے بعد اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ پہلی بار میرے سامنے آیا تھا۔ وہ اونچا لمبا گورے رنگ کا ایک طرہ دار بندہ تھا۔ اس نے کپڑے تو گرمیوں والے پہنے ہوئے تھے لیکن ان کے اوپر ایک کالے رنگ کی واسکٹ جس کا کپڑا ٹھنڈا تھا بھی پہنی ہوئی تھی۔ عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ میں نے اسے اپنے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

"معاملہ تو ذاتی سا ہے۔ لیکن میں نے سوچا کہ آپ کے علم میں لے آؤں کیونکہ میرے بیٹے جمیل اور جمال غصے میں بھرے ہوئے ہیں۔"

"ایسی کونسی بات ہوگئی ہے چوہدری صاحب! کس نے آگ سے کھیلنے کی کوشش کی ہے؟" میں نے اس کی فطرت کے مطابق کہا۔

"کس کی جرأت ہے جو ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔ ہم اس کی آنکھیں نہ نکال لیں۔" پھر وہ اس طرح چپ ہوگیا۔ جیسے اسے اب احساس ہوا ہو کہ وہ تھانے میں ایک تھانیدار کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

"اوہ معاف کرنا تھانیدار صاحب۔ میں ذرا جذباتی ہوگیا تھا۔"

"اس بات پر مٹی ڈالیں۔ آپ وہ بات بتائیں جس کے لیے آپ آئے ہیں۔"

"آپ چوہدری نزاکت کو تو جانتے ہوں گے۔"

"بالکل جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ آپ نے اپنی بیٹی رخسانہ کو اس کے ساتھ بیاہا ہے۔"

"تھانیدار صاحب مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ اس لیے بیٹے کی شادی کر رہی ہے کہ وہ غلط راہوں سے لوٹ آئے لیکن......" اس نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا۔ پھر اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میری بیٹی پچھلے دنوں اپنے میکے آئی تھی۔ اس نے اس دوران کسی عورت کو بلا لیا۔"

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟" میں نے اس کا مدعا سننے کے لیے پوچھا۔

"جب میری بیٹی اپنے سسرال واپس گئی تو......" چوہدری نے چند لمحے بعد کہا پھر بولا۔

"اسے اپنے شوہر کے تکیے سے کسی عورت کا بال ملا۔ افسوس وہ بال ادھر ہی چھوڑ آئی تھی ورنہ؟"

"چوہدری صاحب وہ بال میرے پاس ہے۔" پھر میں نے اسے بال دکھایا تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ ملاقات پر چوہدری نزاکت مجھے بال والی ڈبی دے گیا تھا تاکہ میں کچھ سراغ لگاؤں۔ چوہدری اللہ دتہ مجھے بال واپس کرتے ہوئے بولا۔

"تھانیدار صاحب آپ چوہدری نزاکت کو اپنے کسی سپاہی کے ذریعے کہلوا دیں کہ وہ بال والی عورت کو ہمارے سامنے لائے۔ ورنہ کوئی بڑا واقعہ بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے اسے چوہدری نزاکت کے نقطہ نظر سے آگاہ کرنا مناسب سمجھا۔

"وہ شیطان جھوٹ بول رہا ہے۔" چوہدری اللہ دتہ غصے سے کانپتے ہوئے بولا۔

"آپ نے وہ بات تو سنی ہوگی کہ چور چوری سے چلا بھی جائے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔" میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔

ایک طرف ابھی شکیلہ کا مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ ادھر دو چوہدری میری جان کو آئے ہوئے تھے۔ اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں اس بات کی کھال اتارنے کے لیے میدان میں نکلوں۔ میں نے چوہدری کو یہ کہہ کر رخصت کردیا کہ وہ ٹھنڈا رہے اور اپنے بیٹوں کو بھی ٹھنڈا رکھے اور آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کرے میں بہت جلد بال والی عورت کا سراغ لگالوں گا۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد میں نے ہیڈ کانسٹیبل اشرف علی کو ساتھ لیا اور چوہدری نزاکت کی حویلی پہنچ گیا۔ اس کو جب ہماری آمد کا پتہ چلا تو وہ خود حویلی کے بڑے سے گیٹ پر ہمارے استقبال کے لیے آیا اور ہمیں اپنی بجی سجائی بیٹھک میں لے گیا اور ہماری خاطر تواضع کے لیے بھاگ دوڑ کا سوچنے لگا۔ لیکن میں نے اسے کہا کہ وہ کسی قسم کا تکلف نہ کرے ہم کھاپی کر آئے ہیں۔ لیکن اس نے پھر بھی ہمارے لیے باداموں والے ٹھنڈے دودھ کا بندوبست کردیا۔ نعمت خداوندی سے مستفید ہونے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"میں اس کی خواب گاہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ مجھے اپنی خواب گاہ میں لے گیا۔ وہاں بھی اس کی امارت نے پنجے گاڑھے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں پر دیدہ زیب اور مہنگے پردے پڑے ہوئے تھے۔ یہ کھڑکیاں پچھلی طرف کھلتی تھیں۔ وہاں کھلی فضا تھی اور کھیت اور کھلیان دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں خالص چیڑ کی لکڑی کی بنی ہوئی مسہریاں تھیں۔ جن پر امپورٹڈ گدے اور چادریں بچھی ہوئی تھیں وہاں پر چار کرسیاں اور ایک میز بھی تھی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو حکم دیا کہ وہ باہر لان میں ٹھہرے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے خواب گاہ کا جائزہ لیا اور کھڑکیوں کو کھول کر دیکھا۔ ان میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ خواب گاہ میں داخلی دروازے کے علاوہ اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ داخلی دروازہ باہر لان میں کھلتا تھا۔ میں نے چوہدری سے کہا۔

"باہر لان میں بیٹھنے کا بندوبست کرو۔" اس نے جلد ہی یہ انتظام کردیا۔ وہاں چار کرسیاں اور میز رکھ دی گئی۔ ایک پر میں اور دوسری پر ہیڈ کانسٹیبل اشرف علی بیٹھ گیا اور جونہی میری نظر میز پر پڑی میں اچھل پڑا۔ وہاں ایک بال پڑا ہوا تھا۔ ویسا ہی جیسا میرے دفتر کی دراز میں پڑا ہوا تھا۔ وہی لمبائی اور چمک اس بات میں تھی۔ میں نے بال اٹھالیا۔ اور اس طرح اسے دیکھنے لگا کہ چوہدری نزاکت کی نظر اس پر پڑ جائے۔ جلد ہی میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

"یہ کیا تھانیدار صاحب۔" وہ بے ساختہ بولا۔

"یہ ویسا ہی بال ہے۔ چوہدری جیسا پہلے تمہاری بیوی کو تمہارے تکیے پر مل چکا ہے۔ کیوں ایسا ہی ہے نا۔" میں نے بال اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"بالکل تھانیدار صاحب لیکن خواب گاہ میں تو ہمیں نظر نہیں آیا تھا۔ یہ کرسیاں اور میز وہاں سے ہی تو آئی ہیں۔"

"وہاں چوہدری صاحب ذرا اندھیرا تھا۔ اور یہ ٹھہرا کالا سیاہ بال۔"

"تھانیدار صاحب یہ سب کون اور کیوں کررہا ہے۔ یقین کریں میری تو مت ہی ماری گئی ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔

پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ واقعی چوہدری اس سے لاعلم ہے۔ اور بالوں والی عورت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن ایک بات مجھے الجھا رہی تھی کہ آخر بال ہی کیوں؟ اس میں بھی شاید کوئی راز پوشیدہ ہے۔

"وہ راز کیا ہے اور میں کبھی یقین اور کبھی بے یقینی میں کیوں مبتلا ہوجاتا ہوں یہ کیس واقعی پراسرار تھا۔ اور مجھے حقیقتاً دانتوں پسینہ آگیا تھا۔ میں نے ایک کاغذ منگوا کر بال کو اس میں لپیٹا اور ہیڈ کانسٹیبل کو دے دیا۔ پھر چوہدری سے کہا کہ سب نوکروں کو یہاں بلالے۔ یہ تعداد میں چھ تھے۔ دو عورتیں اور چار مرد۔ جو دو مرد کرسیاں اور میز اٹھا کر لائے تھے۔ ان میں ایک کا نام کرموا اور دوسرے کا رحمت تھا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بال کی طرف توجہ نہیں دی تھی اور نہ یہ جانتے ہیں کہ یہ بال کس طرح خواب گاہ میں پڑی میز تک پہنچا تھا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ دونوں واقعی لاعلم ہیں اور اپنے کام سے کام رکھنے والے نوکر ہیں۔

دوسرے دونوں نوکروں میں ایک مالی اور ایک ڈرائیور تھا۔ ان سے بھی کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوسکی۔ دونوں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ملازمائیں جوان تھیں ایک کھانا پکاتی تھی اور دوسری صفائی وغیرہ کرتی تھی اور کپڑے دھونا بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ میں نے ان سے سوال وجواب کرنے سے پہلے ان سے کہا کہ وہ اپنا ایک ایک بال جڑ سے اکھاڑ کر مجھے دیں۔ انہوں نے بلاحیل وحجت اپنا ایک ایک بال سر سے نکال کر میرے حوالے کردیا۔ میں نے ان کا باریک بینی اور محدب شیشے سے جائزہ لیا۔ تو یہ بال مجھے اس بال سے بہت زیادہ مختلف لگے۔ زمین وآسمان کا فرق تھا۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک فٹ لمبے اور قدرے کھردرے بال تھے۔ ان میں ایک کا نام سلمٰی اور جب کہ دوسری کا نام زینت معلوم ہوا۔ میں نے کافی گھما پھرا کے ان سے سوال وجواب کیے لیکن وہ بھی اس معاملے میں کوری تختی ثابت ہوئیں۔ میں نے انہیں کافی دھمکیاں بھی دی تھیں کہ اگر بعد میں مجھے کوئی بات معلوم ہوئی تو لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی نکلا تھا۔ میں نے سب کو فارغ کردیا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ میں نے چوہدری نزاکت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری خاص نوکرانی کوثر پروین نظر نہیں آرہی؟"

"کوثر پروین۔" اس نے زیرلب دہرایا۔ پھر بولا۔

"اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ ابھی تو یہیں تھی۔"

"اسے جلد حاضر کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ اس کے بعد کوٹھی کا کونا کونا اور اس کا کمرہ جو پھاٹک کے ساتھ تھا چھان مارا گیا لیکن وہ ایسے غائب ہوگئی تھی کہ جیسے کبھی گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوتے ہیں۔ البتہ یہ بات پتہ چلی کہ وہ عجلت میں اپنے کپڑے وغیرہ لے گئی ہے۔ ویسے مجھے اس قسم کے حالات پیش آنے کی توقع پہلے سے تھی۔ اس لیے حویلی آنے سے پہلے میں نے مخبر رفعت کو یہاں بھیج دیا تھا اور مجھے امید تھی کہ ملازم کوثر پروین اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوسکی ہوگی لیکن جب ہم تھانے میں واپس پہنچے تو اس وقت میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ جب میں نے مخبر رفعت کو تھانے میں موجود پایا۔ اس کو میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی بلالیا۔

"کیوں بھئی رفعت یہ منہ کیوں لٹکا ہوا ہے......؟"

"تھانیدار صاحب حویلی کی ملازمہ مجھے جل دے کر نکل گئی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ وہاں سے چھپتی چھپاتی اسٹیشن پر گئی۔ وہاں گاڑی تیار کھڑی تھی۔ میں نے تھوڑا فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ میرے پلیٹ فارم پر پہنچنے سے پہلے گاڑی روانہ ہوگئی۔ میں نے گھوم پھر کر ہر طرف دیکھا لیکن وہ مجھے نظر نہ آئی۔ میں بھاگم بھاگ تھانے میں آگئی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے مخبر رفعت سے کہا کہ وہ چلی جائے اور اردگرد نظر رکھے۔ میں منزل کے قریب پہنچ کر پھر منزل سے دور ہوگیا تھا۔ لگتا تو یہی تھا کہ ان پراسرار واقعات میں کوثر کا ہاتھ تھا۔ تبھی وہ بھاگ گئی تھی۔

اس کیس نے صحیح معنوں میں مجھے تگنی کا ناچ نچادیا تھا۔ شکیلہ والا کیس علیحدہ سر کے اوپر سوار تھا۔ خیر میں نے ہمت ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ میں نے فوری طور پر چوہدری نزاکت کو بلالیا۔ وہ جب میرے سامنے آیا۔ تو میں نے اس سے پوچھا۔ ذرا مجھے کوثر پروین کے متعلق بتاؤ۔

"تھانیدار صاحب اس نے تو ہمیں یہ بتایا تھا کہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔"

"اس لیے تم نے اسے اپنی داشتہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔"

"میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تھانیدار صاحب میں واقعی بہت برا تھا۔ شاید آج کل مجھے اسی وجہ سے سزا مل رہی ہے میں نے کوثر کو اپنے راستے پر چلانے کے لیے اس پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔"

"میں نے جس مقصد کے لیے اسے بلایا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا میں نے اسے رخصت کردیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی جیپ پر آیا تھا اور اکیلا آیا تھا۔ یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔ اس وقت دن کا ایک بج چکا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہمارے پاس اطلاع آئی کہ وہ گاؤں سجاول اور فرید کوٹ کے درمیان ویران جگہ پر جیپ میں مردہ پڑا ہوا ہے۔ اطلاع ایک راہ گیر لے کر آیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ضروری تیاری کی اور سرکاری گاڑی میں دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ ایک قدرے ویران علاقہ تھا۔ جس دور کی یہ کہانی ہے اس دور میں ابھی اتنی زیادہ آبادی نہیں تھی۔ اس قسم کے ویران اور سنسان علاقے آبادیوں کے درمیان مل جاتے تھے۔ راہ گیر نے ایک فوتگی میں جانا تھا اس لیے اس کا بیان اور پتہ نوٹ کرکے میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے لاش کا جائزہ لیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گولی سر میں لگی تھی اور میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ گولی قریب سے ماری گئی ہے اور یہ گولی ریوالور سے ماری گئی ہے ابھی اس کا جسم گرم تھا۔ جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اسے مرے زیادہ دیر نہیں گزری۔ جیپ کی سیٹ پر خون ہی خون تھا۔

میں نے سپاہی قمر کو چوہدری نزاکت کی حویلی کی طرف بھیج دیا۔ اور خود سپاہی سکندر کے ساتھ جیپ کا باریک بینی سے معائنہ کرنے لگا۔

”سر یہ دیکھیں۔ بال اچانک سپاہی سکندر نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروائی میں نے دیکھا کہ اس نے چٹکی میں بال پکڑا ہوا تھا۔“

”اوہ پھر وہی بال قارئین یہ تو ویسا ہی بال تھا۔“ میں نے بال کو محفوظ کرلیا۔ کچھ ہی دیر بعد چوہدری نزاکت کی ماں اور دیگر رشتے دار آ گئے اور وہاں عجیب سی سوگوار فضا بن گئی۔ اس کی ماں کے بین انسانوں کے ساتھ ساتھ اس ویرانے کا دل بھی دہلا رہے تھے اور اس وقت بڑی خراب صورت حال پیدا ہوگئی جب وہ سیدھی میری طرف آئی اور میرا بازو پکڑ کر بولی۔

”تم جاؤ شجاعت کو گرفتار کرو وہی میرے بیٹے کا قاتل ہے۔“

بڑی مشکل سے اسے دیگر عورتیں پیچھے ہٹا کر لے گئیں۔ میں نے نرم لہجے میں سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جو بھی قاتل ہے قانون کے شکنجے سے بچ نہیں سکے گا۔ مجھے اپنا کام کرنے دیں۔“ پھر میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی۔ شکر ہے لاش بھجواتے وقت کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ سپاہی قمر لاش کے ساتھ گیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اس نے دو کام کرنے ہیں ایک تو کھوجی کو ادھر بھیجنا ہے اور دوسرے ڈاکٹر کو میرا یہ پیغام دینا ہے کہ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ جلد از جلد مجھے چاہیے۔

آدھ گھنٹے سے بھی کم وقت میں کھوجی سرکاری گاڑی میں آ گیا۔ یہ اس طرح ہوا کہ جائے وقوع سے سپاہی قمر نے کھوجی کو اس کے گھر سے اٹھایا اور تھانے تک لے گیا اور تھانے میں کھڑی دوسری گاڑی میں کھوجی کو بٹھادیا۔ کھوجی کو میں نے الگ لے جا کر سمجھا دیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔

وہ اپنے کام کا ماہر تھا۔ اس نے کام شروع کردیا۔ میں نے سپاہی سکندر کو کھوجی کے ساتھ رہنے دیا اور خود گاڑی میں بیٹھ کر تھانے میں آ گیا۔

میں نے سپاہی قمر کو کہہ دیا تھا کہ لاش اسپتال میں پہنچا کر جائے واردات پر واپس آنا ہے۔

تھوڑی دیر میں وہاں بابا کھوجی کے ساتھ دو سپاہی اور سرکاری گاڑی اس کی مدد کے لیے موجود تھی اور میں اپنے اس انتظام سے مطمئن تھا۔ یہاں قارئین یہ بات بھی بتا دوں کہ مجھے جیپ کے آس پاس کچھ کھرے ملے تھے اور مجھے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ یہ کھرے مجھے بابا کھوجی کی تجربہ کار نگاہوں کے ذریعے مطلوبہ بندے تک پہنچا دیں گے۔

قارئین اس وقت مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ جب بابا کھوجی اور سپاہی دھول والے چہرے لیے میرے سامنے آ گئے۔ ان کے چہروں سے دبا دبا جوش بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ بابے کھوجی کو میں نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سپاہی قمر سے کہا۔

”جاؤ بازار سے باداموں والا ٹھنڈا دودھ لا کر بابا کھوجی کو پلاؤ۔“

”اللہ آپ کا اقبال بلند کرے۔ بات اس طرح ہے کہ میرے اندازے کے مطابق جس بندے نے چوہدری نزاکت کو گولی ماری تھی وہ تقریباً ایک میل پیدل چل کر وہاں تک گیا۔ درمیان میں کئی جگہ پکی سڑک بھی آئی۔ لیکن آخر میں کھرے اٹھائے اٹھائے وہاں پہنچ ہی گیا۔ ویسے ایک بات ہے تھانیدار صاحب وہ جلدی میں لگتا تھا۔“

”بابا جی آپ کا کام حیران کن ہے۔“ پھر میں نے اسے جیب سے کچھ روپے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

”ابھی سرکار جو انعام تمہیں دے گی وہ علیحدہ ہے۔ اس دوران شربت آ گیا تھا اور بابے کھوجی نے اسے اپنے معدے میں منتقل کرلیا تھا۔

اس کو رخصت کرنے کے بعد میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر حکم دیا کہ وہ چار اہلکاروں کو ساتھ لے جائے اور اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ جب اس کو میرے سامنے لایا گیا میں واقعی حیران رہ گیا تھا کہ یہ سب کچھ اس نے کیا تھا۔ شام کو کھوجی بابا اور سپاہی آگے نہیں گئے تھے۔ لیکن میں سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس جگہ کو تو میں بھول ہی نہیں سکتا تھا۔

جی ہاں وہ جگہ جھگیاں تھیں۔ کھوجی بابا ادھر اکیلا گیا تھا۔ سپاہی آدھا فرلانگ پیچھے درختوں کے جھنڈ میں کھڑے رہے

تھے۔

قارئین اب تو آپ بھی اس کو پہچان گئے ہوں گے۔ جی ہاں یہ فیروزہ بیگم تھی۔ اس وقت بھی اس کے پاؤں میں مردانہ جوتے تھے۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ ایک آسودہ مسکراہٹ تھی جیسی اپنے دشمن کو ختم کر کے خود تھانے میں پیش ہونے والے قاتلوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔

"وہ بولی تھانیدار صاحب آپ بہت جلدی مجھ تک پہنچ گئے۔ میں صبح خود ہی پیش ہو جاتی۔ میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔" اس نے چادر لپیٹی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ چادر کے اندر تھے۔

میں نے اسے کہا کہ ہاتھ باہر نکالو۔ اور جب اس نے ہاتھ باہر نکالے تو اس میں ایک کپڑے کا تھیلا تھا۔ جو اس نے میرے سامنے میری میز پر رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"خود ہی نکال کر دیکھ لیں۔"

جب میں نے تھیلے کے اندر پڑی چیز کو باہر نکالا تو اچھل پڑا یہ ریوالور تھا۔

"یہ آلہ قتل ہے۔ تھانیدار صاحب...... اس کو سنبھال کر رکھ لیں۔"

"لیکن تم نے یہ سب کیوں کیا؟ تمہاری چوہدری نزاکت کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دشمنی۔" اس نے دانت پیسے۔ پھر بولی۔

"میرا بس چلتا تو میں اس کی لاش کے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیتی۔" چند لمحے وہ مٹھیاں بھینچتی رہی۔ پھر نارمل ہوتے ہوئے بولی۔

"میری کہانی تو آپ سن چکے ہیں۔ میں سانپ کی ڈسی ہوئی تھی۔ اس لیے رسی سے بھی ڈرتی تھی۔ میرے ہونٹ گرم دودھ سے جلے تھے مگر میں ٹھنڈے دودھ کو بھی پھونکیں مارتی تھی۔ یعنی میں نے اپنی بیٹی شکیلہ کو کڑی نگرانی میں رکھا ہوا تھا۔ لیکن ایک دن وہ بولی۔"

"امی اگر آپ اتنی پابندیوں میں رکھیں گی تو میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی یا بھاگ جاؤں گی۔"

"میں نے اسے سمجھایا کہ بیٹا یہ باہر کی دنیا بظاہر بڑی رنگین ہے لیکن اندر سے بڑی زہریلی اور سیاہ ہے۔ میں اسے اپنی زندگی کی کہانی تو نہیں سنا سکتی تھی۔ اس طرح اس کی شخصیت بکھر جاتی۔ پتہ نہیں وہ کیا کر لیتی۔ آج میں سوچتی ہوں کہ اپنی کہانی اپنی آپ بیتی سنا ہی دیتی تو اچھا تھا۔ بہر حال وہ آزاد فضاؤں میں نکل گئی۔ نادر کے مرنے کے بعد میں چوڑیاں بیچنے جانے لگ گئی تھی۔ شکیلہ نے مجھے کہا۔ آپ گھر بیٹھیں چوڑیاں بیچنے میں جایا کروں گی۔ باقی جھگیوں کی لڑکیاں بھی تو کچھ نہ کچھ بیچنے جاتی ہیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہو گئی۔ کیونکہ نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ وہ مجھ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی۔ شاید اسے کچھ نہ کچھ کہانی پتہ چل گئی تھی۔ لیکن اس نے کبھی مجھ سے ذکر نہ کیا تھا۔ میں نے اس بات کو غنیمت جان کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اتنی بے بس کیوں ہو گئی تھی۔ تو مجھے خود پتہ نہیں کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔" وہ چند لمحوں کے لیے رکی۔

پھر بولی۔ "تھانیدار صاحب شاید میں اندر باہر سے ڈر گئی تھی۔ پھر وہ دن آیا جب میں نے اسے پریشان دیکھا۔ ہر وقت سوچوں کی گہرائی میں غرق دیکھا۔ مجھے اپنا دور یاد آ گیا۔ میں اندر باہر سے کانپ گئی۔ ایک وقت تھا جب میں اس کے آگے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتی تھی۔ ایک وقت یہ آ گیا تھا کہ وہ مجھ سے ڈری ڈری بلکہ شاید اپنے سائے سے بھی ڈری ڈری رہنے لگی۔" آخر ایک دن میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

"شکیلہ میری بیٹی مجھے بتاؤ تمہیں کیا فکر کھائی جا رہی ہے؟" وہ اچانک رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ جب رو دھو کر اس کے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا تو وہ بولی۔

"امی آپ ٹھیک کہتی تھیں کہ باہر کی دنیا واقعی بڑی ظالم ہے۔" پھر اس نے بتایا کہ "چوہدری نزاکت نے اسے جھوٹی محبت اور شادی کا جھانسہ دے کر لوٹ لیا۔ جب اسے اپنے اندر تبدیلی محسوس ہوئی تو اس نے رو رو کر اس سے التجا کی کہ وہ جلد از جلد اس سے شادی کر لے۔ وہ اسے جھوٹی تسلیاں اور دلاسے دے دے کر بہلاتا رہا۔ آخر ایک دن اسے یہ کہہ دیا کہ تم گھر گھر جا کر چوڑیاں بیچنے والی ایک آوارہ لڑکی ہو۔ پتہ نہیں کس کا گناہ میرے سر تھوپنے کی کوشش کر رہی ہو۔ دفع

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہو جاؤ آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔"

"امی میں تین ماہ سے......" وہ خاموش ہوگئی اور دوبارہ سسکنے لگی۔

"تھانیدار صاحب میرا جی تو چاہتا تھا کہ جوتی لے کر اس پر پل پڑوں لیکن میں نے اپنے غصے کو ضبط کرلیا۔ اس کے بعد میرے دل میں ایک تو اس کی نفرت بیٹھ گئی۔ دوسرے یہ سوچ مجھے زہریلا ناگ بن کر ڈسنے لگی کہ میں جھگی کے مکھیاں کو کیا بتاؤں گی۔ وہ کہیں گے جیسی ماں ایسی بیٹی۔ دیوار ہمیشہ بنیادوں پر جاتی ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ آج یا شاید کافی دنوں سے نیند کے لیے خواب آور گولیاں استعمال کرتی ہے۔ آخر وہ رات آ گیا۔ جس کی صبح آپ کو جھگیوں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر شکیلہ کی لاش ملی تھی۔ میں اچھی بھلی سوئی ہوئی تھی اور یہ خواب دیکھ رہی تھی کہ جھگیوں کے سب لوگ مجھ پر ہنس رہے ہیں اور بدکردار ماں کہہ کر مجھے پکار رہے ہیں۔ تھوڑی دور میری بیٹی کو کچھ لوگ سنگسار کر رہے ہیں۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں پسینے میں شرابور تھی۔ میں نے اٹھ کر پانی پیا۔ اور جب دوبارہ اپنی چارپائی پر جانے لگی تو لالٹین کی مدھم روشنی میں میری نظر شکیلہ پر پڑی۔ وہ گولیوں کے زیر اثر بے خبر سو رہی تھی اچانک مجھے اس سے شدید نفرت کا احساس ہوا اور میرے ہاتھ بے اختیار اس کی گردن پر چلے گئے۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ سب کچھ میں خواب میں کر رہی ہوں لیکن اس نے جب میرے ہاتھوں میں دم توڑ دیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے اور میں نے اپنی بیٹی کا گلہ گھونٹ کر اسے ہلاک کردیا ہے۔ میں بہت روئی لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ کافی دیر بعد میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور مجھے خیال آیا کہ صبح لوگ پوچھیں گے کہ تم نے اپنی بیٹی کا گلہ کیوں گھونٹا پھر مجھے ساری شرمناک کہانی بتانی پڑے گی۔ میں نے شکیلہ کی لاش اٹھائی اور وہاں رکھ آئی جہاں سے آپ کو ملی تھی۔ خود آ کر آنکھیں بند کر کے جھگی میں لیٹ گئی۔ صبح جب سردار لاش کا بتانے آیا تو میں نے جھوٹ بول دیا کہ میں تو سوئی ہوئی تھی۔ اور شکیلہ بھی رات جھگی میں سوئی تھی۔ اس میں آدھی بات سچی تھی۔ بہرحال پھر آپ آ گئے۔ یقین کریں اس وقت میں اداکاری نہیں کر رہی تھی بلکہ میری حالت ہی ایسی ہوگئی تھی۔ پھر میرے دل میں یہ بات سما گئی کہ مجھے چوہدری نزاکت سے انتقام لینا ہے۔ میں اسے شکل سے جانتی تھی۔ اس نے مجھ پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے دھتکار دیا تھا ان دنوں میں چوڑیاں بیچنے جایا کرتی تھی۔ اور اس دوران میری دوستی چوہدری نزاکت کی نوکرانی کوثر پروین سے ہوگئی تھی۔ وہ بھی چوہدری کی ڈسی ہوئی تھی اس کی کہانی آپ تک پہنچ گئی ہے۔

اس موقع پر میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے پتہ تھا کہ وہ بڑی چوہدرانی کی دوائی لینے ثاقب میڈیکل اسٹور پر آتی ہے۔ اس کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ مہینہ ہوگیا ہے چوہدری نزاکت کی شادی ہوگئی ہے۔ یہ بات بتانا اسے پہلے یاد نہیں رہا تھا۔ بہرحال جس کام نے جس وقت ہونا ہوتا ہے وہ اسی وقت ہوتا ہے۔ اس دن شکیلہ کو مرے تیسرا دن تھا۔ جھگی سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ جب میں نے چوہدری نزاکت کی شادی کا سنا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے اسے سسکا سسکا کر مارنے کا ارادہ کرلیا۔ یہاں یہ بات بتادوں کہ میں نے شکیلہ کے کچھ بال کاٹ کر رکھ لیے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے کوثر کو راضی کیا کہ موقع دیکھ کر میاں بیوی میں بدگمانی اور غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے مناسب موقع دیکھ کر ان کی خواب گاہ میں ایک بال رکھ دے۔"

"تھانیدار صاحب وہ ویسے راضی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے غصہ دلایا تھا کہ یہ چوہدری سے انتقام لینے کا اچھا موقع ہے۔ دوسرے میں نے اسے پیسے بھی دیئے تھے۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تو میں نے اسے بتایا کہ کوثر نے کس طرح مختلف مواقع پر یہ کام کیا تھا۔ اور جب میں نے لان میں سب کو اکٹھا کیا تو وہ نکل گئی تھی۔

"تھانیدار صاحب جب عورت انتقام لینے پر آتی ہے تو اس میں بے پناہ طاقت آ جاتی ہے۔ میں نے پہلے یہ سوچا تھا کہ صرف چوہدری کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولوں گی لیکن بعد میں میں نے سوچا کہ ایسے سانپ کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ اس لیے میں موقع کی تلاش میں رہنے لگی۔ یہ کام میں خود کرنا چاہتی تھی۔ آج میں تھانے کے پاس سے گزر رہی تھی۔ تو میں نے چوہدری نزاکت کی جیپ کو تھانے کے باہر دیکھا اور سوچنے لگی۔ کاش وہ اکیلا ہی آیا ہو...... میں کسی بھی طریقے سے اس کی زندگی کا چراغ گل کرانا چاہتی تھی۔ میں تھوڑی

دور آگے جا کر جہاں گھنے درختوں کا جھنڈ ہے وہاں چھپ گئی۔ میری نظریں سڑک پر ہی تھیں۔ کچھ دیر بعد مجھے جیپ آتی دکھائی دی۔

قارئین یہاں یہ بات بتادوں کہ یہ سڑک عام سڑک تھی۔ جو آگے جا کر جی ٹی روڈ سے مل جاتی تھی۔ جیپ کی رفتار کم ہی تھی...... میں اچانک جیپ کے سامنے آ گئی۔ اسے جیپ روکنی پڑی۔ وہ چلا کر بولا۔

"کیوں میرے سر چڑھ رہی ہو۔ آگے جی ٹی روڈ پر اپنا شوق پورا کرو۔"

"میں کود کر جیپ میں سوار ہو گئی۔ ارے ارے مان نہ مان میں تیرا مہمان۔"

چوہدری ایک وہ دن تھا جب تم میرے آگے پیچھے پھرتے تھے اور آج میں خود تمہاری جیپ میں آ گئی ہوں تو ......" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"چپ چاپ نیچے اتر جاؤ۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

"اچھا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے اپنی پریشانی بتادو تو شاید میں تمہاری کوئی مدد کردوں۔"

"مدد......!" اس نے زیر لب دہرایا اور جیپ اسٹارٹ کردی۔ اور جب اس نے اپنی پریشانی مجھے بتائی تو میں جی ہی جی میں خوش ہوئی کہ اونٹ نہ صرف پہاڑ کے نیچے آ گیا ہے بلکہ بلبلا بھی رہا ہے۔

"دیکھو چوہدری تم مجھے کسی طرح اپنی حویلی میں رہنے کی جگہ دے دو۔ میں بالوں والی عورت کا سراغ لگانے کی کوشش کروں گی۔" میں نے چالاکی سے کہا۔

"ٹھیک ہے ہماری ایک نوکرانی چلی گئی ہے۔ اس کی جگہ تم لے سکتی ہو۔ اگر تم نے اس عورت کا سراغ لگالیا تو میں تمہیں انعام دوں گا۔"

"یہ تو بعد کی بات ہے۔" میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور یہ جان چکی تھی کہ کوثر کے متعلق اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ان واقعات میں ملوث تھی۔ اس کے ساتھ میں نے کوئی نہ کوئی بات تو کرنی ہی تھی اس لیے اس سے پوچھا۔

"کوثر تمہاری نوکرانی کیوں چلی گئی؟"

"شاید پولیس سے ڈر کر۔"

اچانک میں نے دیکھا۔ سامنے ریوالور پڑا ہوا ہے۔ وہ اپنی موت کا سامان ساتھ لیے پھر رہا تھا۔ مجھے نادر نے ریوالور چلانا سکھا دیا تھا۔ میں نے سوچا لمبا راستہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پہلے میرا ارادہ تھا حویلی میں جا کر موقع تلاش کرنے کا۔ قدرت نے مجھے یہاں ہی موقع فراہم کردیا تھا۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا۔ جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو فوراً بولا۔

"ارے ارے یہ کیا کررہی ہو؟ اس کا لاک کھلا ہوا ہے۔ چل جائے گی۔"

"اچھا......" میں ایک بار پھر ہنس پڑی۔ پھر بھیانک آواز میں بولی۔

"چوہدری تم ایک ناسور ہو۔ ایک بھنورے ہو۔ زہریلے ناگ ہو۔ میں تمہیں بتاتی ہوں شکیلہ میری بیٹی تھی۔ جس کی زندگی تم نے برباد کر کے اسے آوارہ کہہ دیا تھا۔" چوہدری نے پورے بریک لگا کر جیپ روک دی لیکن میں نے اس سے پہلے ہی ریوالور کا ٹرائیگر اس کے سر کے ساتھ لگا کر دبا دیا تھا۔ اور خود جیپ کے دروازے کے قریب ہو گئی تھی۔ جونہی جیپ رکی وہ بھیانک چیخ کے ساتھ سیٹ پر گر گیا۔ اور میں چھلانگ لگا کر جیپ سے نیچے آ گئی۔ بے خیالی میں ریوالور ساتھ ہی لے آئی۔

اس وقت سڑک پر ہو کا عالم تھا۔ قدرت آج مجھے پورا موقع فراہم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میں وہاں یعنی جیپ میں بال چھوڑ آئی تھی۔ میں نے اسے قانون کے حوالے کردیا تھا لیکن جیل میں جاتے ہی اس نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کرلی۔ ظاہر ہے وہ عدالت میں ذلیل و خوار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یہ اس کا مجھ پر احسان تھا کہ اس نے تھانے میں خودکشی نہیں کی تھی۔ ظاہر ہے اس نے اس مقصد کے لیے گولیاں اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں۔

⌘

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

طاہر قریشی

آج کل سمندری طوفان نے امریکی ساحلی شہروں کا رخ کیا ہوا ہے اس کی تباہ کاریوں کے حوالے سے رپورٹیں آپ لوگ روزانہ اخبارات میں پڑھ اور ٹی وی و نیٹ پر دیکھ رہے ہوں گے مغرب میں ان طوفانوں کو مختلف نام دینے کا چلن عام ہے اس کی وجوہات سے کوئی واقف نہیں۔

ایک پولیس آفیسر کی روداد، اس نے سمندری طوفان کو انسانی شبیہ میں دیکھا تھا لیکن کوئی اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

صبح کا وقت تھا آسمان بالوں سے سرمئی ہو رہا تھا۔ تیز ہواؤں کے جھکڑوں سے درختوں کی شاخیں اور مکانوں کی کچی چھتیں فضا میں اڑ کر بکھر رہی تھیں۔ ساحل سمندر پر واقع چھوٹی سی بستی طوفان کی زد میں تھی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا اور جب بھی سمندری طوفان کا خطرہ ہوتا بستی کو مکینوں سے خالی کروالیا جاتا تھا۔ اس بار بھی یہی ہو رہا تھا بستی سے تقریباً تمام افراد محفوظ مقام پر پہنچائے جاچکے تھے لیکن بوڑھے فری لنگ نے جانے سے انکار کردیا تھا۔ آخر یہ ذمہ داری پٹرولنگ پولیس آفیسر رے ہارلن کے حصے میں آئی تھی اور اس نے موقع پر پہنچ کر بوڑھے فری لنگ کو پٹرولنگ کار میں بٹھایا تھا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔

"آخر میرا جانا اتنا ضروری کیوں ہے؟" بوڑھے فری لنگ نے جھنجلا کر کہا۔ "میں یہاں کا پرانا باشندہ ہوں اور پہلے بھی ایسے ہی سمندری طوفانوں کا سامنا کرتا رہا ہوں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"یہ سمندری طوفان ہیلن ہے اور بہت خطرناک ہے۔" رے ہارلن نے کہا۔ "ہمیں حکم ہے کہ ایک ایک فرد کو بستی سے نکال لیا جائے چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو یہ گورنر کے احکامات ہیں۔"

"لیکن میں تو بہت بوڑھا ہوں پہلے ہی قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں کسی وقت بھی موت مجھے گلے لگا سکتی ہے۔ میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" فری لنگ نے کہا۔

"فری لنگ' میں مجبور ہوں۔ میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا...... میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں اور حکام کے سامنے جواب دہ ہوں۔"

"ہاں ہاں' میں جانتا ہوں۔" فری لنگ نے بے زاری سے کہا پھر اسی وقت بارش شروع ہوگئی تھی۔ رے ہارلن نے کار کے شیشے بند کرلیے تھے بارش کے منہ زور قطرے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے آسمان پر وقفے وقفے سے بجلی چمک رہی تھی اور بادلوں کی شدید گرج دل دہلا رہی تھی پھر رے نے ونڈ شیلڈ وائپرز بھی اسٹارٹ کردیئے تھے بادل گہرے ہوتے جارہے تھے اور اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ رے ہارلن نے کار کا ٹرانس میٹر بھی آن کردیا تھا اور پٹرولنگ کار کو آگے بڑھایا تھا۔ فری لنگ بستی کا آخری شخص تھا جسے وہ لے جارہا تھا پوری بستی خالی ہوچکی تھی اندھیرا اتنا پھیل گیا تھا کہ رات کا گمان ہو رہا تھا جب کہ ابھی دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی۔

"تمہیں یہ طوفانی لہریں نظر آرہی ہیں؟" رے ہارلن نے سمندری رخ پر موجود کھڑکی سے باہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں سمندر کی منہ زور لہروں کو ساحل سے سر پٹختے دیکھا جاسکتا تھا جن کے ٹکرانے سے سمندر کا پانی کئی کئی فٹ اونچا اچھل کر فضا میں ایک سفید قطروں کی

چادر سی بنا رہا تھا اور جگہ جگہ سے بستی میں داخل ہو رہا تھا۔ فری لنگ حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے اس منظر نے مجھے اپنی زندگی کے کچھ واقعات یاد دلا دیئے ہیں۔'' فری لنگ نے رے ہارلن کی طرف مڑتے ہوئے کہا جس کی پوری توجہ کار کو تیزی سے آگے بڑھانے پر لگی ہوئی تھی۔

''یہ 1954ء کی بات ہے میں ایک چھوٹے سمندری جہاز میں کیوبا کے ساحلوں سے تقریباً چالیس پچاس میل شمال میں سفر کر رہا تھا میرے پاس سگاروں کا خاصا ذخیرہ تھا جو مجھے ہوانا پہنچانا تھا تب میں سمندری طوفان میں گھر گیا۔''

''اوہ...... کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟'' رے ہارلن نے بے یقینی سے پوچھا اس کی نظریں ونڈ شیلڈ پر تھیں جہاں سے وہ منہ زور لہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہوا کے تیز جھکڑ کار کو جھٹکے لگا رہے تھے اچانک کوئی چیز کار کی چھت سے ٹکرائی تھی۔

''ہاں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اس طوفان کو محکمہ موسمیات والوں نے ''ہچوئیل'' کا نام دیا تھا وہ بھی بہت سخت طوفان تھا میں اس وقت جہاز کے وہیل ہاؤس میں اکیلا تھا اور جہاز کو گائیڈ کر رہا تھا جب کہ جہاز کا کیپٹن بیمار تھا اسے فوڈ پوائزننگ ہوگئی تھی۔ اس نے کچھ ایسا کھا لیا تھا جو فوڈ پوائزننگ کا سبب بنا تھا وہ اپنے کیبن تک محدود تھا جہاز پچاس فٹ بلند لہروں کے درمیان ہچکولے کھا رہا تھا اور آسمان گہرا سیاہ ہوگیا تھا۔ ہوا تیز سیٹیاں بجاتی چل رہی تھی اور جہاز سے کچھ فاصلے پر رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی ہم وہیل ہاؤس میں کھڑے موت کا یہ منظر دیکھ رہے تھے ہمارے دل خوف سے کانپ رہے تھے اور گنگ ہو چکے تھے تب ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا میں ایک کھڑکی سے باہر جھانک کر طوفان کا جائزہ لے رہا تھا کہ مجھے ایک عورت نظر آئی جو لہروں پر چل رہی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے تیر رہی تھی؟'' رے نے پوچھا۔

"نہیں......میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ کیا میں نے ایسا کہا؟......میں نے کہا وہ چل رہی تھی اس کے پاؤں بالکل بھی پانی کو نہیں چھو رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لہروں کے درمیان اچھل اچھل کر ایک لہر سے دوسری لہر تک جاتے ہوئے کوئی کھیل کھیل رہی ہو لگتا تھا یہ اس کا پسندیدہ کام ہو۔ وہ خوش نظر آرہی تھی۔"

"وہ دیکھنے میں کیسی تھی؟" رے نے فری لنگ کی باتوں میں کچھ یقین اور کچھ بے یقینی کی کیفیت میں اس سے پوچھا۔

"میں نے اسے اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بال سیاہ تھے اور اس نے نیلا......مائل پیلا لباس پہنا ہوا تھا جو ہوا کے زور سے اس کے پیچھے کی طرف لہرا رہا تھا وہ دیکھنے میں خوب صورت تھی لیکن میری پسند کے برخلاف خاصی دبلی تھی یوں لگ رہا تھا کہ سمندر کی لہروں کے درمیان ہونے کے باوجود وہ بھیگی نہیں تھی حالانکہ وہ طوفان کے درمیان موجود تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر میں نے اپنے دوست سے کہا آؤ یہ دیکھو...... یہ دیکھو......تمہیں اس پر یقین نہیں آئے گا۔"

"کیا ہے؟ جس پر مجھے یقین نہیں آئے گا؟" میرے دوست جیک نے پوچھا۔

"جلدی......جلدی ادھر آؤ۔" میں نے اس سے کہا اور وہ میرے قریب آگیا پھر اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اس نے بھی اسے دیکھا وہ بہت حیران ہوا تھا کاش تم اس وقت اس کا حیرت زدہ چہرہ دیکھ سکتے۔" فری لنگ نے کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ تم نے یہ سب دیکھا؟" رے ہارلن نے پوچھا۔

"ہاں میں جو کہہ رہا ہوں اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے ہم اسے کھڑکی میں سے دیکھ رہے تھے وہ ہمیں نظر انداز کررہی تھی ہم نے محسوس کیا وہ جب بھی چلتی تو تیزی سے حرکت کرتی......میرا مطلب ہے کہ جب ہم چلتے ہیں تو جتنی دور ہمارا دوسرا قدم پڑتا ہے اتنا ہی آگے بڑھتے ہیں لیکن وہ جب بھی قدم بڑھاتی تو وہ کم از کم دس فٹ کا فیصلہ ہوتا یوں لگ رہا تھا کہ وہ چل نہیں رہی ہے بلکہ اڑ رہی ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے قدم سمندر کے پانی کو نہیں چھو رہے تھے۔"

"کیا وہ جہاز کی طرف آرہی تھی؟" رے نے پوچھا۔

"نہیں وہ لہروں سے بننے والی ایک پانی کی دیوار کے پیچھے چھپ گئی تھی اور پھر ہم نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔"

"پھر؟......پھر کیا ہوا؟ کیا تم نے لوگوں کو بتایا؟"

"ہاں لیکن میرے دوست جیک نے اس واقعے سے ہی انکار کردیا اور مجھے خفگی اٹھانی پڑی لوگ میرا مذاق اڑا رہے تھے میرا خیال ہے اسی ڈر سے اس نے بھی انکار کیا ہوگا کہ کوئی ہمارا یقین نہیں کرے گا اور مذاق اڑائے گا اور ممکن ہے کہ نوکری بھی چلی جائے کیونکہ پہلے ایک شخص کے ساتھ ایسا ہو چکا تھا۔"

"تمہاری بات سمجھ میں تو آتی ہے۔" رے نے کہا اور فری لنگ پھر کار کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ جہاں سمندر کی لہریں ساحل سے سر ٹکرا رہی تھیں۔

"میں جب بھی کبھی ایسا موسم دیکھتا ہوں مجھے اس عورت کا خیال آجاتا ہے۔" فری لنگ نے کہا اسی وقت ہوا کے زور سے ایک بھاری دھات کا ٹکڑا اڑتا ہوا کار کے سامنے آگرا اور رے بڑی مہارت سے اس سے بچتا کار کو آگے لے گیا طوفان شدید ہوتا جارہا تھا۔

"میں سوچتا ہوں یہ لوگ طوفانوں کو نام کیوں دیتے ہیں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔" فری لنگ نے کہا۔

"کیوں؟ تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟"

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے پرانے زمانے میں یونانی لوگ مختلف دیوتاؤں کے نام رکھتے تھے یہ بھی وہی کررہے ہیں جب کوئی قدرت کی کسی طاقت کو انسانی نام دیتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ اسے ایک شخصیت سمجھ رہا ہوں اور اگر وہ شخصیت آپ کو پسند کرتی ہے تب تو بہت اچھا ہے لیکن اگر وہ آپ کے خلاف ہو اور آپ کو اپنا دشمن سمجھ لے اور آپ کے خلاف تباہی مچادے تو؟"

"لیکن ہیلن تو کسی دیوی کا نام نہیں ہے۔" رے نے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا......تم نے موسم کی رپورٹ دیکھی ہے یا نہیں؟ شاید تم نے غور نہیں کیا کہ "ہیلن" طوفان اس وقت تک ساحل کی طرف نہیں بڑھا جب تک انہوں نے اسے یہ نام نہیں دے دیا نام ملنے کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بعد وہ ساحل کی طرف آیا۔" فری لنگ نے وضاحت کی اور رے نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلایا کیونکہ دفتر سے نکلتے وقت سارجنٹ ڈگاس نے اسے تنبیہ کی تھی کہ بوڑھے فری لنگ سے الجھنا مت وہ پاگل پن کی حد تک خبطی ہے اس کے ساتھ نرمی سے پیش آنا اس سے الجھنے کی صورت میں اسے اپنی بات سمجھانا ممکن نہیں ہوگا۔

"ٹھیک ہے فری لنگ......تم جو کہتے ہو ٹھیک ہی ہوگا۔" رے نے کہا۔

"ہاں...... وہ کسی خونخوار جانور سے کم نہیں ہے تم دعا مانگو کہ یہ ہمیں ہلاک نہ کرے۔" فری لنگ نے کہا تو رے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری وہ سوچ رہا تھا آج کا دن بہتر گزرنے کی امید نہیں ہے۔

رے نے کار ایک بڑے ہائی اسکول کے سامنے روکی تھی جہاں ہنگامی صورت حال میں لوگوں کے رہنے کے لیے محفوظ کیمپ بنایا گیا تھا۔ رے کار سے باہر آیا تھا اور اس نے فری لنگ کے لیے بھی کار کا دروازہ کھولا تھا بارش تیزی سے ہو رہی تھی رے نے دیکھا کہ کار کے اوپر لگا ہوا سائرن اور لائٹ بار غائب تھے۔ شاید کسی اڑتی ہوئی چیز کے ٹکرانے سے وہ نکل کر کہیں گر گئے تھے اچانک ایک اور دھات کا ٹکڑا اڑتا ہوا آیا اور رے سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا رے کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی ان کا یوں کھلی جگہ میں کھڑے رہنا خطرناک تھا۔

"جلدی کرو فری لنگ۔" رے نے کہا اور کار سے اپنا کوٹ نکالا فری لنگ نے بھی تقلید کی تھی اور دونوں اسکول کی عمارت کی طرف دوڑے تھے پھر عمارت میں داخل ہوتے ہی رے نے دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ طوفانی بارش اندر نہ آسکے۔

"شکر ہے تم دونوں پہنچ گئے۔" سارجنٹ ڈگاس نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا جو وہاں موجود تھا۔

"ہاں...... باہر بہت برے حالات ہیں۔" رے نے کہا اسی وقت ایک سرخ لباس میں ملبوس خاتون کمرے میں داخل ہوئی جس کے ہاتھ میں ایک کلپ بورڈ تھا۔

"مسٹر فری لنگ؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں......میں فری لنگ ہوں۔" فری لنگ نے جواب دیا عورت نے اپنے کلپ بورڈ کو چیک کر کے رے کی طرف دیکھا۔

"ہائے رے۔" اس نے کہا اور رے کو حیرت ہوئی کہ وہ اسے کیسے جانتی ہے۔

"کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟" رے نے پوچھا۔

"نہیں، ہم ملے تو نہیں لیکن میں نے اکثر یہاں تمہیں دیکھا ہے۔" عورت نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ......تم سے مل کر خوشی ہوئی لنڈا۔" رے نے اس کے کاندھے پر لگے بیج سے اس کا نام پڑھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی۔" لنڈا نے جواب دیا اور پھر فری لنگ کی طرف مڑی۔

"پلیز آپ میرے ساتھ آئیں۔" اس نے کہا اور فری لنگ اس کے ساتھ ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔

"وہ تمہارے بارے میں مجھ سے پوچھ رہی تھی۔" ڈگاس نے ان کے جانے کے بعد رے سے کہا۔

"تم عورتوں کو بہت پسند آتے ہو بھلا تم یہ کیسے کر لیتے ہو؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا شاید وہ سمجھتی ہیں کہ میں انہیں پسند کرتا ہوں لیکن اس میں میری مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے۔" رے نے کاندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"کیا تم کافی پیو گے؟"

"نہیں شکریہ۔"

"کیا واقعی نہیں پیو گے؟ ریڈ کراس volunteer کافی بنا رہے ہیں اگر پیو تو بتا دو۔" ڈگاس نے پھر پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں......شاید بعد میں پی لوں لیکن ابھی دل نہیں چاہ رہا۔" رے نے جواب دیا۔

"میں نے تم سے ریڈیو پر رابطہ کرنا چاہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی تب ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم طوفان میں گھر گئے ہو گے۔" ڈگاس نے کہا۔

"ریڈیو کا انٹینا کار سے ٹوٹ کر نکل گیا تھا......کیا سب کو بستی سے نکال لیا گیا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے کہ سب کو نہیں نکالا جا سکا ابھی ایک فیملی باقی ہے یہ کلوو 225 میں رہتے ہیں اور فیملی کا سربراہ لونگ اسٹون ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ جگہ ساحل سے قریب ہے۔"

"ہاں، ہم نے انہیں کال کرنے کی کوشش کی لیکن رابطہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نہیں ہوا۔ جب سے طوفان کی وارننگ پہلی بار براڈ کاسٹ ہوئی ہے انہیں نہیں دیکھا گیا ایک پڑوسی کا خیال ہے کہ شاید وہ بلڈنگ کے اندر موجود ہیں اور ہیلن سے بچنے کی جدوجہد کررہے ہیں۔"

"وہ جگہ اس طرح تباہ ہوگی...... جیسے ٹوتھ پک کی تیلیاں بکھر جاتی ہیں۔"

"میں جانتا ہوں لیکن میرا خیال ہے یہ بات وہ لوگ نہیں جانتے۔ ہیلن ایک قاتل ہے اب تک وہ سات زندگیاں لے چکا ہے ہم دعائیں مانگ رہے ہیں کہ جب وہ ساحل سے ٹکرائے تو اس کا زور ٹوٹ جائے۔"

"ہمارے پاس کتنا وقت ہے؟"

"محکمہ موسمیات کا کہنا ہے کہ ہیلن اپنی پوری قوت سے دوپہر تک ساحل سے ٹکرائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ گلف کوسٹ سے مغرب کی طرف جائے گا ممکن ہے اس کی پہنچ ٹیکساس تک ہو۔ بہت تباہی ہوسکتی ہے۔"

"میرا خیال ہے اتنا وقت ہے کہ میں لونگ اسٹون تک پہنچ جاؤں گا۔" رے نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال نہیں کہ ایسا ممکن ہے...... یہ بہت خطرناک ہوگا۔" ڈگلس نے کہا لیکن رے اس کی بات نہیں مانتا تھا اور اپنی کار میں بیٹھ کر لونگ اسٹون کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ جگہ جگہ سڑکوں پر پانی جمع ہوگیا تھا وہ بہت آہستہ کار چلا رہا تھا سامنے کا منظر بھی بارش کی وجہ سے دھندلا نظر آرہا تھا آسمان سیاہ ہوتا جارہا تھا اچانک ایک چھت کا بورڈ کار سے ٹکرایا اور اسی وقت راستے میں بڑا سا پتھر آگیا جس نے ونڈ شیلڈ کو نقصان پہنچایا اور پسنجر سائیڈ کے شیشے میں کریک پڑ گیا۔

جب رے کلوو اسٹریٹ پہنچا تو کار کے دھندلے شیشوں سے اس نے باہر بلڈنگوں کے شیشے ٹوٹتے دیکھے وہ کار سے باہر آگیا اور بلڈنگ کے قریب جا کر اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر کا منظر امید افزا نہیں تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے بلڈنگ میں پانی بھر گیا تھا جس میں اندر کا سامان تیر رہا تھا۔

مسٹر لونگ اسٹون۔" رے نے آواز لگائی لیکن جواب میں اسے چنگھاڑتی ہوئی ہوا کی آواز ہی سنائی دی۔ وہ بلڈنگ میں داخل ہوگیا اور اچھی طرح پوری بلڈنگ کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا۔ وہ واپس باہر آگیا اور اپنی کار کی طرف بڑھا تیز ہوا اس کے چلنے میں مزاحمت کررہی تھی۔ بارش کے بھاری قطرے اس کے سر اور شانوں پر گر رہے تھے اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا اچانک روڈ پر لگا ہوا ایک سائن بورڈ اکھڑ کر اس کی طرف آیا اور اس کے سر سے ٹکرایا۔ رے چوٹ کی شدت سے گر گیا تھا اور بے ہوش ہوگیا تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو ہر طرف خاموشی تھی۔ اس کے سر میں شدید درد ہورہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر آجانے والے بال ہاتھ سے ہٹائے تو اس کے ہاتھوں میں خون لگ گیا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ وہ مشکل سے کھڑا ہوا اور ایک دیوار کا سہارا لے کر منظر کا جائزہ لینے لگا۔ جو اسے دھندلا نظر آرہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ درخت ٹوٹ کر اس کی پیٹرول کار پر گرا ہوا ہے۔ اسے اپنی حماقت پر غصہ آیا کہ اس نے اپنی کار درخت کے قریب کیوں پارک کی تھی اس نے اطراف کا جائزہ لیا ہر طرف مختلف قسم کا سامان بکھرا پڑا تھا اور ساری جگہ تباہی کا منظر پیش کررہی تھی۔

خوفناک سمندری طوفان کے بادل اب دور فاصلے پر نظر آرہے تھے رے کو اندازہ ہوا کہ جہاں وہ موجود تھا وہاں پر طوفان خاصا پرسکون ہوچکا تھا لیکن نئے آنے والے کالے بادلوں اور چمکتی ہوئی بجلی سے اسے اندازہ ہورہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں پھر ایک طوفان کی لہر آنے والی تھی ابھی ہیلن طوفان کہیں اور تباہی مچارہا تھا۔

رے آہستہ آہستہ چلتا ایک فون بوتھ تک گیا پھر اس نے ریسیور کان سے لگا کر آواز سنی لیکن فون ڈیڈ تھا۔ وہ بوتھ سے باہر آگیا اسی وقت ہوا پھر تیز ہوگئی اس بار اس کی سمت بدل گئی تھی۔ گہرے بادل پھر آسمان پر چھا گئے تھے۔ اس نے کسی محفوظ مقام کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا اس علاقے میں زیادہ عمارتیں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ جو تباہ ہوچکی تھیں پھر اسے سمندر کی سمت کچھ حرکت سی نظر آئی یوں لگا جیسے وہاں کوئی فرد ہو اسے اندازہ ہوا جیسے وہ کوئی نوجوان عورت ہو۔ وہ سفید لباس میں ملبوس تھی اور دور سڑک پر جارہی تھی۔ جہاں تباہ شدہ سامان بکھرا تھا۔

"اے...... سنو۔" رے نے اسے آواز دی لیکن عورت

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے دوبارہ آواز دی لیکن وہ بغیر رکے آگے بڑھتی رہی تو رے نے اپنے ریوالور کے لئے کمر کے گرد ہاتھ بڑھایا تاکہ فائر کرکے اسے خبردار کرسکے لیکن اس کا ریوالور موجود نہیں تھا۔ رے اس کی طرف بڑھنے لگا وہ ایک کونے سے مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی اور ہوا تیز ہوگئی تھی۔ جیسے ہی رے نے کونا مڑا بارش بھی شروع ہوگئی۔ وہ اسے سامنے ہی نظر آرہی تھی اور بہت تیزی سے حرکت کررہی تھی۔ وہ ایک درخت پر سے چھلانگ مار کر آگے بڑھا جو اس کے راستے میں آگیا تھا۔ عورت کا لباس تیز ہوا میں اڑ رہا تھا۔

"سنو لڑکی۔" رے نے اسے پھر آواز لگائی۔

"ابھی طوفان ختم نہیں ہوا ہے۔ ہمیں کسی محفوظ مقام پر چھپ جانا چاہئے۔" رے نے پھر کہا لیکن وہ یوں چلتی رہی جیسے اس نے رے کی آواز ہی نہ سنی ہو۔

رے تیزی سے اس کے پیچھے لپکا وہ سوچ رہا تھا کہ وہ لڑکی اس طوفان میں اکیلی اس علاقے میں کیا کررہی ہے۔ اب لڑکی ایک اور سڑک پر پہنچ کر مغرب کی طرف مڑ گئی تھی۔

"ارے لڑکی! یہ وقت باہر گھومنے کا نہیں ہے۔" رے چیخا وہ اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس کی طرف لڑکی کی پشت تھی یوں لگتا تھا جیسے لڑکی کو اس کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو اور تیز ہوا سے بھی اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس کے بال بھی ہوا سے نہیں بکھرے تھے لیکن اس کا لباس اڑ رہا تھا جس کے اڑنے سے اس کی ٹانگوں میں پہنا سفید پاجامہ جھانک رہا تھا اور پھر ایک چیز نے رے کو چونکا دیا اس لڑکی کے پاؤں زمین کو نہیں چھو رہے تھے وہ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پار کرتی آگے بڑھتی جارہی تھی اچانک لکڑی کی بنی ہوئی عمارت نیچے گری اس میں سے لکڑی کی الماریاں بھی گری تھیں اور بہت سی کتابیں جگہ جگہ بکھر گئی تھیں۔ وہ شاید کوئی لائبریری کی عمارت ہی ہوگی۔ لڑکی کی رفتار میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی اب رے کو احساس ہوچلا تھا کہ وہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ وہ اسے ایسی لگ رہی تھی جیسی عورت کا ذکر کچھ دیر پہلے اس سے فری لنگ نے کیا تھا اور اس کا نام "ہیلن" تھا اس خیال کے آتے ہی رے ایک جگہ کھڑا ہوگیا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا

تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ مغرب کی طرف آگے ہی آگے بڑھتی جارہی تھی جیسا کہ محکمہ موسمیات نے پیشن گوئی کی تھی کہ اب طوفان بھی مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ اب وہ لڑکی جس تباہی کا ذریعہ بننے والی تھی اس کی پہلے کوئی مثال نہیں تھی اچانک رے کو ایک خیال آیا اس نے سوچا وہ ایک عورت ہے یا کم از کم نظر عورت آرہی ہے ممکن ہے اگر رے اس سے بات کرے تو وہ اسے سنے اور رے اسے قائل کرسکے۔

''ہیلن!'' رے نے اسے نام لے کر پکارا۔

''ہیلن ٹھہرو۔'' اور وہ رک گئی اسی وقت بارش کا ایک تیز ریلا اسے تر کر گیا اور رے نے سوچا خدایا کیا میں واقعی یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے بات کروں؟ وہ رے کی طرف مڑی تھی اور بغور اسے دیکھ رہی تھی جب کہ رے کا دماغ خوف سے سن ہوگیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے وہ تو بس یہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی بلا کی خوب صورت تھی اس میں اتنی کشش تھی کہ اس پر سے توجہ ہٹانا ممکن نہیں تھا چند لمحوں کے بعد لڑکی مسکرائی اور دوسری طرف مڑ گئی۔

اسی وقت ٹیلی فون کا ایک پول ٹوٹ کر اس کی طرف جھکا۔ رے چیخ مار کر ایک طرف ہٹا وہ پول بالکل اس کی ٹانگوں کے درمیان گرا تھا۔ اور اس کا آدھا دھڑ بھی پول کے نیچے دب گیا تھا۔ رے نے خود اس پول کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوگیا کیونکہ اس پول سے جڑے تار جو دوسرے پول تک جارہے تھے اس کے راستے میں مزاحم تھے۔

''ہیلن۔'' رے زور سے چیخا وہ جہاں تھا وہاں سے اسے ہیلن نظر نہیں آرہی تھی۔ بارش اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی جس سے اس کی آنکھیں بند ہوئی جارہی تھی۔ اچانک اسے دھندلی سی ایک جھلک نظر آئی وہ اس کے سامنے کھڑی تھی اور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ حیرت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ رے نے دیکھا اس کی آنکھیں بڑی اور گہری سرمئی تھیں جن میں گہرائی تھی۔ رے کو لگا جیسے اس نے تباہی پھیلانے والے طوفان کی آنکھوں میں جھانک لیا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس عورت کی طرف بڑھا دیئے۔ جیسے مدد چاہتا ہو۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کررہی ہو۔ پھر وہ جھکی اور اس کے ہاتھ تھام لیے اس کی گرفت سرد تھی رے کو محسوس ہوا جیسے وہ بے وزن ہوگیا ہو یا کسی ہوا کے بھنور کی زد میں آکر اپنا توازن کھو چکا ہو لڑکی کے ذرا سا کھینچنے پر وہ ٹیلی فون کے نیچے سے پول سے آرام سے نکل آیا تھا۔

جیسے ہی رے سیدھا کھڑا ہوا اس نے ہیلن کا ہاتھ تھام لیا اس کی نظریں ہیلن کی گردن کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے سونے کا لاکٹ پہنا ہوا تھا۔ اسے یاد آیا ایسا سونے کا لاکٹ اس نے میوزیم میں دیکھا تھا جو اسپین میں آنے والے سمندری طوفان کی باقیات میں پایا گیا تھا اور صدیوں پرانا تھا۔ رے حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا شاید یہ لاکٹ ہیلن کو سمندر کی تہہ سے ملا ہو اور اسے پسند آیا ہو اسی لیے اس نے پہن لیا ہو۔ ہیلن نے مسکرا کر اس سے ہاتھ چھڑا لیا تھا اور پھر مغرب کی طرف بڑھی تھی بجلی اب بہت نزدیک چمک رہی تھی۔ نیچے سڑک پر بھرے پانی میں اس کی جھلک نظر آرہی تھی۔ فضا میں پھر طوفان کی گرج سنائی دینے لگی تھی۔

''ہیلن! اس سمت مت جاؤ۔'' رے نے آواز دی وہ ایک بار مڑی اور رے کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''وہاں تمہارے لیے کچھ نہیں ہے...... وہاں بہت نقصان ہوا ہے...... بہت سے لوگ متاثر ہوئے ہیں اور آگے مت جاؤ۔'' رے نے کہا اور اس کی طرف بڑھا وہ دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی وہ اچانک پھسلا اور خود کو گرنے سے بچانے کے لیے قریب پڑی ایک لکڑی کا سہارا لینا چاہا تو اس کے ہاتھ میں ایک کیل چبھ گئی جو لکڑی سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے کھینچ کر اسے نکالا تو تکلیف سے اس کی چیخ نکل گئی اس نے پھر ہیلن کی طرف دیکھا وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

''تم بہت خطرناک ہو۔'' رے نے کہا۔

''لیکن تم بہت خوب صورت بھی ہو...... تمہاری تباہی میں بھی زندگی ہے۔'' رے نے کہا وہ اسے دیکھ کر اب بھی مسکرا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہیلن کہاں جانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔ رے نے اپنا ہاتھ اس کے

کاندھے پر رکھا تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مزاحمت کرے گی لیکن وہ ساکت کھڑی رہی۔ اس نے محسوس کیا ہیلن کے ہونٹ برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ پھر اچانک اسے لگا جیسے ہیلن کے اندر بھی طوفان جیسی تباہ کرنے والی طاقت آ گئی ہو ان کا ملاپ ایسا ہی تھا جیسے زندگی اور ماورائی قوتوں کا ملاپ ہو۔ وہ اس کی سانسیں لے رہی تھی اور رے کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ بے ہوش ہونے والا ہو۔ اس نے ہیلن کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور پیچھے جھکتا چلا گیا لیکن زمین پر گرنے کے بجائے وہ ہیلن کے ساتھ ہوا میں معلق تھا پھر وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

رے کی آنکھ اس وقت کھلی جب اسے اسٹریچر پر ڈالا گیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر آنکھیں کھولی تھیں تو اس کے اوپر نیلا آسمان موجود تھا۔ اطراف میں لوگوں کی آوازیں تھیں جو طوفان سے ہونے والا کوڑا کرکٹ سمیٹ رہے تھے اور بستی کی صفائی میں مصروف تھے۔

''ارے دوست تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' سارجنٹ ڈگاس نے اس پر جھک کر پوچھا۔

''میں کہاں ہوں؟'' رے نے حیرت سے کہا۔

''تم ایک ایمبولینس میں ہو۔ تمہیں سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور اس کے علاوہ تم زخمی بھی ہو۔'' ڈگاس نے کہا اور ایمبولینس کا دروازہ بند کر دیا۔ ڈگاس اس کے ساتھ ہی ایمبولینس میں بیٹھ گیا تھا۔

''تم نے طوفان کے دوران خطرے کے باوجود لونگ اسٹون جا کر لوگوں کی مدد کرنا چاہی یہ تمہاری بہادری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ وہ لوگ ایک ہفتہ پہلے ہی بستی چھوڑ کر جا چکے تھے وہ اب محفوظ ہیں۔'' ڈگاس نے اسے بتایا۔

''ہیلن کہاں ہے؟'' رے نے پوچھا اور ڈگاس نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''وہ جا چکی ہے...... ایک چیز پر سب حیران ہیں جو سب نے محسوس کی کہ مغرب کی طرف طوفان جا رہا تھا اور اس سے بہت زیادہ تباہی کی توقع تھی لیکن اچانک ہوا کا رخ بدل گیا اور طوفان دوسری طرف مڑ گیا اور ہیلن کی تباہی واپس سمندر میں چلی گئی اور اب شاید کہیں اور تباہی پھیلانے کے لیے وہ خود کو تیار کر رہی ہو۔''

''میں نے اسے دیکھا ہے۔'' رے نے کہا۔

''تم نے کیسے دیکھا؟'' ڈگاس نے پوچھا۔

''ہیلن...... میں نے ہیلن کو دیکھا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے تم نے طوفان کو دیکھا ہے؟''

''نہیں، میں نے ہیلن کو دیکھا ہے وہ ایک عورت ہے۔'' رے نے کہا اور ڈگاس نے فکرمندی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں جانتا ہوں تم سوچ رہے ہو میں پاگل ہوں لیکن وہ موجود ہے وہ سفید لباس پہنتی ہے۔'' رے نے بیٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ اسٹریچر کے ساتھ بیلٹ سے بندھا تھا۔

''اوہ رے لگتا ہے تم نے بوڑھے فری لنگ کی باتیں بہت غور سے سنی ہیں اور ان کا بہت اثر لیا ہے۔''

''مجھے ان بیلٹوں سے آزاد کرو۔'' رے نے کہا۔

''دیکھو رے۔'' ڈگاس نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے سر پر شدید چوٹ آئی ہے اور تمہیں چیزیں تصور میں نظر آ رہی ہیں اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس وقت تک خاموش رہتا جب تک کہ اسپتال پہنچ کر میرے ایکس رے نہ لے لیے جاتے۔'' ڈگاس نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'' اس نے پوچھا اور رے نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اس کی مٹھی بند تھی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ اس نے کچھ پکڑا ہوا ہے۔ اس نے مٹھی کھول دی اس کے ساتھ میں سونے کا لاکٹ تھا۔ وہی لاکٹ جو ہیلن کے گلے میں پڑا تھا اور شاید جب ہیلن نے اسے سہارا دیا تھا تو وہ اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ رے نے ڈگاس کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

''پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ تم چپ ہی رہنا۔'' ڈگاس نے کہا اور ایمبولینس سے اتر گیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بچپن کے سپنے اگر شدت اختیار کرلیں تو جنون کی شکل اختیار کرلیتے ہیں اور جنون پاگل پن سے کم نہیں ہوتا۔
ایک دوشیزہ کا فسانہ اسے ہواؤں میں اڑنے کا شوق تھا مگر قدم قدم پر اس کی راہ میں رکاوٹیں تھیں۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"ماما مجھے یہ ایروپلین چاہیے"۔ چار سالہ عائشہ نے شیشے کے شوکیس میں رکھے جہاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ فاطمہ گل نے ایک نظر چمکتے شیشے کے پار رکھے اُس جہاز کو دیکھا اور دوسری نظر اپنی بیٹی کو جو آنکھوں میں حسرت لیے اُس جہاز کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اُس کی عجیب سی فرمائش پر کچھ حیران سی ہوئیں۔

"لڑکیاں پلین سے نہیں گڑیا سے کھیلتی ہیں بیٹا آؤ میں آپ کو پیاری سی گڑیا لے کے دوں"۔ فاطمہ گل نے ننھی عائشہ کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنا چاہا مگر ایسا کر نہ پائیں کیونکہ عائشہ نے قدم نہیں بڑھائے تھے۔ وہ وہیں آنکھوں میں ناراضگی لیے کھڑی تھی۔

"مجھے گڑیا نہیں چاہیے...... مجھے ایروپلین چاہیے"۔ وہ بالکل ضدی بچی نہیں تھی مگر اس وقت اپنی بات پر آڑ چکی تھی۔ فاطمہ گل نے خود کو بے بس محسوس کیا۔

"ارے بہن اگر بچی کو جہاز کا شوق ہے تو وہی لے دیں نہ اتنا سوچ کیوں رہی ہیں"۔ پاس کھڑی کسی عورت نے مشورہ دیا۔ فاطمہ گل کچھ شرمندہ سی ہوگئیں کہ نا جانے وہ عورت کیا سوچ رہی تھی۔ کیا وہ اتنی غریب تھیں کہ اپنی بیٹی کے لیے معمولی سا کھلونا افورڈ نہیں کر سکتی تھیں۔

"عائشہ بیٹا آپ کو تو جہاز چلانا ہی نہیں آتا پھر یہ لے کہ کیا کریں گی"۔ وہ بیٹی کو ایک دفعہ پھر بہلا رہی تھیں۔

"میں سیکھ لوں گی ماما آپ مجھے بس ایروپلین لے کر دیں"۔ اُس نے ایک دفعہ پھر جہاز کی طرف دیکھا۔ فاطمہ گل بیٹی کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھیں اس لیے سیلز مین کو پیک کرنے کا کہا۔

سیلز مین نے جب وہ لا کہ عائشہ کو تھمایا تو اُس کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔ فاطمہ گل نے آج سے پہلے بیٹی کے چہرے پر اتنی چمک کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ یوں خوش ہو رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

......☆☆......

"بابا یہ پلین ہوا میں کیسے اُڑتا ہے؟"۔ عائشہ نے ناشتے کی ٹیبل پر نصار بیگ سے پوچھا۔ وہ اب دس سال کی ہو چکی تھی۔

نصار بیگ نے کچھ حیرت سے بیٹی کو دیکھا جو ناشتہ آگے رکھے اُن سے بڑی معصومیت سے سوال کر رہی تھی۔

"بھئی یہ تو پائلٹ ہی بتا سکتا ہے کہ پلین ہوا میں کیسے اُڑتا ہے"۔ اُنہوں نے کچھ شرارت سے جواب دیا۔ وہ سنجیدہ نہیں تھے۔

"پائلٹ کیسے بنتے ہیں؟"۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد نیا سوال آیا تھا۔ نصار بیگ ہلکا سا مسکرائے۔

"پائلٹ بننے کے لیے پہلے بہت سارا پڑھنا پڑتا ہے پھر ائرفورس جوائن کرتے ہیں وہیں ٹریننگ کی جاتی ہے تب کہیں جا کہ پائلٹ بنتے ہیں"۔ اُنہوں نے اُس کے سوال کے جواب کو مختصر کر دیا۔

"پاپا میں بھی ائرفورس میں جاؤں گی"۔ وہ اُن کی بات ختم ہوتے ہی بول پڑی۔ سب نے حیرانگی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"لڑکیاں ائرفورس میں نہیں جاتی بیٹا وہ صرف لڑکوں کے لیے ہوتی ہے"۔ صدف تائی نے اُسے پیار سے سمجھایا۔ پرانے خیالات کی صدف بیگم کو یہ بات کچھ عجیب لگنے کے ساتھ ساتھ ناگوار بھی لگی۔

"پر ایان بھائی کے ساتھ تو لڑکیاں بھی ہوتی ہیں میں نے پکچرز میں دیکھا تھا"۔ وہ اُن کی بات سن کر کچھ مایوس سی ہوئی تھی۔ مگر ہمت بالکل نہ ہاری۔ صدف بیگم کو اُن کے بیٹے کا حوالہ دیا جو ائرفورس میں تھا۔ ایان کو گئے ہوئے ابھی چند مہینے ہوئے تھے۔ وہ ابھی ٹریننگ کر رہا تھا۔ عائشہ نے اُس کے پاس تصویروں میں دیکھا تھا کہ لڑکیاں بھی ٹریننگ کر رہی تھیں۔ یہ بات اُس کے ننھے دماغ میں سما گئی تھی کہ لڑکیاں یہ کام کر سکتی ہیں۔

صدف بیگم لاجواب سی ہوگئیں۔

"عائشہ اسکول کے لیے دیر ہو رہی ہے بیٹا جلدی سے ناشتہ ختم کرو"۔ فاطمہ گل نے اُس کی باتوں کو سنتے ہوئے کہا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ مزید کوئی سوال جواب کرے۔ کہیں نہ کہیں یہ بات اُن کو بھی بری لگی تھی۔ آخر کو وہ بھی ایک ماں تھیں۔ ہر ماں کی طرح بیٹیوں کے بارے میں اُن کے بھی وہی خیال تھے۔ زمانہ چاہے بدل جائے...... لوگ بدل جائیں مگر خیالات اور سوچ بدلنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ایسا کرنے میں زمانے لگ جاتے ہیں۔

عائشہ اُن کی بات سن کر فوراً ناشتے کی طرف متوجہ ہوئی مبادا کہیں سچ میں دیر ہی نہ ہو جائے۔

......☆☆......

وہ پانچویں کلاس میں تھی۔ ایک دن اسکول میں میڈم فلک نے جو کہ میتھ کی ٹیچر تھیں بچوں سے پوچھا کہ وہ مستقبل میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے خواب بتائے۔ وہ بچوں کی معصوم معصوم باتوں پر مسکراتی رہیں۔ پھر یہی سوال اُنہوں نے عائشہ سے کیا کہ وہ فیوچر میں کیا کرنا چاہتی ہے۔

"میں ائرفورس میں پائلٹ بننا چاہتی ہوں"۔ وہ کھڑی ہو کر معصومیت سے بتا رہی تھی۔ آگے بیٹھے کئی بچوں نے گردنیں موڑ کر عائشہ نصار کی طرف دیکھا۔ میڈم فلک بھی کافی حیران ہوئیں اور ساتھ ہی متاثر بھی کیونکہ یہ بات کہتے ہوئے اُنہوں نے عائشہ کے چہرے پر جو چمک دیکھی تھی وہ اور کسی بچے کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

میڈم فلک کو عائشہ کے اندر اپنا بچپن نظر آیا کبھی وہ بھی یہی کہتی تھیں۔ کئی سال پہلے اُن کی بھی تو یہی خواہش تھی۔ مگر حالات اور وقت نے اِس خواہش کو پورا نہیں ہونے دیا تھا۔ نا جانے کتنے لوگ ہیں ایسے جن کے ساتھ یہ ہوتا۔ اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر وہ جی تو لیتے ہیں مگر کبھی نہ کبھی دل میں اُن کے ادھورا رہ جانے کی پھانس ضرور چبھتی ہے۔

"وری گڈ......"۔ اُنہوں نے بے ساختہ اُسے سراہا۔

"لیکن میڈیم میری تائی اماں کہتی ہیں کہ لڑکیاں ائرفورس میں نہیں جاتیں"۔ وہ یہ بات بتاتے ہوئے کچھ بجھ سی گئی تھی۔ میڈم فلک ہلکا سا مسکرائیں۔ ایک اور فلک جنم لینے والی تھی۔ جس نے لوگوں کے ڈر سے اپنے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا تھا اور اُن کو دفنا دیا تھا۔

"عائشہ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا جب بھی ہم اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے سفر کرتے ہیں تو ہمیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے...... ہمارے راستے میں بہت سارے پتھر اور کانٹے ہوتے ہیں جو ہمیں روکنے اور واپس جانے پر مجبور کرتے ہیں ایسے میں ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے بلکہ اپنے قدموں کو اتنی مضبوطی سے راستے پر جمانا چاہیے کہ کوئی رکاوٹ کوئی مشکل اُن کو اکھاڑ نہ سکے۔ اپنے ارادوں کو اتنا پختہ رکھو کہ دنیا کی کوئی طاقت نہ اُن کو کمزور بنا سکے کیونکہ جب کسی انسان کے ارادے پختہ ہوں تو وہ پہاڑوں سے بھی ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے اس کی راہ میں آنے والے وہ تمام پتھر جو اُس کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

میڈم فلک نے اپنی بات کے اختتام پر عائشہ کو دیکھا جو سانس روکے کھڑی تھی اور اُن کی ایک ایک بات کو اپنی رکی سانس میں جذب کر رہی تھی تا کہ وہ جب بھی دوبارہ سانس لے یہ سب باتیں اُسے یاد رہیں۔ اگر کبھی وہ اپنے مقصد میں کمزور پڑنے لگے تو یہ باتیں اُس کو مضبوط بنائیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کل کو عائشہ بھی اُن کی طرح گھٹ گھٹ کر جیے۔ وہ اُس کا سہارا بننا چاہتی تھیں۔ وہ اُڑنے کا خواب دیکھ رہی تھی اور وہ اُس کے پر بننا چاہتی تھیں۔

وہ جب اپنی سیٹ پر بیٹھی تو وہ اُس عائشہ سے بالکل مختلف تھی جو کھڑی ہوئی تھی۔ جو بڑی بے بسی سے میڈم کو یہ بتا رہی تھی کہ اُس کی تائی اماں کہتی ہیں کہ لڑکیاں ائرفورس میں نہیں جاتیں۔ اُس عائشہ کے ارادے کمزور تھے مگر اِس عائشہ کے ارادے پہاڑ کی طرح مضبوط تھے۔

میڈم فلک کو عائشہ کے خواب میں ایک جنون نظر آیا تھا اُنہوں نے یہ سب اُسے اس لیے بتایا تھا کہ کہیں وہ کل کو اپنے ارادوں میں یہ سوچ کر کمزور نہ پڑ جائے کہ وہ لڑکی ہے اور لڑکیاں یہ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سارے لوگ ہیں جو عورتوں کو کمتر اور کمزور سمجھتے ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ ذات ارادوں میں مردوں سے بھی زیادہ مضبوط اور ہمت والی ہیں۔

......☆☆......

سال گزرتے گئے اور پانچویں سے وہ ایف ایس سی میں آ گئی۔ ائرفورس میں پائلٹ بننے کا خواب اب اُس کا جنون بن چکا تھا۔ وہ ہر حال میں اپنے اس خواب کو پورا کرنا چاہتی تھی۔ اُسے میتھ بالکل نہیں آتا تھا مگر اُس نے ایف ایس سی میں میتھ رکھ لیا۔

اُس نے میڈم فلک کی وہ بات اپنے دل و دماغ میں بٹھا لی۔ وہ دن رات محنت کر رہی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح نہ تو اُسے گھرداری میں دلچسپی تھی اور نہ ہی فیشن اور دوسری ایسی خرافات میں۔ وہ فارغ وقت میں نیٹ پر جنرل نالج کے کوئز حل کرتی کیونکہ اُسے ائرفورس کا ٹیسٹ ہر حال میں

کلئیر کرنا تھا۔ گھر میں وہ وقتاً فوقتاً یہ بات سب کو بتاتی رہتی کہ وہ ایف ایس سی کے بعد ائرفورس کا ٹیسٹ دے گی۔ کوئی بھی اُس کی باتوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ شاید اُن کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ وہ یہ سب بھول جائے گی۔

ایف ایس سی کے پیپرز کے بعد پہلی دفعہ گھر میں یہ ہنگامہ اُٹھا جب اُس نے کہا کہ وہ ٹیسٹ دینا چاہتی ہے۔ فاطمہ گل اور صدف بیگم کو تو یہ بات ذرا ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ایسی فضول بات سوچ بھی کیسے سکتی تھی۔

''پاپا میری لائف کا سب سے بڑا خواب ہے ائرفورس میں پائلٹ بننا پلیز مجھے جانے دیں''۔ اُس نے نصار بیگ سے منت بھرے لہجے میں کہا جو خود بیٹی کی بات پر شاکڈ تھے۔ پہلے وہ اُس کی باتوں پر مسکرا دیتے تھے یہ سوچ کر کہ وہ ابھی بچی ہے۔ مگر وہ بچی آج بڑی ہو کر اُسی خواب کو پورا کرنے کے لیے تیار تھی۔ بچپن میں جس جہاز کو وہ کھلونا سمجھ کر کھیلتی تھی آج اُسی جہاز کو وہ چلانے کی ضد میں اُن کے سامنے کھڑی تھی۔

''بیٹا ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کے لیے اس فیلڈ کو اچھا نہیں سمجھا جاتا آپ دوسری جس فیلڈ میں جانا چاہیں جا سکتی ہیں''۔ نصار بیگ نے اُسے نرم لہجے میں سمجھایا۔

''معاشرہ تو کسی بھی فیلڈ کو اچھا نہیں سمجھتا پاپا تو کیا اس ڈر سے ہم اپنے خوابوں کو بھول جائیں...... معاشرہ تو لڑکیوں کو پڑھانے کے حق میں بھی نہیں ہے تو کیا اس ڈر سے لوگوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا ہے نہیں نا تو پھر میں کیوں کروں ایسا...... کچھ کرنے کچھ بننے کا خواب دیکھنا کیسے چھوڑ دوں''۔ وہ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی۔ نصار بیگ نے خود کو لاجواب محسوس کیا۔

''تم یہ فضول کی دلیلیں نہ دو ہمیں...... چپ چاپ پری ایس سی میں ایڈمیشن فارم جمع کرواؤ آئی سمجھ''۔ فاطمہ گل سختی سے کہتی ہوئی وہاں سے سے چلی گئیں۔ عائشہ کو دکھ ہوا مگر اُس سے بھی زیادہ دکھ تب ہوا جب نصار بیگ بھی چلے گیے۔ عائشہ کو کم از کم اُن سے ایسی اُمید نہیں تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ کمزور نہیں پڑی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ابھی تو شروعات ہوئی ہے ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ خوابوں کو پانے کا سفر اتنا آسان کہاں ہے۔

......☆☆......

رات کی تاریکی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی میں کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی بھی خلل ڈال رہی تھی۔ وہ کمرے کی واحد کھڑکی سے ٹیک لگائے خالی خالی نظروں سے شہر کی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ وہ اکثر دس بجے تک سو جاتی تھی مگر آج نیند کی دیوی روٹھ کر نا جانے کہاں بھٹک رہی تھی۔ وہ عصر سے کمرہ بند کیے بیٹھی تھی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ آج پھر دوپہر میں اُس کے گھر والوں سے شدید بحث ہوئی تھی اور ہمیشہ کی طرح سب نے اُسے ڈانٹ دیا تھا۔ ٹیسٹ کی رجسٹریشن میں صرف ایک دن باقی تھا۔ اور عائشہ کی راتوں کی نیند اُڑ چکی تھی۔ اگر رجسٹریشن نہ ہوئی تو وہ ٹیسٹ کیسے دے گی۔ گھر والوں کو ہر طرح سے منانے کی کوشش کر چکی تھی مگر سب کا وہی جواب تھا کہ لڑکیاں ائرفورس میں نہیں جاتیں۔ وہ آج نا جانے کیوں ٹوٹ سی رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خوابوں کا محل بہت جلد زمین بوس ہو جائے گا۔ وہ ہار ماننا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی ہار رہی تھی۔ اُس کے گھر والے آج بھی پرانے خیالات کو دل میں لیے جی رہے تھے کہ لڑکیوں اور لڑکوں میں بہت فرق ہوتا۔ وہ ہر کام نہیں کر سکتیں۔

اچانک اُس کے ذہن میں کوئی خیال آیا۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی بیڈ کی طرف آئی۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سے ایک ڈائری نکالی۔ اُس ڈائری میں میڈم فلک کا نمبر لکھا ہوا تھا جو انہوں نے آج سے دو سال پہلے عائشہ کو دیا تھا۔

اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ نمبر ڈائل کیا۔ دل میں ڈر تھا کہ کہیں میڈم نے نمبر چینج ہی نہ کر لیا ہو یا بند نہ ہو۔ مگر یہ خیال اُسے جھٹکنا پڑا کیونکہ چوتھی بیل پر ہی فون اُٹھا لیا گیا تھا۔

''ہیلو!''۔ دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز اُبھری تھی۔ عائشہ نے ایک منٹ کے لیے فون کان سے ہٹا لیا کیونکہ مردانہ آواز سن کر وہ ڈر سی گئی تھی۔ فون کے اسپیکر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں سے بار بار ہیلو کی آواز آرہی تھی۔ اُس نے یہ سوچ کر دوبارہ فون کان سے لگالیا کہ شاید میڈم کا بیٹا وغیرہ ہوگا۔

"مجھے میڈم فلک سے بات کرنی ہے"۔ وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"آپ کون بات کر رہی ہیں؟"۔ کچھ دیر خاموش ہونے کے بعد سوال پوچھا گیا تھا۔ عائشہ نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔

"میں اُن کی سٹوڈنٹ عائشہ بول رہی ہوں"۔ اُس نے خود کو کمپوز کرنے کے لیے دو تین گہرے سانس لیے۔

"اوکے آپ ہولڈ کریں میں دیتا ہوں"۔ دوسری طرف سے انتظار کرنے کا کہہ کر وہ شاید چلا گیا تھا۔ کیونکہ کافی دیر تک کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ تقریباً تین منٹ بعد میڈم فلک کی آواز سنائی دی تھی۔ اُنہوں نے ہیلو کہا تھا۔

"السلام وعلیکم میڈم میں عائشہ ہوں"۔ اُس نے اُن کی آواز سنتے ہی اپنا تعارف کروایا۔

"وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہو آپ؟"۔

"اللہ کا شکر ہے میڈم میں بلکل ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟"۔ عائشہ اب خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔

"الحمداللہ ڈیئر میں بلکل ٹھیک ہوں آپ بتاؤ خیریت تھی؟"۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ کوئی بات ضرور تھی۔

"میڈم مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے"۔ عائشہ نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔

"جی بیٹا بتائیں میں سن رہی ہوں"۔ اُن کا نرم لہجہ ہمیشہ کی طرح تھا۔ بولتے ہوئے یوں لگتا جیسا منہ میں شہد ڈال کے بول رہی ہوں۔ اُن کی ہر بات میں ایک عجیب میٹھی تاثیر ہوتی تھی۔

"میڈم میرے گھر والے نہیں مان رہے...... میں بہت پریشان ہوں...... کل رجسٹریشن کی لاسٹ ڈیٹ ہے...... مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں کیا کروں"۔ وہ بات کرتے ہوئے رو پڑی تھی۔

"عائشہ ریلیکس بیٹا پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے...... آپ اپنے گھر والوں کو کنوینس کرنے کی کوشش کرو"۔ اُنہوں نے اُسے تسلی دی۔

"بہت کی ہے میڈم لیکن کوئی نہیں مان رہا اگر کل تک رجسٹریشن نہ کروائی تو میں ٹیسٹ کیسے دوں گی...... پلیز بتائیں میں آخر کیا کروں؟"۔ وہ ازحد پریشان تھی۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا نہ کہ ہم جب بھی اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو مشکلات راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں مگر ہم ہمت حوصلے اور ثابت قدمی سے اُن کو دور کر سکتے ہیں...... اگر آپ ابھی سے کمزور پڑ جائیں گی تو آگے کیا ہوگا کیونکہ ابھی تو راستہ شروع ہوا۔ آپ کے پاس بہت ٹائم ہے ابھی سمجھاؤ اُن کو...... منانے کی کوشش کرو وہ تمہارے پیرنٹس ہیں ضرور مان جائیں گے...... بس تمہیں ہمت سے کام لینا ہے"۔ اُنہوں نے بڑے پیار سے اُسے سمجھایا تھا۔ عائشہ کو واقعی میں حوصلہ ہوا۔

"اگر وہ لوگ نہ مانے تو؟ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے"۔ ایک ڈر ابھی بھی اندر بیٹھا تھا۔

"بیٹا ہمیشہ اچھے کی اُمید رکھو ہمیشہ ہی ایسا ہوتا کہ آپ جب بھی اُڑان بھرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی زندگی میں ایسا ضرور ہوتا جو آپ کے پر کاٹ کر آپ کو گرانے کی کوشش کرتا ہے تو ایسے لوگوں سے ڈرتے نہیں ہیں بلکہ اُن کا سامنا کرتے ہیں...... آپ کو ابھی بہت اُڑنا ہے...... بہت اوپر جانا ہے اس لیے آپ کو کبھی بھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے کچھ بھی ہو جائے آپ کو بار بار کوشش کرنی ہے اُس پرندے جیسا بننا ہے جو پیدا ہونے کے بعد اُڑنے کی کوشش کرتا مگر بار بار گر جاتا لیکن وہ کبھی ہمت نہیں ہارتا بلکہ پھر سے کوشش کرتا...... آپ بھی کوشش کرو بار بار کوشش کرو اگر اب گر گئی تو دوبارہ اُٹھنا اور اُڑنے کی کوشش کرنا ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب آپ اپنے مقصد کو پالو گی" وہ لفظ نہیں ادا کرتی تھیں بلکہ جادو پھونکتی تھی۔ عائشہ نے اپنے اندر ہمت اور حوصلے کو دوبارہ جنم لیتے دیکھا۔

دس منٹ کی بات کے بعد فون بند ہوگیا۔ عائشہ خود کو بہت ریلیکس فیل کر رہی تھی۔

......☆☆......

وہ صبح دس بجے سو کر اُٹھی۔ فجر کی نماز کے بعد لیٹی تو پھر دن چڑھے ہی آنکھ کھلی۔ وہ سستی سے دوپٹہ گلے میں ڈالتی نیچے آگئی۔ لاؤنج میں آکر حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ ایان لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ صدف

بیگم اور برابر والے صوفے پر فاطمہ گل بیٹھی ہوئی تھیں۔ عائشہ کو دیکھ کر وہ مسکرایا تھا۔ عائشہ نے دیکھا وہ اس وقت مکمل یونیفارم میں تھا۔ شاید کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔ آسمانی رنگ کی شرٹ اور گہری نیلی پینٹ میں سر پر کیپ لگائے وہ کافی اچھا لگ رہا تھا۔ عائشہ کے دل میں شدت سے حسرت جاگی کہ کاش وہ بھی ایک دن ایسے ہی اس یونیفارم میں وہاں بیٹھی ہو۔

''بڑے لوگوں کو مل گئی فرصت ہم جیسے چھوٹے لوگوں سے ملنے کی......''۔ ایان نے مسکراتے ہوئے ہلکا سا طنز کیا تو عائشہ اُس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ایان بھائی آپ یونیفارم میں بہت اچھے لگ رہے ہیں''۔ عائشہ کو اور کچھ نہ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی دے رہا تھا۔ وہ تو یک ٹک سی ایان کے یونیفارم پر لگے رینک دیکھ رہی تھی۔

''شکریہ جناب''۔ وہ اپنی تعریف پر کچھ جھینپ سا گیا تھا۔

''ایان بھائی ایک بات بتائیں گے؟''۔ عائشہ نے کچھ سوچ کر اُس کو مخاطب کیا۔

''پیاری بہنا دو پوچھ لو......''۔ وہ کافی خوش اخلاق تھا۔ ہر کسی سے ہنس کے اور پیار سے بات کرتا تھا۔ عائشہ کو تو وہ بالکل سگی بہنوں کی طرح پیار کرتا تھا۔

''کیا لڑکیاں ائرفورس میں نہیں جاسکتیں؟''۔ اُس نے لہجے میں ایک آس لیے سوال پوچھا تھا۔ اُس کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے تو ایان چپ ہوگیا تھا۔ مگر پھر ہنس کر بولا۔

''کیوں نہیں جاسکتیں بھئی یہ کس نے کہہ دیا......''۔

''سب کہتے ہیں کہ لڑکیاں وہاں نہیں جاسکتیں''۔ وہ فاطمہ گل کی گھوریوں کی پروا کیے بغیر بول رہی تھی۔

''ارے غلط کہتے ہیں سب......لڑکیاں کونسا کام ہے جو نہیں کرسکتیں......میرے ساتھ بیس میں کافی لڑکیاں ہیں جو پائلٹ ہیں......اور ایسے جہاز اُڑاتی ہیں کہ ہم لڑکے بھی دیکھتے رہ جاتے ہیں''۔ ایان بھی کسی حد تک اُس کے شوق سے واقف ہی تھا۔ جس طرح وہ اُس سے ائرفورس کے متعلق انفارمیشن لیتی تھی ایان کو لگتا تھا کہ وہ بھی جانے کا شوق رکھتی ہے مگر جنون کی حد تک رکھتی ہے یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ کیونکہ وہ گھر بہت کم کم آتا تھا۔ گھر میں ہونے والی اکثر باتوں سے لاعلم ہی ہوتا تھا۔

عائشہ چپ چاپ بیٹھی اپنے ہاتھوں کے ناخن تکتی رہی۔

''آپ سنائیں محترمہ آگے کیا کرنے کے ارادے ہیں؟''۔ کچھ دیر بعد اُس نے سوال کیا تو عائشہ نے شاکی نظروں سے ماں کو دیکھا جو اُسی کو دیکھ رہی تھیں۔

''ایان بھائی مجھے بھی ائرفورس جوائن کرنی ہے آپ کی طرح......''۔ اُس نے ایان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کافی حیران ہوا۔

''پر عاشی ائرفورس کی ٹریننگ بہت زیادہ مشکل ہوتی ہے کیا تم کر پاؤ گی؟''۔ وہ اُس کے نازک سراپا پر ایک نگاہ ڈال کر بولا۔

''کوئی بھی کام مشکل نہیں ہوتا اُسے ہم خود مشکل بناتے ہیں...... مجھے یقین ہے کہ میں کرلوں گی''۔ وہ کافی پُرعزم تھی۔ ایان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''ایک دفعہ پھر سوچ لو......لڑکیاں اکثر چھوڑ کر آجاتی ہیں''۔ ایان نے اُسے ڈرایا۔

''میں کبھی بھی اُن لڑکیوں میں سے نہیں ہونگی''۔ عائشہ ازحد سنجیدہ تھی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے پھر تمہیں ضرور کوشش کرنی چاہیے......اگلے مہینے ٹیسٹ ہو رہے ہیں تم ٹیسٹ دو''۔ وہ شاید ساری باتوں سے بے خبر تھا اِسی لیے خوشی خوشی مشورہ دیا۔

''ایان......''۔ صدف بیگم اور فاطمہ گل نے ایک ساتھ کہا۔ وہ دونوں کو باری باری دیکھنے کے بعد سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ کیوں عائشہ ایسے سوال پوچھ رہی تھی۔

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے اگر عائشہ ٹیسٹ دینا چاہتی ہے تو اُس کو دینے دیں''۔ اُس نے بہت رسان سے اُن کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''پر بیٹا یہ کیسے جاسکتی ہے وہاں؟''۔ فاطمہ گل نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

''ارے کیوں نہیں جاسکتی بھئی میری بہنا بہت بہادر ہے رہی بات چاچو کی تو اُن سے میں خود بات کرلوں گا اُن کو میں سمجھاؤں گا......عاشی تم بس ٹیسٹ کی تیاری

کرو...... میں تمہارے ساتھ ہوں جو ہیلپ چاہیے مجھ سے لے لینا"۔ اُس نے عائشہ کو کہا تو وہ ایک دم بے یقین ہوگئی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ سب اچانک سے بنا کچھ کیے ہو جائے گا۔

"سچ بھائی"۔ اُس نے چمکتی نگاہوں سے ایان کو دیکھا تھا۔

"بلکل ڈیئر......"۔ آیان اُسے اتنا خوش دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"لیکن رجسٹریشن......"۔ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"آج لاسٹ ڈیٹ ہے میں جانتا ہوں بٹ یو ڈونٹ وری میں کچھ دیر میں ہی کروا دیتا ہوں تم بس تیاری کرو"۔

اجازت ملتے ہی وہ اپنے کمرے میں بھاگی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا......"۔ فاطمہ گل نے آیان کو ناراضگی سے دیکھا۔

"آنٹی آپ نے دیکھا نہیں وہ کتنی خوش ہو رہی تھی...... اگر وہ یہ کرنا چاہتی ہے تو کرنے دیں نہ...... آپ لوگ کیوں اُس کے راستے کی رکاوٹ بن رہے ہیں بہت اچھی فیلڈ ہے یہ لڑکیوں کی بہت ریسپکٹ کی جاتی ہے اس فیلڈ میں اس لیے آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے"۔ ایان نے اُن کو سمجھایا تو وہ چپ ہو گئیں۔ دل البتہ وسوسوں سے بھرا ہوا تھا۔ جو شاید وقت کے ساتھ نکل جانے تھے۔

......☆☆......

ایان نے پاپا کو کیسے منایا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ البتہ اُس دن کے بعد کسی نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ٹھیک پندرہ دن بعد اُس کا ٹیسٹ تھا۔ وہ جی جان سے تیاری میں لگ گئی۔ ایان نے اُس کی کافی مدد کی۔ وہ ٹیسٹ والے دن اُس کے ساتھ بھی گیا۔ اُس کی تمام محنت رنگ لائی۔ اُس نے ٹیسٹ کلیئر کر لیا۔ تین دن بعد اُس کا میڈیکل تھا۔ میڈیکل سے اگلا مرحلہ انٹرویو کا تھا۔ وہ تھوڑی سی نروس تھی۔ مگر یہاں بھی ایان نے اُس کی ہمت بندھائی اُسے یقین دلایا کہ وہ کر سکتی ہے۔

انٹرویو کے دوران اُس سے پہلا سوال یہی پوچھا گیا تھا کہ وہ ائرفورس کیوں جوائن کرنا چاہتی ہے۔

"سر یہ میرا خواب ہے...... اور میں نے اُس کو پانے کے لیے بہت محنت کی ہے"۔ اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ نے ائرفورس میں پائلٹ بننے کو ہی کیوں ترجیح دی؟"۔ اگلا سوال بھی پہلے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

"سر بچپن میں جب لڑکیاں گڑیوں سے کھیلتی ہیں میں تب ایروپلین سے کھیلتی تھی۔ بازار میں سیکڑوں کھلونے چھوڑ کر میں صرف ایروپلین کا انتخاب کرتی تھی۔ جس عمر میں لڑکیاں ڈرامے اور موویز دیکھتی ہیں میں ائرفورس کی ڈاکومینٹریز دیکھتی تھی اور ہمیشہ یہی سوچتی تھی کہ میں بھی ایک دن ایسی بنوں گی"۔ وہ بڑے کانفیڈینس سے بول رہی تھی۔ سامنے بیٹھا افسر متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ ہلکا سا مسکرایا بھی تھا۔

"فرض کریں اگر ہم آپ کو سلیکٹ نہ کریں تو کیا کریں گی؟"۔ اگلا سوال اُس کے چہرے کو تاریک کر گیا تھا۔ عائشہ نے ایک نظر سامنے یونیفارم میں بیٹھے شاندار بندے پر ڈالی جو ہرگز مذاق نہیں کر رہا تھا۔

"میری میڈم کہتی ہیں کہ انسان کو کبھی نیگیٹیو نہیں سوچنا چاہیے...... جب ایک پرندہ پہلی بار اُڑنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بار بار گرتا ہے مگر اُس گرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ ہار مان لے کہ وہ اب اُڑ نہیں سکتا بلکہ وہ بار بار کوشش کرتا اور ایک دن اپنی منزل پا لیتا ہے۔ اگر آپ مجھے سلیکٹ نہیں کریں گے تو میں دوبارہ کوشش کروں گی اور تب تک کروں گی جب تک اپنی منزل پا نہیں لیتی"۔ وہ پُر امید لہجے میں بول رہی تھی۔ وہ افسر ایک بار پھر مسکرایا تھا۔

"اوکے آپ جا سکتی ہیں"۔ دو تین اور سوالوں کے بعد اُسے جانے کی اجازت مل گئی۔

وہاں سے باہر نکلتے ہوئے اُس کا چہرہ بہت چمک رہا تھا۔ کچھ پا لینے کا جنون اُس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔

جب اُسے جوائننگ لیٹر ملا تو کتنی ہی دیر وہ شاکڈ کیفیت میں رہی۔ کیا خواب یوں بھی حقیقت میں بدلتے ہیں۔ منزل کی پہلی سیڑھی پر اُس نے پہلا قدم رکھ دیا تھا۔

آج اُس کا اکیڈمی میں پہلا دن تھا۔ وہ اتنی خوش تھی کہ خوشی چہرے سے چھلک رہی تھی۔ رگ رگ میں اُس کا جنون دوڑ رہا تھا۔ اگلا سفر کیسا تھا...... اُسے کتنی مشکلیں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اُٹھانی پڑتی تھیں اِن سب کی اُسے بالکل پروا نہیں تھی۔ بس وہ بے تحاشہ خوش تھی۔

اکیڈمی میں اسے ویلکم بہت ہی سخت انداز میں کیا گیا تھا۔ تین گھنٹے تک سخت سردی میں جب مسلسل کھڑے رہنا پڑا تو وہ صحیح معنوں میں پریشان ہوئی۔ جتنا آسان وہ سمجھ رہی تھی سب اُتنا آسان تھا نہیں...... بلکہ یہ تو آنے والے وقت کی ایک جھلک تھی۔ ابھی بہت کچھ ہونا باقی تھا۔

آج اُن کا اکیڈمی میں باقاعدہ پہلا دن اور پہلی کلاس تھی۔ سب لوگ ایکسائیٹڈ ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ کنفیوز بھی تھے۔ کلاس میں پورے آٹھ بجے سر آگئے۔

''السلام وعلیکم کیڈٹس...... سب سے پہلے تو میں آپ سب کو رسالپور اکیڈمی میں خوش آمدید کہتا ہوں...... امید ہے کہ آپ سب کا یہاں بہت اچھا وقت گزرے گا اور کل کو جب آپ لوگ یہاں سے پائلٹ بن کے جائیں گے تو اس گزرے ہوئے وقت کو ہمیشہ یاد کریں گے''۔

وہ خوبصورت انداز میں بول رہے تھے۔

''جیسا کہ آپ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاک فضائیہ کا شمار دنیا کی بہترین فورسز میں ہوتا ہے...... اِس کے پائلٹ اور انجینئرز اپنی قابلیت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ آپ سب کو بھی کل جب یہاں سے نکلنا ہے تو ایک کامیاب پائلٹ اور ایک قابل انسان بننا ہے اور اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرنی ہے کیونکہ یہاں آتے ہی آپ پر یہ فرض ہو چکا ہے کہ آپ اپنے ملک کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں...... یہاں آپ کو ہر طرح سے ٹرینڈ کیا جائے گا...... آپ کو فزیکلی مضبوط بنایا جائے گا...... ذہنی طور پر آپ کی تعمیر کی جائے گی...... مجھے امید ہے کہ آپ لوگ جب یہاں سے جائیں گے تو وطن کی محبت آپ کے خون میں شامل ہو چکی ہوگی...... یہاں آپ کو ہوسکتا ہے بہت ساری پرابلم کا سامنا کرنا پڑے آپ کی ٹریننگ بہت ٹف ہو مگر ایک اچھا اور قابل آفیسر ہمیشہ اِن سب مرحلوں سے گزر کر ہی بنتا ہے...... یہاں جو لوگ آپ کو ٹریننگ دیں گے وہ بھی کل آپ جیسے ہی تھے...... وہ لوگ بھی بہت محنت اور مشکلات کا سامنا کر کے آج اِس مقام پر ہیں اور ان شاء اللہ وہ وقت بھی بہت جلدی آئے گا جب آپ لوگ بھی اُن کی جگہ ہوں گے...... انسان پیدائشی کچھ نہیں ہوتا بلکہ وہ محنت، ہمت اور حوصلے سے کامیاب ہوتا ہے...... اور سب سے بڑی اور اہم بات آپ لوگوں نے اپنے ارادوں کو مضبوط بنانا ہے کیونکہ کوئی بھی کام بنا ڈیٹرمنیشن ہوئے نہیں ہوسکتا...... ہر کام کو کرنے کے لیے اس کا جنون ہونا لازمی ہے...... آپ کے جتنے مضبوط ارادے ہوں گے آپ اُتنا ہی آگے جائیں گے کیونکہ ارادے چٹان تو اونچی اُڑان''۔ اُنہوں نے اپنی بات کے اختتام پر سب کیڈٹس کو دیکھا جو ان کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔

''ایوری باڈی انڈرسٹینڈ''۔ اُنہوں نے سب سے پوچھا۔

''یس سر......''۔ سب نے یک آواز میں کہا۔

''گڈ......''۔ وہ مسکرائے۔

''پاکستان......''۔ وہ اونچی آواز میں بولے۔

''زندہ باد''۔ سب نے پہلے کی طرح ایک آواز میں جواب دیا۔

......☆☆......

اگلے دن صبح پانچ بجے ہی سب کو اُٹھا دیا گیا۔ پہلے تو اُسے غصہ آیا وہ کہاں اتنی جلدی گھر میں اُٹھتی تھی۔ مگر پھر یاد آیا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ سب سے پہلے فجر کی نماز پڑھی۔ چھ بجے تک ہر حال میں گراؤنڈ میں پہنچنا تھا۔ ہر طرف عجیب سا عالم تھا۔ آج دوسرا دن تھا مگر پھر بھی سب ہی گھبرا رہی تھیں۔

گراؤنڈ میں ایک طرف لڑکے قطاریں باندھے کھڑے تھے اور دوسری طرف لڑکیاں کھڑی تھیں۔ وہ دوسری قطار میں سب سے آگے کھڑی تھی۔ سب کی نظریں بالکل سیدھی تھیں۔

ٹریننگ کروانے والے وہاں تین چار ٹرینز آفیسرز موجود تھے۔ سب کے چہروں پر سختی اور آواز میں گرج تھی۔ وہ اتنی زور سے بولتے کہ سب کانپ جاتے۔

عائشہ کو اُن کو دیکھ کر ایان یاد آیا۔ کیا وہ بھی اتنا ہی سخت ہوگیا۔ گھر میں تو اُس نے کبھی اونچی آواز میں بات تک نہیں کی تھی مگر یہاں کھڑے ہونے کا پہلا اور آخری تقاضا ہی شاید غصہ تھا۔

وہ پورا دن سب کا بہت مشکل تھا۔ اگلے دنوں میں تو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

عائشہ کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ یہ سب تو اُس کی سوچ سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ اتنی ٹف ٹریننگ کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ذراسی غلطی پر سزا مل جاتی۔

سیل فون رکھنے کی پرمیشن نہیں تھی۔ گھر والوں سے بھی بہت مختصر بات ہوتی۔ ایسے میں وہ کئی دفعہ تو رو ہی پڑتی۔

اس وقت بھی وہ کلاس لے کر فری ہوئی تھی جب اُسے اطلاع ملی کی کوئی اُس سے ملنے آیا ہے۔ وہ حیران ہوتی آفس میں آئی تو وہاں یونیفارم میں ملبوس ایان کو دیکھ کر خود پر قابو ہی نہ رکھ پائی۔ اُس کے گلے لگ کر وہ دھواں دھار رونا شروع کیا کہ ایان سے چپ کروانا مشکل ہو گیا۔

''عائشو یہ کیا پاگل پن ہے؟''۔ ایان نے خفگی سے اُسے دیکھتے ہوئے خود سے الگ کیا۔

''ایان بھائی مجھے گھر واپس جانا ہے میں یہاں نہیں رہ سکتی یہ لوگ بہت سخت ہیں''۔ وہ سوں سوں کرتے ہوئے بولی۔

''بہت افسوس کی بات ہے عائشہ کہ یہ تم کہہ رہی ہو......اتنی جلدی ہار مان لی ابھی تو شروعات ہے''۔ ایان نے اُسے پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

''بات بات پر ڈانٹتے ہیں......ذراسی غلطی پہ اتنی سخت سزا دیتے ہیں......کل رات بھی تین گھنٹے سردی میں کھڑا رکھا صرف اس بات پر کہ ہم لوگ گراؤنڈ میں دو منٹ لیٹ پہنچے تھے......اور یہ دیکھیں ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں......پیروں کی ایڑھیاں تک پھٹ گئی ہیں''۔ وہ اپنی دونوں ہتھلیاں اُس کے سامنے پھیلاتے ہوئے بولی۔

ایان نے ایک لمبا سانس لیا۔

''میں نے تمہیں پہلے دن بتایا تھا کہ ائر فورس کوئی مذاق نہیں ہے......اس کی ٹریننگ بہت ٹف ہوتی ہے لیکن تب تم نے کہا تھا کہ تم کر لوگی تو اب کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو اب کرو ٹریننگ''۔ ایان نے اُسے ڈانٹا تو وہ رونے لگی۔

''مجھ سے نہیں ہوتی مجھے گھر جانا ہے آپ پلیز مجھے لے جائیں''۔ وہ مسلسل ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھی۔

''او مائی گاڈ میں نے یہاں آکر بہت بڑی غلطی کی ہے......ایک تو میں اتنی دور سے تم سے ملنے آیا ہوں اور تم ہو کہ رو رو کے مجھے پریشان کر رہی ہو اور ساتھ ساتھ فضول باتیں بھی کر رہی ہو......اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ میں آئندہ نہ آؤں''۔ آیان کو غصہ آگیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی کمانڈر فہد وہاں آگئے اور اُنہوں نے آتے ہی عائشہ کو وہاں سے جانے کا حکم دیا کیونکہ وہ آیان کی آخری بات سن چکے تھے اور سارا معاملہ بھی سمجھ چکے تھے۔

''کیڈٹ عائشہ آپ کی کلاس ہے جائیں اٹینڈ کریں جا کر......''۔ وہ سختی سے کہتے ہوئے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔

عائشہ نے مدد طلب نظروں سے آیان کی طرف دیکھا مگر حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ آیان اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ انسو پیتی وہاں سے نکل آئی۔

''ایان بھائی آپ اتنی جلدی بدل جائیں گے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی''۔ وہ دل ہی دل میں اُن سے مخاطب ہوتی کلاس کی طرف آگئی۔ وہ آیان سے سخت ناراض ہو گئی تھی۔

......☆☆......

رات کو گراؤنڈ میں پریڈ ہو رہی تھی۔ وہ سب وہیں جمع تھے۔ اِس وقت وہ لوگ اسکائی بلیو کلر کی شرٹس اور ڈارک بلیو کلر کی پینٹس میں ملبوس تھے۔ آج ٹریننگ کروانے والے دو لوگ تھے۔

''آر یو ریڈی کیڈٹس......؟''۔ ایک ٹرینر نے اونچی آواز میں کہا۔

سب لوگ ایک دم سیدھے ہو گئے۔

''یس سر......''۔ آواز ایک جیسی تھی۔

''میں نے سنا نہیں کیا کہا آپ لوگوں نے......؟''۔ ٹرینر نے اونچی آواز میں غصے سے کہا۔

''یس سر......''۔ اب کی بار آواز کئی گنا زیادہ اونچی تھی۔

''اوکے......ناؤ سٹ''۔ اُس نے تمام کیڈٹس کو بیٹھ جانے کا آرڈر تھا۔

سب لوگ ایک ساتھ بیٹھ گئے۔

''اسٹینڈ اپ''۔ اگلے لمحے کھڑے ہونے کا حکم ملا۔

''گیٹ فاسٹ''۔ ٹرینر نے اونچی آواز میں کہا۔ وہ لوگ جو کچھ ریلیکس ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر سے فارم میں آگئے۔

پانچ منٹ تک یہ ایکٹیویٹی جاری رہی۔
اب تمام کیڈٹس کو زمین پر لیٹنے کا حکم ملا۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ اگلے ہی لمحے وہ لوگ زمین پر اُلٹے لیٹے ہوئے تھے۔
"ناؤ اپ......"۔ سب کو ایک ساتھ کرنے کو بولا گیا۔
تمام کیڈٹس کہنیوں کو پھیلا کر ہاتھوں پر وزن ڈال کر ذرا اوپر کی جانب اُٹھے۔
"ناؤ ڈاؤن......"۔ اب نیچے ہونے کا حکم ملا۔
تمام کیڈٹس پھر سے پہلے والی پوزیشن میں آ گیے۔
"سٹارٹ اینڈ کیپ اٹ"۔
یہ عمل کافی مشکل تھا۔ کیڈٹس کو خاص کر لڑکیوں کو کرنے میں کافی مشکل پیش آ رہی تھی۔ کچھ لڑکے بھی ٹھیک سے نہیں کر پا رہے تھے۔
"لاسٹ وارن بی وتھ دیم......"۔ ٹریز نے غصے سے پچھلی رو میں کرتے کیڈٹ کو کہا جو سب کے ساتھ نہیں کر رہا تھا۔
وارننگ پر وہ کچھ ڈر گیا اور خود کو سب کے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ مگر شاید ابھی بھی کوئی کمی تھی۔ تبھی ٹریز غصے سے پیچھے آیا۔
"سٹینڈ اپ"۔ اُس نے اُسے کھڑے ہونے کا کہا۔
"واٹ دا ہیل آر یو ڈوئینگ؟"۔ اُس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔
"سوری سر......"۔ وہ منمنایا۔
"سوری مائی فٹ...... ناؤ اسٹارٹ اگین"۔ اُس نے اُس کی سوری کو خاطر میں لائے بغیر کہا۔
"ناؤ سٹینڈ اپ......"۔ اُس نے آگے آتے ہوئے سب کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔
"گو اینڈ کمپلیٹ ون راؤنڈ آف گراؤنڈ ان فورٹی سیکنڈز"۔ اُس نے سب کو جانے کا اشارہ کیا۔
سب نے بنا وقت ضائع کیے دوڑ لگا دی۔
"سپیڈ اپ......"۔ وہ پیچھے سے چلایا۔
چالیس سیکنڈز میں سب واپس اُسی جگہ تھے۔ اب وہ اُن سے کوئی اور ایکٹیویٹی کروا رہے تھے۔
"سامنے دیکھو ایڈیٹ......"۔ ایک ٹریز نے تھرڈ رو میں دائیں جانب تیسرے نمبر پر کھڑے کیڈٹ سعد کو غصے سے کہا۔
پریڈ تقریباً دو گھنٹے کی تھی۔ سب کیڈٹس کو جانے کا حکم مل گیا۔
"یار غلطی کی یہاں آ کر......"۔ خدیجہ نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عائشہ کو کہا جو پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔
"غلطی نہیں بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے"۔ وہ اُس سے بھی زیادہ تپی ہوئی تھی۔
کہتے ہوئے وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھ گئی۔

......☆☆......

آج اُسے اکیڈمی آئے پورے چار مہینے ہو چکے تھے۔
صبح ایکسر سائز کرتے ہوئے اُس کے پاؤں میں فریکچر ہو گیا تو وہ وہیں بیٹھ کر اونچی آواز میں رونا شروع ہو گئی۔ آفیسر ثاقب نے اُس کو بچوں کی طرح روتے دیکھ کر ڈانٹ دیا۔
"کیڈٹ عائشہ آپ فوج کی سولجر ہیں یہ کیا فضول حرکت ہے اتنی معمولی سی چوٹ میں آپ اس طرح بیہو کر رہی ہیں کل کو اگر آپ کو جنگ میں گولی وغیرہ لگ جائے تو کیا آپ وہاں بھی ایسے ہی روئیں گی"۔ اُنہوں نے غصے سے کہا مگر وہ سن کہاں رہی تھی۔ بس رونا آ رہا تھا۔
"کیڈٹ عائشہ سٹاپ اٹ......"۔ وہ اتنی اونچی آواز میں بولے تھے کہ عائشہ کا ننھا سا دل سہم گیا۔ آواز حلق میں ہی دب گئی۔
البتہ آنکھوں سے درد کی شدت سے آنسو جاری رہے۔ اتنے میں ڈاکٹر آ گیا۔ چیک اپ کے بعد پتہ چلا کہ معمولی سا فریکچر ہے۔ پاؤں مڑنے کی وجہ سے ذرا سی موچ آ گئی ہے۔ یہ سنتے ہی آفیسر ثاقب کا غصہ آسمانوں کو چھونے لگا۔ اتنی سی چوٹ پہ اُس کا یہ حال تھا اگر ذرا زیادہ لگ جاتی تو وہ تو آسمان سر پر اُٹھا لیتی۔
ڈاکٹر نے کچھ میڈیسن لکھ کر دیں اور چین کے لیے انجکشن لگانے لگے تو وہ پھر رونا شروع ہو گئی۔
"کیڈٹ عائشہ ڈونٹ بیہو لائک آ چائلڈ......"۔ اُنہوں نے اتنی سختی سے کہا کہ وہ اندر ہی اندر آنسو پی گئی۔
"آپ کو بیڈ ریسٹ کے لیے صرف دو دن کی لیو دی جا رہی ہے اوکے......"۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد ایک جان لیوا خبر اُس کو سنائی گئی۔ کتنے ظالم لوگ تھے دو دن میں

تو درد بمشکل جاتا تھا۔

"مائی گاڈ یہ فیوچر سولجرز ہیں......"۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ پیچھے وہ پھر رونا شروع ہو گئی۔

"عاشی بس کر دو یار اتنی تو تمہیں چوٹ نہیں آئی جتنا تم رو رہی ہو"۔ خدیجہ جو اُس کی میٹ تھی اُن کے جانے کے بعد بولی۔

"خدیجہ مجھے ماما بہت یاد آ رہی ہیں مجھے گھر جانا ہے"۔ گھر والوں کی یاد آج پھر شدت سے آ رہی تھی۔

"میری جان گھر کو تو تم بھول ہی جاؤ اب...... بس اپنی ٹریننگ پر فوکس کرو......"۔ خدیجہ اُس کا کاندھا تھپتھپا کر باہر نکل گئی۔ عائشہ نے بے بسی سے سر گھٹنوں میں دے لیا۔

آج اتوار تھا۔ وہ ناشتے کے بعد میڈم فلک کو فون کرنے کی نیت سے نیچے آئی۔ تین چار منٹ سے زیادہ کال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اُس کا پاؤں اب ٹھیک ہو چکا تھا۔

اُس نے اُن کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف فون اُٹھانے والی میڈم فلک ہی تھیں۔ عائشہ نے شکر کیا ٹائم بچ گیا تھا۔

"ہیلو میڈم میں عائشہ بول رہی ہوں"۔ اُس کا لہجہ نا جانے کیوں بھیگ گیا تھا۔

"عائشہ بیٹا کیسی ہو آپ؟ اور آپ کی ٹریننگ کیسی جا رہی ہے؟"۔ انہوں نے پوچھا تو وہ رونے لگ گئی۔

"عائشہ ڈیئر کیا ہوا؟ آر یو اوکے؟"۔ وہ فوراً پریشان ہو گئیں۔

"میڈم اِٹس ٹو مچ ٹف...... میں تھک گئی ہوں مجھ سے اور نہیں ہوتا"۔ وہ ٹوٹ چکی تھی۔

"بری بات بیٹا آپ نے ایسا سوچا بھی نہیں کہ آپ یہ نہیں کر سکتی یو کین ڈو اایوری تھنگ تھنکنگ از امپوسیبل فار یو"۔ وہ پھر اُس کی اُمید بڑھا رہی تھیں۔ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کی زندگی میں کوئی ایسا شخص ہوتا جو اُن کو حوصلہ دیتا...... جو اُن کو ٹوٹنے نہیں دیتا...... میڈیم فلک عائشہ نصار کی زندگی میں اُسی شخص کی اہمیت رکھتی تھیں۔

"خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کا سفر بہت مشکل ہے بیٹا...... کچھ بھی پانا آسان نہیں ہوتا بہت مہنگی قیمت چکانی پڑتی ہے بہت سفر کرنا پڑتا...... اگر آپ ایسے ہمت ہار جاؤ گی تو پائلٹ کیسے بنو گی...... آپ کو خود کو مضبوط اور بہادر بنانا ہے"۔ انہوں نے اُسے سمجھایا۔

"میں کوشش کروں گی"۔ وہ کچھ نارمل ہو چکی تھی۔

"گڈ مجھے یہی امید تھی آپ سے"۔ انہوں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

عائشہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ نا جانے ایسا کیا تھا میڈم فلک کی باتوں میں کہ وہ ہمیشہ اُن سے بات کر کے ریلیکس ہو جاتی۔ اُس کی ساری ٹینشن زائل ہو جاتی جیسا اب ہوا تھا۔ آتے ہوئے وہ جتنی مایوس اور پریشان تھی جاتے ہوئے اُتنی ہی سرشار اور مطمئن تھی۔

......☆☆......

وہ لان میں بیٹھی پچھلی کلاس کا لیکچر دیکھ رہی تھی جب کیڈٹ حارث نے آ کر اُسے اطلاع دی کہ اُس کے لیے فون ہے۔ وہ حیران ہوتی وہاں سے اُٹھی۔

"سر کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"۔ وہ باہر کھڑی اجازت طلب کر رہی تھی۔

"جی آ جائیں"۔ اجازت ملتے ہی وہ اندر آ گئی۔

"آپ کے گھر سے فون ہے"۔ انہوں نے اُسے ریسیور تھمایا اور خود باہر چلے گئے۔

اُس نے ریسیور کان سے لگا لیا۔

"ہیلو......"۔ مدھم سے لہجے میں وہ بولی تھی۔

"کیسی ہیں آپ......؟"۔ دوسری طرف سے مردانہ اور اجنبی آواز سن کر وہ ڈر گئی۔ ریسیور گرتے گرتے بچا۔

"کک کون؟"۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہیں کوئی آس پاس تو نہیں تھا۔ اگر کوئی سن لیتا تو مصیبت آ جاتی تھی۔

"یہ بات پھر کبھی کے لیے رکھ لیتے ہیں کبھی فرصت میں جواب دوں گا ابھی بس آپ مجھے اتنا بتائیں کہ آپ کیسی ہیں؟"۔ دوسری طرف سے جس انداز میں پوچھا گیا تھا اُس سے وہ یہ تو سمجھ گئی تھی کہ وہ جو کوئی بھی تھا اُسے جانتا تھا۔ مگر اُسے اِس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مگر ایک بات پر حیرت تھی کتنے دھڑلے سے وہ اُس کو جھوٹ بول کہ فون کر رہا تھا۔ کتنی ہمت تھی اُس کے اندر وہ بنا کوئی

جواب دیے فون رکھ کر باہر آ گئی۔ دل سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

اس بات کو کافی دن بیت گیے۔ پھر کوئی فون نہیں آیا تھا۔ عائشہ نے سکھ کا سانس لیا۔ چند دنوں بعد وہ سب بھول بھال گئی۔

ڈنر کے بعد اچانک سب کو گراؤنڈ میں پہنچنے کا بلاوا آ گیا۔ عائشہ جو ابھی یونیفارم چینج کر کے سونے کے لیے لیٹی تھی ہڑبڑا کر اٹھی۔ فوراً یونیفارم پہنا۔ جلدی جلدی میں وہ اسکارف کے اوپر کیپ پہننا بھول گئی۔ گراؤنڈ میں جا کر خدیجہ کے یاد کروانے پر اُسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

کیڈٹس کو کچھ ہدایات دیتے ایک آفیسر کی اُس پہ نظر پڑ گئی۔

''کیڈٹ عائشہ لیو دی رو......''۔ اُنہوں نے اُسے سائیڈ پر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

ایک دو اور کیڈٹ کو بھی یونیفارم کمپلیٹ نہ ہونے پر سائیڈ پر کھڑا کر دیا گیا۔

''کیڈٹس بالکل سیدھے کھڑے ہوں اور اپنی دائیں ٹانگ اوپر کر لیں''۔ ٹرینز افیسر نے سب کو آرڈر دیا۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔

''اب ٹانگ کو خود جھکتے ہوئے پیچھے کی طرف اٹھائیں......''۔ اُنہوں نے سب کو ایک ساتھ کرنے کا حکم دیا۔

''نو باڈی ول مس اٹ......''۔ اُنہوں نے کہا تو سب نے او کے سر کہتے ہوئے فوراً کرنا شروع کر دیا۔

''بی ود دیم......یو ایڈیٹ''۔ سامنے کھڑے ایک کیڈٹ کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا جو باقی کے ساتھ نہیں کر رہا تھا۔

دو منٹ تک وہ لوگ اسی پوزیشن میں کھڑے رہے۔

''ناؤ اسٹینڈ اپ......''۔ اب اُن کو ایک ساتھ کھڑے ہونے کا کہا گیا۔

''آئی وانٹ فسٹ اینڈ لاسٹ راؤنڈ آف گراؤنڈ ان تھرٹی سیکنڈز''۔

ٹرینز کا حکم ملتے ہی سب بھاگے تھے۔

ایک گھنٹے میں ہی سب کی جان چھوٹ گئی۔ سب لوگ واپس چلے گئے تو وہ تینوں آفیسرز اُن کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ہاں جی تو کیا سزا تجویز کی ہے پھر آپ لوگوں نے اپنے لیے''۔ اُن میں سے ایک نے سنجیدگی سے پوچھا۔ سب کے سر جھک گئے۔ کسی کی بولنے یا جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔

''دو منٹ ہیں آپ لوگوں کے پاس گراؤنڈ کے پانچ چکر لگا کر واپس آئیں''۔ دوسرے آفیسر نے نیا حکم جاری کیا۔ عائشہ تو یہ سن کر بیہوش ہوتے ہوتے بچی۔

''پانچ چکر......''۔ وہ گرنے والی ہو گئی۔ اتنا بڑا گراؤنڈ اور دو منٹ میں پانچ چکر کیسے لگانے تھے۔

''یور ٹائم اسٹارٹ ناؤ......''۔ ایک آفیسر نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تو وہ سب بھاگے۔ کیونکہ دو منٹ میں ہر حال میں یہ کرنا تھا۔

عائشہ اپنی طرف سے جتنا تیز بھاگ سکتی تھی بھاگ رہی تھی۔ ایک تو رات کا وقت تھا۔ صحیح طرح سے نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ چوتھے چکر میں ہی کسی چیز سے ٹکرا کر گری۔ دونوں کہنیاں اور گھٹنے بری طرح اچھل گئے۔ درد کی شدت سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر یہ رونے کا وقت نہیں تھا۔ وہ پھر اُٹھی۔

اب بھاگتے ہوئے بہت درد ہو رہا تھا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ وہ دو منٹ کی بجائے ساڑھے تین منٹ میں پہنچی تھی۔ جس پر ڈانٹ تو پڑی ہی تھی ساتھ میں نئی سزا مل گئی۔ آدھا گھنٹہ مسلسل ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کا حکم مل گیا۔ وہ اندر ہی اندر آنسو پیتی رہی۔ کتنی بے بسی تھی وہ کسی کو اپنے زخم نہیں دکھا سکتی تھی حتیٰ کہ اپنی چوٹ کا بتا بھی نہیں سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ روم میں پہنچی تو سب سو چکی تھیں۔ وہ واش روم میں کتنی ہی دیر روتی رہی۔ جب باہر آئی تو پیغام ملا کہ اُس کے لیے فون ہے۔

وہ چہرہ صاف کرتی نیچے آ گئی۔ اُس کا روم سیکنڈ فلور پر تھا۔

''آج جو کچھ ہوا مجھے بہت دکھ ہوا اُس پر......لیکن تم بہت بیوقوف ہو سوری نہیں کر سکتی تھیں'' دوسری طرف پھر وہی اجنبی تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے والے واقعے کے متعلق بات

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کر رہا تھا عائشہ سمجھ گئی تھی مگر وہ یہ بات کیسے جانتا تھا۔
عائشہ کو حیرت ہوئی۔ وہ بولی کچھ نہیں تھی۔

"بہرحال آئندہ ذرا خیال رکھیے گا اور ہاں جہاں جہاں چوٹ لگی ہے وہاں مرہم لگا لیجیے گا"۔ عائشہ کی بات سنے بغیر ہی اُس نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔

"اس کو شاید پتہ نہیں کہ سوری لفظ یہاں استعمال نہیں کیا جاتا"۔

وہ حیران پریشان سی کمرے میں آگئی۔ چوٹ درد سب بھول گیا تھا۔ آخر یہ تھا کون جو اتنے دھڑلے سے بنا کسی ڈر اور خوف کے اُس کو فون کرتا تھا۔ شاید نہیں یقیناً وہ یہیں کا رہنے والا تھا اور اُس کو آل ٹائم واچ کرتا تھا۔ دوسرا وہ کوئی عام نہیں تھا کسی بڑے عہدے پر تھا کیونکہ کوئی عام آدمی اتنی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پریشان ہونے سے زیادہ حیران ہو رہی تھی۔

......☆☆......

آج اُن کی پیرا کوئس کی ٹریننگ تھی۔ جس میں کیڈٹس دو فٹ کی بلندی سے جمپ لگا رہے تھے۔ وہ سب بار بار یہ عمل دہرا رہے تھے۔ اس ٹریننگ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جب بھی اُن کو جہاز سے جمپ لگانا پڑے تو اُس دوران ان کو کیا کرنا چاہیے۔

ٹرینر آفیسر تمام کیڈٹس کو گائیڈ کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ اُن کو ہدایات بھی دیتے جا رہے تھے۔

اس ٹریننگ میں شروع شروع میں کیڈٹس تقریباً دو فٹ کی بلندی سے جمپ لگاتے تھے مگر آہستہ آہستہ جمپ کی اونچائی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

"خدیجہ میں نے اِس سے پہلے کبھی آدھے فٹ کی بلندی سے بھی جمپ نہیں لگایا قسم سے"۔ وہ لوگ کچھ دیر ریسٹ کرنے کے لیے سائیڈ پہ بیٹھیں تو پانی پیتی عائشہ نے کہتے ہوئے خدیجہ کو کہا جو اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

"ہاں میں تو جیسے بچپن سے یہی کرتی آئی ہوں نہ"۔
وہ چڑ کر بولی تو عائشہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"ویسے یہ ہے بہت انٹرسٹنگ اس بات میں کوئی شک نہیں"۔ خدیجہ نے اُس کے ہاتھ سے پانی والی بوتل لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بہت انٹرسٹنگ ہے...... اگر ابھی کوئی جمپ لگاتے ہوئے ذرا چوک گیا نہ تو اُس کی کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی پھر دیکھنا کتنا انٹرسٹنگ لگتا"۔ عائشہ نے ایک نظر سامنے دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ کچھ کیڈٹس اب دس فٹ کی بلندی سے جمپ کر رہے تھے۔

"اگر بندے کی شکل اچھی نہ ہو تو بندہ بات ہی اچھی کر لے"۔ خدیجہ نے اُسے گھورا تو وہ ڈھٹائی سے مسکراتی رہی۔

......☆☆......

وہ ایک ہفتے کی چھٹیوں پر گھر آئی تو جیسے پھر سے جی اُٹھی۔ زندگی ایک دم سے جیسے پُرسکون ہو گئی۔ وہ اپنی مرضی سے اُٹھتی اپنی مرضی سے سوتی کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ واقعی گھر کسی جنت سے کم نہیں ہوتا۔ اُسے گھر کی اور گھر والوں کی اب قدر ہوتی تھی جب وہ کئی کئی مہینوں بعد اُن سے دور رہتی تھی۔ وہ آج لنچ کے بعد سوئی تو عصر کے بعد ہی آنکھ کھلی۔ عصر بھی نکل گئی تھی اُسے افسوس ہوا۔ اب تو قضا کا بھی وقت نہیں تھا وہ بے دلی سے پھر لیٹ گئی تبھی فاطمہ گل اُس کے لیے کافی بنا کر لے آئیں۔ وہ جب بھی گھر آتی تھی وہ اُس کا بہت خیال رکھتیں۔ اُس کی پسند کے کھانے بناتیں اُس کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کرتیں۔ عائشہ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی تھی۔

"یہ لو کافی پیو......"۔ اُنہوں نے اُسے کافی کا مگ تھمایا اور اُس کے کمرے کی کھڑکی کے پردے برابر کرنے لگیں۔ شام کے سائے اب سمٹتے جا رہے تھے۔ پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ سورج بھی غروب ہو چکا تھا۔ ہر طرف ایک گہری اور پُراسرار خاموشی کا راج تھا۔

وہ اُس کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔ عائشہ گھونٹ گھونٹ کافی پیتی رہی۔ کافی بہت اچھی بنی تھی۔

فاطمہ گل نے سائیڈ ٹیبل پہ پڑی اُس کی تصویر اُٹھالی۔ جس میں وہ یونیفارم میں تھی۔ یہ تصویر پچھلے دنوں اُس کی غیر موجودگی میں نصار بیگ نے رکھوائی تھی۔ ایک اپنے کمرے میں اور ایک عائشہ کے کمرے میں

"کتنی پیاری لگتی ہو نہ تم یونیفارم میں......"۔ اُنہوں نے بے ساختہ تصویر چوم لی۔ عائشہ اُن کی محبت پر نہال سی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوگئی۔ کتنا سکون اُس کے اندر اُتر آیا تھا۔

"تم نے ساڑھی بھی پہنی ہے کبھی......؟"۔ کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

"جی بہت دفعہ پہنی ہے......"۔ عائشہ کافی ختم کر چکی تھی۔ وہ اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"اگلی بار جب آؤ گی تو کس بنا کر لانا......"۔ وہ اُس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔

"جی لاؤں گی......"۔ وہ آنکھیں موندتے ہوئے بولی۔

"تم کتنی کمزور ہوگئی ہو......؟"۔ اُنہوں نے اُس کے کملائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

عائشہ ہلکا سا مسکرائی۔

"میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں ماما......"۔ وہ پرسکون ہوتی جا رہی تھی۔

"ماما کی جان......"۔ فاطمہ گل نے فرطِ جذبات سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیے۔ عائشہ کی روح تک میں چین اُتر گیا۔ کتنا پُرسکون لمس تھا۔ وہ غنودگی میں چلی گئی۔

چھٹیاں کیسے ختم ہوئیں اُسے پتہ بھی نہ چلا۔ وہ آتے ہوئے بہت اداس تھی۔ اکیڈمی آ کر بھی پورا دن اُداسی میں گزرا۔

شام کو پھر اُس کے لیے فون تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کس کا فون تھا۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی آ گئی۔

دوسری طرف واقعی وہ تھا۔

"تھینک گاڈ آپ واپس آ گئیں...... میں نے بہت مس کیا آپ کو......"۔ بڑے بے چین لہجے میں جواب آیا تھا۔ عائشہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا جواب دیتی۔

"آپ چپ کیوں ہیں......؟"۔ وہ اُس کی مسلسل چپ سے پریشان ہوگیا تھا۔

"کیا آپ مجھ سے مل سکتے ہیں......؟"۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے پوچھا۔

مقابل کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا تھا۔

"وقت آنے پر مل لوں گا"۔ کہتے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا تھا۔

وہ حیران سی فون کو دیکھتی رہی۔

"عجیب آدمی ہے"۔ وہ سوچتی ہوئی باہر آ گئی۔

......☆☆......

پلٹ کر جھپٹنا جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہ گراؤنڈ کا منظر تھا۔ جہاں سب کیڈٹس کو پیرا موٹر گلائیڈنگ کی ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ اُن کو ایک موٹر کے ساتھ جسکا وزن فورٹی سے ففٹی کلوگرام تک ہوتا ہے اُس کے ساتھ فضا میں پرواز کرنا ہوتا ہے۔ اس میں کیڈٹس کو اُس موٹر کے ساتھ چار سو سے لے کہ پانچ سو فٹ تک کی بلندی پر پرواز کرنا ہوتا ہے۔ اس فلائیٹ کا ٹائم ڈیوریشن تقریباً پندرہ سے بیس منٹ تک ہوتا ہے۔

"کیڈٹ عائشہ آر یو ریڈی؟"۔ ٹریننگ آفیسر صائم نے اُس سے پوچھا جو اِس وقت اُس موٹر کو پہنے ہوئے تھی اور فلائنگ کے لیے ریڈی تھی۔

"یس سر......"۔ اُس نے سر ہلا دیا۔

وہ کچھ ڈری ہوئی تھی کیونکہ یہ تجربہ وہ فرسٹ ٹائم کر رہی تھی۔

"او کے بیسٹ آف لک اینڈ ٹیک آف"۔ وہ کہتے ہوئے خود سائیڈ پہ ہو گئے۔

کچھ دور بھاگنے کے بعد اُس نے آہستہ آہستہ فضا میں پرواز کرنا شروع کر دیا۔

دل میں موجود ڈر بھی آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ وہ اب فلائنگ کو کافی انجوائے کر رہی تھی۔ فضا میں پرواز کا یہ کافی انوکھا اور دلچسپ تجربہ تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد وہ لینڈ کر چکی تھی۔

"کیسا ایکسپیرینس تھا؟"۔ واپسی پر خدیجہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اٹ واز ونڈر فل یار...... بہت مزہ آیا"۔ وہ کافی خوش تھی۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا"۔ خدیجہ کافی گھبرائی ہوئی تھی کیونکہ اب اُس کی باری تھی۔

"پہلے پہلے ایسے ہی ہوتا...... ڈونٹ وری"۔ وہ اُسے تسلی دیتی سائیڈ پہ ہوگئی۔

کچھ دیر بعد خدیجہ بھی اُسی طرح چار سو فٹ کی بلندی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پہ پرواز کر رہی تھی۔

.......☆☆.......

آج اس کی پہلی فلائیٹ تھی۔ ٹریننگ کے دوران وہ جو پہلا جہاز اُڑاتے ہیں اُس کا نام مشاق ہے۔ یہ اُن کی پرائمری ٹریننگ کے دوران اُن کو چلانا سکھایا جاتا ہے۔ جب وہ اکیڈمی میں پہلی دفعہ فلائینگ شروع کرتے ہیں تو یہ جہاز اُڑاتے ہیں۔

آج اُس کی زندگی کا پہلا خواب پورا ہو رہا تھا۔ وہ خواب جو اُس نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ مکمل یونیفارم میں تھی۔ ایک آفیسر اُس کے ساتھ تھے۔ جوں جوں طیارہ زمین سے دور جا رہا تھا اُس کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کا جنون اُس کے خواب سب کھلی فضا میں سانس لے رہے تھی۔ کھلے آسمان پر بادلوں کے درمیان اُڑنا کس قدر نیا اور انوکھا ہوتا یہ اُسے آج پتہ چلا تھا۔

وہ لوگ قریب دو گھنٹے فضا میں پرواز کرتے رہے اور یہ دو گھنٹے عائشہ نصار بیگ کی زندگی کے سب سے یادگار اور سکون بھرے تھے۔ زمین پہ قدم رکھتے وقت بھی وہ دور اُن فضاؤں میں ہی سفر کر رہی تھی۔ سب کچھ کتنا اچھا اور خوبصورت لگ رہا تھا۔

"کیڈٹ عائشہ ہاؤ واز یور فرسٹ فلائٹ؟"۔ کمانڈر فہد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ایکسیلنٹ سر......"۔ وہ خوشی کو قابو میں کرتے بس اتنا ہی بول پائی تھی۔

"گڈ لک......"۔ وہ اُس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"تھینک یو سر......"۔ وہ سرشاری اُن کا شکریہ ادا کرتی وہاں سے ہاسٹل چلی آئی۔

"عائشہ تم سے کوئی ملنے آیا ہے......"۔ تبھی اُسے اطلاع ملی تو وہ بنا چینج کیے نیچے آ گئی۔

آفس میں بیٹھے آیان کو دیکھ کر تو یقین ہی نہ آیا کیونکہ اُس دن کی ناراضگی کے بعد وہ آج دوسری بار آیا تھا۔

"ایان بھائی......"۔ وہ دوڑ کے اُس کے گلے لگ گئی۔ آج وہ اُس روتی منہ بسورتی عائشہ سے بالکل الگ تھی۔

"آج تو میری گڑیا بہت خوش لگ رہی ہے......"۔

آیان نے اُس کے چمکتے چہرے کو پیار سے دیکھا۔

"بالکل آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ آج میری پہلی فلائٹ تھی"۔ اُس نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

"جانتا ہوں اسی لیے تو تم سے ملنے آیا ہوں......ایک کام کرو جلدی سے چینج کر کے آؤ ہم باہر لنچ کریں گے......اُس کے بعد میں تمہیں شاپنگ بھی کرواؤں گا"۔

آیان نے اُسے جانے کا اشارہ کیا مگر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

"ڈونٹ وری گڑیا میں پرمیشن لے چکا ہوں......تم بس تیار ہو کر آؤ"۔ وہ اُس کی اُلجھن اور پریشانی سمجھ گیا تھا۔

"اوکے......"۔ عائشہ مسکراتے ہوئے اوپر آ گئی۔

ایان اُسے پہلے شاپنگ کروانے لے گیا۔ شاپنگ کے بعد اُس نے ایک اچھے سے ریسٹورینٹ میں اُسے ڈنر کروایا۔ آئس کریم کھلانے کے بعد وہ اُسے پزا ہٹ لے گیا۔ وہاں سب کے لیے پیزا پیک کروایا اور اِس طرح وہ دو گھنٹے گزار کر واپس آ گئی۔ سب کچھ کتنا اچھا اور پرسکون ہو گیا تھا۔ کاش زندگی ہمیشہ ایسی ہی رہتی۔ وہ دن زندگی کا یادگار ترین دن تھا۔ ایان اُسے اکیڈمی چھوڑ کر خود واپس چلا گیا۔ وہ رات کو ڈنر کے لیے جانے ہی لگی تھی کہ اُسے پیغام ملا کہ اُس کے لیے فون ہے۔ عائشہ ایک سیکنڈ میں سمجھ گئی تھی کہ کون ہو گا۔

"پتہ نہیں کون ڈھیٹ انسان ہے جو اتنی جرأت سے فون کر کے مجھے بلواتا ہے"۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی نیچے آ گئی۔

"پہلی کامیابی مبارک ہو......"۔ دوسری طرف وہی تھا۔ عائشہ نے گہرا سانس لیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح چپ رہی۔ شکریہ کہنے کی زحمت بھی نہ کی۔

"میری دعا ہے کہ آپ ایسی ہزاروں کامیابیاں پاؤ......میں آپ کو بہت اوپر دیکھنا چاہتا ہوں"۔ وہ اُس کی خاموشی پر بغیر برا مانے بولا۔

"میں اکیڈمی کی سب سے اونچی منزل پر چڑھ جاتی ہوں آپ دیکھ لینا"۔ وہ چڑ کر بولی تو دوسری طرف قہقہہ لگایا گیا۔ وہ اُس کی بات پر کافی محظوظ ہوا تھا۔

"انٹرسٹنگ......مطلب بولنا جانتی ہیں آپ...... بلکہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بہت تیکھا بول سکتی ہیں''۔ وہ ڈھٹائی سے بولا تو عائشہ نے دانت پیسے۔

''آپ کو ذرا خیال ہے اس بات کا کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ آپ مجھے فون کرتے ہیں تو میرا کیا حشر ہوگا''۔ وہ غصے سے بولی۔

''کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا میں ہوں نہ سو ڈونٹ وری''۔ دوسری طرف کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ عائشہ نے بے بسی سے ایک گہرا سانس لیا اور فون رکھ دیا۔

اُس کی ایک بات اچھی تھی کہ وہ اُس کے فون بند کرنے پر دوبارہ فون نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اُسے بات کرنے پر فورس کرتا تھا۔ اگر وہ بات کر لیتی تو ٹھیک ورنہ وہ اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیتا تھا۔ عائشہ کو وہ باتوں سے کافی مہذب اور سلجھا ہوا لگتا تھا۔

سوچ سوچ کر عائشہ کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کون تھا اور اُسے کیوں فون کرتا تھا۔ وہ جتنا سوچتی اُتنا ہی الجھ جاتی۔

وہ ڈنر کے لیے میس جانے کی بجائے واپس روم میں آ گئی کیونکہ بھوک بالکل ختم ہو چکی تھی۔

......☆☆......

اُس کی ماما سے بات ہوئی تو پتہ چلا کہ آیان کے لیے اُنہوں نے لڑکی دیکھ لی ہے اور اگلے مہینے کی چھ تاریخ کو شادی ہے۔ وہ سن کر بہت زیادہ خوش ہوئی۔ تھوڑا سا دکھ بھی ہوا کہ وہ گھر پر نہیں تھی اور سب اُس کی غیر موجودگی میں ہوا تھا۔

''تم یکم کو آ جانا گھر......''۔ فاطمہ گل نے اُس کو مشورہ دیا۔

''نہیں ماما اتنے دن پہلے میں آ گئی تو، شادی کے فوراً بعد واپس آنا پڑے گا...... میں مہندی والے دن آ جاؤں گی اور پھر شادی کے بعد کچھ دن آپ لوگوں کے ساتھ رہ لوں گی''۔ عائشہ نے اپنی طرف سے حساب لگاتے ہوئے کہا۔

''میں ایان سے کہوں کہ تمہاری زیادہ دن کی چھٹی کے لیے کسی سے بات کرے''۔ فاطمہ گل کو یہ بات کچھ دکھی کر گئی تھی۔ اُن کی اکلوتی بیٹی شادی میں مہمانوں کی طرح آتی یہ کہاں گوارہ تھا۔

''نہیں ماما پھر یہاں سے بہت حرج ہوگا اگلے منتھ میرے ایگزامز بھی ہیں...... پھر مشکل ہو جائے گی...... ہماری ٹریننگ بھی چل رہی ہے اس لیے میں ایسا نہیں کر سکتی لیکن مجھے ایک ویک کی لیو مل جائیگی اور وہ کافی ہے''۔ اُس نے اُنہیں سمجھایا۔

''چلو جیسے تمہیں مناسب لگے''۔ وہ مان گئیں۔

''اچھا آپ ساری شاپنگ میرے لیے میری پسند سے کیجیے گا......''۔ اُس نے اُن کو یاد دلایا۔

''ہاں سب تمہاری پسند سے بناؤں گی تم بالکل فکر مت کرنا......''۔ فاطمہ گل نے پیار سے جواب دیا۔

''اچھا ماما پھر بات کروں گی کال کا ٹائم ختم ہو رہا''۔ اُس نے ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو اپنا خیال رکھنا...... خدا حافظ''۔ فاطمہ گل نے فون بند کر دیا۔

عائشہ ریسیور رکھ کر کلاس میں آ گئی۔ جہاں سب بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ وہ خدیجہ لوگوں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''کہاں تھی تم......؟''۔ خدیجہ نے اُس کو گھورتے ہوئے پوچھا کیونکہ پچھلے پندرہ منٹ سے وہ بنا بتائے لاپتہ تھی۔

''ماما کا فون تھا اُن سے بات کر رہی تھی''۔ اُس نے کیپ سر سے اُتار کر گود میں رکھتے ہوئے مختصر انداز میں بتایا۔

''تم نے آج کی تازہ خبر سنی......؟''۔ ہدیٰ بھی اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کونسی......؟''۔ عائشہ نے بھویں اچکا کر پوچھا۔

''فلائٹ لیفٹیننٹ ایاز سیف کا پلین کریش ہو گیا اور وہ شہید ہو گئے ہیں''۔ ہدیٰ نے افسردگی سے بتایا تو وہ شاکڈ ہو گئی۔

''او مائی گاڈ یہ کیسے ہوا؟''۔ عائشہ کا دل تھم سا گیا تھا۔

''یار موسم کافی خراب ہے نہ آجکل تو وہ روٹین راؤنڈ کے لیے نکلے تھے...... پتہ نہیں کیسے پلین آؤٹ آف کنٹرول ہوا اور کریش ہو گیا''۔ خدیجہ نے اُسے مختصر تفصیل بتائی۔

''کس جگہ پہ ہوا ہے کریش؟''۔ عائشہ نے اگلا سوال

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پوچھا۔

"کوئی سنسان جگہ تھی۔ تھینک گاڈ کہ آبادی سے دور تھا ورنہ بہت نقصان ہوتا"۔ ہدی نے بتایا تو وہ اداس ہوگئی۔

"بہت افسوس ہوا ان کے یار......"۔ اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اُتر آئی۔

رات کو پھر اُس کے لیے فون تھا۔ آج تقریباً دو ہفتوں کے بعد اُس نے فون کیا تھا۔

"کیسی ہو؟"۔ وہی ہمیشہ والا خوبصورت لہجہ تھا۔ اُس کی آواز بہت پیاری تھی۔ کبھی کبھی تو وہ بے ساختہ سوچنے پر مجبور ہوجاتی کہ جس انسان کی آواز اتنی خوبصورت ہے وہ خود کیسا ہوگا۔

"اچھی ہوں......"۔ مختصر الفاظ میں جواب دیا گیا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اتنی دیر سے اُس کو فون کرتا مگر ابھی تک وہ اُس کے نام سے انجان تھی۔ نہ اُس نے کبھی بتایا تھا اور نہ عائشہ نے کبھی پوچھنے کی زحمت کی تھی۔ اُن کی بات چیت کا دورانیہ بہت مختصر ہوتا تھا دو یا تین منٹ اُن میں بھی زیادہ وہی بات کرتا تھا۔ عائشہ اب نا جانے کیوں اس کے فون کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اگر وہ فون نہ کرتا تو وہ لاشعوری طور پر اُس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوجاتی۔

"پریشان ہو......؟"۔ وہ اُس کو اندر تک جانتا تھا۔

"ہاں......"۔ وہ آہستگی سے اقرار کر گئی۔

"کیوں؟"۔ وہ کچھ بے چین ہوا تھا۔

"فلائٹ لیفٹیننٹ ایاز سیف کی شہادت کا سن کر......"۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد بتایا گیا۔

"اچھا"۔ وہ صرف اتنا ہی بولا تھا۔

"آپ کو دکھ نہیں ہوا کیا پتہ تو آپ کو بھی چل ہی گیا ہو"۔ عائشہ نے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ بات اُس کو یقیناً پتہ ہوگی۔

"وہ میرا چھوٹا بھائی تھا"۔ کافی گہری اور پُراسرار خاموشی کے بعد دوسری طرف سے جواب آیا تھا۔

عائشہ اپنی جگہ پتھر کی ہوگئی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ آگے سے کیا بولے۔ اُس کی آنکھوں سے نا جانے کیوں آنسو نکل آئے۔

وہ اپنی بات کہہ کر فون بند کر چکا تھا۔ عائشہ آنسو ضبط کرتی روم میں آگئی۔ آج پتہ نہیں کیوں دل از حد بے چین تھا۔

"خدیجہ ایک بات پوچھوں؟"۔ رات کو سونے سے پہلے اُس نے خدیجہ کو مخاطب کیا۔ اُن دونوں کا بیڈ ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے مچھر کافی زیادہ تھے۔ اس لیے وہ لوگ آجکل مچھر دانیاں لگا کر سوتی تھیں۔

"ہاں ضرور پوچھو......"۔ خدیجہ نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر جواب دیا۔

"کیا فلائٹ لیفٹیننٹ ایاز کا کوئی بڑا بھائی بھی ائر فورس میں ہے؟"۔ وہ کافی لمبے سوچنے کے بعد بولی تھی۔

"پتہ نہیں یار میں نے تو نہیں سنا......تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"۔ خدیجہ اس بات سے انجان تھی۔

"ویسے ہی......"۔ وہ بے دلی سے بولی۔

خدیجہ نے پھر کوئی بات نہ کی شاید وہ سو رہی تھی۔

......☆☆......

کتنے ہی دن گزر گئے مگر دوبارہ اُس کا فون نہ آیا۔ عائشہ کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نا جانے وہ کہاں مصروف تھا۔ عائشہ کے پاس اُس کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ وہ تو اُس کے نام تک سے انجان تھی۔

وہ لان میں بیٹھی رجسٹر سامنے رکھے سوچوں میں گم تھی۔ تبھی خدیجہ چلی آئی۔

"عائشو تم اِدھر بیٹھی ہو میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہی ہوں......بہت عجیب ہو تم بنا بتائے کبھی بھی غائب ہو جاتی ہو"۔ خدیجہ نے بیٹھتے ہوئے شکوہ کیا۔

عائشہ چپ چاپ گھاس پہ نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ خدیجہ کو غصہ آگیا۔

"اوکے میں جا رہی ہوں اگر تمہیں مجھ سے بات نہیں کرنی تو......"۔ خدیجہ ناراضگی سے اُٹھنے لگی تو عائشہ نے اُس کا بازو پکڑ کر واپس بٹھا لیا۔ وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے کیونکہ ہر وقت اتنی دکھی بن کہ بیٹھی رہتی ہو؟"۔ خدیجہ اُس کو مسلسل خاموش دیکھ کر دوبارہ بول پڑی۔

"اگر میں تمہیں بتاؤں گی تو تم میرا مذاق تو نہیں بناؤ گی نا......؟"۔ عائشہ نے اُس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ خدیجہ کو اپنا راز بتائے گی۔ شاید وہ اُس

کی کوئی مدد کرے یا کوئی اچھا مشورہ دے۔
"بالکل نہیں جانتی میں کیوں تمہارا مذاق بناؤں گی...... تم بات بتاؤ"۔ خدیجہ کچھ سنجیدہ ہوگئی۔ اُس کا ہاتھ دبا کر تسلی بھی دی۔
"مجھے کوئی پچھلے ایک سال سے فون کرتا ہے"۔ اُس نے گھاس پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا تو خدیجہ حیران رہ گئی۔
"تمہارے پاس سیل فون ہے......؟" اُس کے دل میں پہلا خیال یہی آیا تھا۔
"نہیں......" اُس نے سر نفی میں ہلا دیا۔
"مطلب آفس میں فون آتا......؟" وہ بات سمجھ گئی تھی۔
"ہاں......" اب کی بار اُس کا سر ہاں میں ہل گیا۔
"تم جانتی ہو وہ کون ہے؟" خدیجہ نے اگلا سوال کیا۔
"نہیں...... مگر مجھے شک ہے کہ وہ یہیں رہتا کیونکہ کوئی اور ایسی جرأت نہیں کر سکتا"۔ وہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"ہمم......"۔ خدیجہ نے ایک لمبا ہنکارا بھرا۔
"نام کیا ہے اس کا......؟"۔ وہ کچھ دیر بعد دوبارہ بولی۔
"اُس نے کبھی بتایا ہی نہیں"۔ وہ پھر سامنے دیکھنے لگی۔
"کہتا کیا ہے......؟" خدیجہ کو مزید تجسس ہوا۔
"کچھ خاص نہیں بس حال چال پوچھتا ہے"۔ اُس نے سچائی سے بتایا۔
"اِس میں پرابلم کی کیا بات ہے؟"۔ خدیجہ کو سن کر حیرت ہوئی۔ بات تو کچھ خاص نہیں تھی۔
"وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا...... میں کب خوش ہوتی ہوں کب پریشان ہوتی ہوں اُسے ایک ایک لمحے کی خبر ہوتی ہے...... یوں جیسے وہ ہر وقت میرے آس پاس موجود ہو...... ہر وقت مجھ پر فوکس رکھتا......"۔ اُس نے اگلی بات بتائی تو خدیجہ سچ میں حیران ہوئی۔
"یہ تو واقعی بہت عجیب بات ہے...... اچھا یہ بتاؤ تمہیں کسی پہ شک ہے؟"۔ خدیجہ نے کچھ سوچ کر پوچھا تو

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"لیکن مجھے اتنا پتہ کہ وہ فلائٹ لیفٹیننٹ ایاز سیف کا بڑا بھائی ہے......"۔ عائشہ کے پاس اُس کے متعلق صرف ایک ہی انفارمیشن تھی۔
"یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟"۔ خدیجہ کے ذہن میں وہ رات آئی جب عائشہ اُس سے یہ بات پوچھ رہی تھی۔
"جب لاسٹ ٹائم اُس نے مجھے فون کیا تھا تب بتایا تھا"۔ عائشہ اُس کو ہر بات بتاتی جا رہی تھی۔
"ہمم مطلب ہم پتہ لگا سکتے ہیں کہ فلائٹ لیفٹیننٹ ایاز کا کونسا بھائی یہاں ہے"۔ خدیجہ پُرسوچ انداز میں گویا ہوئی۔
"لیکن ہم پتہ لگائیں گے کیسے؟"۔ عائشہ کو یہ خاصا مشکل کام لگا تھا۔
"کسی نہ کسی سے تو پتہ چل ہی جائے گا......"۔ خدیجہ پُرامید تھی۔ عائشہ خاموشی سے اُس کو دیکھتی رہی۔
اگلے دن وہ دونوں کریم بخش کے پاس پہنچ گئیں۔ وہ میس میں کھانا بناتے تھے۔ وہ کافی عرصے سے یہاں تھے۔ سب کے بارے میں جانتے تھے۔ خدیجہ نے اُن سے پوچھا تو اُن کا جواب اُن دونوں کو حیران کر گیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ ایاز سیف کا کوئی بھائی یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ دونوں وہاں سے آگئیں۔
"ہوسکتا اُس نے تم سے جھوٹ بولا ہو"۔ خدیجہ کو تو یہی لگا تھا۔
"پتہ نہیں"۔ عائشہ نے ناسمجھی سے کندھے اچکائے۔

......☆☆......

ایان کی شادی سے ایک دن پہلے وہ گھر چلی گئی۔ آج مہندی کا فنکشن تھا۔ اُس نے ہرے رنگ کے لہنگے کے اوپر اورنج کلر کی لانگ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں ہرے اور اورنج کے امتزاج والا دوپٹہ تھا۔ لمبے بالوں کی اُس نے ڈھیلی سی چٹیا بنا رکھی تھی جس میں سے آدھے سے زیادہ بال باہر تھے۔ جیولری کے نام پر صرف کانوں میں آئیر رنگز تھے اور میک اپ وہ پہلے ہی بہت کم کرتی تھی مگر ائرفورس میں جا کر تو بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ بالکل سادہ تھی۔ سفید دودھیا رنگت بغیر کسی میک اپ کے

ہی چمک رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں موتیے اور گلاب کے گجرے پہن رکھے تھے جو ماما نے زبردستی پہنائے تھے۔

اکیڈمی میں سے کافی لوگ آئے تھے کیونکہ وہ سب آیان کے جاننے والے تھے۔ اُس نے خدیجہ اور ہدیٰ کو بھی انوائٹ کیا تھا مگر اُن دونوں نے معذرت کر لی جس پر وہ اُن سے ناراض ہو کر آئی تھی۔

"عائشہ ویسے ائرفورس کے لڑکے کتنے پیارے ہوتے ہیں......" اُس کی کزن حبیبہ نے آیان کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھے اُس کے کولیگز اور سینئرز کو دیکھتے ہوئے کہا جن میں سے کچھ ابھی ابھی آئے تھے اور یونیفارم میں ہی تھے۔ اُن کو چینج کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملا تھا۔

"خیر اتنے بھی نہیں ہوتے جتنے تم کہہ رہی ہو"۔ وہ شرارت سے بولی تھی۔

"یار یہ تو زیادتی ہے اتنے پیارے تو ہیں......" حبیبہ اُس کی شرارت نہیں بھانپ سکی تھی۔

"اچھا تمہارے ساتھ بھی تو لڑکے ہیں تم بتاؤ تمہیں کوئی پسند آیا اُن میں سے......" حبیبہ نے اُس کو گھیرا۔

"ہاں بھئی بتاؤ بتاؤ......" ندا بھی گفتگو میں شریک ہوئی۔

"یار ایک تو ہمارے پاس اتنا ٹائم ہی نہیں ہوتا کہ ہم یک دوسرے کو اس لحاظ سے دیکھیں اور دوسرا ہمیں ان سب کی پرمیشن بھی نہیں ہے"۔ وہ سادگی سے بولی تھی۔ سچ بھی یہی تھا کہ اُس نے آج تک کسی لڑکے سے آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔

"پھر تو بہت بورنگ ہے یار...... مطلب اتنے پیارے پیارے لڑکے ساتھ ہوں اور بندہ اُن کی طرف دیکھے بھی نہ"۔ ندا نے منہ بناتے ہوئے کہا تو عائشہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے دونوں گالوں میں ننھے ننھے گھڑے ابھرے تھے۔ اس حسین منظر نے دور بیٹھے ایک شخص کا دل ہی لوٹ لیا تھا۔ وہ کتنے ہی لمحے اُس چہرے کو دیکھتا رہا جو پچھلے ایک سال سے اُس کے حواسوں پر بری طرح چھایا ہوا تھا۔

عائشہ کو اپنے چہرے پر کسی کی نگاہوں کی تپش محسوس ہوئی تو گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر سب لوگ مصروف تھے۔ کوئی بھی تو متوجہ نہیں تھا۔ وہ پھر بھی وہاں سے اُٹھ کر اندر آ گئی۔

اگلا بارات کا دن تھا۔ پورا دن عائشہ کو محسوس ہوا کہ وہ کسی کی گہری نظروں کے حصار میں ہے۔ مگر حیرت کی بات تو یہ تھی کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ فاطمہ گل نے اُسے زبردستی سب کے ساتھ پارلر بھیج دیا تھا مگر عائشہ نے جب خود کو اِس عجیب کشمکش میں مبتلا پایا تو غصے سے منہ دھو آئی جس پر سب نے ڈانٹا مگر اُسے پروا کب تھی۔ اِس معصوم اور جان لیوا حرکت پر کوئی مسلسل مسکراتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اُس کے مسلسل دیکھنے پر کافی اُلجھن کا شکار تھی مگر وہ چاہ کر بھی خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔

ویسے والے دن بھی سیم سچوئشن تھی عائشہ کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا تھا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی اور دوسرا دیکھنے کا والا کمبخت سامنے بھی نہیں آ رہا تھا۔ کئی بار تو اُس نے اسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹکنے کی کوشش کی مگر یہ وہم ہرگز نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو ایک چھٹی حس دے رکھی ہے جب کوئی اُسے ایسی نظروں سے دیکھے تو اُسے فوراً پتہ چل جاتا ہے۔

"حد ہے ویسے ایک وہ بندہ ہے جو مجھے ایک سال سے فون کر رہا ہے جس کا میں نام تک نہیں جانتی اور ایک یہ نا جانے کون منحوس ہے جس نے پچھلے تین دن سے میرا جینا حرام کر رکھا ہے...... پتہ نہیں ایسے عجیب و غریب مسئلے میرے ساتھ ہی کیوں ہوتے ہیں"۔ وہ اپنے کمرے میں غصے سے ٹہلتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ بہت ہی عجیب قسم کی سچوئشن تھی۔

"کہیں یہ وہی تو نہیں جو مجھے اکیڈمی میں فون کرتا ہے......" اُس کے دل میں اچانک خیال آیا۔

"شاید وہی ہے......ہو سکتا وہ بھی آیان بھائی کی شادی میں آیا ہو...... مگر کمبخت ایسے چھپ کر مجھے پریشان کیوں کر رہا ہے......سیدھی طرح سامنے آ کر بات کرلے"۔ وہ جتنا سوچ رہی تھی اُتنا ہی اُلجھ رہی تھی۔ اِس نہ نظر آنے والے بندے نے پچھلے ایک سال سے اُس کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔

وہ ایک ہفتے کی چھٹی گزار کر واپس اکیڈمی آ گئی۔ اُسی دن رات کو ڈنر سے پہلے پھر اس کا فون آ گیا۔

"کیسی ہیں آپ......؟" دوسری طرف ہمیشہ کی

طرح وہی نرم لہجہ تھا۔ وہ سخت چڑ گئی۔

"آپ نے کیا قسم کھا رکھی ہے کہ مجھے سکون سے نہیں رہنے دینا......"۔ وہ غصے سے پھٹ پڑی تو دوسری طرف یک لخت خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ ایسی بات اَن ایکسپکٹڈ نہیں کر رہا تھا۔

"آخر آپ ہیں کون؟ پچھلے ایک سال سے مجھے سخت ذہنی اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے......نہ اپنا نام بتاتے ہیں......نہ سامنے آتے ہیں آخر آپ چاہتے کیا ہیں......؟ اگر آپ کو بات کرنی ہے تو انسانوں کی طرح سامنے آ کر لیں مگر یہ کیا گھٹیا طریقہ ہے کہ کسی کو اس طرح پریشان کرنا......حد ہوتی ہے ہر بات کی بھی"۔ وہ بولی تو پھر بولتی چلی گئی۔ دوسری طرف گہری خاموشی تھی۔ وہ کچھ نہیں بول رہا تھا۔ ایک لمحے کو تو عائشہ کو یقین ہوا کہ شاید فون بند ہو گیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ اُس کی سانس لینے کی آواز وہ سن سکتی تھی۔ وہ بہت چپ تھا شاید اُس کی باتوں سے ہرٹ ہوا تھا۔ عائشہ کو ایک دم اپنے سخت رویے کا احساس ہوا۔ وہ کچھ زیادہ ہی ہارش الفاظ استعمال کر چکی تھی۔ اُس کی خاموشی عائشہ کو بے چین کر گئی۔

"میں آج کے بعد آپ کو فون نہیں کروں گا......"۔ کافی دیر بعد اُس کی آواز آئی تو عائشہ کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ اُسے منع کرنا چاہتی تھی مگر وہ فون بند کر چکا تھا۔ عائشہ کا دل چاہا چیخ چیخ کر روئے۔ اُس لمحے اُسے احساس ہوا کہ وہ اُس سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

وہ روم میں جا کر اُس دن بہت روئی تھی۔ سب لڑکیاں اُس وقت میس میں تھیں۔ اُس نے شکر کیا کیونکہ اُس کی حالت بہت ہی قابلِ رحم تھی۔

پھر آنے والے وقت میں اُس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ کتنے ہی دن بیت گیے مگر اُس کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ عائشہ کا ایک ایک دن بے چینی میں گزر رہا تھا۔

......☆☆......

آج اکیڈمی میں فیئر ویل پارٹی تھی۔ جو اُن لوگوں نے اپنے سینئرز کو دی تھی۔ پارٹی کا ارینجمنٹ لان میں ہی کیا گیا تھا۔ عائشہ کا جانے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ مگر خدیجہ اُسے زبردستی ساتھ لے کے گئی۔ لمبے خوبصورت بلیک انارکلی فراک میں جس پر گولڈن موتیوں کا کام تھا اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ ہائی ہیل پہنے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دوپٹہ گلے میں تھا مگر سر پر اُس نے ہمیشہ کی طرح حجاب لیا ہوا تھا۔ حجاب بھی گولڈن کلر کا تھا۔ میک اپ کے نام پر صرف ہلکے سے گولڈن کلر کی لپ اسٹک لگائے وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔

"آج تو کئی فوجی بیہوش ہوتے دیکھ لینا"۔ ہدی نے اُسے شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا تو جھینپ سی گئی۔

"فضول باتیں ذرا کم کیا کرو"۔ اُس نے ہدی کو گھورنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی کیونکہ اُن کو ہنستا دیکھ کر وہ خود بھی ہنس پڑی تھی۔

وہ بہت کنفیوز تھی۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس نے ہیل پہلی بار پہنی تھی۔ خدیجہ اور ہدی کے فورس کرنے پر پہن تو لی تھی مگر چلنا نہیں آ رہا تھا۔ وہ آتے ہی ایک کونے میں بیٹھ گئی تھی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ خواہ مخواہ سب کے سامنے اُس کا تماشہ بنے۔

ہدی اور خدیجہ دونوں کمپیئرنگ کر رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ اُن کے دو بیس میٹ ہاشم اور سعد بھی تھے۔ عائشہ خاموشی سے پیچھے بیٹھی تھی۔

اُس کا دھیان وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھا۔ وہ مسلسل اُس اجنبی کے بارے میں سوچ رہی تھی جس نے پچھلے ستائیس دنوں سے کوئی فون نہیں کیا تھا۔ وہ شدت سے اُس کے فون کی منتظر تھی مگر وہ تو شاید بھول ہی گیا تھا۔

تبھی اُسے اپنے نام کی پکار سنائی دی۔ اُسے اسٹیج پر بلایا گیا تھا۔ وہ حیرانگی سے اُن دونوں کو دیکھنے لگی جو اُس کے نام کی اناؤنسمنٹ کے بعد اب ہلکا ہلکا مسکرا رہی تھیں۔ عائشہ بیٹھی رہی تو کئی لوگوں نے گردنیں موڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ جس پر چار و ناچار اُسے اُٹھنا پڑا۔ وہ بڑے سنبھال سنبھال کے قدم اُٹھاتی بمشکل اسٹیج تک پہنچی۔

اُسے اسٹیج پر کوئی اچھی سی پوئٹری سنانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ یہ ہدی اور خدیجہ کی شرارت تھی وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

"چھوڑوں گی نہیں میں تم دونوں کو......"۔ اُس نے کھا جانے والی نظروں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

وہ چاروں اب سائیڈ پر ہو چکے تھے۔ وہ اکیلی مائیک تھامے کھڑی تھی۔ سب لوگ اُس کو دیکھ رہے تھے۔ عائشہ

کی نا جانے کیوں ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اُس نے ایک نظر سامنے دیکھا۔

جانے کیوں دل پہ اک عذاب آئے
آج تم یاد بے حساب آئے
تم چلے تو گئے تھے لیکن پھر
دن جو آئے بہت خراب آئے
جب بھی تیری نگاہ میں ڈوبا
بس خیالوں میں اک شراب آئے
جب ہو صورت گری تصور میں
یاد ماضی کی اک کتاب آئے
زندگی کیا ہے میں نہیں سمجھا
دور نظروں میں بس سراب آئے
آج بھی انتظار ہے شائد
میرے پیغام کا جواب آئے
دور جانا ہے، اُٹھ فہیم اب تو
دوسرے اک جہاں کا خواب آئے

اُس نے بہت خوبصورت انداز میں یہ غزل پڑی تھی۔
سب نے تالیوں کی گونج میں اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ سب کا شکریہ ادا کرتی واپس اپنی جگہ پر آ گئی۔
خدیجہ کچھ دیر بعد اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ سب لوگ اِدھر اُدھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ تبھی کسی نے مدھم آواز میں گٹار بجانا شروع کیا تھا۔ ہر طرف جیسے خاموشی چھا گئی۔ عائشہ نے حیرت سے خدیجہ کی طرف دیکھا جو خود اِدھر اُدھر دیکھ کر آواز کا تعین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر کوئی گانے لگا۔ اتنی خوبصورت آواز عائشہ کھو سی گئی۔ گانے والے کی اُن کی طرف پشت تھی اس لیے وہ اُس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی۔
"ائرفورس میں سنگر بھی ہیں......"۔ اُس نے حیرانگی سے خدیجہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیوں کیا ائرفورس میں سنگر کی انٹری منع ہے؟"۔ وہ اُلٹا اُسی سے پوچھنے لگی۔
"نہیں میرا مطلب وہ نہیں تھا"۔ عائشہ کچھ گڑبڑا گئی تھی
تبھی وہ اچانک مڑا تھا۔ عائشہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس نے اپنی پوری لائف میں اتنا ہینڈسم اور پرسنالٹی بندہ نہیں دیکھا تھا۔ بلیک ڈنرسوٹ میں وہ نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا۔ وہ بنا پلک جھپکے کتنی ہی دیر اُس کو دیکھتی رہی۔ وہ جو کوئی بھی تھا آج سے پہلے عائشہ نے اُس کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔
"عاشی یہ کیسا ہے......؟"۔ خدیجہ نے اُسے کولڈ ڈرنک کا گلاس پکڑاتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔
"میں نے آج سے پہلے اتنا شاندار بندہ کبھی نہیں دیکھا قسم سے...... بہت لکی لڑکی ہوگی وہ جس کی قسمت میں ہوگا"۔ وہ مسلسل اُس کو دیکھ رہی تھی۔
خدیجہ ہلکا سا مسکرائی۔
"اگر میں یہ کہوں کہ وہ لکی گرل تم ہو تو"۔ خدیجہ کی بات پر اُس کی کولڈ ڈرنک والے گلاس پہ گرفت ڈھیلی ہو گئی۔
"تو میں کہوں گی کہ یہ بہت ہی بیہودہ مذاق ہے......"۔ عائشہ کو اُس کی بات خاصی ناگوار گزری تھی۔
"یہ مذاق نہیں حقیقت ہے میری جان......"۔ وہ ایک نظر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی جو کسی بات پہ مسکرا رہا تھا۔
"کیا مطلب......؟"۔ عائشہ کے خاک پلے نہیں پڑا تھا۔
"یہ وہی بندہ ہے جو تمہیں فون کرتا ہے......"۔ خدیجہ نے اُس کے سر پر کوئی بلاسٹ کیا تھا۔ وہ تو شاک کی کیفیت میں آ گئی۔
"کیا؟"۔ اُس سے کچھ بولنا مشکل ہو گیا۔
"جی ہاں ڈیئر یہ پائلٹ آفیسر تیمور سیف ہیں...... فلائٹ لیفٹیننٹ ایاز سیف کے بڑے بھائی...... یہی فون کرتے ہیں تمہیں"۔ خدیجہ نے اُس کو مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔
عائشہ اِس اتفاق پہ ہقا بقا کھڑی تھی۔
"یار ایسا کیسے ہو سکتا ہے...... میں نے تو اِس کو کبھی دیکھا ہی نہیں...... تو پھر اِس نے مجھے کہاں دیکھ لیا"۔ وہ شدید صدمے کا شکار تھی۔
"یہ یہاں نہیں ہوتے...... کبھی کبھار آتے ہیں...... اب تمہیں اُنہوں نے کہاں دیکھا یہ تو وہی بتا سکتے ہیں"۔ خدیجہ اپنی کولڈ ڈرنک ختم کر چکی تھی۔ جب کہ عائشہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا۔
"تمہیں یہ سب کس نے بتایا......؟"۔ اُس نے ایک نظر پھر تیمور پر ڈالی جو مسلسل باتوں میں مصروف تھا۔
"سعد نے بتایا ہے......"۔ خدیجہ نے مختصر جواب دیا تو وہ خاموش رہی۔
"عاشی تمہیں اِن سے بات کرنی چاہیے"۔ اچانک خدیجہ بولی۔
"پاگل ہوگئی ہو میں کیا بات کروں گی......"۔ وہ فوراً انکار کرتے ہوئے بولی۔
"یار تمہیں بات کرنی چاہیے سب پوچھنا چاہیے اُن سے......"۔ خدیجہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔
"لیکن خدیجہ میں کیا بولوں گی جا کر؟"۔ وہ کشمکش کا شکار تھی۔ حالانکہ دل اُس سے بات کرنے کے لیے مچل رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی ایسی حالت پر اُس کو بہت ڈانٹ رہی تھی مگر وہ تو بن دیکھے ہی اُس پہ فدا تھا اور آج تو ویسے ہی دیکھ لیا تھا۔
وہ اُسے قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اُس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اتنی چھوٹی بات پہ ناراض ہو کر کیوں فون نہیں کرتا تھا۔ وہ اُسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اُس کے فون کا بہت انتظار کرتی تھی۔
ایک عجیب سا ڈر لگ رہا تھا۔
"جاؤ بھی......"۔ خدیجہ نے اُس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور اُسے جانے کا اشارہ کیا۔
"لیکن خدیجہ......"۔ وہ ڈر رہی تھی۔
"عائشو جسٹ گو......"۔ خدیجہ نے اُسے دھکیلا تو وہ گرتے گرتے بچی۔
بمشکل قدم اُٹھاتی وہ اُس کے نزدیک چلی آئی۔ وہ اُس کی طرف پشت کیے ہوئے تھا۔
"ایکسکیوز می سر......"۔ اُس نے تمام ہمت مجتمع کر کے اُسے پکارا۔
وہ اچانک مڑا تھا۔ عائشہ کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔
اُس کے ساتھ کھڑے باقی لوگ بھی عائشہ کی طرف دیکھنے لگے۔
"جی......؟"۔ وہ اُسے اپنی طرف دیکھتا پا کر سمجھ گیا تھا کہ وہ اُسی سے مخاطب ہے۔ اُس نے سوالیہ نظروں سے عائشہ کی طرف دیکھا۔
"مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے کیا آپ دو منٹ سائیڈ پہ آ سکتے ہیں"۔ وہ بہت بہادر بنی مگر یہ الفاظ بولتے ہوئے زبان کے ساتھ ساتھ ٹانگیں بھی لڑکھڑانے لگیں۔
"شیور......"۔ وہ اُن سے معذرت کر کے سائیڈ پہ آ گیا۔
"جی بتائیں؟"۔ اُس نے عائشہ کو فارملی سا دیکھتے ہوئے کہا تو اُس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔
یہ آواز وہ ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ وہ واقعی وہی تھا۔ عائشہ کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ ایک بات پریشان کرنے لگی اگر وہ اُسے جانتا تھا تو اِس طرح فارمل انداز میں کیوں بات کر رہا تھا۔ اُس کے کسی انداز سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ عائشہ کو جانتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں شناخت کی کوئی رمق نہیں تھی۔ عائشہ کا دل نا جانے کیوں بری طرح ٹوٹا۔
"آپ تیمور سیف ہیں......؟"۔ اُس نے کچھ دیر بعد سوال کیا تو اُس کا سر اثبات میں ہل گیا مگر وہ بولا نہیں تھا۔
عائشہ خاموش ہو گئی۔ اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولتی۔
"پر آپ کون ہیں؟"۔ اُس کے سر پر ایک اور بم گرا۔
دل میں جو خوش فہمیوں کا محل تعمیر کیا تھا وہ ایک لمحے میں زمین بوس ہوا تھا۔ وہ بنا کچھ بولے بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ آنکھوں میں جیسے مرچیں لگ رہی تھیں۔ وہ روتی ہوئی اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ کاریڈور کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے اُس کا پیر بری طرح مڑا تھا اور وہ چھ سیڑھیوں سے نیچے گرتی زمین پر آ گئی تھی۔ زمین پہ سر لگنے سے ماتھے پر گہرا زخم آیا تھا جس سے فوراً خون نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ اُس کے پیچھے آتے تیمور سیف کی اِس منظر نے سانسیں کھینچ لی تھیں وہ دیوانہ وار اُس کی جانب مڑا مگر وہ گرتے ہی بیہوش ہو چکی تھی۔

......☆☆......

عائشہ کی آنکھ کھلی تو وہ ہاسپٹل میں تھی۔ اُس نے حیرانگی سے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دائیں ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر ایسا نہ کر پائی کیونکہ سر میں شدید درد کی لہریں اُٹھی تھیں۔ اُس نے

بے بسی سے سر تکیے پہ گرا لیا۔

"میم کیسا فیل کر رہی ہیں آپ؟"۔ نرس جو کچھ دور کھڑی اُس کی رپورٹس دیکھ رہی تھی اُسے ہوش میں آتا دیکھ کر اُس کی طرف آئی۔

عائشہ نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ کچھ دیر اُس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی لیکن جب وہ چپ چاپ لیٹی رہی تو وہ باہر نکل گئی۔

"سر آپ کی پیشنٹ کو ہوش آ گیا"۔ اُس نے جاتے ہوئے باہر کھڑے آیان کو اطلاع کی تو وہ فوراً اندر آیا۔

عائشہ اُسے سامنے پا کر رونا شروع ہو گئی۔

"عائشو یہ کیا حالت بنا لی ہے تم نے اپنی......"۔ وہ اُسے روتے دیکھ کر فوراً اُس کے پاس آیا۔ آیان نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔

عائشہ اُس کے گلے لگ کر کتنی ہی دیر روتی رہی۔ جب رو رو کر ہلکان ہو گئی تو آیان نے اُسے پانی کا گلاس دیا۔ دو تین گھونٹ پینے کے بعد اُس نے گلاس واپس آیان کو تھما دیا۔ آیان نے اُس کے آنسو صاف کیے۔

"اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟"۔ وہ کچھ حواسوں میں لوٹی تو آیان نے پیار سے پوچھا۔ وہ کل سے ازحد پریشان تھا۔ اُسے کل ہی خبر مل گئی تھی کہ عائشہ کے پاؤں میں فریکچر ہو گیا۔ وہ اُسی وقت آ گیا تھا۔ عائشہ کو اس حال میں دیکھ کر اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ پورے ایک دن بعد وہ ہوش میں آئی تھی اور یہ ایک دن آیان نے کانٹوں پہ گزارا تھا۔

"میں گر گئی تھی"۔ وہ سر جھکائے مجرموں کی طرح بتا رہی تھی۔

"کیسے اور کہاں سے؟"۔ وہ اُسکی پیلی رنگت دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ کل سے وہ صدیوں کی بیمار لگ رہی تھی۔

"کاریڈور کی سیڑھیوں سے گری تھی"۔ اُس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بتایا۔

"پتہ میں کل سے کتنا پریشان ہوں"۔ وہ اُسے بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے بولا۔ وہ لڑکی اُسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

"آیان بھائی میں یہاں نہیں رہوں گی اب...... مجھے گھر واپس جانا ہے...... مجھے اِدھر نہیں رہنا"۔ اُس کے پھر آنسو نکل آئے۔

آیان ششدر سا اُسے دیکھتا رہا۔

"مگر کیوں گڑیا...... کچھ ہوا ہے کیا؟"۔ اُسے پریشانی محسوس ہوئی۔

"جب سے یہاں آئی ہوں میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے یہ جگہ یہ فیلڈ کچھ بھی مجھے سوٹ نہیں کرتی آیان بھائی...... میں یہاں نہیں رہوں گی...... میں گھر جاؤں گی واپس اور جا کر بی ایس سی میں ایڈمیشن لے لوں گی...... لیکن میں ائرفورس میں نہیں رہوں گی اب"۔ وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔

آیان نے بے بسی سے اُسے دیکھا۔

"اوکے ہم گھر چلیں گے تم بس جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ"۔ وہ اُسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ عائشہ خاموشی سے لیٹ گئی۔ آیان اُس پر کمبل دے کر باہر آ گیا۔ وہ عائشہ کی باتوں سے سخت پریشان ہو گیا تھا۔ آخر ایسا کیا ہو گیا تھا کہ وہ یہ سب کہہ رہی تھی۔

وہ باہر آیا تو اُسے کوریڈور میں تیمور مل گیا۔

"کیسی ہے اب تمہاری کزن؟"۔ تیمور نے اُس سے گلے ملتے ہوئے پوچھا۔ وہ دونوں بیسٹ فرینڈ تھے۔ تیمور اُس سے کافی سینئر تھا مگر دونوں کی کافی گہری دوستی تھی۔

"یار اُس کی حالت سے بہت پریشان ہوں میں"۔ آیان نے وہاں پڑے بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا تو تیمور کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"کیوں کیا ہوا؟"۔ اُس نے بے چینی سے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یار جب وہ یہاں آئی تھی تو بہت خوش تھی لیکن پھر ٹریننگ کی وجہ سے اور کچھ اکیڈمی میں سختی کرنے کی وجہ سے وہ ہمت ہار گئی تھی اور واپس جانے کے لیے ضد کی مگر پھر نا جانے کیا ہوا وہ خود ہی ٹھیک ہو گئی۔ میں بھی مطمئن تھا کہ چلو اچھا ہوا اُس کا دل لگ گیا پھر میں ایک دو بار اُس سے ملنے بھی آیا تھا تو وہ کافی خوش تھی مگر اب اچانک اُس کا اِس طرح منع کرنا کہ مجھے واپس جانا ہے مجھے بہت پریشان کر رہا...... پتہ نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ کچھ ہوا ہے ورنہ وہ ایسی بات نہیں کرتی"۔ آیان اُس کے سامنے سب کہہ رہا تھا اور تیمور بے چینی سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''تم اُسے کچھ دن ریلکس کرنے کے لیے دو ابھی وہ تھوڑی پریشان ہے اس لیے ایسے کہہ رہی ہے جب ٹھیک ہو جائے گی تو بات کرنا''۔ تیمور نے کچھ دیر بعد اُسے مشورہ دیا۔

''لیکن چھٹی کا مسئلہ ہوگا''۔ ایان کو اس کی بات کچھ معقول لگی۔

''ڈونٹ وری میں کمانڈر فہد سے بات کرلوں گا اس بارے میں''۔ تیمور نے اُسے تسلی دی۔

آیان نے مشکور نظروں سے اُس انسان کو دیکھا جو ہر مشکل وقت میں ہمیشہ اُس کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔

......☆☆......

عائشہ کو تین دن بعد ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ آیان اُسے اکیڈمی چھوڑنے کی بجائے گھر لے آیا۔ وہ بہت گم صم سی تھی۔ اندر ہی اندر نا جانے کیوں پریشان رہتی تھی۔ اُس کو گھر آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ تبھی اچانک ایک دن اُس سے میڈم فلک ملنے چلی آئیں۔

عائشہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوش ہوئی تھی۔

''کیسی ہو بیٹا؟''۔ اُنہوں نے پیار سے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا تھا۔ عائشہ کی آنکھوں کے گوشے نا جانے کیوں بھیگ گیے۔

''ٹھیک ہوں......''۔ اُس نے بھیگی پلکوں سے اُن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ میڈم فلک کو اُس پہ بے تحاشہ پیار آیا۔ یہ لڑکی نا جانے کیوں اُن کو بہت پیاری تھی۔ وہ آٹھ سال تک اُن کی اسٹوڈنٹ رہی تھی۔

''ایان نے کل مجھے فون کر کے تمہارے بارے میں بتایا تھا تو مجھ سے رہا نہیں گیا اسی لیے تم سے ملنے چلی آئی''۔ وہ اُس کا ہاتھ اب تک تھامے ہوئے تھیں۔

''میں بھی آپ سے ملنا چاہتی تھی......''۔ عائشہ نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بتایا۔

''میں نے کبھی سوچا نہیں تھا عائشہ کہ میں اگر کبھی تم سے ملوں گی تو اس حال میں ملوں گی میں اُس عائشہ سے ملنے کی خواہش مند تھی جس کی آنکھوں میں ہمیشہ ایک چمک ہوتی تھی...... جس کے ارادوں میں مضبوطی تھی...... جو بہادر تھی...... اتنی چھوٹی سی تکلیف کو تو وہ کسی خاطر میں لاتی ہی نہیں تھی''۔ وہ عائشہ کو اس حال میں دیکھ کر بہت دکھی ہو گئی تھیں۔

عائشہ کے دل میں کوئی پھانس سی چبھنے لگی۔

''وہ عائشہ اب بہت کمزور پڑ چکی ہے میڈم...... اُس کا سارا حوصلہ ختم ہو گیا...... وہ ہار چکی ہے''۔

''بالکل نہیں...... عائشہ کبھی ہار نہیں مان سکتی اور نہ ہی اُس کی میڈم اُسے کبھی ہار ماننے دیں گی...... کمزور وہ لوگ پڑتے ہیں جو بزدل ہوتے ہیں...... جن کے پاس اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ مصیبتوں کا ڈٹ کر سامنا کریں...... اور میں جانتی ہوں کہ عائشہ بزدل نہیں ہے...... وہ بہت بہادر ہے کیونکہ وہ میری سٹوڈنٹ ہے میڈم فلک جہانگیر کی اور نہ ہی آج تک میڈم فلک جہانگیر نے ہار مانی ہے اور نہ ہی وہ عائشہ کو کبھی ماننے دیں گی''۔ وہ عائشہ کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھیں اور نا جانے کیوں عائشہ کا سر جھکتا چلا جا رہا تھا۔ میڈم فلک نے عائشہ کے سامنے اس لیے کہا تھا ایسا کیونکہ وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ ان کی باتوں کو ہر حال میں مانتی ہے وہ اُسے یہ نہیں بتانا چاہتی تھیں کہ کبھی وہ خود بھی ہار گئی تھیں۔

''لیکن میڈم زندگی اتنی آسان نہیں ہے اپنی منزل کو پانا بہت مشکل ہے...... آپ نے کہا تھا کہ منزل کے راستے پر لوگ ہمیں ہٹانے کی کوشش کریں گے...... وہ ہمارا دھیان بٹانے کی کوشش کریں گے مگر مجھے لوگوں نے توڑ دیا ہے...... میں بہت تھک گئی ہوں میرے اندر اب مزید سفر کرنے کی بالکل ہمت نہیں ہے...... میں نہیں کر سکتی اب''۔ وہ ایک بار پھر بکھر رہی تھی۔

''تو عائشہ کیا تم لوگوں کی وجہ سے اپنے خوابوں کا گلا گھونٹ دو گی...... کیا تم اُڑنے کا خواب بھول سکتی ہو؟''۔ اُنہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

عائشہ نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پھر تم نے کیوں کہا کہ تم نے ہار مان لی ہے؟''۔ وہ کچھ خفا ہوئیں۔

''میں کیا کروں پھر؟''۔ اُس کو شرمندگی ہوئی۔

''واپس جاؤ اور جا کہ اپنا سفر وہیں سے شروع کرو جہاں سے چھوڑا ہے...... اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتیں تو ایک بات یاد رکھنا میں زندگی میں کبھی تم سے بات نہیں کروں گی

کیونکہ میں عائشہ نصار کو کبھی ہارا ہوا اور بزدل نہیں دیکھ سکتی"۔ وہ ایک بار پھر اُس کا حوصلہ بن رہی تھیں۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گی کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا...... تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا...... میں بس اتنا جانتی ہوں کہ اگلی بار جب میری عائشہ سے بات ہوگی تو وہ یہ عائشہ ہرگز نہیں ہوگی...... بلکہ وہ عائشہ ہوگی جو مجھے اپنی کامیابیوں کے بارے میں بتائے گی...... جس کی آنکھوں میں چمک ہوگی...... جو بہت مضبوط ہوگی...... جس کے اندر اڑنے کا جنون ہوگا...... جو صرف فضاؤں میں پرواز کرنے کا جذبہ رکھتی ہوگی...... جس کو ہار سے نفرت ہوگی...... بولو کیا میں اُمید رکھوں کہ میری اُس عائشہ سے بات ہوگی؟"۔ اُنہوں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"بہت جلد ہوگی یہ میرا آپ سے وعدہ ہے"۔ اُس کی آنکھوں میں یک لخت چمک اُبھری تھی۔

"کیا وہ عائشہ پھر سے ہار مانے گی؟"۔ اُنہوں نے اُسے دیکھا۔

"کبھی نہیں...... کیونکہ اُس عائشہ کا حوصلہ میڈم فلک ہیں اس لیے وہ کبھی ہار نہیں مانے گی...... میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں پھر وہی عائشہ بنوں گی اور آج کے بعد چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اپنی اُڑان زمین کی طرف نہیں بلکہ آسمان کی طرف بھروں گی"۔ وہ اُن کو اُمید دلا رہی تھی۔

"مجھے انتظار رہے گا اُس عائشہ سے بات کرنے کا"۔ وہ اُٹھتے ہوئے بولیں۔

عائشہ نے ہلکی سی مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

......☆☆......

وہ پندرہ دن کی چھٹی کے بعد واپس آگئی۔ اس دوران اُس کی ٹریننگ کا کافی کچھ مس ہوا تھا۔ اُسے باقی کیڈٹس کے ساتھ پہنچنے کیلیے کافی محنت کرنی پڑی۔ وہ اب بالکل بھی نہیں ڈری تھی۔ اُس نے گھر سے آتے وقت خود کو ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ زندگی اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی اُسے یہاں آئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنی ٹریننگ کا کافی حصہ ختم کر چکی تھی مگر ابھی ٹریننگ ختم نہیں ہوئی تھی۔

اُس دن وہ لوگ جیٹ ٹریننگ کر رہے تھے۔ یہ ٹریننگ مشاق کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اِس ٹریننگ کے کیڈٹ جیٹ اُڑاتے ہیں۔

اس جہاز کو فلائی کرتے وقت کیڈٹ آکسیجن ماسک اور ہیلمٹ وغیرہ کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کی اسپیڈ بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس ٹریننگ کو مکمل کرنے کے بعد کیڈٹ ایک پائلٹ بن جاتا ہے۔ مگر اس کا سیکھنے کا مرحلہ جاری رہتا ہے۔

"عائشہ ایک بات پوچھوں؟"۔ خدیجہ نے فلائنگ کے بعد اُس سے پوچھا۔

"ہاں پوچھو......"۔ وہ آج کافی ایسا یٹڈ تھی۔ اور ایکسائٹمنٹ اُس کے چہرے پر دیکھی جا سکتی تھی۔

"اُس دن تمہاری پائلٹ آفیسر تیمور سے کیا بات ہوئی تھی؟"۔ خدیجہ کافی دن سے پوچھنا چاہ رہی تھی مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔

"چھوڑو یار اس ٹاپک پہ بات نہیں کرنی مجھے"۔ عائشہ نے اُسے ٹال دیا۔

"اوکے...... نو پرابلم"۔ خدیجہ کی اچھی عادت تھی کہ وہ اُسے فورس نہیں کرتی تھی۔

"چلو کچھ کھاتے ہیں مجھے بہت بھوک لگی ہے"۔ عائشہ نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔

سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔

"رکو میں ہدی کو بتا کر آتی ہوں"۔ وہ اُسے انتظار کرنے کا کہہ کر خود چلی گئی۔

عائشہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ وہیں کھڑی ہو کر اُس کا انتظار کرنے لگی۔

"ایکسکیوز می"۔ تبھی پیچھے سے کسی نے اسے پکارا تو وہ مڑی۔

سامنے کھڑے تیمور کو دیکھ کر اُسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ بھلا وہاں کب اور کیسے آیا تھا۔ عائشہ نے فوراً اُسے سیلوٹ مارا کیونکہ وہ اِس وقت مکمل یونیفارم میں تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟"۔ تیمور اُسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا تھا۔ عائشہ کا دل چاہا کوئی چیز اُٹھا کر دے مارے۔

"میں ٹھیک ہوں"۔ وہ کافی تمیز سے بولی تھی۔ وہ اُس

کا کافی سینئر تھا اور دوسرا وہ اِس وقت اکیڈمی میں تھی لہذا بدتمیزی کرنے کا تو کوئی چانس ہی نہیں تھا۔
البتہ دل ہی دل میں وہ سخت غصے میں تھی۔ وہ رُخ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔
''آپ کا پاؤں کیسا ہے اب؟''۔ وہ اُسے نارمل دیکھ کر ذرا حیران ہوا تھا۔
''الحمداللہ بہتر ہے''۔ وہ اُس کی پوزیشن کے خیال سے کافی شرافت کا مظاہرہ کر رہی تھی ورنہ دل تو چاہ رہا تھا اُس کا منہ توڑ دے۔
''دیٹس گڈ''۔ تیمور ہلکا سا مسکرایا۔
''اگر آپ اِس وقت فری ہوں تو کیا ہم کچھ دیر بات کر سکتے ہیں؟''۔ تیمور کو پورا یقین تھا کہ وہ نہیں مانے گی مگر پھر بھی وہ پوچھ بیٹھا۔ رزلٹ اُس کی توقع کے عین تھا۔
''سوری میری فلائیٹ ہے ایک گھنٹے بعد اور مجھے تیاری کرنی ہے''۔ اُس نے بڑے دھڑلے سے جھوٹ بولا۔
حالانکہ ایسا نہیں تھا اور یہ بات تیمور بھی جانتا تھا۔
''اوکے نو پرابلم......''۔ وہ غصے میں نہیں آیا تھا۔ عائشہ کو حیرت ہوئی۔
''اچھا میں چلتا ہوں پھر خدا حافظ اپنا خیال رکھیے گا''۔ وہ چلا گیا تو عائشہ کو ناجانے کیوں شرمندگی ہوئی۔ دل بھی اُس سے خفا ہوا۔
''کیا تھا اگر میں اس کی بات سن لیتی تو''۔ اُس نے خود کو ملامت کیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا وہ تو جا چکا تھا۔
وہ لاکھ اُس کو بلانے کے جتن کرتی مگر اب ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اُس کے دل میں چپکے سے آن سمایا تھا۔ عائشہ کی ہر کوشش بیکار گئی تھی۔ وہ جتنے مرضی ارادے مضبوط بناتی کہ وہ اُس کے بارے میں نہیں سوچے گی مگر ایسا ممکن کہاں تھا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر وہ خود اُس کی جانب قدم بڑھائے گا تو وہ اُسے مایوس نہیں کرے گی اور نہ ہی وہ ایسا کر سکتی تھی۔ مگر ابھی اُس سے بہت سارے سوالوں کے جواب جاننے تھے اور اُن کو جانے بغیر وہ اُس کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتی تھی۔

......☆☆......

وقت گزرتا گیا۔ اُس کی ٹریننگ مکمل ہوگئی۔ وہ اب کیڈٹ عائشہ نصار بیگ سے فلائیٹ لیفٹیننٹ عائشہ نصار بیگ بن چکی تھی۔ زندگی میں جو خواب دیکھا تھا وہ اب حقیقت میں بدل چکا تھا۔ اپنے خواب کے حصول کے لیے اُس نے بہت محنت کی تھی۔ کبھی وہ ایک دفعہ جہاز کو دیکھنے اُسے چلانے کے لیے ترستی تھی مگر آج وہ روز چلاتی تھی۔ زندگی میں کبھی سائیکل تک نہ چلانے والی لڑکی اب فضاؤں میں کئی ہزار فٹ کی بلندی پر جہاز چلاتی تھی۔
اُس کے اِس سفر میں بہت سارے لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس کا ہر قدم پر ساتھ دیا تھا۔ میڈم فلک جہانگیر کا نام اُن لوگوں میں سرِ فہرست تھا۔ میڈم فلک وہ جوہری تھیں جنہوں نے اُس پتھر کو تراش کر ہیرا بنایا تھا۔ عائشہ نصار کی کامیابی میں کہیں نہ کہیں تیمور سیف بھی تھا۔ اُس انسان نے ہمیشہ اس کی مدد کی تھی۔ گزرے تمام سالوں میں اُس نے عائشہ کی زندگی میں بہت اونچا مقام حاصل کر لیا تھا۔ وہ اُس سے نہ تو بات کرتا تھا اور نہ ہی ملتا تھا مگر وہ دونوں پھر بھی ہمیشہ ایک دوسرے سے جڑے رہتے تھے۔
وہ آج گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کئی مہینوں بعد اُسے پندرہ دن کی چھٹی ملی تھی اور وہ اُس پر بہت اکسائیٹڈ تھی۔ اُس نے رات کو ہی پیکنگ کر لی تھی۔ آیان اُسے کچھ دیر میں لینے آنے والا تھا۔
دس بجے اُسے اطلاع ملی کہ آیان آگیا ہے۔ وہ سب سے مل کر باہر آگئی۔ وہ کسی آفیسر کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا۔ عائشہ کو اُس نے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے آکر گاڑی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ آیان اُس کے پیچھے ہی آگیا۔
''ابھی تک باہر ہی کھڑی ہو بیٹھی کیوں نہیں......؟''۔ آیان نے اُسے گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
''آپ کا ویٹ کر رہی تھی''۔ عائشہ نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔
ایان اُس کی بات پر مسکرایا اور اُس کا سامان ڈگی میں رکھنے لگا۔ وہ اِس کام سے فارغ ہو کر فرنٹ سیٹ پر آن بیٹھا۔
''عائشو سیٹ بیلٹ باندھ لو''۔ بیٹھتے ہی پہلی نصیحت کی جس پر عائشہ کا منہ بن گیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''ضروری ہے''۔ اُسے سیٹ بیلٹ سے خاصی الرجی تھی۔
''بالکل ضروری ہے''۔ آیان اُس کی بات پر پھر مسکرایا۔
''بھابھی کیسی ہیں؟''۔ اب وہ چپ بیٹھنے والوں میں سے تو تھی نہیں لہذا شروع ہوگئی۔
''گھر جا کر پوچھ لینا''۔ آیان نے ایک نظر بیک مرر میں سے دیکھتے ہوئے سرسری سا کہا۔
''کیوں آپ کو بتانے میں کیا مسئلہ ہے''۔ وہ فوراً مائنڈ کرگئی۔
ایان نے بے بسی سے ایک دفعہ پھر پیچھے دیکھا۔
''نہیں میں ویسے ہی کہہ رہا تھا''۔ اُس نے اُس کا موڈ خراب ہوتے دیکھ کر کہا۔
''آیان بھائی ویسے میں نے ایک بات نوٹ کی ہے جب سے آپ کی شادی ہوئی ہے آپ بہت بدل گئے ہیں...... مجھ سے ٹھیک طرح سے بات ہی نہیں کرتے کیا بھابھی نے آپ کو منع کیا ہے؟''۔ وہ بیوقوف تھی یہ تو آیان جانتا تھا مگر اتنی تھی یہ اُسے آج پتہ چلا تھا۔ آیان کا دل چاہا کسی جگہ گاڑی دے مارے۔
''آپ چپ ہیں مجھے پتا ہے ایسا ہی ہے''۔ وہ اُسے خاموش دیکھ کر پھر بولی۔ لہجہ خفگی بھرا تھا۔
ایان شرم کے مارے کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ اب وہ اُسے کیسے سمجھاتا کہ وہ کیوں ٹھیک سے بات نہیں کر رہا۔ وہ پھر کچھ بولنے والی تھی کہ آیان نے اُسے ایسا کرنے سے روکا۔
''عائشہ سر کو سلام کرو''۔ آیان نے اُس کا دھیان پیچھے بیٹھے تیمور کی طرف مبذول کروایا تو اُس نے فوراً پیچھے دیکھا۔
پچھلی سیٹ پر بیٹھے تیمور کو دیکھ کر اُس کی بیچ میں سٹی گم ہوگئی۔ آیان کا یوں ہچکچانا اُسے اب سمجھ میں آیا تھا۔
وہ آج کئی مہینوں بعد اُسے دیکھ رہی تھی۔
''السلام وعلیکم!''۔ آیان کے اشارہ کرنے پر اُسے چاروناچار سلام کرنا پڑا۔
''وعلیکم السلام''۔ تیمور نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔
عائشہ نے فوراً سامنے کی طرف چہرہ کرلیا۔ اب ایک بات تو کنفرم تھی کہ اُس نے سارا رستہ منہ نہیں کھولنا تھا چاہے کچھ بھی ہو جاتا۔ آیان اور تیمور اُسے مسلسل چپ دیکھ کر زیرِ لب ہی مسکراتے رہے۔

......☆☆......

گھر میں زندگی پھر پہلے جیسی ہوگئی تھی۔ وہ ردا بھابھی کے ساتھ مل کر کچن میں نت نئی ڈشز بناتی ہر وقت گھر میں شور برپا کیے رکھتی۔ سب اُسے خوش اور مطمئن دیکھ کر خود بھی خوش ہو جاتے۔ عائشہ کا تو ہر پل ہی خوشگوار گزر رہا تھا۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ مگر اِس سکون میں خلل ڈالا تھا آیان کے نئے شگوفے نے طوفان برپا کیا تھا۔ آیان کے بقول تیمور سیف نے عائشہ کے لیے اپنا پرپوزل بھیجا تھا۔ عائشہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا تیمور سیف کا قتل کردیتی۔
''ہمت تو دیکھو اِس بندے کی میرے گھر رشتہ بھیج ڈالا پہلے مجھے دو سال پاگل بنائے رکھا اور اب شادی کرنا چاہتا...... بندہ پوچھے کوئی شرم ہوتی کوئی حیا ہوتی مگر اُس کو کیا پتہ کہ وہ کیا ہوتی''۔ وہ اپنے کمرے میں غصے سے ٹہلتے ہوئے اونچی آواز میں بول رہی تھی۔
''اِس آفیسر کا دماغ تو میں ٹھکانے لگاتی ہوں''۔ وہ تن فن کرتی اپنے کمرے سے نکلی۔ آیان کے کمرے میں جا کر اُس کے فون سے تیمور کا نمبر نکال کر واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ ردا بھابھی پیچھے ارے ارے کرتی رہ گئیں۔ آیان اُس وقت گھر پہ نہیں تھا۔
کمرے میں آتے ہی اُس نے نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی۔
''السلام وعلیکم تیمور سپیکنگ''۔ چوتھی بیل پر کال پک کر لی گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو عائشہ گھبرا گئی تھی۔ اُس کی آواز سے لگ رہا تھا جیسے وہ کافی سنجیدہ ہے۔ وہ بھول گئی کہ کیا کہنا تھا۔
''ہیلو''۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بولا۔
عائشہ اب بھی خاموش رہی۔
''مس عائشہ جب بات کرنے کا موڈ ہو تو دوبارہ فون کرلینا''۔ وہ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد بولا تو عائشہ کے ہاتھ سے فون گرتے گرتے بچا۔ اُسے کیسے پتہ چلا کہ وہ

تھا۔

"ٹھیک ہے فون بند کردیں"۔ اُسے غصہ آگیا۔ ایک تو اِس بندے میں ایٹی ٹیوڈ بہت تھا۔

"اگر میں نے کیا ہوتا تو اب تک ضرور بند کر دیتا...... آپ نے کیا ہے اس لیے آپ ہی کردیں"۔ اُس کی گمبھیر آواز سے عائشہ کے دل کے تار بج اُٹھے۔

اُف کتنا عجیب انسان تھا۔ عائشہ کو بھول گیا کہ اُس نے کیوں فون کیا تھا۔

ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا وہ اُس سے بات کرتے ہوئے ہر دوسری بات بھول جاتی۔ وہ چاہ کر بھی اُس سے سخت لہجے میں بات نہیں کرسکتی تھی۔ اُس کی پرسنالٹی ہی ایسی تھی کہ وہ مسمرائز ہوکر رہ جاتی۔

تین منٹ کی خاموشی کے بعد بھی فون آن تھا۔ عائشہ حیران رہ گئی۔ یعنی کہ اگر وہ فون بند نہ کرے تو وہ یونہی فون سے کان لگا کر سنتا رہے گا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی سانس لینے کی آواز سن رہے تھے۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں ہوں...... میں تو بولی بھی نہیں تھی۔؟"۔ اُس نے طویل ہوتی خاموشی کو توڑا۔

"آپ نے خاموشی اختیار کی تھی سانس لینا تو نہیں چھوڑا تھا نہ میں آپ کی سانسوں سے بھی آپ کو پہچان سکتا ہوں کیونکہ آپ کو ہمیشہ سے خاموش رہنے کی عادت ہے فون پر...... انسان جب فون کرتے وقت سانس لیتا ہے تو دوسری طرف والا شخص باآسانی آواز سن سکتا ہے...... مجھے آپ کی خاموشی سننے کی اب عادت ہوچکی تھی......"۔ اُس نے صاف صاف بتایا۔ عائشہ کا تو بیہوش ہونے والا حال ہوگیا۔ وہ اُس انسان کو اب تک ایک فیصد بھی نہیں جان پائی تھی۔ عجیب پُر اسرار سا انسان تھا۔ اُس کو حرف حرف پڑھ چکا تھا مگر اپنے بارے میں اُس نے کسی بات کا ذرا سا شک بھی نہیں ہونے دیا تھا۔

وہ اُن دھاگوں کی طرح اُلجھا ہوا تھا کہ انسان اُن کو سلجھاتے سلجھاتے خود تھک جاتا مگر ایک بھی دھاگے کو سلجھا نہ پاتا۔

"کیا آپ مجھے اب بتائیں گی کہ آپ نے فون کیوں کیا؟"۔ اُسے پھر سے چپ پاکر وہ خود ہی بول پڑا۔

عائشہ کو بھی یاد آیا کہ اُس نے کیا بات کرنے کے لیے فون کیا تھا۔

"میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی"۔ وہ یہ بات غصے میں نہیں کہہ رہی تھی بلکہ اُس کا ری ایکشن دیکھنا چاہتی تھی۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ چاہیں میں آپ کو فورس نہیں کروں گا"۔ دوسری طرف وہ سن کر ڈسٹرب ہوا تھا یا نہیں مگر عائشہ کو اُس نے بڑے نرم لہجے میں جواب دیا تھا۔ وہ اندازہ ہی نہیں کرپائی تھی کہ وہ دکھی تھا یا خوش۔

"آپ اپنا پرپوزل واپس لے لیں"۔ عائشہ کو سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔ وہ جان بوجھ کر بات بڑھانے کی کوشش کررہی تھی۔

"آپ نے منع کردیا ڈونٹ وری اب دوبارہ اِس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی"۔ اُس کا لہجہ اب بھی نارمل تھا۔

عائشہ البتہ سن کر رونے والی ہوگئی۔

"میں فون بند کردوں؟"۔ ایک آخری اُمید تھی کہ شاید وہ کہہ دے کہ نہ کرو۔

"آپ کی مرضی ہے......"۔ سارا معاملہ اُس پر چھوڑ دیا۔

اُس کی آنکھوں سے کئی موتی ٹوٹ کر گرے۔

"بہت بے حس انسان ہیں آپ جان بوجھ کر دوسروں کو تکلیف دیتے ہیں...... اللہ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا"۔ اُس نے روتے ہوئے کہا اور فون کاٹ دیا۔

تیمور حیران پریشان سا فون کو ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ وہ سب کچھ برداشت کرسکتا تھا مگر اُس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو نہیں برداشت کرسکتا تھا۔ اُس کا دماغ کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس کی انگلیاں آیان کا نمبر ڈائل کررہی تھیں۔ آیان سے دو منٹ کی مختصر بات کے بعد اُس نے فون بند کردیا اور سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹکالیا۔

......☆☆......

کبھی کبھی زندگی اچانک اپنے ٹریک سے اُتر جاتی ہے یا اچھی خاصی پُرسکون زندگی میں کوئی طوفان آجاتا اور انسان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کردیتا۔ اُس کی زندگی میں بھی کچھ ایسا ہی طوفان آیا تھا۔ میڈم فلک جہانگیر کی موت...... دودن پہلے اچانک حرکت قلب بند ہونے سے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ان کی وفات ہوگئی تھی۔ عائشہ نصار کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔ اُس کی ہمت اُس کا حوصلہ سب ختم ہو گیا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی گہرائیوں میں گری تھی۔ وہ اتنی بری طرح گری تھی کہ لگ رہا تھا کبھی نہیں اُٹھ پائے گی۔ یہ صدمہ اُسے توڑ کر ریزہ ریزہ کر چکا تھا۔ زندگی میں ایک ہی تو روشنی تھی جس نے ہر اندھیرے سے بچا کر رکھا تھا۔ ہر تاریکی میں اُس کے لیے ہمت اور حوصلے کی شمعیں جلائی تھیں۔ جو اس کے اندھیرے میں جانے سے پہلے ہی شمع جلا دیتی تھیں۔ مگر آج وہ پہلی بار گھپ اندھیروں میں کھڑی تھی۔ ہمت دور کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اُس کا حوصلہ الگ بین کر رہا تھا۔ سب کچھ جیسے رک سا گیا تھا۔ اُس کو جو دو دن سے چپ لگی تو ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ڈاکٹرز کے بقول اس صدمے سے اس کے دماغ کی نسیں پھٹ سکتی تھیں۔ ہر کوئی کوشش کر چکا تھا۔ مگر اُس کی چپ نہیں ٹوٹی تھی۔ اُسے تو میڈم فلک سے ملنا تھا ابھی...... اُن کو بہت کچھ بتانا تھا۔ وہ عائشہ نصار سے ملنے کی چاہ میں مر چکی تھیں۔ کاش وہ اُن سے بات کر لیتی۔ کئی کاش اُسکے سامنے منہ کھولے کھڑے اُسے نگلنے کو بے تاب تھے۔

''عائشہ......'' آیان اُس کے ساتھ آن بیٹھا۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگائے نیچے قالین پر بیٹھی تھی۔ بکھرے بال اُجڑا ہوا چہرہ کوئی الگ ہی داستان سنا رہا تھا۔

ایان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اُس نے زندگی میں کبھی اس کی ایسی حالت نہیں دیکھی تھی۔ حتی کہ اُس وقت بھی نہیں جب وہ گری تھی۔ اُس وقت اُس نے رو کے اپنا سارا غبار نکال لیا تھا۔ مگر آج تو وہ رو بھی نہیں رہی تھی۔ بس اپنی کھنڈر اور ویران آنکھوں سے آیان کو دیکھتی رہی۔

''پلیز سنبھالو خود کو ایسا کب تک چلے گا''۔ آیان نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی اِس پیاری بہن کو اس تکلیف میں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اُس نے ہمیشہ اُسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مگر آج کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔

''عاشو پلیز ایسے مت کرو مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے''۔ اُسے مسلسل خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا۔ مگر وہ چپ چاپ گھٹنوں پہ سر رکھے دیوار کو گھورتی رہی۔

''میں جانتا ہوں یہ بہت بڑا صدمہ ہے تمہارے لیے مگر تیمور کے بارے میں بھی تو سوچو اس کی تو وہ ماں تھیں۔ سوچو اُسکو کتنی تکلیف ہو رہی ہو گی...... لیکن کیا کر سکتے ہیں مرنے والے کے ساتھ کوئی مر تو نہیں نہ جاتا''۔ آیان نے اُس کے سر پہ جیسے کوئی بلاسٹ کیا تھا۔ تیمور سیف کی ماں میڈم فلک جہانگیر یہ کونسی حقیقت سے پردہ اُٹھ رہا تھا۔

''کیا میڈم فلک تیمور سر کی مدر تھیں''۔ اُس نے دو دن بعد پہلی بات کی تھی۔

''ہاں......''۔ ایان اس کے اتنا چونکنے پر کافی حیران ہوا تھا۔

''کیا تم یہ بات نہیں جانتی؟''۔ اُس نے عائشہ سے استفسار کیا۔

''نہیں مجھے تو آج پتہ چلا''۔ وہ ابھی تک شاکڈ تھی۔

''مگر مجھے حیرت ہو رہی ہے اِس بات پر کہ تیمور سر کے فادر کا نام تو سیف ہے لیکن میڈم فلک کا پورا نام تو فلک جہانگیر ہے''۔ عائشہ نے ذہن میں آتے سوال کو زبان دے ڈالی۔

''تیمور کے فادر کا نام جہانگیر سیف ہے اور تیمور کا پورا نام بھی تیمور سیف جہانگیر ہے لیکن میڈیم اپنے نام کے ساتھ صرف جہانگیر ہی لگاتی تھیں''۔ آیان نے اُسے مختصر تفصیل بتائی۔

عائشہ اِس انکشاف پہ جتنا حیران ہوتی کم تھا۔ اُسے تیمور پر بے تحاشہ ترس آیا۔ پہلے جوان بھائی کی شہادت کا صدمہ اور اب ماں جیسی ہستی سے ہمیشہ کے لیے جدائی۔ وہ اُس کی کچھ بھی نہیں لگتی تھیں کوئی خونی رشتہ نہیں تھا صرف ایک استاد شاگرد کا رشتہ تھا پھر وہ اتنی پریشان تھی مگر تیمور کی تو ماں تھی اس کے لیے کتنا بڑا صدمہ تھا۔ ٹھیک کہہ رہا تھا آیان ہمدردی جتانے کی ضرورت عائشہ نصار کو نہیں بلکہ تیمور سیف کو تھی جس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔

جب اس کے درد کا احساس ہوا تو اُسکا اپنا دل بھی تڑپنے لگا۔ وہ ایک بار پھر سے چپ ہو گئی۔ کاش یہ سب کبھی نہ ہوتا۔ اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر روئے مگر چیخیں حلق میں ہی دم توڑ گئیں۔ آنسو بھی جیسے خشک ہو چکے تھے۔ وہ ایک دفعہ پھر ٹوٹ کر بکھرتی گئی۔

......☆☆......

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ کمرے میں ہر طرف اندھیرا تھا۔ فجر کی اذان ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں کھولے لیٹی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی نیند سے آنکھ کھلی تھی۔ اس کا دل بہت بے چین تھا۔ ایک عجیب سا ڈر دل میں بیٹھا ہوا تھا۔

تبھی کسی نے دھیرے سے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ آنے والا دبے پاؤں چلتا ہوا اُس کے بیڈ تک آیا تھا۔ وہ ذرا بھی نہیں چونکی یا گھبرائی تھی۔

آنے والے نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ بورڈ کا ایک بٹن دبا کر زیرو پاور کا بلب جلایا تھا۔ عائشہ نے دیکھا وہ فاطمہ گل تھیں۔ وہ اُن کو دیکھ کر بھی خاموشی سے لیٹی رہی۔ بس خالی خالی نظروں سے اُن کو تکتی رہی۔ وہ اُس کے بیڈ پر آن بیٹھیں۔ عائشہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اتنی رات کو کیوں جاگ رہی ہو؟'' انہوں نے پیار سے اُس کے بال سنوارتے ہوئے پوچھا۔

''نیند سے آنکھ کھل گئی تھی کچھ دیر پہلے تو پھر نیند ہی نہیں آئی'' وہ اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''آپ کیوں جاگ رہی ہیں؟'' اُس نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں تہجد پڑھنے کے لیے اُٹھی تھی۔ دوبارہ سونے لگی تو دل چاہا ایک بار تمہیں دیکھ لوں'' وہ اُسکے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔

عائشہ خاموشی سے آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔

''کل تم نے جانا بھی تو ہے نہ سو جاؤ اب......'' اُسے خاموش پا کر وہ گویا ہوئیں۔

اُس کی چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ پندرہ دن میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ گھر آتے وقت کتنی خوش تھی مگر اب از حد اُداس تھی۔

''عائشہ ایک بات کہوں بیٹا؟'' فاطمہ گل نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں روک کر پوچھا۔ عائشہ نے آنکھیں کھول کر اُن کو دیکھا۔

''جی......'' وہ فقط اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

''تیمور سیف بہت اچھا لڑکا ہے......ہم سب کو بہت پسند ہے......اگر تم کہو تو ہم اس کے رشتے کے لیے ہاں کر دیں......اب اُس کی والدہ تو رہیں نہیں......ہو سکتا ہے کہ اُن کے گھر سے کوئی اب اِس بارے میں بات کرنے نہ آئے مگر میں چاہتی ہوں کہ تم اُس سے شادی کر لو وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا اور سب سے بڑی بات وہ بھی تمہارے شعبے سے تعلق رکھتا ہے تمہیں بعد میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا''۔ انہوں نے بڑے نرم لہجے میں اُسے سمجھایا۔

عاشو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''عاشو بولو بیٹا'' انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

''آپ کو اگر مناسب لگتا ہے تو کر دیں...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے''۔ اُس نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

فاطمہ گل نے اُس کا ماتھا چوم لیا۔

''چلو اب سو جاؤ''۔ وہ اُس پر کمبل اوڑھ کر چلی گئیں۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ البتہ بلب اب بھی جل رہا تھا۔

......☆☆......

ٹھیک تین مہینے بعد اس کی اور تیمور کی شادی ہو گئی۔ وہ سادگی سے رخصت ہو کر تیمور سیف کے گھر چلی آئی۔ کوئی ہنگامہ نہیں اُٹھا تھا۔ نہ شادیانے بجے تھے۔ بس سادگی سے نکاح ہوا تھا۔ کیونکہ تیمور کی یہ خواہش تھی کہ سب سادگی سے ہو۔

وہ کمرے میں بیٹھی تیمور کا انتظار کر رہی تھی مگر وہ نا جانے کہاں تھا۔ عائشہ نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی۔ کمرے میں کسی قسم کی کوئی سجاوٹ نہیں تھی۔ بس بیڈ پر پھولوں کی پتیاں بچھی ہوئی تھیں۔

تبھی وہ چلا آیا۔ ہلکے سے دروازہ بند کر کے وہ چلتا ہوا بیڈ کے قریب آیا۔ عائشہ کا سر جھک گیا۔ اُس نے کوئی گھونگھٹ نہیں اوڑھ رکھا تھا۔ تیمور کچھ دیر کھڑا اُسے دیکھتا رہا پھر آہستگی سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''کیسی ہو......'' مدھم سے لہجے میں پوچھا۔

''یقیناً بہت ناراض ہو گی میں نے تمہیں ستایا جو بہت ہے''۔ وہ خود ہی بول پڑا۔

عائشہ نے پلکیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ نظریں ملیں تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔ یہ وہ تیمور تو نہیں تھا۔ جسے عائشہ جانتی تھی۔ جس کو عائشہ نے آخری دفعہ دیکھا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی تھا۔ اس کی آنکھوں کے ڈورے گہرے سرخ تھے۔

جیسے کئی راتوں سے آنکھوں کو نیند میسر نہیں ہوئی تھی۔ چہرے پر وہ مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔ نہ وہ سنجیدہ تھا نہ آج کوئی ایٹی ٹیوڈ تھا۔ بس ایک درد تھا چہرے پر جیسے سب کچھ کھو دیا ہو۔ ہر دم فریش رہنے والا چہرہ مرجھا کر رہ چکا تھا۔

عائشہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"اب کچھ بولو نہ"۔ تیمور نے اُسکا ہاتھ تھام کر جیسے ریکوسٹ کی تھی۔ عائشہ کے ہاتھ کی کپکپاہٹ تیمور محسوس کر سکتا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا ہاتھ تھام کر اُسے جیسے حوصلہ دیا تھا۔

"میں بہت ٹوٹ گئی ہوں تیمور......"۔ وہ تین مہینوں بعد روئی تھی۔ تیمور کو اُس نازک سی لڑکی پر بہت ترس آیا۔ اُس نے عائشہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اُسکے شانے سے لگی بکھرتی چلی گئی۔ کئی مہینوں کا غبار نکل گیا۔ تیمور نے اُسے کھل کر رونے دیا۔

کچھ دیر بعد وہ خود ہی الگ ہو گئی۔ دل کا بوجھ شاید کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اُسکا سر خود بخود جھک گیا۔

"عائشہ اِدھر دیکھو میری طرف......"۔ تیمور نے اُسکا چہرہ اوپر کرتے ہوئے کہا۔

"میں کہاں سے لاؤں اُس عائشہ کو......وہ تو شاید میڈیم فلک کے ساتھ ہی مر گئی تھی......اب جو عائشہ ہے وہ تو صرف سانس لے رہی ہے......زندگی کو کھینچ کھینچ کر جی رہی ہے......"۔ وہ پھر سے رونے لگی۔ تیمور کو شدید تکلیف ہونے لگی۔

"ایسے نہیں کہتے عائشہ......تم بہت سے لوگوں کے لیے اہم ہو بہت سے لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے سب سے زیادہ اِس وطن کو ہے کیونکہ تم ایک فائٹر ہو تمہیں بہت لڑنا ہے......اگر تم ایسے ہمت ہار جاؤ گی تو کیسے چلے گا"۔ وہ اُسے سمجھانے لگا۔

"میری ہمت اب اِس دنیا میں نہیں ہے تیمور میں کیا کروں میں بہت کمزور ہو گئی ہوں"۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی ٹوٹنے لگی۔

"میں بنوں گا تمہاری ہمت عائشہ......میں دوں گا تمہیں حوصلہ......میں دور کروں گا تمہاری زندگی کے سارے اندھیرے......میں تمہاری راہ میں شمعیں جلاؤں گا میں تمہیں کبھی ہارنے نہیں دوں گا عائشہ کیونکہ تیمور سیف عائشہ کو کبھی ہارتے اور ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا"۔ وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔

عائشہ کو لگا جیسے میڈم فلک اس کے سامنے بیٹھی ہوں۔

وہ حیرت بھری نگاہوں سے تیمور کو دیکھ رہی تھی۔

زندگی میں جب بھی ہمارے پر کٹ جاتے ہیں اور ہم اڑ نہیں سکتے تو کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہوتا ہے جو پھر سے ہمارے پر بن جاتا ہے۔ اللہ اگر ایک سہارا چھین لیتا ہے تو دوسرا سہارا بھی ضرور دیتا ہے۔ جب وہ اپنے بندے کو ہارنے نہیں دیتا تو بندہ خود کیسے ہار مان سکتا ہے۔

"تمہیں پتہ ہے ماما کو بھی ائرفورس جوائن کرنے کا بہت کریز تھا۔ وہ کچھ الگ کرنا چاہتی تھیں۔ مگر اُن کے پیرنٹس اور رشتے داروں نے اُن کی اِس خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر ماما نے مجھے اور ایاز کو بھیجا......وہ ہم دونوں کے ذریعے اپنے سارے خواب پورے کرنا چاہتی تھیں۔ مجھے اُس منزل پر دیکھنا چاہتی تھیں جس پر پہنچنے کے اُنہوں نے کبھی خود خواب دیکھے تھے۔ میں اور ایاز دونوں آفیسر بن گئے مگر پھر بھی ان کو سکون نہیں ملا تھا۔ مگر جب تم ائرفورس میں گئی تھی تو ماما پہلی بار پرسکون ہوئی تھیں۔ اسی لیے اُنہوں نے ہمیشہ تمہیں حوصلہ دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ تم بھی اُن کی طرح بنو۔ جانتی ہو عائشہ میں نے پہلی بار ماما کو تمہارا حوصلہ بڑھاتے اُس وقت دیکھا تھا جب تم پانچویں کلاس میں تھی۔ تم نے کہا تھا کہ تم پائلٹ بننا چاہتی اور ائرفورس میں جانا چاہتی ہو مگر تمہارے گھر والے کہتے ہیں کہ لڑکیاں ائرفورس میں نہیں جاتی مگر ماما نے جس طرح تمہیں ہمت دی میں پہلی دفعہ حیران ہوا۔ میں کلاس کے دروازے پر کھڑا سب سن رہا تھا۔ ماما کی باتیں مجھے بہت اچھی لگیں۔ اُسی دن میں نے اُن کو اپنی آئیڈیل مان لیا۔ جیسے تم نے مان لیا۔ اُس دن مجھے پہلی بار میں ہی تم بہت اچھی لگیں۔ پھر میں جب واپس اکیڈمی گیا تو مجھے پتہ چلا کہ تم ایان کی کزن ہو۔ ایان مجھ سے جونیئر تھا۔ مگر ہم بہت اچھے دوست تھے۔ اُس نے ایک دن مجھے اپنی فیملی فوٹو دکھائی جس میں تم بھی تھیں۔ میں اس انکشاف پہ بہت حیران ہوا۔ مگر مجھے خوشی بھی ہوئی۔ آیان اکثر تمہاری باتیں کرتا تھا۔ تمہاری معصوم شرارتوں کے بارے میں بتاتا تھا۔ پھر ایک دن تم نے ہمارے گھر فون کیا۔ تم ماما سے

بات کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے فون پر تمہاری آواز سنی تو مجھے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ جس کی وجہ مجھے اُس وقت سمجھ نہیں آئی تھی۔ تب ایان نے مجھے بتایا کہ تم ائرفورس جوائن کرنا چاہتی ہو لیکن تمہاری فیملی نہیں مان رہی میں پرسنلی تمہارے پاپا سے ملا اُن کو سمجھایا کہ وہ تمہیں اپنے خواب پورے کرنے دیں۔ پھر تم اکیڈمی چلی گئیں۔ ایان بھی اُن دنوں وہیں تھا۔ وہ مجھے تمہارے بارے میں ہر خبر دیتا تھا۔ وہ میرا بیسٹ فرینڈ اور بھائی تھا۔ میں نے اُسے بہت پہلے ہی تمہارے بارے میں بتا دیا تھا''۔

وہ سانس لینے کو رکا تھا۔

وہ مجھے تمہاری ہر بات بتاتا۔ اُسی کی وجہ سے میرا تم سے رابطہ ہوا تھا۔ مگر ایاز کی شہادت کے بعد میں کافی ٹوٹ گیا تھا لیکن پھر میں نے تمہارے لیے اور ماما کے لیے خود کو سنبھال لیا۔ ایان کی شادی میں تمہیں کئی سالوں بعد دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔ اسی لیے تین دن تک مسلسل تمہیں دیکھتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا کہ تم ڈسٹرب تھیں۔ مگر میں اُس دن دوبارہ ٹوٹ گیا تھا جب تم نے مجھ سے رو ڈلی بات کی تھی۔ مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ میں نے خود سے وعدہ کر لیا تھا کہ کبھی تمہاری زندگی میں اب کوئی مشکل نہیں پیدا کروں گا کیونکہ میں تمہیں ذہنی اذیت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر ایک دن میں اکیڈمی گیا تو میری ملاقات تمہاری دوست خدیجہ سے ہوئی اُس نے مجھے دیکھتے ہی صرف ایک سوال پوچھا تھا کہ سر آپ ایاز کے بھائی ہیں نہ...... ہم دونوں کی شکل بہت ملتی ہے شاید اُس نے اندازہ لگایا تھا جو کہ درست نکلا تھا۔ میں نے اُس سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ پھر خدیجہ نے مجھ سے پوچھا کہ آپ ہی عائشہ کو فون کرتے ہیں نہ..... تب بھی میں جھوٹ نہ بول سکا۔ خدیجہ نے مجھ سے کہا کہ وہ تمہارے بارے میں مجھے بتاتی رہے گی..... فیئر ویل فنکشن والے دن میں نے تمہیں پہچاننے سے انکار اس لیے کیا تھا کیونکہ میں تھوڑا سا ناراض تھا اور تمہیں تنگ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اُس دن میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ لیا تھا۔ مگر اس ستانے کی مجھے بعد میں بہت بڑی قیمت چکانی پڑی تھی۔ تمہیں جب چوٹ لگی تھی تو کئی راتیں میں سو نہیں پایا تھا۔ تم میری وجہ سے بہت ٹوٹ گئی تھی۔ تم نے آئیر فورس چھوڑنے تک کیا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر میں نے آیان سے کہا کہ تمہیں ریلکس ہونے دے۔ ماما کو میں نے تب تمہارے بارے میں سب کچھ سچ بتا دیا۔ اُنہوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔ پھر وہ تم سے ملنے گئیں کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم ماما کی بات کبھی نہیں ٹالو گی اور وہی ہوا تھا۔ باقی جو ہوا وہ تمہارے سامنے ہے''۔ وہ اب خاموش ہو چکا تھا۔ عائشہ سانس روکے اُسکی ہر بات سن رہی تھی۔

''عائشہ میں نے تم سے بہت پیار کیا ہے ماما کے بعد صرف تمہارے لیے جی رہا ہوں''۔ وہ اُسے چپ پا کر دوبارہ بولا۔

عائشہ کیا کہتی اُسکا تو دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔

''عائشہ''۔ تیمور نے اُسے ہلایا۔

''تیمور میں کچھ نہیں کہنا چاہتی سوائے اِس بات کے کہ میں نے بھی اگر کسی کو چاہا ہے تو وہ آپ ہیں''۔ وہ بڑی خوبصورتی سے اقرار کر گئی تھی۔

تیمور ہلکا سا مسکرایا تھا۔

''تمہیں ماما کی وفات سے بہت صدمہ لگا ہے جس نے تمہیں توڑ دیا اور تم کمزور پڑ گئی ہو......لیکن میں کوشش کروں گا کہ میں تمہیں اب کبھی ہارنے نہ دوں...... تمہیں پھر سے سمیٹ لوں''۔ ''وہ اُس کو اُمید دلا رہا تھا۔

عائشہ نے پُرسکون ہو کر اُسکے شانے سے سر ٹکا لیا۔ تیمور سیف اُسکے پر بن چکا تھا۔ وہ پھر سے اُڑان بھر سکتی تھی۔ ابھی بہت ساری اُلجھنیں ایسی تھیں جن کو وہ سلجھانا چاہتی تھی مگر اِس وقت وہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی بس سکون چاہتی تھی۔ الجھنوں کو سلجھانے میں تو ابھی زندگی پڑی تھی۔ زندگی تو خود ہی ایک پہیلی اور اُلجھن ہے۔ جب تک انسان زندہ رہتا زندگی کی میں سب کچھ ہوتا رہتا۔ ضرورت بس اِس بات کی ہے کہ انسان کبھی ہار نہ مانے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کاغذ کے ایک معمولی ٹکڑے کا احوال، اس پر بنے تین نقطے اس کے لیے وبال بن گئے تھے وہ کیا تھے کسی پر اسرار مخلوق کا پیغام تھے یا کسی دوسرے سیارے کی زبان۔

مختصر لیکن خوب صورت کہانی

تینوں ستارے روشن تر ہو رہے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ ان کا رخ میری جانب تھا۔ پھر جیسے جیسے وہ میرے قریب ہو رہے تھے ان کی روشنی مدھم ہوتی گئی۔ روشنی کے اس بدلاؤ کو سمجھنے کا موقع نہ مل سکا کیوں کہ میری آنکھیں اب واضح طور پر تین چٹانیں دیکھ رہی تھیں۔ زندگی اور موت کے درمیان عطا کردہ مہلت میرے سامنے تھی اور پھر یہ مہلت بھی مجھ سے چھین لی گئی۔ میری روح اب جسم سے جدا ہو چکی تھی اور میرا جسم بے سدھ پڑا تھا۔

مجھ پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ میرے مردہ جسم کے پہلو میں شدید چبھن ہو رہی تھی، جس کی تکلیف میری روح تک پہنچ رہی تھی۔ اس تکلیف نے مجھ پر اس قدر بوکھلاہٹ طاری کی کہ میں ہڑبڑاتے ہوئے بیدار ہو گیا۔ خاصی دیر بعد جب میں اس سحر سے نکلا تو سمجھ میں آیا۔

"او میرے خدایا! یہ کیسا خواب تھا؟" میں منہ میں بڑبڑایا۔

وقت دیکھا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ اچانک مجھے اپنی پسلیوں کی جانب شدید چبھن محسوس ہوئی۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنی جیب میں چلا گیا جس میں سے ایک بوسیدہ سا کاغذ نکلا۔ کاغذ ہاتھ میں پکڑنے کی دیر تھی کہ وہی چبھن ہاتھ میں محسوس ہونے لگی۔ زندگی میں پہلی بار مجھ پر ایسا حملہ ہوا تھا اور یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ مجھے اپنا ذہن مفلوج ہوتا دکھائی دیا۔ میں نے ہاتھ کو جھٹکا دیتے ہوئے کاغذ کو خود سے الگ کرنا چاہا مگر وہ ایسے چپکا رہا جیسے لوہے کے ساتھ مقناطیس... کچھ ہی دیر بعد میرے ہاتھ میں چبھن ہونا بند ہو گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر گھڑی کی جانب دیکھا۔ اب تین بج کر پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے جھٹ سے کاغذ سیدھا کیا تاکہ اس پر لکھی عبارت پڑھ سکوں۔

......☆☆......

میری بچپن سے ایک عادت تھی۔ وہ یہ کہ مجھے جہاں کہیں بھی کاغذ کا ٹکڑا گرا ہوا ملتا، اسے فوراً اٹھا لیتا۔ اسے نظر انداز کرنا میرے اختیار میں نہیں ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ عادت مجھ میں پختہ ہوتی گئی۔ گرے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے کو اٹھا کر اسے پڑھ کر مناسب ٹھکانے لگانا میرا مشغلہ رہا ہے۔ میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جب تک ایسا نہ کرتا، مجھے اضطراب گھیرے رکھتا۔اس عادت نے مجھے ہر قسم کے الفاظ سے آشنا کردیا تھا۔

گزشتہ شام کھیلنے کے بعد میں اپنے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا کہ میری نظر ایک بوسیدہ سے کاغذ پر پڑی۔عادت سے مجبور میں نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر جیب میں ڈال لیا کہ گھر پہنچ کر بلب کی روشنی میں اسے پڑھوں گا۔گھر پہنچتے ہی مصروفیت مجھ پر اس قدر غالب ہوئی کہ میں اس کاغذ سے غافل ہوگیا۔رات ہوئی تو اپنے الگ کمرے کا رخ کیا اور بستر پکڑتے ہی نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

......☆☆......

اس کاغذ پر سیاہ رنگ کے تین نقطے تھے۔یہ جسامت میں برابر تھے۔ایسے لگ رہا تھا جیسے تین سیاہ دھبے ہوں۔میں ان میں چھپے اسرار کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔جیسے تیسے رات کٹی۔تڑکا ہوتے ہی میرا رخ قریبی نہر کی جانب تھا۔نہر کے قریب پہنچ کر میں اس کاغذ کو جیب میں سے نکالا اور تہیں لگا کر نہر کے اندر پھینک دیا۔میں خود کو ایک بھاری بوجھ سے آزاد محسوس کرکے گھر واپس آگیا۔

میرا حربہ ناکام ہوا۔رات کے اسی پہر مجھے پھر وہی خواب دکھائی دیا اور پہلو میں سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔میں حواس باختہ ہوکر بیٹھ گیا۔میری جیب سے ایک بار پھر وہی کاغذ برآمد ہوا۔پندرہ منٹوں کی تکلیف جھیلنے کے بعد جب سکون ملا تو میں نے اس کاغذ کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کردیا کیوں کہ یہ ایک آسیب زدہ کاغذ تھا۔

میں کسی عامل کے پاس جا کر اس معاملے کو مزید پیچیدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھر والوں کو پریشان کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ مجھے جلد از جلد ان نقطوں سے نجات چاہیے تھی۔ اس سلسلے میں مَیں نے ایک مخلص دوست سے رابطہ کیا۔ اس نے آگ سے جلا دینے کا مشورہ دیا۔ مجھے یہ مشورہ پسند آیا کیوں کہ اس سے سب کچھ بھسم ہو جانا تھا۔ چناں چہ میں نے اسی مشورے پر عمل کیا اور کاغذ خاکستر ہو گیا۔ اب میں بالکل مطمئن تھا۔

وہ رات مجھ پر بہت بھاری ثابت ہوئی۔ میں کروٹیں بدلتا رہ گیا مگر نیند تو جیسے مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ سو جاگتے جاگتے رات کٹ گئی۔

اُدھر گھڑی نے تین بجائے، اِدھر میں حیرت اور دہشت کی کیفیت میں اچھل پڑا۔ میری آنکھیں ایک عجیب منظر دیکھ رہی تھیں۔ تین انگارے دروازے کی اوٹ سے جادوئی انداز میں داخل ہوئے اور کمرے میں گردش کرنے لگے۔ ان کی گردش اس قدر ہولناک تھی کہ میں بھاگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ خواب نہیں بلکہ جاگتی آنکھوں کا منظر تھا۔ مجھے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔ تینوں انگارے میری جانب لپکے۔ میں اپنے دفاع کے لیے بس اتنا ہی کر سکا کہ خود کو سمیٹ لیا اور اپنے چہرے کو بازوؤں سے چھپا لیا۔ انگارے میرے بازوؤں پر حملہ آور ہو گئے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے دہکتی ہوئی سلاخوں کے کچوکے لگ رہے ہوں۔ درد انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ میرے لیے یہ درد برداشت سے باہر تھا۔ میں اب موت کی آرزو کر رہا تھا۔ بے بسی، گھٹن اور درد کی شدت نے میرے حواس مجھ سے چھین لیے اور میں بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو دن کے بارہ بج رہے تھے۔ میرے اردگرد میرے گھر والے پریشان بیٹھے تھے۔ میری ایک جانب ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے سب کو مطمئن کیا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں۔ پھر خود کو اکیلا پاتے ہی میں نے فوراً اپنے بازوؤں پر نگاہ دوڑائی اور انھیں ٹٹولا۔ میرے بازو بالکل سالم تھے اور انگاروں کی آمد کو صاف جھٹلا رہے تھے جب کہ رات کا سارا منظر میرے ذہن پر نقش تھا۔ جب میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہی کاغذ کا ٹکڑا سالم حالت میں موجود پایا جس پر سیاہ نقطے ثبت تھے۔ میں ششدر رہ گیا۔ میرے لیے اب خطرہ بڑھ چکا تھا۔ مجھے ہر صورت آج ہی ان نقطوں سے چھٹکارہ پانا تھا مگر میں تو اپنے طور پر ناکام ہو چکا تھا مجھے اب کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ کھانے پینے سے بے نیاز ہو کر چارو ناچار میں شہر کے سب سے مشہور عامل کے ہاں چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے کاغذ کا ٹکڑا اسے تھماتے ہوئے ساری روداد سنا دی۔ عامل نے کافی دیر اس کاغذ پر اپنی نظریں جمائے رکھیں اور پھر آنکھیں بند کر کے کچھ بڑبڑانے لگا۔ یہ عمل میری سمجھ سے باہر تھا اس لیے میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد عامل مجھ سے مخاطب ہوا۔

''بچہ یہ نقطے بہت بڑی طاقت ہیں۔ ان کے ساتھ جڑی ہوئی ایک بے ٹھکانہ مخلوق ہے۔ تیرا کام انھیں ٹھکانے لگانا ہے۔''

میں منہ کھول کر اس عامل کی باتیں دھیان سے سن رہا تھا۔ وہ بات بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کسی قبرستان کے قریب گھنا اور سرسبز و شاداب درخت تلاش کرو۔ اس درخت کے تنے کے قریب تقریباً تین فٹ گہرا گڑھا کھود کر یہ کاغذ اس میں دفن کر دو۔ یاد رہے یہ عمل رات کی تاریکی میں کرنا ہے تاکہ کسی آدم زاد کی نظر نہ پڑے اور جب یہ عمل کرو گے تو پھر پیچھے مت ہٹنا ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' عامل کی ان باتوں نے مجھے مزید خوف زدہ کر دیا تھا مگر گزشتہ رات والی کیفیت مجھے مجبور کر رہی

تھی کہ میں آج ہی ان نقطوں کو ٹھکانے لگادوں۔عامل سے ملاقات کے بعد میں سیدھا قبرستان پہنچ گیا۔میں نے دن کی روشنی میں گھنے درخت کی نشان دہی کی اور پھر گھر واپس آگیا۔پھر رات بارہ بجے تک انتظار کرتا رہا۔جب سارا عالم تاریکی میں ڈوب گیا تو میں دبے پاؤں قبرستان کی جانب چل دیا۔احتیاطاً میں نے ایک چاقو بھی ساتھ لے لیا تاکہ کسی چھوٹے موٹے خطرے کا مقابلہ کرسکوں۔

چاند بادلوں کی اوٹ سے آنکھ مچولی کررہا تھا۔میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ بغیر کسی برقی روشنی کے مجھے منزل کو جاتا ہوا راستہ دکھائی دے رہا تھا۔میں تیز تیز قدم بھرتا ہوا بالآخر قبرستان پہنچ گیا۔میرا اندازہ تھا کہ مجھے قبرستان سے کدال مل جائے گی جو گڑھا کھودنے میں مدد دے گی مگر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔مجھے کہیں کدال نہ ملی۔میرے پاس وقت بہت کم تھا اور کدال کے بغیر گڑھا کھودنا ممکن نہ تھا۔گھر میں ایسا کوئی اوزار نہیں تھا اور رات کے اس پہر دکانیں بھی بند تھیں۔انتہائی پریشانی کے عالم میں مَیں مطلوبہ درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔مجھے کوئی ترکیب نہیں سوجھ رہی تھی۔سوچتے سوچتے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب اڑھائی بج گئے۔میرے پاس اب آدھے گھنٹے کی مہلت تھی۔میرا دل اب گھبرانے لگا تھا۔میرے پاس چاقو واحد اوزار تھا جس سے تین فٹ گہرا گڑھا کہاں کھودا جاسکتا تھا... مگر اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔میں نے چاقو ہاتھ میں پکڑا اور پاگلوں کی طرح کھدائی شروع کردی۔گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میرا ہیجان بڑھ رہا تھا اور جسم تھکن سے چور ہوکر نڈھال ہورہا تھا۔سر کی نسیں زور زور سے پھڑپھڑا رہی تھیں۔میں کسی طور بھی ہمت ہارنے پر آمادہ نہ تھا۔چاقو کی مدد سے کھدائی نہ ہونے کے برابر تھی۔مجھے اپنی مشقت بے سود دکھائی دینے لگی مگر میرے پاس رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔میں اسی جنونیت میں چاقو کی مدد سے وار کرتا رہا۔اچانک میرے کانوں سے دبی دبی ہنسی میں لپٹی سرگوشیاں ٹکرائیں۔مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا مذاق اڑایا جارہا ہو۔تین بج چکے تھے۔میرا دل ڈوبا جارہا تھا اور ہاتھ کپکپا رہے تھے۔میں نے انتہائی کرب کی حالت میں بھی اپنا عمل جاری رکھا۔یکایک میرا چاقو کسی بڑی کدال کی مانند کام کرنے لگا۔یہ ان انجانی طاقتوں کی بدولت تھا جو میرے ساتھ اس عمل میں شامل ہوچکی تھیں۔پلک جھپکتے ہی ایک گہرا گڑھا تیار ہوگیا۔میں نے کاغذ اس گڑھے میں پھینکا اور ہاتھوں کی مدد سے مٹی کے ڈھیر سے اسے زمین کے برابر کردیا۔پندرہ منٹ سے پہلے ہی میں اس عمل سے فارغ ہوچکا تھا۔میں نے شکر کا سجدہ ادا کیا اور گھر لوٹ آیا۔

اگلی صبح تجسس مجھے اسی درخت کی جانب لے گیا۔میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔سامنے کا منظر حیران کن تھا۔زمین کی حالت ایسی تھی جیسے صدیوں سے اسے کسی نے چھوا تک نہ ہو۔میں لاحول ولاقوۃ پڑھتا ہوا واپس آگیا۔بالآخر میں ان پراسرار نقطوں کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گھاؤ

اکبر لاہوری

اکبر لاہوری کی پنجابی کہانی "عورت جدوں بدلہ لیندی اے" کا اردو ترجمہ

مصائب و آلام، درد، دکھوں کی دھند میں لپٹی ایسی بپتا جس کا انجام آپ کو چونکا کر رکھ دے گا۔

اسے طرح طرح کے القابات سے نوازا گیا۔ فرسٹریشن کا شکار افراد نے اسے نہ جانے کیا کچھ کہا، جتنا برا بھلا اسے کہا جا سکتا تھا کہا گیا، اخبارات نے بھی خوب مرچ مسالے والی سرخیاں لگائیں اسے چڑیل لکھا، ڈائن کا نام دیا گیا، بچھے کٹنی، بھوتنی جیسے نام دے کر سرخیاں جمائی گئیں، جب اسے پولیس گرفتار کر کے لے گئی تب سے مقدمے کے فیصلے تک لوگ طرح طرح کی باتیں کر کے چٹخارے لیتے رہے، پولیس تفتیش سے لیکر سیشن کورٹ کے فیصلے تک اسے بری طرح لتاڑا اور پھٹکارا گیا۔ بھری کچہری میں گواہوں نے اس سے ایسی بات منسوب کیں جن کا وجود تک نہ تھا، اس نے ان گواہوں کو پہلی بار دیکھا تھا، پورے وقوعہ میں یہ گواہ کہیں نظر نہیں آئے تھے، کچہری میں نہ جانے آسمان سے اُترے یا زمین نے اُگل دیئے تھے لیکن اس نے پولیس تفتیش سے لیکر عدالت کے فیصلے تک زبان نہ کھولی، ہونٹوں کو جیسے مقفل کر لیا تھا، اس کی خاموشی سے لوگوں کو اور شہ ملی اور انہوں نے خوب دل کا غبار نکالا۔ اس نے مقدمہ کا ہر مرحلہ طے کیا لیکن اپنی چپ نہ توڑی۔ جیسے اس کا اس مقدمے سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو، عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنا دی۔

☆..................☆

اس کی عمر ابھی کھلونوں سے کھیلنے اور گڑیا گڈے کی شادی رچانے کی تھی جب اس کے رشتہ دار گاؤں کے چوکیدار کے بڑے بیٹے سے اس کا نکاح کر دیا گیا۔ گھر میں شادی کی رسمیں ہو رہی تھیں اور وہ معصوم آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں، اسے خبر ہی نہ تھی کہ یہ تقریب اس کی شادی کی ہے، ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی صرف 9 برس اور اُدھر دُلہا میاں بھی اس کے ہم عمر تھے، اسے تو یہ تک نا پتہ تھا کہ شادی ہوتی کیا ہے؟ بارات واپس جانے والی تھی، اسے دلہن بنا دیا گیا، وہ معصوم لہجے میں اپنے باپ سے کہنے لگی۔

"ابا میں بارات کے ساتھ جاؤں گی، لیکن اکیلی نہیں آپ بھی ساتھ چلو" اس کی یہ بات جب اس کے چچا اور کزنوں کے کانوں میں پڑی تو کھلکھلا اٹھے، بارات جب رات کو واپس گھر پہنچی تو وہ سو چکی تھی، ایک خاتون نے اسے کاندھے سے لگا کر کمرے تک پہنچایا۔

☆..................☆

میاں بیوی دونوں ہی نابالغ تھے، برادری کے قبیح رسم و رواج کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے، دونوں کو ہی معلوم نہ تھا میاں بیوی کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ وقت بھی کبھی رکتا ہے، پر لگا کر اڑتا رہا، دھیرے دھیرے دونوں اکٹھے ہی جوانی کی سیڑھی قدم بہ قدم چڑھتے گئے، پیار بھی بڑھتا گیا، دونوں نے وہ رنگ روپ نکالا کہ دیکھنے والے دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے، دونوں ایک سے بڑھ کر حسین، بیوی رانی دکھتی تھی تو خاوند کوئی راجا معلوم ہوتا تھا، تب انہیں معلوم ہوا کہ پتی اور پتنی کا سمبندھ کیا ہوتا ہے، اس کے شوہر نے بھی خاندانی پیشہ اپنایا اور گاؤں کا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

چوکیدار بن گیا تھا، لیکن جب وہ کسی پرے پنچایت میں کھڑا ہوتا تھا تو کوئی راجا ہی معلوم ہوتا تھا، چوڑے شانے، سرو جیسا قد، کشادہ پیشانی، تیکھے نقوش، موٹی موٹی سحر زدہ کر دینے والی آنکھیں، گھنگھریالے بال جو شانوں کو چھوتے تھے، انار کی طرح سرخ رنگ، ایک غریب چوکیدار حسن کا دیوتا معلوم ہوتا تھا جو بھی اسے نظر بھر کر دیکھ لیتا پھر دیکھتا ہی رہ جاتا تھا، رضیہ نے خود کئی لوگوں کو یہ باتیں کرتے سنا تھا کہ شاید یہ چوکیدار پچھلے جنم میں کسی دیس کا مہاراجا رہا ہوگا، وہ غریب تھے، نیچ برادری سے تعلق رکھتے تھے لیکن کسی اونچی ذات کے جوان میں جرأت نہ تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے، جھگڑا ڈالنا ہو یا لاٹھی چلانے کا کھیل ہو، شکار کا معاملہ ہو یا کبڈی کا میچ، اس جیسا وجیہ جوان پورے گاؤں میں کوئی نہ تھا۔

☆..................☆

رضیہ کو اپنے خاوند سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ کبھی اس کے بنا گاؤں سے باہر نہیں گئی تھی، جب کبھی مشکل وقت آن پڑا اس کے شوہر نے اسے سہارا دیا۔ ایک بار سیلاب آ گیا، لوگ ڈر گئے اور گھروں سے نکل آئے، پانی اتنی تیزی سے گاؤں کی جانب آ رہا تھا کہ ان کے پاس بندھ باندھنے کیلئے وقت بہت کم تھا۔ اس کے خاوند شکور نے گاؤں کے جوانوں کو فوری اکٹھا کیا، اپنے گھر، نمبردار اور دوسرے گاؤں والوں کے گھروں سے تختے اکھاڑنے اور اکٹھے کرنے شروع کر دیئے، انہیں گاؤں کے اطراف میں بالخصوص جہاں سے پانی کے داخلے کا راستہ تھا، وہاں مٹی میں دبا کر اوپر مٹی ڈالنا شروع کر دی، بندھ بنانے کا کام شروع ہو گیا تھا، مال و متاع اور جانیں بچانے کیلئے دیکھا دیکھی گاؤں کے دوسرے افراد بھی اس کی مدد کو دوڑے، شکور دن سے رات تک کبھی ایک جگہ سے اور کبھی دوسری جگہ سے کسی سے مٹی نکال کر بندھ

مضبوط بنانے کے لئے ڈالتا رہا، یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں بجلی بھر گئی ہو، اس کا ہاتھ پل بھر کو بھی نہ رکا، وہ دوسروں کو بھی حوصلہ دیتا جا رہا تھا، لوگوں نے پوری رات خون پسینہ ایک کر کے بالآخر بندھ نا صرف باندھ لیا بلکہ اسے خاصا مضبوط بھی کر لیا تھا، اب یقیناً پانی اس بندھ سے ٹکرا کر راستہ بدل لیتا اور فصلوں کو تباہ کرتا کسی نشیبی مقام کا رخ کر لیتا۔ جیسے ہی سورج کی کرنوں نے فضاء کو روشن کیا پانی بندھ سے جا ٹکرایا، لیکن کوئی نقصان نہ ہوا۔

گاؤں والے اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے کہ اگر یہ گھبرو جوان ہمت نہ کرتا تو راتوں رات اتنا سا چوڑا بندھ نہیں بن سکتا تھا اور گر بندھ نا بنایا جاتا تو نا جانے گاؤں کا کیا حشر ہوتا، ضلعی افسر کشتی میں ان کے گاؤں کے پاس سے گزرے تو رک کر گاؤں والوں کو کہنے لگے کہ بھئی آپ نے جو بندھ بنایا ہے یہ دوسرے بہت سے دیہات سے مضبوط اور سیلاب کی آفت کو روکنے کیلئے زبردست ہے یہ دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے۔ گاؤں والوں نے افسران کو بتایا کہ یہ سب ہمارے چوکیدار شکور کا کمال ہے، اس کی ہمت و حوصلہ نے سب کی ہمت بندھائی اور ہم کامیاب ہو گئے، کشتی میں سے بیٹھے بیٹھے بڑے افسر نے جیب سے 100 روپے کا ایک نوٹ نکالا اور شکور کو بطور انعام دیا، اس روز رضیہ پھل پھل کے پہاڑ ہو رہی تھی، سارے گاؤں کی ٹیاریں اس کے ماہی کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھیں، اس کا اپنا پیر خوشی سے زمین پر نہیں پڑ رہا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے وہ بادلوں کی طرح فضاء میں اڑ رہی ہے، اس کے شوہر کے کارنامے نے گاؤں پر دھاک بٹھا دی تھی۔

☆..............☆

گاؤں کے چوہدری کی عمر ساٹھ یا پینسٹھ برس تھی، اپنی حرکتوں اور برے کاموں کے باعث وہ نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ ارد گرد کے دیہات میں بھی خاصا بدنام تھا، اس نے ہر حیلہ بہانہ کیا لیکن خدا نے اسے اولاد سے نا نوازا، شاید رب نے اسے اس لائق ہی نہ سمجھا تھا، لوگوں کی زبان پر بھی یہی بات ہوتی تھی کہ یہ ایک طرح سے ٹھیک ہی ہوا ہے، اس طرح کے بدکار اور بدمعاش شخص کی نسل آگے بڑھنی ہی نہیں چاہیے، سانپ کا بچہ بھی سانپ ہی ہوتا ہے، اس کا بے اولاد ہونا ہی سب کے لئے بھلے کا سودا تھا۔

☆..............☆

چوہدری نے کبھی کبھار شکور کو بلانا ہوتا تھا تو بندہ بھیجنے کے بجائے خود چل کر ان کے دروازے پر آ جاتا، جب کبھی رضیہ نے دروازہ کھولا اور سامنے چوہدری کو دیکھا تھا تو اس کی خوفناک آنکھوں اور اس کے گھورنے کے انداز سے خوفزدہ ہو جاتی، سارے گاؤں کے سامنے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ کسی غریب کی عزت اس خبیث چوہدری کے ہاتھوں پامال ہونے سے نہیں بچی، لیکن سب کے لب جیسے سلے ہوئے تھے، سب ڈرتے تھے اس عفریت سے، کسی کی مجال نا تھی کہ چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات بھی کر سکے، سرکار نے نا جانے کتنے قانون بنائے ہوں گے لیکن اس حقیقت کو کون جھٹلائے کہ اس دھرتی پر جس قانون کی بادشاہی ہے وہ قانون ہے طاقت کا قانون، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، جو زورآور وہی سب سے بڑا، طاقتور کا گناہ بھی جائز اور غریب کی چیخ بھی گستاخی تصور کی جاتی ہے۔

☆..............☆

ایک روز رضیہ شکور سے کہنے لگی۔" مجھے چوہدری کی آنکھوں میں سور کا بال نظر آتا ہے، بری نظروں سے دیکھتا ہے وہ" شکور دھیرے سے مسکرایا اور اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہنے لگا" بھولی لڑکی، تمہیں کیا معلوم کہ تمہارے شوہر کے سامنے چوہدری کے ہاتھ پاؤں کیسے پھول جاتے ہیں، میرے سامنے تو اس کی آواز بھی نہیں نکلتی، وہ یہ بات بڑے اچھے طریقے سے جانتا ہے کہ اگر کبھی اس نے اس گھر کی طرف بری نظر سے دیکھا تو اس کا ایک پاؤں اس دروازے کے اندر ہو گا اور دوسرا اگلے جہان جہنم میں ہو گا"۔

☆..............☆

ایک روز اس کی سکھیوں اور گاؤں کی چند بزرگ

خواتین نے اسے کہا" رضیہ تم دیکھ رہی ہو، یہ بدذات نا جانے کتنی زندگیوں کو برباد کر کے اب تیرے اوپر نظر رکھے ہوئے ہے، اس نے ان باتوں کو ہنسی میں اڑا دیا اور کہنے لگی۔

میں شیر کے گھر میں رہتی ہوں، مجھے گیدڑ کی گیدڑ بھبکیوں یا اس کے گھورنے سے کیا لینا دینا، اس میں اتنی جرأت نہیں کہ شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالے۔"

☆..................☆

ان دنوں ایک بات نے سب کو پریشان کر کے رکھا ہوا تھا، روز خبر ملتی کہ فلاں گاؤں میں ڈاکوؤں نے دھاوا بول دیا، کبھی پتہ چلتا ڈاکوؤں نے لوٹ مار کے دوران دو بندے بھی مار دیئے، ڈاکو پولیس کو ڈرانے اور لوگوں پر اپنا ڈر جمانے کیلئے آزادانہ وارداتیں کرتے، تلواریں، بندوقیں، پستول، ہر طرح کے اسلحہ سے لیس ہو کر وہ ہلہ بولتے تھے، آس پاس کے علاقوں میں خوف کی فضاء تھی، لوگ سراسیمگی کے عالم میں جی رہے تھے، جہاں ڈاکو دھاوا بولتے، سامنے آنے والے ہر شخص کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے یا گولیوں سے چھلنی کر دیتے، ان کی بے رحمی اور لوٹ مار سے دیہاتیوں کا خون خشک رہتا تھا۔ مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق ڈکیتی کی وارداتوں کے ساتھ ساتھ چوروں نے بھی ات مچا رکھی تھی، گہری تاریک راتوں میں مویشی کھول کر لے جاتے، جب کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تو گاؤں والے ڈرتے ڈرتے ان کا مقابلہ کرتے، کیونکہ ان کے پاس اسلحہ تھا نہ لڑنے مرنے کیلئے دوسرے ہتھیار، ڈانگوں، ڈنڈوں اور چھریوں سے کیا مقابلہ کرتے، نتیجہ یہ نکلتا کہ گاؤں والے پسپا ہو جاتے اور وارداتیے اپنا کام دکھا کر چلتے بنتے، مجال ہے جو پولیس نے کبھی ان کو گھیرنے، پیچھا کرنے یا للکارنے کی ہمت کی ہو، جیسے ہی انہیں پتہ چلتا تھانوں اور چوکیوں میں یوں دبک جاتے تھے جیسے کسی آہنی پنجرے میں بند مرغی بلی کو دیکھ کر پنجرے ہی کے دوسرے کونے سے لگ کر بیٹھ جائے اور خوفزدہ نظروں سے دیکھتی رہے۔

☆..................☆

موسم ایسا تھا کہ ابھی مویشیوں کو کمروں یا چھپروں کے نیچے باندھنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ لوگ جانوروں کو کھلے صحن میں ہی باندھتے تھے، لوگ بھی کھلے آسمان تلے چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے، وہ رات کا پچھلا پہر ہوگا، نمبردار نے ایک آدمی کو بھیجا، اس نے پیغام دیا کہ گاؤں میں مویشی چور آ گئے ہیں، شکور نے جلدی سے اپنی ڈانگ اٹھائی اور اس کے ساتھ چل دیا، رضیہ دروازہ بند کر کے دوبارہ چارپائی پر لیٹی ہی تھی کہ اسے فائرنگ کی آواز سنائی دی، ایک شور سا مچ گیا، کڑک دار آوازوں کی گونج بھی اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی، آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ چور نہیں بلکہ ڈاکوؤں نے دھاوا بولا ہے اور وہ گلیوں میں گھس آئے ہیں، لوگ کوٹھوں پر چڑھ گئے، لیکن پھر ڈاکوؤں کے خوف سے نیچے اتر آئے، کیونکہ ڈاکو چھتوں پر چڑھنے والوں کو تاک تاک کر نشانہ بنا رہے تھے۔

فائرنگ، مار دھاڑ، چیخ و پکار سے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس کا پلڑا بھاری ہے، یوں لگ رہا تھا آج سبھی کی لاشیں گریں گی، فائرنگ میں تیزی آتی جا رہی تھی، ہاہا کار مچی ہوئی تھی، لیکن موت سب کے لئے کہاں؟ وہ تو چن چن کر بہادروں کو اپنے پنجے میں جکڑتی ہے، فائرنگ جب تھمی تو رضیہ کے مقدر میں جگہ جگہ چھید ہو چکے تھے، چند افراد ایک چارپائی اٹھائے اس کے دروازے پر آئے تو اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ جیسے دل سینہ چیر کر باہر نکل آئے گا، اس کھر پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا، چارپائی پر شکور لہو میں نہایا پڑا تھا، صحن میں چارپائی رکھتے ہی شکور نے آخری سانسیں لیں اور دم توڑ دیا، ایک ہی رات میں اس کا سہاگ اجڑ گیا تھا، رضیہ کو تن من کا ہوش نہ رہا، اس کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اس کا محبوب کبھی نہ اٹھنے کیلئے لیٹا ہوا تھا، غم واندوہ کی شدید کیفیت نے اس پر سکتہ طاری کر دیا اور وہ گر گئی۔

☆..................☆

روشنی پھوٹی تو وہ چارپائی پر ڈھیر تھی۔ اردگرد گاؤں کی عورتیں موجود تھیں، وہ اس بچے کی ماں بن چکی تھی جس کے باپ کو اگلے جہان کا سفر درپیش آ گیا تھا، شکور کے جسم پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے، کسی نے کہا گاؤں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کا شیر ٹھنڈا ہوگیا، دوسرا ابوالشکور جیسے بہادروں کو مائیں کم
کم ہی جنم دیتی ہیں، رضیہ کی آنکھ دوبارہ کھلی تو نظر اس
شیر کے بچے پر پڑی جسے وہ جنم دے چکی تھی، ایک دلیر چلا
گیا تھا لیکن اس کو ایک اور بہادر کا تحفہ دے گیا تھا، شکور کا
دوسرا روپ رب نے اسے دے دیا تھا۔ اس نے دل
میں سوچا میرے شکور کو تو انہوں نے مجھ سے چھین لیا لیکن
وہ بیٹے کی شکل میں پھر میری حفاظت کیلئے آ گیا ہے، بچے
کی پیدائش میں تو ابھی دو ماہ باقی تھے پھر اسی روز ہی
کیوں جنم لے لیا جس روز اس کا شیر جوان باپ اس پاپی
دنیا سے لڑتا اپنی جوانی گنوا بیٹھا تھا، کسی بزدل نے اس کی
پیٹھ میں گولی ماری تھی، وہ تو سینے پر وار سہنے والا تھا یہ پیٹھ
پیچھے سے کس ڈرپوک نے حملہ کیا، یہ بات رضیہ کے حلق
سے نیچے نا اتر رہی تھی، شکور فرش زمین ہوگیا تو رضیہ نے
اپنے کلیجے کے چھید کسی کو دکھانے کے بجائے اپنے
نومولود کو دیکھ دیکھ کر غم غلط کرنے کی کوشش شروع کردی۔
وہ قدرت کی مصلحت پر انگشت بدنداں تھی، اس بات پر
اس کا یقین تب تب پختہ ہوتا جب جب وہ بچے کو دیکھتی
کہ خدا نے اسے دوسرا شکور دے دیا ہے، بالکل باپ پر
گیا تھا، ویسا ہی چوڑا ماتھا، وہی آنکھیں، اس جیسی
ناک، ویسے ہی ہونٹ، وہ سوچنے لگی یہ میرا پُت نہیں بلکہ
پتی ہے، کون کہتا ہے کہ میرا سہاگ لٹ گیا، میں اب بھی
مانگ سجاؤں گی، میں اب بھی سہاگن ہی کہلواؤں
گی۔ رضیہ نے اس کا نام ظہور رکھا، واقعی خاوند کی صورت
میں ظہور ہی تو ہوا تھا۔

☆..................☆

دنوں میں اس نے رنگ ڈھنگ نکالا، رضیہ حیران تھی
کہ وہ یوں دن بہ دن بڑا ہو رہا تھا کہ ناقابل یقین سی
بات لگتی تھی۔ وہ اپنی عمر کے بچوں سے پہلے ہی باتیں
کرنے لگ گیا، وہ اتنی جلدی چلنا سیکھ گیا کہ اڑوس
پڑوس والے کہتے ”یہ بچہ تو بہت کمال کا ہے خدا نے اس
کو دوسرے بچوں سے زائد صلاحیتوں سے نوازا ہے“
جواب میں رضیہ کہتی ”کمال کا کیوں نہ ہو یہ پہلے بھی گھبرو
تھا اب پھر جوانی کی چوکھٹ پر قدم رکھ رہا ہے مسافر
جہاں سے آیا ہو واپس ادھر کو ہی جاتا ہے۔“

☆..................☆

رضیہ اپنے محبوب کی موت کے دکھ کو بھول کر دوبارہ
سہاگ کی خوشیوں میں ڈوبی رہتی تھی کہ چوہدری نے
گھناؤنا کھیل کھیلنا شروع کردیا۔ رضیہ کو اپنی طرف مائل
کرنے کیلئے ہر حیلہ بہانہ آزمایا، دن رات اپنی مکروہ
سازشوں میں لگا رہا، رضیہ پہلے پہل تو یہی سمجھتی رہی
چونکہ اس کے شوہر نے گاؤں کی خاطر گولی کھائی ہے اس
لئے چوہدری ان غریبوں کی مدد کیلئے آٹا، گھی، کپڑے
بھجواتا رہتا ہے، اس کا دھیان اس طرف رہتا کہ
چوہدری یتیم بچے اور ایک بہادر کی بیوہ کے جسم و روح کا
رشتہ برقرار رکھنے کے لئے مدد کررہا ہے لیکن جیسے جیسے دن
گزرتے گئے رضیہ نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اس کی
برادری کی بڑی بوڑھیاں اور چوہدری کے قریب رہنے
والی عورتوں نے دھیرے دھیرے اس کے گھر آنا شروع
کردیا ہے اور یہ آمدورفت بڑھتی ہی جارہی ہے۔ کچھ
نے تو باتوں باتوں میں مطلب کی بات بھی کہنا شروع کر
دی، کوئی کہتی۔“
بے وقوف تیرے بھاگ جاگ اٹھے ہیں، چوہدری
تم پر مرتا ہے، اب تو تم رانی بن کر رہو گی“ دوسری کہتی
”دیکھ لینا جیسے ہی تو نے اس کے گھر قدم دھرا اس کے گھر
کا چراغ روشن ہو جائے گا“ کوئی مشورہ دیتی ”آخر کب
تک مرنے والے کا غم سینے سے لگائے رکھے گی، بھولی
عورت، کبھی مرنے والوں کے ساتھ مرا بھی جاتا ہے، یہ
کیوں نہیں سمجھتی کہ اس کی جگہ اگر موت تجھے لے جاتی تو
وہ کتنا عرصہ رنڈوا رہتا؟“ کوئی کہتی ”یہ پہاڑ جیسی جوانی
کیسے کاٹے گی، لوگ باتوں کے تیر چلا چلا کر تیرے تن
من میں اتنے سوراخ کردیں گے کہ نہ جی سکے گی نہ مر
سکے گی“ اسے ڈرانے، دھمکانے، لبھانے، لالچ دینے
کے سارے حربے ایک ایک کرکے استعمال کئے جارہے
تھے۔

☆..................☆

رضیہ تنہائی میں سوچتی اگر میں مر جاتی تو ساتھ ہی
سارے دکھ درد بھی ختم ہو جاتے، لیکن مجھ بدنصیب،
بھاگاں جلی کو موت کہاں آتی، عورتوں کی طرح طرح کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

باتیں سن کر اس کا کلیجہ پھٹنے کو آجاتا، وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ جاتی، سوچوں کی یلغار اسے پریشان کردیتی، وہ سوچتی کیسے ہیں یہ سنسار والے، غریبوں کی خوشیاں بھی نہیں دیکھ سکتے اور ان کو بچھڑنے والوں کے غم میں رونے بھی نہیں دیتے، جینا چاہو تو جگ جینے نہیں دیتا، مرنا چاہو تو مرنے بھی نہیں دیتا، یہ سوچ سوچ کر وہ ہلکان ہوجاتی، سدھ بدھ کھو بیٹھتی لیکن پھر جیسے ہی گھبرو بیٹے کو دیکھتی تو دل ودماغ میں روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوتی اور سب کچھ بھول بھلا کر ظہور کو یک ٹک دیکھنے لگ جاتی، وہ من مار کر بیٹھ رہنا سیکھ گئی تھی، لیکن گھاؤ میں نمک مرچ لگانے والیاں گھات میں تھیں، چوہدری کے ایماء پر اس کے درپے تھیں، بلائیں اس کے پیچھے لگی ہوئی تھیں، وہ آبرو سے رہنا چاہتی تھی لیکن چوہدری کی چڑیلوں نے اس کا جینا دوبھر کر رکھا تھا، کبھی اسے جواہر میں تولنے کا لالچ دیتیں تو کبھی چوہدری کی وحشت انگیز حرکتوں سے اسے ڈراتی دھمکاتی تھیں۔

☆..................☆

چوہدری سمجھ گیا تھا کہ پہلے اس کی راہ میں باپ رکاوٹ تھا اب بیٹا راستے کا پتھر بن رہا تھا، اس کے حواریوں نے یہ بات اس کے کان میں ڈال دی تھی کہ ظہور کے ہوتے ہوئے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی، اگر راستے کا یہ روڑا نہ ہٹایا گیا تو پھر دلی ہنوز دور است والا معاملہ ہی رہے گا، چوہدری کو جب کسی کروٹ چین نہ آیا تو اس نے ظلم وستم کی ہر حد پار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆..................☆

ابھی دوپہر نہیں ہوئی، ہمسائیوں کا لڑکا بھاگم بھاگ آیا، اس کا سانس پھولا ہوا تھا، دھڑ ادھڑ اس نے دروازہ بجایا، رضیہ کا دل دھڑک اٹھا "یااللہ خیر" اس کے منہ سے نکلا، فیقے نے روتے ہکلاتے ہوئے بتایا کہ ظہور دریا میں ڈوب گیا ہے، اس کا جسم سن ہو کر رہ گیا، سینہ جلنے لگا، اس پر رقت طاری ہوگئی، لگاتار روتے ہوئے پوچھا۔

"کک...... کیسے...... کیسے......؟"

وہ چوہدری کے نوکر کے ساتھ بھینسیں نہلا رہا تھا، اس نے بھینس کا رسہ پکڑ رکھا تھا اور نوکر بھینس کا جسم مل رہا تھا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کہ اچانک ڈر کر بھینس گہرے پانی میں چلی گئی۔ ظہور رسے سے ہاتھ نہ نکال سکا اور ڈوب گیا۔ بیج چڑھتے ہی اس کا سہاگ چھین لیا گیا تھا، اب کے دل کے ٹکڑے، آنکھ کے تارے، راج دلارے، معصوم کو ہوس کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا، یہ غم رفو نہیں ہو سکتا تھا، اس کا سینہ شق ہو چکا تھا لیکن ظہور کا پھر ظہور نہ ہوا، غوطہ خور تھک ہار کر لوٹ آئے اور اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے، وہ بچی نہیں تھی بخوبی سمجھتی تھی کہ دکھ والم کی ان اتھاہ گہرائیوں میں اسے دھکا دینے والا کون ہے اور کیا چاہتا ہے، اس نے فساد کھڑا کئے بغیر انوکھا فیصلہ کرلیا۔

☆..................☆

ایک روز گاؤں والے یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے کہ رضیہ نے چوہدری سے نکاح کرلیا ہے، وقت پر لگا کر اڑتا رہا، پھر بے اولاد چوہدری کی خوشی کا ٹھکانہ نا رہا جب رضیہ نے اس کے بیٹے کو جنم دیا، سب نے اسے رضیہ کا بیٹا کہا، لیکن رضیہ کا زخم زخم دل جانتا تھا کہ ماں بننے میں اس کا کردار کیا تھا، چوہدری کے بچے کی ماں بن کر بھی وہ ماں نہیں بنی تھی اس نے کوزہ گر والا کردار نبھایا تھا، بچہ باپ کا ہمشکل تھا، چوہدری جیسا کالا بھجنگ، افیم کا مارا ہوا، ایسے جیسے توے کا نچلا حصہ، بھینگی آنکھیں، ٹیڑھی ٹانگیں، بے ڈول جسم، سانپ اور اس کے بیٹے میں رتی برابر فرق نہ تھا، منہ نہ متھا، جن پہاڑوں لتھا۔ رضیہ نے ایک دن بھی اسے سینے سے لگا کر دودھ نہ پلایا تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی اس کی چھاتیوں میں موجود دودھ لہو بن چکا ہے۔

☆..................☆

چوہدری کی تو کایا پلٹ گئی تھی۔ خوشی سے سینہ ایسے پھلائے رکھتا جیسے غبارے میں غلطی سے زیادہ ہوا بھر دی گئی ہو، پہلے وہ اپنی زمین دھڑا دھڑ فروخت کئے جا رہے تھا، اب جہاں سے جتنی بھی زمین ملتی، خریدتا چلا جا رہا تھا، دن بدن اس کی اراضی بھی بڑھ رہی تھی اور اراضی کا وارث بھی۔ گاؤں کے لوگ بھی یہی باتیں کرتے نظر آتے کہ بھئی کیوں نہ زمینیں خریدے، اب وارث نے جو جنم لے لیا ہے، چوہدری ہر وقت خوش باش نظر آتا، اسے دولت کی کمی نہیں تھی، خود پرستی اور خود پیرائی میں پہلے ہی

وہ کسی سے پیچھے نہ تھا، اب تو رب نے موقع ہی ایسا دے دیا تھا کہ رقص کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا تھا اور پھر ''رانی کو کون کہے کہ آ گا ڈھک'' ایک بزرگ نے کیا خوب مثال دی کہ ''کمیں کو لوٹا ملا، پانی پی پی مرا'' چوہدری نے پرانا کچا کمرہ گرا کر پختہ کمرہ بنوایا، نئے دیوان خانے تعمیر کرائے، نیا مہمان گھر بن گیا، دو گھوڑے تھے اب شہر سے بگھی بھی لے آیا، جب وہ بیٹے کو بگھی میں بٹھا کر سیر کو نکلتا تو بھکاری دعائیں دیتے ''پتر کا بیاہ کرے، پوتوں کی خوشیاں دیکھے'' چوہدری جھوم اٹھتا، شوم تو بہت تھا لیکن اس سے وہ خوب خیرات کرتا، پہلے کوئی بھکاری ہاتھ پھیلاتا تھا تو ڈنڈے مار کر ہاتھ توڑ دیتا تھا۔

☆..................☆

رضیہ کی خوشیوں کے محل کو مسمار کرنے والا موذی اپنی نسل بڑھنے کے سہانے خواب دیکھنے لگا تھا، عورت کا کچھ پتہ نہیں چلتا، دنیا کا شاید ہی کوئی فرد ہو جو یہ دعویٰ کرے کہ ''میں عورت کو مکمل طور پر سمجھتا ہوں'' نا جانے ہر اپرادھی یہ کیسے خیال کرلیتا ہے کہ دوسرے میرے سے کم اپرادھی ہوں گے یہ سوچ اسے مزید مظالم پر ابھارتی ہے اور وہ ظلم وستم کے پہاڑ توڑ کر مظلوم کے بدلے سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ مظلوم کا مزاج آگ ہو جائے تو سب کچھ بھسم کر کے رکھ دیتا ہے، مغالطہ میں اپرادھی کا مزاج جب ساتویں آسمان سے فرش کو بوسہ دیتا ہے تو پتہ چلتا ہے مکافات عمل کیا ہوتا ہے، چوہدری کی دراز رسی کھینچے جانے کا سمے قریب آرہا تھا جبکہ وہ موج مستیوں کی لہروں کے ساتھ بہے جا رہا تھا۔

☆..................☆

وقت کی گاڑی نان سٹاپ جارہی تھی، چوہدری کا بیٹا آٹھ سال کا ہو گیا، اس کی سالگرہ کی تیاریوں کا دھوم دھام سے آغاز ہوا، ظہور بھی تو آٹھ برس کا تھا جب وہ پانی میں ڈوبا یا اسے ڈبویا گیا تھا، رضیہ ایک روز اپنی ہم راز سکھی کے سامنے ماضی کی کتاب کے ورق پلٹ رہی تھی، بڑے دکھ سے بولی ''لوگ شاید یہی سمجھتے آرہے ہیں کہ شکور اور ظہور کی اموات حادثے تھے اور میں ان کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

موت کو حادثہ ہی سمجھ رہی ہوں، ظالم کو اتنا کوئی نہیں سمجھ سکتا جتنا اس کی چھری تلے آنے والا سمجھ سکتا ہے، میں جانتی ہوں میرے سر کے تاج کو کس نے مجھ سے چھینا، وہ سینے پر گولی کھانے کا حوصلہ رکھتا تھا اس کی پیٹھ پر وار کیا گیا، میں جانتی تھی میرے کلیجے پر کس نے ہاتھ ڈالا ہے اور میرے لعل کو کس نے ڈبو کر مارا ہے، میں بھی اس کے کلیجے کو پاؤں تلے مسلنا چاہتی تھی، میں اس کی تمام آس اور امیدوں پر چھری چلانا چاہتی تھی، میں بھی اسے اپنی طرح برباد ہوتے، روتے، کلبلاتے، بے بسی سے چیختے چلاتے دیکھنا چاہتی تھی" رضیہ کا سانس پھول گیا، اس کی مٹھیاں غصے سے بھنچی ہوئی تھیں، اس کی باتوں سے لگ رہا تھا وہ ساری دنیا سے ٹکر لینے کو تیار ہے۔

☆.................☆

سالگرہ کا دن آ پہنچا۔ چوہدری کی حویلی کی سج دھج دیدنی تھی۔ طرح طرح کے مہمان چلے آ رہے تھے۔ اگر سونا تھا تو صرف رضیہ کے دل کا آنگن، اگر کہیں خوشی کی رمق نہیں تھی تو بدنصیب رضیہ کی آنکھوں میں نہیں تھی، احاطے میں آگ کے الاؤ روشن تھے جن پر دیگیں پکائی جا رہی تھیں، دوسری جانب رضیہ کے تن من کو آگ بھسم کئے جا رہی تھی، بدلے کی آگ، رضیہ جو برسوں دل میں انصاف انصاف کی مالا جپتی رہی آج اس نے خود ہی انصاف کرنے کا فیصلہ کر لیا، بدلے چکانے کا بہترین سمے آ گیا تھا۔

☆.................☆

رضیہ نے مہمانوں کے بیچ سے چوہدری کے بیٹے کو اٹھایا، نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سینے سے لگایا، چپکے سے حویلی سے نکلی اور دریا کا رخ کر لیا، نہ جانے چوہدری نے رضیہ کی آنکھوں میں روشن الاؤ دیکھ لیا تھا یا پھر اسے کسی نے بتا دیا کہ رضیہ کو بچے کے ساتھ دریا کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے، چوہدری کے پاؤں تلے زمین نکل گئی، بدحواسی کے عالم میں ساری چودھراہٹ بھول کر وہ دیوانوں کی طرح رضیہ کے پیچھے دریا کی طرف بھاگا، مہمانوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے، چوہدری کے کچھ حواری بھی اس کے پیچھے لپکے، رضیہ دریا کنارے پہنچ گئی، وہ ساری کشتیاں جلا کے آئی تھی، اس نے چوہدری کے بیٹے، جسے اس نے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا کو دونوں ہاتھوں سے پورا زور لگا کر پانی میں ڈبو دیا۔ جان کس کو پیاری نہیں ہوتی، بچہ جان بچانے کے لئے جتنے جتن کر رہا تھا وہ اتنے ہی زور سے اسے غرق آب کئے جا رہی تھی، دھیرے دھیرے بچے کے ہاتھ پاؤں ساکت ہو گئے، پانی کے نیچے اس کا جسم مری ہوئی مچھلی کی طرح ٹھنڈا ٹھار ہو چکا تھا۔ رضیہ نے بچے کو باہر نکال کر دور سے اندھا دھند بھاگتے چوہدری کو ایک نظر دکھایا اور پھر اس کی آس امیدوں کو موت کی جھلک دکھا کر بچے کو لہروں کے سپرد کر دیا، چوہدری جیسے جیسے قریب آ رہا تھا اس کے بھیانک نقوش اور بھی بگڑتے جا رہے تھے، اس کا جسم تڑپ رہا تھا، رضیہ کے جسم میں ٹھنڈ پڑ رہی تھی، اس کی ڈراؤنی آنکھیں، پھولتے پچکتے نتھنے دیکھ کر رضیہ کو ایسے لگا جیسے ایک بوڑھا سور ایک جانب سے شکاریوں، دوسری طرف سے کتوں میں گھرا ہوا ہے، اس کا یہ درد اور بے بسی دیکھ کر رضیہ کو محسوس ہوا اسے انصاف مل گیا ہے، اس نے ظالم سنسار سے اپنا بدلہ لے لیا ہے، چوہدری اسے چوٹی سے پکڑے دریا کو دیکھ رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی، مجھے اپرادھی کہا جائے گا لیکن میں اپنے سہاگ کے بعد سہاگن رہی کب تھی، مجھے زبردستی بیوی بنانا چوہدری کی بھول تھی، مجھے ایک ظالم ماں کہا جائے گا، لیکن اپنے ظہور کو کھونے کے بعد میں ماں رہی کب تھی" چوہدری اسے بری طرح مار رہا تھا لیکن وہ سوچوں کی کھائیوں میں گری ہوئی تھی، چوہدری نے زبردستی مجھے ماں بنایا، یہ اس کا اپرادھ تھا، میری تمنا نہیں تھی، فرعون کا ہیرو کارا سے چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹتا حویلی کی طرف لے جا رہا تھا جہاں خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے، کسی سیانے نے سچ ہی کہا" جیسے کو تیسا ملے سُن تو راجا بھیل لو ہا چوہا کھا گیا، لڑکا لے گئی چیل"

مہتاب خان

وہ صاحب ثروت ہونے کے باوجود پاگل اور دیوانی لگتی تھی اس کا گھر بھوت بنگلے کے نام سے جانا جاتا تھا آخر وہ اس حال کو کیونکر پہنچی یا اسے یہاں تک کون لایا یہ بھی اسرار کے پردے میں چھپا راز تھا پھر اس کی زندگی میں بدلائو آیا اور وہ دنیا میں واپس آگئی اسے واپس لانے والا کون تھا یہ بھی ایک راز تھا جس سے وہ خود بھی ناواقف تھی۔

ہزاروں گز قطعہ اراضی پر بنا ہوا وہ بنگلہ اس علاقے میں بھوت بنگلے کے نام سے مشہور تھا۔ مدتوں سے رنگ وروغن نہ ہونے کی وجہ سے در ودیوار نے سیاہی مائل رنگت اختیار کرلی تھی۔ باہر لگا بڑا سا فولادی گیٹ اور اس پر لگا لیٹر بکس زنگ آلود ہو چکا تھا۔ لان کی گھاس کو ایک عرصے سے تراشا نہیں گیا تھا اور اس میں خودرو جھاڑ جھنکار اگ آئے تھے۔ لان کی ایک جانب قد آدم پنجرے نصب تھے جن میں انواع واقسام کے پرندے موجود تھے۔

یہ بنگلہ ایک لڑکی کی ملکیت تھا جس کا نام سارا ہاشوانی تھا۔ تیس پینتیس سالہ سارا عجیب وغریب وضع قطع رکھنے والی عورت تھی۔ پڑوس میں وہ کسی سے ملتی جلتی نہیں تھی۔ کافی عرصے سے کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی اور کسی کو اس کے بنگلے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ آس پاس کے لوگوں کا خیال تھا کہ سارا کوئی بہت بدصورت عورت ہے یا کوئی مریضہ ہے جو اپنے عیوب چھپانے کے لیے بنگلے میں روپوش رہتی ہے۔ صرف ایک کل وقتی ملازمہ زینب تھی جو اس کے ساتھ رہتی تھی۔ تقریباً پچاس سالہ زینب ایک خرانٹ عورت تھی جو کسی کو بنگلے کے آس پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتی تھی۔ وہ ہی اس کی خدمت گزاری اور گھریلو کام کاج انجام دیتی تھی۔

کبھی یہ گھرانہ بے حد متمول اور خوش وخرم ہوا کرتا تھا۔ روشن ہاشوانی کا شمار بے حد دولت مند اور کاروباری فرد کے طور پر ہوا کرتا تھا۔ سارا جب چھ سال کی تھی تو ہاشوانی صاحب مختصر علالت کے بعد وفات پاگئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کا بھائی شمس ہاشوانی جو کافی عرصے سے بیرون ملک مقیم تھا۔ ان کے کاروبار وغیرہ کی دیکھ بھال کے لیے وہاں آ گیا تھا۔ اس کے وہاں آتے ہی سب کچھ گڑ بڑ ہوگیا تھا۔ اس چالاک اور عیار شخص نے بنگلے اور کاروبار پر اپنا قبضہ جمالیا تھا اور ان دونوں ماں بیٹی کو بنگلے کے ایک حصے میں محصور کردیا تھا۔ شمس نے پڑوسیوں سے بھی ہر طرح کا تعلق ختم کردیا تھا۔

سارا کے والد نے یہ بنگلہ اور تمام کاروبار اپنی زندگی میں ہی سارا کے نام کردیا تھا۔ جو اسے اٹھارہ سال کی عمر میں ملنے والی تھیں۔ ان کے ایک ایڈووکیٹ دوست مبین ملک اس تمام معاملے کے نگراں تھے۔ یوں شمس کی ایک نہیں چلی تھی۔ اب اسے اس وقت کا انتظار کرنا تھا جب تک تمام جائیداد سارا کو مل نہ جائے۔

ابھی اس کے والد کے انتقال کو ایک سال ہی ہوا تھا کہ اس کی ماں بھی اسے چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھی پھر سنا گیا کہ اس نے کسی سے شادی کرلی تھی۔ دو تین سال بعد وہ اپنی بیٹی سے ملنے آئی تھی مگر شمس نے اسے سارا سے ملنے نہیں دیا تھا اور وہ روتی دھوتی واپس چلی گئی تھی پھر کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

چچا نے اس واقعے کا پورا فائدہ اٹھایا تھا اور اسے خوب

ڈرایا دھمکایا تھا اور اسے بار بار یہ احساس دلایا تھا کہ وہ اتنی بری ہے کہ ماں جیسی ہستی بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ سوچا جاسکتا ہے کہ اس حادثے کا سارا پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ بچے ایسے میں خود کو قصوروار سمجھتے ہیں اور ایسے موقع پر اس کے قریب سہارا دینے کے لیے اس کا کوئی ہمدرد بھی موجود نہیں تھا۔ شاید اس نے یہی سوچا ہوگا کہ وہ کسی کی محبت کے لائق نہیں تھی ورنہ اس کی ماں اسے چھوڑ کر کیوں جاتی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو وہ اندر ہی اندر گھٹتی چلی گئی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ان دنوں اس نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ چچا کی کڑی نگرانی میں اس نے تعلیم کے یہ مدارج طے کیے تھے۔ جوانی اس پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ درمیانے قد بھرے بھرے جسم گوری رنگت خوب صورت پیشانی اور بڑی بڑی روشن آنکھوں کا نام سارا تھا۔ جو بھی اسے دیکھتا' دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔

اس دن وہ اپنے چچا کے ساتھ کہیں جا رہی تھی جب اسی محلے میں کارنر کے بنگلے میں رہنے والے ڈاکٹر رضا نے سارا کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ڈاکٹر رضا ان دنوں اپنی میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ سرخ لباس نے گوری رنگت میں کھل کر سارا کے حسن کو شعلے کی طرح دھکا دیا تھا۔ وہ اس پر سے نظریں ہٹا نہیں سکا تھا اور دل تھام کر رہ گیا تھا۔ سارا اسے بہت پیاری لگی تھی۔

ان دنوں سارا کے بہت رشتے آ رہے تھے جنہیں اس کا چچا کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتا تھا۔ رضا نے بھی اپنی امی کو سارا کے رشتے کے لیے بھیجا تھا۔ سارا انہیں بھی بہت پسند تھی اور رضا ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ رضا کے والد وفات پا چکے تھے۔ جب وہ اس کا رشتہ لے کر گئیں تو شروع میں تو شمس نے ٹال مٹول سے کام لیا تھا پھر کچھ دن بعد یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ رضا سارا کو پسند نہیں ہے۔

یہ سن کر رضا کا دل بری طرح ٹوٹا تھا پھر کچھ عرصے بعد والدہ کے اصرار پر اور ان کی پسند کے مطابق رضا نے شادی کر لی تھی اور ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ میٹرک کے بعد سارا کے چچا نے اسے گھر بٹھا دیا تھا۔ نہ اس کی کوئی دوست تھی اور نہ ہی پڑوسیوں سے کوئی میل جول تھا۔ کسی نے اسے اس بھنور سے نکالنے کی کوشش نہیں کی اور کس کے پاس اتنا ٹائم تھا کہ وہ توجہ دیتا۔ سارا کا چچا بہت بد مزاج اور خرانٹ تھا۔ محلے میں سب اس سے ڈرتے تھے۔ اسی لیے ان لوگوں سے دور رہتے تھے۔ سارا کے تمام کاروبار اور آمدنی پر چچا کا قبضہ تھا اور اب اس کی نظر سارا کی جائیداد پر تھی جو جلد ہی سارا کو ملنے والی تھی۔ اور رہی سارا تو وہ اس کی اجازت کے بغیر سانس بھی نہیں لیتی تھی۔

قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ اور ہے۔ اس کے چچا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک رات ہارٹ اٹیک سے اس کی اچانک موت واقع ہوگئی اور اس کے سارے منصوبے دھرے رہ گئے۔

چچا کے مرنے کے بعد ایک بار پھر پڑوسیوں نے سارا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اب اسے کسی کا اعتبار نہیں رہا تھا اور لوگوں کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی جو اس کے لیے کچھ سوچتے آخر سب نے اسے اکیلا چھوڑ دیا اور وہ اپنے اندر سمٹتی چلی گئی۔

سارا کے بنگلے کے بالکل سامنے جنید عرف جوجو کا

مکان تھا۔ جوجو سولہ سترہ سال کا ایک توانا اور شوخ وشریر لڑکا تھا۔ اس کا کمرہ مکان کی اوپری منزل پر واقع تھا۔ جہاں ایک کھڑکی سے سارا کا بنگلہ صاف نظر آتا تھا۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر بنگلے کا نظارہ کرنا جوجو کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

جب رات کی تاریکی گہری ہو جاتی تو اس وقت بنگلے کی کھڑکیوں اور دروازوں پر پڑے دبیز پردوں سے چھن کر روشنی باہر آتی تھی اور یہ احساس دلاتی تھی کہ ان کے پیچھے کوئی وجود موجود ہے۔ سارا بہت کم باہر نکلتی تھی۔ وہ باہر جاتی بھی تو کبھی سر اٹھا کر کسی کی جانب نہیں دیکھتی تھی۔ بدرنگ بدہیئت لباس بکھرے بالوں اور اجڑے حلیے نے اس کے نقوش کو بھی دھندلا دیا تھا۔ نہ جانے وہ قید کی زندگی کیوں گزار رہی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ آدم بیزار ہے اور کچھ کا خیال تھا کہ وہ تنہا رہنے کے باعث وہ نفسیاتی مریضہ بن گئی ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو اپنے بنگلے کی طرح وہ بھی ایک پراسرار شخصیت تھی۔

ہر پراسرار چیز دلچسپ ہوتی ہے۔ جوجو بھی پراسرار کے یہ پردے اٹھانا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ کھڑکی میں کھڑا سارا کے بنگلے کی سمت دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے وہاں کھڑا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اس کھڑکی کی جانب دیکھا اس امید پر کہ شاید وہ سارا کی جھلک دیکھ لے لیکن وہاں کھڑکیاں اور دروازے ہمیشہ کی طرح بند تھے اور ان پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ ان اندھے شیشوں کے آر پار کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے اکثر دیکھا تھا۔ دن کے وقت تو بنگلے کی اوپری منزل جہاں سارا کا کمرہ تھا۔ جس کی کھڑکیاں اور بالکونی کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا البتہ رات کو کبھی کبھی کھڑکیوں کے ایک دو پٹ کھل جاتے اور گرمیوں میں اکثر بالکونی کا دروازہ بھی کھل جایا کرتا تھا۔ مگر پھر بھی وہاں تاریکی سیاہ پردے کی طرح پڑی رہتی تھی۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ بالکونی کے ساتھ والے کمرے میں روشنی کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا کر باہر آنے کی کوشش کرتی اور پھر کمرے کی محدود فضاؤں میں ہی اپنی مالکہ کی طرح قید ہو کر رہ جاتی۔ سارا نے خود کو خاموشی اور اسرار کے دبیز پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ مگر یہ خاموشی چیخ رہی تھی اور یہ چیخ جوجو سن رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کھڑکیوں کے اندھے شیشوں پر روشنی کے زاویے بدل رہے تھے اور وہ ادھر سے ادھر کسی بے چین روح کی طرح بھٹک رہی تھی۔

"جوجو...... جوجو۔" اسی وقت جوجو کی امی کی آواز آئی کچھ دیر بعد وہ کمرے میں آ گئیں۔

"جوجو میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہی ہوں اور تم یہاں کھڑے ہو۔ کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ اس کے نزدیک چلی آئی تھیں۔

"وہ دیکھیں امی کتنی ویرانی ہے وہاں۔" اس نے سارا کے گھر کی جانب اشارہ کیا۔

"وہ ایسی کیوں ہے؟ اس تنہائی سے اس کا دل نہیں گھبراتا۔ اس کے گھر میں نہ فون ہے نہ ٹی وی بیرونی دنیا سے اس کے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ کیسے رہتی ہوگی امی۔"

"میں جب یہاں آئی تھی انہیں دنوں اس کے ڈیڈی کی ڈیتھ ہوئی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد اس کا چچا یہاں آ گیا تھا اور اس نے آتے ہی سارا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ بڑا ظلم کرتا تھا ان ماں بیٹی پر۔ یہ سب منظر ہمارے گھر سے نظر آتا تھا مگر ہم بے بس تھے ان مظلوموں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔"

"سارا نے شادی کیوں نہیں کی؟" جوجو نے کہا۔

"وہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی بیٹا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ شروع میں تو اس کے بہت رشتے آتے تھے بلکہ کئی رشتے تو محلے والوں کی طرف سے بھی گئے تھے۔"

"پھر......"

"مجھے تو لگتا ہے اس کی دولت اور جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے ہی اس کے چچا نے سب کو بھگا دیا ہوگا۔ چچا کی نظر اس کی دولت پر تھی وہ دولت جو خود چچا کے کام نہ آ سکی۔"

"امی چچا کے مرنے کے بعد وہ شادی کر سکتی تھی۔"

"اسے شاید کسی پر اعتبار نہیں رہا ہوگا۔ وہ یہ سمجھتی ہوگی کہ کوئی بھی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بہر حال چھوڑو اس قصے کو تم چلو کھانا کھاؤ۔" اس کی امی نے کہا اور دروازے کی سمت بڑھیں۔

"میرا دل چاہتا ہے۔ اسے اس قید تنہائی سے کھینچ کر باہر کی دنیا میں لے آؤں اور اسے بتاؤں کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔" جوجو نے کہا اور اپنی امی کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

❁......❁......❁......❁

قد آور مضبوط بازوؤں اور چوڑے سینے والا خوبرو ڈاکٹر رضا پندرہ سال کا طویل عرصہ ملک سے باہر گزار کر حال ہی میں پاکستان واپس آیا تھا۔ وہ اپنی والدہ کی اچانک موت کی وجہ سے آیا تھا اور اب اس نے یہیں رہنے بسنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ رضا بھی سارا کے امیدواروں میں سے ایک امیدوار تھا مگر بقول اس کے چچا کے سارا کے انکار سے وہ دل برداشتہ ہوگیا تھا اور اس نے والدہ کی پسند کے مطابق شادی کرلی تھی مگر قسمت کی ستم ظریفی کہ یہ شادی زیادہ عرصے نہیں چل سکی تھی اور آج کل وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ دن میں وہ ایک مشہور و معروف اسپتال میں جاب کرتا تھا اور اکثر شام کو وہ گھر کے نزدیک واقع پارک میں دیکھا جاتا تھا۔ جہاں محلے کے دیگر افراد بھی باقاعدگی سے جایا کرتے تھے۔

وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ سارا نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اور وہ عجیب و غریب زندگی گزار رہی تھی۔ اسے سارا کے بارے میں بڑا تجسس تھا مگر کہیں سے اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں مل سکی تھیں وہ جب سے آیا تھا سارا کو کہیں آتے جاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔

رضا جب بھی اس بنگلے کے قریب سے گزرتا تو سر اٹھا کر زنگ آلودہ گیٹ کی جانب ضرور دیکھتا۔ اس امید پر کہ شاید کسی دن اس کی جھلک دیکھ لے۔ لیکن گیٹ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ نہ جانے اب وہ کیسی ہوگی؟ کیا آج بھی وہ اتنی ہی خوب صورت ہوگی جیسے پہلے تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا مگر اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ اسے نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اسی سوچ میں سرگرداں رہتا تھا۔

روشن ہاشوانی کی اکلوتی بیٹی ان کی تمام تر دولت اور جائیداد کی تنہا وارث حسن و جمال کا پیکر سارا سب سے الگ تھلگ تھی۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں اور یہ باتیں ایسی تھیں جو اسے دن بدن پراسرار بنا رہی تھیں۔ لیکن ان باتوں سے رضا کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا تھا اور یہ محبت برسوں پر محیط تھی۔ وقت اور فاصلے بھی اس کی محبت کی شدتوں کو کم نہیں کرسکے تھے۔

❁......❁......❁......❁

اس دن عجیب واقعہ ہوا تھا۔ جوجو اور بلال اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ باہر کرکٹ کھیل رہے تھے۔ جب بلال کے ایک تیز شاٹ مارنے کے نتیجے میں بال سارا کے بنگلے کی دیوار کراس کرتی ہوئی اس کے لان میں کہیں جاگری۔ لڑکوں میں سے کوئی اس بھوت بنگلے میں جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کھیل جاری رکھنے کے لیے بال ضروری تھی۔ ایسے میں جوجو آگے بڑھا تھا اور بال لانے کے لیے دیگر لڑکوں کی مدد سے وہ بنگلے کی دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا تھا۔ کافی دیر وہ لان میں بال تلاش کرتا رہا مگر وہ نہیں ملی۔ بری طرح جھاڑ جھنکار اور جھاڑیوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ برسوں سے انہیں تراشا نہیں گیا ہے۔ لان کی حالت بڑی ابتر تھی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ لان عبور کرکے لکڑی سے بنے سال خوردہ منقش دروازے کے قریب آیا۔ بال کی تلاش وہ فراموش کرچکا تھا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ ایک تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر آگیا۔ یہ ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا۔ برسوں سے دروازے کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے ایک مخصوص سی مہک وہاں بسی ہوئی تھی۔

ابھی اسے وہاں آئے کچھ ہی لمحے ہوئے تھے کہ ہال کی ایک جانب بنی سیڑھیوں سے اسے ایک خراٹ آواز سنائی دی۔

"اے کون ہو تم؟ اور اندر کیسے آئے؟"

جوجو نے چونک کر سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔ وہاں زینب کھڑی تھی۔

"وہ...... ہماری بال یہاں آگئی تھی۔" وہ جھجکتا ہوا بولا۔

"بھاگو یہاں سے...... کوئی بال وال نہیں ہے یہاں۔" زینب تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے قریب پہنچی۔

"کیا ہوا زینب کون ہے وہاں؟" اسی وقت سارا اندر کسی کمرے سے ہال میں آئی۔ بدہیئت اور اجاڑ حلیے میں وہ خوفناک لگ رہی تھی۔

"میں جنید ہوں۔ آپ کے سامنے والے گھر میں رہتا ہوں۔ ہماری بال آپ کے بنگلے میں آگئی تھی۔ وہ تلاش کرنے آیا تھا۔ باہر میرے دوست انتظار کررہے ہیں۔" وہ سٹپٹا کر بولا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''گیٹ پھلانگ کر آئے ہو۔'' اس نے انتہائی غصے سے آنکھیں نکالیں۔

''نکلو یہاں سے اور اپنے دوستوں سے بھی کہہ دینا۔ اگر کوئی بنگلے کے آس پاس نظر آیا تو اچھا نہیں ہوگا۔'' وہ خونخوار لہجے میں چیخی وہ تیزی سے پلٹا اور باہر کی سمت دوڑ لگا دی۔

''سنو۔'' سارا نے اسے آواز دی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم صفیہ آپا کے بیٹے ہو۔'' اس بار اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ جوجو نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔

''آئندہ یہاں نہیں آنا۔'' وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ جیسے ہی وہ بیرونی گیٹ سے باہر نکلا اس کے سارے دوستوں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے تمام روداد انہیں کہہ سنائی۔

''بال ملی۔'' ایک دوست نے جلدی سے پوچھا۔

''نہیں یار وہ شاید کسی پنجرے کے نیچے گم ہوگئی مجھے نظر نہیں آئی۔''

''لیکن تو اندر کیوں گیا تھا؟'' بلال نے کہا۔

''بس ایسے ہی میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔'' جوجو نے کہا۔

''چڑیل کہیں کی اسے تو سبق سکھانا چاہئے۔'' بلال نے کہا۔

''ویسے غلطی تو ہماری ہے میں بغیر اجازت اس کے گھر میں گھسا تھا۔'' جوجو نے کہا۔

''ہماری نیت تو بری نہیں تھی۔'' ایک نے کہا۔

''سبق تو سکھانا پڑے گا۔ اس نے دھمکی کیوں دی۔'' بلال نے کہا۔

''ایک آئیڈیا ہے میرے پاس۔'' جوجو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟'' بلال نے اس کی طرف دیکھا۔

''بعد میں بتاؤں گا۔'' جوجو نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''تم لوگ ابھی تک یہاں کھڑے ہو۔ بھاگو یہاں سے۔'' زینب جو گیٹ بند کرنے نہ جانے کب وہاں پہنچی تھی غرا کر بولی تو وہ سب اپنے اپنے گھر کی سمت چلے گئے۔

❁......❁......❁......❁

بنگلہ میں رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس کی دلی جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ کیسے جیتے جی مر گئی تھی۔ سب اسے چھوڑ گئے تھے یہاں تک کہ اس کی پیاری ماں بھی اسے چھوڑ گئی تھی۔ وہ منحوس تھی چچا نے اسے یہی بتایا تھا۔ الفاظ کے تیروں نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ اور تو اور دنیا والوں نے بھی اسے ٹھکرا دیا تھا۔ کوئی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے خود کو ان سب کی نظروں سے چھپا لیا تھا۔

پندرہ سال سے وہ اس چار دیواری میں قید تھی اور یہ خود ساختہ قید تھی وہ خود کو سزا دے رہی تھی۔

''یہ گوشہ نشینی مجھے مار ڈالے گی۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر ایک گناہ گار کی طرح منہ چھپائے بیٹھی ہوں۔'' وہ بڑبڑائی۔

وہ بدصورت نہیں تھی۔ اس میں کوئی عیب بھی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ دوسروں کے سامنے آنے سے کتراتی تھی۔ پندرہ سال پہلے اس کے حسن میں غضب کا نکھار آیا تھا۔ کیا اب بھی وہ حسن باقی ہے؟ اس نے سوچا۔ وہ اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ دھندلے آئینے میں اس کا عکس مزید دھندلا گیا تھا۔ اس کے سامنے الجھے بالوں ویران آنکھوں والی ایک اول جلول سی حلیے والی عورت کھڑی تھی۔ یہ وہ سارا تو نہیں تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سارا کہاں گم ہوگئی تھی۔ وہ وہاں سے پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی کی جانب آگئی۔ جیسے ہی اس نے کھڑکی کھولی سامنے اس کی نظر جوجو کے گھر کی جانب گئی جہاں جوجو کھڑکی میں کھڑا اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید اسے دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا تھا۔ سارا نے کھڑکی بند کر دی اور کمرے میں ادھر ادھر چکر لگانے لگی۔

❁......❁......❁......❁

''وہ اپنے آپ کو کیوں چھپا رہی تھی۔ اسے کیا ڈر تھا آخر میں اس کے بارے میں کیوں سوچ جا رہا ہوں؟'' وہ بیڈ پر لیٹا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سوچتے سوچتے اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آ ئیں۔ سارا مجسم اس کے خیالوں میں آ گئی تھی۔ پندرہ سال پہلے اس نے سارا کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک خوب صورت دوشیزہ تھی۔

"مجھے صبر وتحمل سے کام لینا چاہئے اور اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ تلاش کرنا چاہئے پھر اس تک پہنچنے کا راستہ بن جائے گا۔" اس نے سوچا پھر وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آیا اور دور بین اٹھائی اور سارا کے بنگلے کی سمت دیکھنے لگا۔ آخر شب کی ہواؤں میں خنکی آ گئی تھی۔ باہر تاریکی تھی صرف اوپری منزل کی کھڑکیاں روشن تھی۔ ان کے پیچھے وہ پراسرار ہستی شاید جاگ رہی تھی۔ ادھر اس کی آنکھوں سے بھی نیند اڑ گئی تھی اور ادھر روشن شیشے رت جگا منا رہے تھے۔

یہ دوسرے دن کا واقعہ تھا۔ صبح رضا حسب معمول اسپتال جا رہا تھا جب سارا کے بنگلے کے قریب سامنے سے اچانک آنے والی ایک تیز رفتار کار سے بچنے کے لیے رضا نے اسٹیئرنگ گھمایا تو اس کی کار بے قابو ہو گئی اور بنگلے کے زنگ خوردہ فولادی گیٹ سے جا ٹکرائی۔ وہ گیٹ شاید اسی ٹکر کا منتظر تھا۔ اس کا ایک پٹ ٹوٹ کر زمین بوس ہو گیا اور اس پر لگے ہوئے لیٹر بکس کا دروازہ کھل گیا اور مختلف بلز اور کاغذات وغیرہ آس پاس بکھر گئے۔ گیٹ ٹوٹنے اور گرنے کی آواز خاصی زوردار تھی۔ رضا نے گاڑی روکی اور نیچے اتر آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسی وقت سارا کی ملازمہ زینب نہ جانے کہاں سے نکل کر گیٹ پر آ گئی اور لگی شور مچانے۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟ سارا بی بی کو پتا چلا تو خیر نہیں؟"

"خدا کے لیے چپ ہو جاؤ...... میں ٹھیک کروادوں گا۔" رضا نے جلدی سے بولا۔

"کیسے ٹھیک کروائیں گے؟ کب ٹھیک کروائیں گے اور جب تک ہم کیا کریں گے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ محلے والوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کل وہ شریر لڑکے گھر میں کود آئے اور آج آپ نے گیٹ توڑ دیا...... میں سارا بی بی کو اٹھاتی ہوں۔ وہ سو رہی ہیں وہ خود ہی نمٹیں گی۔" زینب تیز لہجے میں بولی۔

"میں نے کہا نا میں ٹھیک کروادوں گا۔ ابھی اسپتال جا کر ملازم کو بھیجتا ہوں۔ وہ اسے ٹھیک کروادے گا۔ انہیں اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" رضا نے نرم لہجے میں رسانیت سے سے سمجھایا۔ زینب بڑبڑاتے ہوئے لیٹر بکس کے قریب بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹ کرنے لگی۔

زینب سارا کے کمرے میں آئی تو دیکھا وہ کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے کاغذات ٹیبل پر رکھے اور کہا۔

"آپ نے دیکھا وہ نکڑ پر رہنے والے ڈاکٹر نے ہمارا گیٹ توڑ دیا۔"

"ہاں میں دیکھ رہی تھی...... سنو وہ ملازم کو بھیج دے تو اپنی نگرانی میں گیٹ ٹھیک کروادینا۔"

"ٹھیک ہے...... ناشتہ تیار ہے۔ ابھی کریں گی یا کچھ دیر بعد؟" زینب نے کہا۔

"لے آؤ۔" اس نے کہا اور ٹیبل کے قریب رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ زینب چلی گئی۔ وہ کاغذات دیکھنے لگی۔ کاغذات الٹ پلٹ کرتے ہوئے اس کی نظر ایک لفافے پر پڑی۔ اسے دیکھ کر وہ چونکی اس پر کوئی مہر وغیرہ نہیں تھی۔ لفافے پر صرف اس کا نام لکھا تھا۔ یعنی یہ خط کہیں سے پوسٹ نہیں کیا گیا تھا بلکہ کسی نے جان بوجھ کر اس کے لیٹر بکس میں ڈالا تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اندر ایک خط تھا۔ سارا کے چہرے پر شدید حیرت تھی اسے خط لکھنے والا کون تھا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

"پیاری سارا! یہ خط پڑھ کر تم یقیناً حیران ہو رہی ہوگی۔ تمہاری حیرانی بجا ہے۔ اس لیے کہ تمہیں پتا ہی نہیں کہ میں کون ہوں۔ تو سنو آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ آج سے نہیں برسوں سے۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو اس دن تم بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ تمہارا بے مثال حسن دمک رہا تھا۔ اسی لمحے میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ تمہارا وہ حسین چہرہ آج بھی میرے خیالوں میں موجود ہے۔ اور وہ پیاری سی مسکان جو اس چہرے پر کھلی ہوئی تھی آج بھی ہے یا نہیں......

صرف تمہارا......

خط لکھنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ اس نے الٹ پلٹ کر خط دیکھا۔

"کس نے کیا ہے یہ بیہودہ مذاق۔" اس نے سوچا خط پھاڑنے کے ارادے سے اس نے کاغذ بلند کیا پھر رکی اور

دوبارہ پڑھنے لگی۔ ایک بار دو بار پھر متعدد بار پڑھ ڈالا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب لکھنے والا کون ہے۔ وہ اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا تو خط کے الفاظ اس کے ذہن میں ابھرے وہ پیاری سی مسکان جو اس چہرے پر کھلی ہوئی تھی آج بھی ہے یا نہیں۔ مسکرانے کی کوشش میں اس کے لب بھینچ کر رہ گئے اور آنکھوں کی ویرانی کچھ اور بڑھ گئی۔ شاید اس کے ہونٹ مسکرانا بھول چکے تھے۔ اسی وقت زینب ناشتے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی تو سارا نے جلدی سے خط مٹھی میں دبالیا۔

"ناشتہ ٹیبل پر رکھ دو اور تم جاؤ۔" سارا نے کہا۔

زینب کے جانے کے بعد وہ کرسی پر آ بیٹھی اور دوبارہ خط پڑھنے لگی۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر اس نے کاغذ ٹیبل پر ایک طرف ڈالا اور کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا دیا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔

❀......❀......❀......❀

اسپتال پہنچتے ہی رضا نے ملازم کو گیٹ ٹھیک کرنے بھیج دیا تھا۔ شام کو جب وہ واپس گھر آ رہا تھا تب سارا کے بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ گیٹ کو درست کر دیا گیا تھا اور لیٹر بکس بھی اپنی جگہ لگا دیا گیا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور کار کی رفتار تیز کر دی۔

دو تین دن گزرے تھے۔ سارا بہت بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس راز سے پردہ نہیں اٹھا تھا کہ اسے وہ خط لکھنے والا کون تھا۔ اس دن اس نے لیٹر بکس کھولا تو وہاں خط پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے لفافہ اٹھایا اور اپنے کمرے میں آگئی خط کھولا تو اس میں لکھا تھا۔

پیاری سارا! تم نے شاید میرے پہلے خط کو مذاق سمجھا ہوگا لیکن یہ مذاق نہیں ہے۔ میں اپنے دلی جذبات ہر صورت تم تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے خط لکھنے پر مجبور ہوں کیونکہ تم سے رابطے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ نہ تم کسی سے ملتی ہو نہ سامنے آتی ہو۔ نہ جانے یہ خط تم تک پہنچ بھی رہے ہیں یا نہیں۔ لیکن پھر بھی میں تمہیں خط لکھتا رہوں گا۔ جب تک تمہیں میری محبت پر یقین نہ آ جائے۔ تم سوچ رہی ہوگی کہ اتنے عرصے میں میں نے تم سے رابطہ کیوں نہیں کیا تو سنو۔ میں یہاں نہیں تھا۔ لیکن اس تمام عرصے میں میں تمہیں ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں بھول سکا اور اس تمام عرصے میں دل نے بہت کہا کہ تمہیں دل کی بات بتادوں مگر ہر بار رک گیا۔ یہ سوچ کر کہ تمہاری شادی ہوگئی ہوگی۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ تم نے ابھی تک شادی نہیں کی لیکن یہ پتا نہیں چلا کہ تم نے شادی کیوں نہیں کی۔ بہرحال اب میں خود کو روک نہیں پایا۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پچھلے طویل عرصے میں صرف اور صرف تم میرے خیالوں میں رہی ہو۔ میں تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ تمہاری وہ خوب صورت آنکھیں ریشمی زلفیں اور دلکش سراپا آج بھی میری آنکھوں میں مجسم نظر آتا ہے۔ پیاری سارا میں آج بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جیسے پہلے کرتا تھا۔

صرف تمہارا............

خط پڑھ کر وہ گم صم سی ہوگئی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی سانسوں کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ کمرے میں اسے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اٹھی اور تمام کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے۔ وہ پھر کرسی پر آ بیٹھی اور ایک بار پھر خط پڑھنے لگی۔ وہ خط اس نے سیکڑوں بار پڑھ ڈالا تھا۔ وہ اٹھی اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے برش اٹھایا اور بال سنوارنے لگی۔ کھڑکی سے در آنے والی سنہری دھوپ میں اس کے عارض چمک رہے تھے۔

"وہ کون تھا؟ اس نے کب اور کہاں سارا کو دیکھا تھا۔" سوچ سوچ کر سارا کا ذہن تھک چکا تھا۔ اگر یہ مذاق تھا تو اتنا سنگین مذاق کون کر سکتا تھا؟ اور اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ سوال تھے جس کے سارا کے پاس کوئی جواب نہیں تھے۔

ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ وہ روز ہی لیٹر بکس دیکھ رہی تھی مگر وہ خالی تھا۔ کوئی خط نہیں آیا تھا۔ اس نے آس پاس بھی نظر رکھی ہوئی تھی اور تو اور راتوں کو اٹھ کر بھی وہ کھڑکی سے نیچے جھانکتی رہتی تاکہ خط لیٹر بکس میں ڈالتے ہوئے وہ اس شخص کو پکڑ سکے۔ جس نے اس کا چین وسکون برباد کر دیا تھا۔ اس دن لیٹر بکس بند کر کے پلٹی تو دیکھا سامنے بلال اور جنید غالباً کالج سے آ رہے تھے۔ وہ اسے گیٹ پر دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

"یار سارا اتنی بری بھی نہیں۔ اچھی خاصی خوب صورت ہے اگر اسے ڈھنگ کا لباس پہنا دیا جائے اور ہلکا سا میک

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اپ کردیا جائے تو بہت پیاری لگے گی۔"

"ہاں کہتا تو ٹھیک ہے۔ نہ جانے وہ ایسا حلیہ کیوں بنائے رکھتی ہے۔" بلال نے کہا۔

"او کے بلال شام کو ملتے ہیں۔" جنید نے بلال سے ہاتھ ملایا اور اپنے گھر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ بلال نے سر ہلایا اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

"اگلے دن سارا نے لیٹر بکس کھولا تو خط وہاں موجود تھا۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس پورے ہفتے اس نے کڑی نگرانی کی تھی مگر خط رکھنے والے کو پکڑ نہیں سکی تھی۔ نہ جانے اس شخص نے کب وہ خط وہاں رکھا تھا۔ بہر حال وہ وہیں پرندوں کے پنجروں کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی اور بے تابی سے خط کھولا۔ اور پڑھنے لگی لکھا تھا۔

پیاری سارا...... تمہیں یک طرفہ خطوط لکھنا پاگل پن نہیں تو کیا ہے۔ مگر میں پھر بھی لکھتا رہتا ہوں اور تمہیں سوچتا رہتا ہوں۔ میں اکثر خود سے سوال کرتا ہوں کہ اگر تم مجھے مل گئی ہوتیں اور ہماری شادی ہوجاتی تو ہماری زندگی کیسی ہوتی اور میرا دل جواب دیتا ہے بہت خوب صورت۔ دراصل زندگی تو وہی ہوتی جو تمہارے ساتھ گزرتی یہ بھی کوئی زندگی ہے ویران اور اداس۔

میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں سارا کہ میں تم سے بہت قریب ہوں اتنا کہ جب چاہوں تمہارے سامنے آسکتا ہوں مگر ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم یہ نہ کہہ دو کہ تمہاری زندگی میں اب میری کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نے ایک طویل عرصہ صرف تمہاری یادوں کے سہارے گزارا ہے۔ اور اب میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا اور دنیا بھر کی خوشیاں میں تمہارے قدموں میں ڈھیر کردینا چاہتا ہوں۔ تمہارے حسین چہرے کی وہ پیاری مسکان آج بھی میرے خیالوں میں موجود ہے۔ میرا چہرہ تو شاید تمہیں یاد بھی نہیں ہوگا۔

تمہارا......

سارا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خط تہہ کرکے لفافے میں ڈال دیا اور کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا دیا۔ اس کی نظریں دور خلاؤں میں کچھ تلاش کررہی تھیں۔ زینب جو نہ جانے کب وہاں آئی تھی اسے جو یوں بیٹھے دیکھا تو چونک گئی پھر پرندوں کو دانا ڈالنے کے لیے پنجروں کی جانب بڑھی۔ کافی دیر گزر گئی تھی۔ سارا اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ زینب پنجروں کی صفائی وغیرہ کرکے واپس پلٹی اور اس کے سامنے سے گزری تو سارا اپنے خیالات سے چونکی اور اس کی طرف دیکھا جو سر جھکائے اندر کی سمت جارہی تھی۔ سارا نے آواز دی۔

"زینب۔"

"جی۔" وہ اس کے قریب چلی آئی۔

"تم نے کسی کو بنگلے کے آس پاس منڈلاتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں......" اس نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"ہاں ایک دو بار ڈاکٹر رضا کو ہمارے بنگلے کے سامنے کھڑے دیکھا ہے۔ وہ اکثر رات میں وہاں کھڑا آپ کے کمرے کی کھڑکی کو تکتا رہتا ہے۔"

"اچھا......" اس نے حیرت سے کہا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

وہ کچھ دیر وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ رضا سے اس کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ ہاں اسے یہ یاد تھا کہ رضا کی والدہ کافی عرصے پہلے اس کے رشتے کے سلسلے میں اس کے گھر آئی تھیں۔ مگر پھر کیا ہوا تھا اور اس کے چچا نے کیوں انکار کیا تھا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

"تو وہ تم ہو ڈاکٹر رضا۔" اس نے دھیرے سے کہا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور اس خط کو باقی خطوط کے ساتھ ٹیبل پر ڈال دیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ دیر تک آئینے میں اپنے عکس کو تنقیدی نظروں سے دیکھتی رہی پھر نہ جانے دل میں کیا آیا کہ الماری کے قریب آئی اسے کھولا اور اپنے ملبوسات دیکھنے لگی۔ جو برسوں سے وہاں رکھے تھے۔ اس نے ایک ایک کرکے ہینگر باہر نکالے اور بیڈ پر ڈھیر کردیئے۔ سارے لباس آؤٹ آف فیشن ہوچکے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور سرخ لباس اٹھالیا۔ آئینے کے سامنے آئی اور لباس خود سے لگا کر آئینے میں دیکھا۔ کمرے کی محدود روشنی میں لباس کی سرخی اس کے رخساروں پر جھلملا رہی تھی۔ وہ اپنے عکس کو محویت سے دیکھ رہی تھی۔ ایسے جیسے وہ اپنے آپ کو نہیں بلکہ کسی اجنبی لڑکی کو دیکھ رہی ہو اور پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ ادھ کھلی کھڑکی سے خنک ہوائیں اس کے ریشمی بالوں سے کھیل رہی تھیں۔ وہ مسکرادی۔

جنید اور بلال جنید کے گھر کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے جب بلال کی نظر بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی سارا پر پڑی تھی جو تیز قدموں سے چلتی کہیں جا رہی تھی۔

"ارے یہ کہاں جا رہی ہے؟" بلال نے حیرت سے کہا۔ جنید کی پشت سارا کی جانب ہونے کی وجہ سے وہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔

"کون؟" وہ تیزی سے پلٹا اور سارا کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

"کسی کام سے جا رہی ہوگی۔" جنید نے کہا۔

"لیکن یہ تو کبھی گھر سے نکلتی ہی نہیں تو پھر آج کیسے؟"

"جانے دے یار ہمیں کیا۔" جنید نے کہا پھر دور تک ان کی حیرت بھری نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ سارا کے قدم لمحے بھر کے لیے ڈاکٹر رضا کے گھر کے سامنے رکے اس نے ایک نظر سر اٹھا کر اس کے گھر کی سمت دیکھا پھر آگے بڑھ گئی۔

وہ ایک طویل عرصے کے بعد کھلی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ سب کچھ اسے عجیب لگ رہا تھا۔ ہر نظر اسے اپنی جانب گھورتی نظر آ رہی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی مگر تیز قدموں سے چلتی وہاں سے دور نکل آئی تھی۔

یہ ایک بہت بڑا اور مشہور شاپنگ مال تھا۔ جہاں وہ بڑے عرصے کے بعد شاپنگ کے لیے آئی تھی۔ وہ اپنے لیے کپڑے خریدنے ایک بوتیک میں گھسی اور کچھ دیر کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ اسے دیکھ کر ایک سیلز گرل اس کی طرف بڑھی۔

"مے آئی ہیلپ یو میڈم؟" لڑکی نے کہا۔

"مجھے اپنے لیے کچھ ڈریسز چاہئیں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"آئیں میرے ساتھ۔" لڑکی کی رہنمائی میں اس نے کچھ ڈریس پسند کیے تھے۔

"آپ چاہیں تو چینجنگ روم میں جا کر چیک کر سکتی ہیں۔" لڑکی نے کہا تو ایک ڈریس اٹھا کر وہ چینجنگ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد نیا ڈریس پہنے باہر لگے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود کو تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔ بہترین تراش کے یہ لباس اس پر سج گیا تھا۔

"میڈم آپ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں۔" لڑکی نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ سارا نے چونک کر اسے دیکھا۔ کتنی مہربان تھی وہ لڑکی اور کتنا احترام تھا اس کے لہجے میں۔ یہ وہ دنیا تو نہیں تھی جو اس نے سوچی تھی۔

یہاں سے اس نے تین چار لباس خریدے تھے۔ وہاں سے نکل کر وہ ایک بیوٹی پارلر میں چلی گئی۔ جہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ وہ ہر ایک کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ سب اس کی مدد کر رہی تھیں اور اس کا حلیہ سدھارنے میں جتی ہوئی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ایک مختلف سارا ان کے سامنے تھی۔ برسوں کی بے توجہی نے جس حسن کو گہنا دیا تھا وہ اب دمک رہا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔ سب کچھ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس دن اس نے ڈھیروں شاپنگ کر ڈالی تھی۔ اس شاپنگ مال میں آئے اسے کئی گھنٹے گزر گئے تھے اور اسے زوردار بھوک لگی تھی۔ وہ اسی شاپنگ مال میں واقع ایک ریسٹورنٹ میں آ گئی اور ڈٹ کر کھانا کھایا۔ پھر ویٹر کو بل ادا کر کے شاپنگ بیگز اٹھائے اور باہر نکل آئی۔

وہ شاپنگ مال کے باہر کھڑی سواری کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ جب اس کی نظر اس ویٹر لڑکے پر پڑی جسے کچھ دیر پہلے وہ ریسٹورنٹ میں دیکھ چکی تھی وہ لڑکا دوڑتا ہوا اس کی جانب آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئی تھی نہ جانے وہ کس ارادے سے آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کے نزدیک آ گیا اور اس کا پرس آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میڈم آپ اپنا پرس ٹیبل پر بھول آئی تھیں۔" اس نے پرس تھاما اور کھول کر دیکھا۔ پرس نوٹوں سے بھرا ہوا تھا اس نے کچھ نوٹ نکالے اور ویٹر کی طرف بڑھائے۔

"نہیں جی یہ میں نہیں لے سکتا۔" لڑکا جلدی سے بولا۔

"رکھو یہ میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں۔" اس نے نوٹ اس کے ہاتھ میں پکڑائے جو اس نے تھام لیے تھے۔ یہ دنیا اتنی ڈراؤنی نہیں تھی جتنا وہ سمجھتی تھی۔ پھر وہ کس دنیا میں جی رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں کی قید سے اسے آزادی مل گئی ہو۔

اس دن جنید اور بلال کالج سے واپس آ رہے تھے۔ جب سارا کے بنگلے کے سامنے سے گزرے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بنگلے کے سارے دروازے اور کھڑکیاں

کھلی ہوئی تھیں اور لان میں ایک جانب گھر کا سامان ڈھیر تھا۔ جنید ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ سامان کے قریب زینب کھڑی ہوئی تھی۔

"چل بھائی رک کیوں گیا۔" بلال نے کہا تو جنید بولا تو جا میں ذرا پتہ کر کے آتا ہوں سارا نے گھر کا سامان باہر کیوں نکالا ہے۔ بلال بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ جنید کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

"سارا میڈم کہیں شفٹ ہو رہی ہیں کیا؟ یہ سامان یہاں کیوں نکالا ہے؟" جنید نے زینب کے قریب آ کر استفسار کیا۔

"کیوں تمہیں کیا مطلب کچھ خریدنا ہے تو بولو۔ نہیں تو جاؤ یہاں سے۔" زینب بولی۔

"سارا میڈم کہاں ہے؟" وہ اندر جاتے ہوئے بولا۔

"سنو کہاں جا رہے ہو؟ تم اندر نہیں جا سکتے۔" زینب اس کے پیچھے لپکی لیکن اس نے زینب کی ایک نہیں سنی اور تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔ اسی وقت سارا سیڑھیاں اترتی ہال میں آ گئی۔ جہاں جنید کھڑا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ سارا تو نہیں تھی جسے کچھ عرصے پہلے جنید نے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بلیک اور ایڈ کنٹراسٹ کے سوٹ میں انتہائی خوب صورت لگ رہی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"آپ کہیں جا رہی ہیں کیا؟" جنید نے پوچھا۔

"باہر سامان؟"

"نہیں...... کچھ کاٹھ کباڑ نکالا ہے۔" سارا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" اس نے اطمینان کی سانس لی اور تیزی سے واپس پلٹ کر باہر نکل گیا۔ وہ حیرانی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

دو تین دن گزرے تھے کہ اس دن صبح سویرے زینب نے وہ خط اسے لا کر دیا تھا۔ خط دیکھ کر اسے ایک انجانی سی خوشی ہوئی تھی۔ ان خطوط نے تو اس کی دنیا ہی بدل دی تھی وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ انہیں وہ بار بار پڑھتی تھی۔ زینب کے جاتے ہی اس نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا اور خط پر نظریں دوڑانے لگی۔

سارا...... میں نہیں جانتا کہ تمہیں خط لکھنا چاہئے یا نہیں مگر ہر بار میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہوں۔ بہت دل کو سمجھاتا ہوں مگر یہ نہیں مانتا۔ تنہا زندگی گزارنا آسان نہیں ہے۔ نہ جانے تم کیسے یہ زندگی گزار رہی ہوگی۔ بہرحال تم اس دنیا میں ہو اور یہ دنیا خوشی اور محبت سب تمہارے سامنے بانہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔ بس انہیں آزمانے کی دیر ہے۔ سارا میں تم سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا بغیر کسی وجہ کے اور بغیر کسی مقصد کے۔ تم اس وقت بھی میرے خیالوں میں ہو اور سنہری دھوپ نے تمہیں اپنی بانہوں میں جکڑ رکھا ہے یہ دھوپ نہیں میرا وجود ہے سارا۔

صرف تمہارا......

وہ خط پڑھنے میں محو تھی اور ایک خوب صورت مسکان اس کے ہونٹوں پر بھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھی اور کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ سامنے اپنے کمرے کی کھڑکی میں جنید کھڑا تھا۔ سارا کو اپنی جانب دیکھتے پا کر اس نے ہاتھ لہرایا تھا۔ سارا نے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ لہرایا۔

جنید کے ایگزام ہو رہے تھے اور وہ بری طرح پڑھائی میں مصروف تھا۔ اس دن وہ پیپر کی تیاری کر رہا تھا اس کی امی کھڑکی میں کھڑی باہر جھانک رہی تھیں وہ اچانک بولیں۔

"یہ سارا کی کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ لگتا ہے اس نے گوشہ نشینی ترک کر دی۔ میں نے اکثر اسے شام کو باہر ٹہلتے دیکھا ہے۔ اس وقت بھی شاید سیر کے لیے نکلی ہے۔" یہ سنتے ہی وہ اچھل کر بیڈ سے اترا اور کھڑکی کے نزدیک آ گیا۔ ان دونوں کی نگاہیں سارا پر مرکوز تھیں جو سڑک پر خراماں خراماں چلی جا رہی تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹا اس کا گورا چہرہ چمک رہا تھا اور سفید اور نازک ہاتھ بتا رہے تھے کہ وہ ایک خوب صورت دوشیزہ کے ہاتھ ہیں۔

ڈاکٹر رضا جو غالباً اس وقت واک کے لیے نکلا تھا۔ اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظریں سارا کے حسین چہرے پر گئیں وہ ایک ساعت کے لیے سانس لینا بھول گیا۔ گلابی چہرہ گلاب کی پتیوں جیسے نازک ہونٹ ستواں ناک بڑی بڑی کٹورہ سی آنکھیں وہ آنکھیں رضا کو دیکھ رہی تھیں اور رضا انہیں دیکھ رہا تھا۔

آج اس نے اتنے طویل عرصے کے بعد سارا کو دیکھا تھا۔ پہلے اس نے جس سارا کو دیکھا تھا وہ تھوڑے بہت فرق

کے ساتھ وہی تھی۔ اب بھی اس کے چہرے سے وہی بھولا بسرا چہرہ جھانک رہا تھا۔ وہ نزاکت اور شگفتگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ اس کے جسم کی شادابیاں آج بھی برقرار تھیں۔ وہ پتھر کی طرح ساکت ہو گیا تھا۔ سارا ایک لمحہ کے لیے اس کے سامنے رکی تھی۔ پھر آہستہ قدموں سے چلتی آگے بڑھ گئی۔ کچھ دور جا کر نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا کہ وہ واپس پلٹی اور آہستہ قدموں سے چلتی اپنے گھر کی سمت بڑھی۔ چلتے چلتے وہ رضا کے سامنے رک گئی اور الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں کئی سوال تھے۔ رضا سحر زدہ سا اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ سارا نے نظریں جھکائیں اور آگے بڑھ گئی۔ اور رضا بت بنا وہیں کھڑا اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ اس واقعے کے اگلے دن سارا کو اس کا وہ خط موصول ہوا جو اس کا آخری خط تھا۔

پیاری سارا! یہ میرا آخری خط ہے جو تم تک پہنچے گا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری محبت قبول کر لی ہے۔ مجھے اپنی محبت پر بھروسہ ہے کیونکہ یہ دل کا رشتہ ہے۔ احساس کا رشتہ ہے۔ اسے کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ اور پیاری سارا جب بھی تم خود کو اکیلا پاؤ تو گھبرانا نہیں اور نہ ہی اداس ہونا بس مجھے سوچنا تم ہمیشہ مجھے خود کے قریب پاؤ گی۔

ہمیشہ کے لیے تمہارا..........ا

پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ سارا نے محلے میں میل ملاقاتیں شروع کر دی تھیں۔ رضا سے بھی وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جنید ہائیر اسٹڈیز کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تھا۔

وہ پانچ سال بعد وطن واپس آیا تھا۔ اٹھارہ سالہ کھلنڈرے لڑکے سے جنید ایک خوبرو نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایئر پورٹ پر اس کی امی اسے لینے آئی تھیں جو پہلے سے کچھ کمزور ہو گئی تھیں۔ انہوں نے بڑھ کر اسے گلے لگایا تھا وہ اپنے گھر کی جانب جا رہے تھے اور جب وہ اپنے محلے میں داخل ہوئے تو جنید کو سب بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ جہاں سیارا کا ویران بنگلہ تھا وہاں اب ایک شاندار عمارت کھڑی تھی۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''سارا نے اپنا مکان بنوایا ہے امی۔'' جنید نے پوچھا۔

''نہیں اس نے اپنا بنگلہ فروخت کر دیا تھا۔ اب یہاں کوئی اور فیملی رہتی ہے۔''

''کیا کب؟'' جنید چونکا۔

''تمہارے جانے کے ایک سال بعد...... جاتے ہوئے وہ کسی سے مل کر بھی نہیں گئی۔ کسی کو اس کے بارے میں کچھ نہیں پتا کہ وہ کہاں گئی؟''

''اس نے شادی نہیں کی؟ وہ تو ٹھیک ہو گئی تھی اور سب سے ملنے جلنے لگی تھی۔'' جنید نے کہا۔

''نہیں شادی تو نہیں کی تھی اس نے...... اور ہاں ڈاکٹر رضا بھی تو چلے گئے۔ انہوں نے بھی اپنا مکان فروخت کر دیا تھا بلکہ سارا سے پہلے ہی وہ یہاں سے چلے گئے تھے۔ شاید بیرون ملک ہی چلے گئے ہوں گے۔'' انہوں نے خیال ظاہر کیا۔ یہ سب سن کر وہ ازحد پریشان ہو گیا تھا۔

''ارے تمہیں کیا ہوا کیوں پریشان ہو گئے۔'' اس کے چہرے پر چھائی پریشانی کی تحریر دیکھ کر اس کی امی نے کہا۔

''اسے کسی نے تلاش نہیں کیا؟'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''کون کرتا اس کا دنیا میں ہے ہی کون؟'' گھر آ گیا تھا۔ جہاں سب اہل خانہ اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

وہ بہت بے چین تھا اور سارا کو بے قراری سے تلاش کر رہا تھا۔ ہر اس جگہ اس نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جہاں امکان ہو سکتا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے اسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو۔

اس کی زندگی کا واحد مقصد یہ رہ گیا تھا کہ سارا کو تلاش کرے اور جانے کہ وہ کس حال میں ہے۔ زندہ بھی ہے یا...... خدانہ کرے۔ اس نے دل میں آئے اس خیال کو رد کیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس نے سارا کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اس نے اسے محبت بھرے خطوط لکھے تھے اس وقت تو اسے پتا بھی نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے اور اب جب وہ سمجھ سکتا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے اور کسی پر بھروسہ کرنا کیا ہوتا ہے انتظار کیا ہوتا ہے تو یہ بھی سمجھ میں آیا تھا کہ بھروسہ ٹوٹنے پر کیا گزرتی ہے اور دل کا ٹوٹنا کیا ہوتا ہے۔ وہ خط سارا کے لیے کیا تھے اسے اب احساس ہو رہا تھا۔

"یہ میں نے کیا کیا اس کے ساتھ؟" اس نے سوچا۔ وہ ان دنوں اسے سوشل میڈیا پر تلاش کر رہا تھا۔ وہ تو نہیں ملی تھی مگر اس کے والد کے ایڈووکیٹ دوست مبین ملک مل گئے تھے۔ ان سے اس کی بات چیت ہوئی اور ان کا ایڈریس ملا تو دوسرے ہی دن وہ ان سے ملنے پہنچ گیا۔
مبین ملک ان دنوں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ جب اس نے انہیں اپنے وہاں آنے کا مقصد بتایا تو وہ بولے۔
"بھئی میں سارا کی اجازت کے بغیر اس کا ایڈریس اور رابطہ نمبر تو تمہیں نہیں بتا سکتا مگر اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہارا رابطہ نمبر اس تک پہنچا دوں۔" یہ سن کر اسے قدرے اطمینان ہوا تھا کہ وہ ٹھیک ہے اور اسی شہر میں کہیں رہتی ہے۔ اس نے اپنا موبائل نمبر وغیرہ ایک چٹ پر لکھ کر دے دیا تھا اور وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔
کئی دن گزر چکے تھے مگر وہ فون کال نہیں آئی تھی جس کا وہ شدت سے منتظر تھا۔ پھر کئی ہفتے گزر گئے سارا کا فون نہیں آیا اور اب تو وہ مایوس ہو چلا تھا کہ اس دن اچانک اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔
"ہیلو...... کون ہیں آپ؟" ایک اجنبی نسواں آواز نے اسے چونکا دیا۔
"مم...... میں...... آپ کون بول رہی ہیں؟"
"سارا نے نمبر کنفرم کیا۔ آپ اس نمبر سے بات کر رہے ہیں؟"
"جی۔"
"کون ہیں آپ؟"
"آپ بتائیں محترمہ کال آپ نے کی ہے۔"
"میں وہی ہوں جسے آپ تلاش کر رہے ہیں۔ مبین ملک صاحب نے مجھے یہ نمبر دیا تھا۔ کیا میں جان سکتی ہوں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔
"میں جنید......"
"اوہ جو جو تم......؟" پھر دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے اور سارا نے اسے اپنے گھر انوائیٹ کیا تھا۔
اگلے دن وہ سارا کے بے حد شاندار بنگلے میں جو شہر کے ایک پوش ایریا میں واقع تھا ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ گلابی لباس میں اپنے گلابی وجود کے ساتھ وہ بہت خوب صورت اور باوقار لگ رہی تھی۔ اس کے استفسار پر وہ اپنی روداد سنا رہی تھی۔
"یقین کرو جنید ان خوب صورت خطوط نے مجھے میرے ہونے کا احساس دلایا تھا اور میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔" سارا نے کہا۔ اسی وقت ایک تین چار سال کا خوب صورت سا بچہ دوڑتا ہوا اندر آیا اور ممی کہتا ہوا سارا سے لپٹ گیا۔
"انکل سے ہاتھ ملاؤ سمیر۔" سارا نے بچے سے کہا۔
"یہ میرا بیٹا ہے۔"
"کہاں ہو سارا کون آیا ہے؟" ڈاکٹر رضا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔
"یہ میرے ہزبینڈ ہیں رضا۔ تم تو انہیں جانتے ہو۔"
"ارے جنید آیا ہے۔" وہ آگے بڑھے اور اس سے بغل گیر ہو گئے۔
"تو آپ کو وہ مل گیا۔" جنید نے سارا سے کہا۔
"خط لکھنے والا تو نہیں ملا مگر محبت مل گئی۔" سارا نے رضا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو محبت پاش نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"بھئی میں تو اس شخص کا شکر گزار ہوں جس نے سارا کو وہ خطوط لکھے تھے۔ ورنہ یہ قیدیوں جیسی زندگی گزارتی رہتی اور مجھے کبھی نہ ملتی۔ کیوں سارا؟"
اور جنید سوچ رہا تھا۔ آپ کو وہ کبھی نہیں ملے گا۔ اس کا اس دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ کیونکہ اسے تو اس نے اپنے خیالوں میں تخلیق کیا تھا۔
"لیکن تم بتاؤ مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟" سارا نے کہا تو وہ گڑبڑا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔
"اپنی شادی پر آپ لوگوں کو انوائیٹ کرنا تھا۔" دونوں نے اسے مبارک باد دی تھی اور جنید نے ان کے خوشیوں سے سرشار چہروں کو دیکھ کر اطمینان کی سانس لی تھی۔

❁

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

صداقت حسین ساجد

وہ ایک ادیب تھا اس کا موضوع پر اسرار واقعات تھے اس کے ناول ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے تھے پھر ایک دن وہ اپنی انہی پر اسرار کہانیوں کا کردار بن گیا۔

رات کی تاریکی میں ایک الو کی گول گول آنکھیں گھور گھور کر اس کھنڈر کو دیکھ رہی تھیں، جس میں اس وقت وہ موجود تھا۔ بھورے رنگ کا یہ الو ایک سوکھے ہوئے ٹنڈ منڈ درخت کی ٹہنی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی چونچ لمبی تھی اور مڑی ہوئی تھی۔ چونچ کا آخری حصہ کسی چاقو کی طرح نوک دار تھا۔ الو رات کو جاگتا ہے اور دن کو سوتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں بھی وہ ہر طرف آسانی سے دیکھ لیتا ہے۔ اس وقت اس کی نگاہوں کا مرکز وہ آدمی تھا، جو اس درخت کے تنے سے اپنی کمر لگائے زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ایک طرف چارجنگ والی لائٹ پڑی تھی۔ اس کی روشنی اب ختم ہونے کو تھی۔ آدمی کے ہاتھ میں ایک قلم اور ایک کلپ بورڈ تھا، جس میں بہت سے کاغذ لگے ہوئے تھے۔ ان کاغذوں پر کچھ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جب تک چارجنگ لائٹ کی روشنی رہی تھی، وہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہا تھا، لیکن جوں ہی روشنی ختم ہوئی، اس نے لکھنا بند کر دیا تھا۔ اب جب اس نے روشنی مدھم پڑتے دیکھی، تو ایک سرد آہ بھر کر قلم اور کلپ بورڈ چارجنگ لائٹ کے پاس رکھ دیے اور دور کہیں گھورتے ہوئے اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔

اس کا نام ارشان تھا۔ وہ اصل میں ایک ادیب تھا اور ملک کا مشہور و معروف خوف ناک ادب لکھنے والا ادیب۔ ہر ماہ اس کا کم سے کم ایک ناول چھپ کر بازار میں آ جاتا تھا، جو فوراً ہی بڑی تعداد میں بک جاتا تھا۔ ہاتھوں ہاتھ بکنا اس کے لیے حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ اس کے ناولوں کے مرکزی خیال ہمیشہ بہت ہی عجیب و غریب ہوا کرتے تھے۔ ناولوں کے خیالات کی طرح اس کی اپنی عادتیں بھی بہت عجیب تھیں۔ اس کی سب سے عجیب عادت تو یہ تھی کہ وہ اس کھنڈر میں آ کر لکھتا تھا۔ اصل میں اسے اس کھنڈر کا اجاڑ پن اور ویرانی بہت پسند تھی۔

ہر روز جوں ہی رات کے بارہ بجتے، وہ اس کھنڈر کی طرف پیدل چل پڑتا۔ درخت کے اوپر بیٹھا ہوا الو اس کا دوست تھا، جو اس نے پال رکھا تھا۔ اس الو کے علاوہ اس دنیا میں اس کا کوئی اور نہیں تھا۔ اس نے الو کا نام 'مونی' رکھا ہوا تھا۔ پورا دن مونی گھر کے کسی کونے کھدرے میں دبک کر پڑا رہتا۔ رات کو جب ارشان اس کھنڈر کی طرف آنے لگتا، تو مونی بھی خود بخود اس کے ساتھ ہو لیتا۔ اس سفر کے دوران میں وہ ارشان کے کندھے پر بیٹھا رہتا یا پھر اس کے سر کے اوپر ہی پرواز کرتا رہتا۔ کھنڈر میں پہنچنے پر ارشان اس واحد درخت کے تنے سے کمر لگا کر زمین پر بیٹھ جاتا۔ چارجنگ لائٹ روشن کر دیتا اور لکھنا شروع کر دیتا، جب کہ مونی کھنڈر میں آوارہ گردی کرنے لگتا۔ اس دوران میں وہ اپنے لیے کوئی نہ کوئی شکار بھی ڈھونڈ لیتا تھا۔ اس کی آواز بہت بھیانک تھی۔ جب وہ اپنی مکروہ آواز میں چیختا، تو کھنڈر کا ماحول اسے اور بھی بھیانک بنا دیتا تھا۔ ایسے ماحول میں اس الو کی کرخت اور مکروہ آواز ارشان کے علاوہ کسی اور میں سننے میں ہمت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ کھنڈر شہر سے باہر ایک گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی عمارت بے حد پر اسرار دکھائی دیتی تھی۔ جگہ جگہ مکڑیوں کے جالے بنے ہوئے تھے۔ عمارت کی چھتوں سے ان گنت چمگادڑیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں اور بہت سے عجیب و غریب قسم کے کیڑے مکوڑے زمین پر رینگتے پھرتے تھے۔

پتوں سے خالی یہ درخت بھی اس کی وحشت میں اضافہ کر رہا تھا۔

یہاں تو کسی میں دن میں آنے کا حوصلہ نہیں تھا، لیکن ارشان کو یہ ماحول بہت پسند تھا۔ بڑی بڑی زہریلی مکڑیوں کو دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے، نہ چمگادڑیں اسے ڈرا سکتی تھیں۔ اسے ان کیڑے مکوڑوں سے بھی کراہیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ اس کے اردگرد موجود ہوتا تھا، لیکن وہ ان سب سے بے نیاز ہو کر لکھتا چلا جا رہا ہوتا تھا۔ وہ اس لیے بھی مطمئن ہوتا تھا، کیوں کہ اسے پتا ہوتا تھا کہ اس کا دوست مونی اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ یہ حقیقت بھی تھی، کیوں کہ جیسے ہی کوئی کیڑا مکوڑا یا کوئی زہریلی مکڑی اس کی طرف بڑھتی، مونی تیر کی طرح اس پر جھپٹتا اور اسے ہڑپ کر جاتا۔ ارشان تب تک لکھتا رہتا، جب تک دن کا اجالا نہ ہو جاتا۔

آج اتفاق سے چارجنگ لائٹ کی چارجنگ جلد ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس کھنڈر میں صرف چارجنگ لائٹ ہی رات کے گھپ اندھیرے میں روشنی کا سبب بنتی تھی۔ اب تو اس کی روشنی بالکل ختم ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہر طرف بھیانک تاریکی چھا گئی تھی۔ اس نے کلپ بورڈ اور قلم نیچے رکھے اور انگڑائی لے کر بولا۔

"یہ اچھا ہی ہوا کہ چارجنگ جلد ختم ہو گئی...... آج زیادہ لکھنے کو دل بھی نہیں کر رہا تھا۔"

پھر وہ مونی سے مخاطب ہوا۔

"کیوں بھئی مونی! چلیں...... آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

اس کی بات سن کر مونی نے اپنی آنکھیں یوں جھپکیں، جیسے اس کی بات سمجھ گیا ہو۔ پھر اس نے ایک تیز آواز نکالی اور درخت کی ٹہنی چھوڑ دی۔

"اووووو......"

ارشان بھی چارجنگ لائٹ، کلپ بورڈ اور قلم لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ اس دوران میں اس کی یہی عادت رہی۔

پچھلے کئی دنوں سے ارشان کو کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کا دوست مونی جس سے دوسرے سب خوف کھاتے تھے، اب ارشان بھی اس سے ڈرنے لگا تھا۔ مونی جب اپنی گول گول آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا، تو ارشان کے جسم میں خوف کی ایک سرد سی لہر سرائیت کر جاتی۔ اب تو اسے اس کی آواز سن کر یوں لگتا تھا، جیسے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اسے اپنی اس عجیب و غریب تبدیلی پر بہت حیرت ہوتی تھی۔ وہ حیران تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، لیکن اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟" یہ سوال اس نے کئی بار خود سے کیا۔ "میں مونی سے کیوں ڈرنے لگا ہوں......؟ وہ ایک عرصے سے میرے ساتھ ہے اور میرا دوست ہے...... میں نے کبھی اس سے خوف نہیں کھایا، لیکن اب......"

لیکن اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

جب اس پر یہ خوف حد سے زیادہ سوار ہو گیا، تو اس نے کھنڈر جانا ہی چھوڑ دیا۔

اب مونی اس کے کندھے پر بیٹھتا، تو اسے یوں لگتا کہ وہ اپنے پنجوں سے اس کا کندھا ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ اسے اب کھنڈر کے ماحول سے خوف آنے لگا تھا۔ اب وہ یہ بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ جیسے مونی اپنے پنجوں اور چونچ سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالے گا اور کیڑے مکوڑے اس کی لاش کھا جائیں گے۔

ایک رات اس نے اپنے دماغ اور دل سے کھنڈر کا نامعلوم خوف جھٹکا اور مونی کے ساتھ کھنڈر کی طرف چل پڑا۔

وہاں جا کر اس نے چارجنگ لائٹ روشن کی اور اسی ٹنڈ منڈ درخت کے تنے کے ساتھ کمر لگا کر بیٹھ گیا اور لکھنے لگا۔ ابھی اسے وہاں آئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس پر خوف طاری ہو گیا۔ اس بار وہ اسے جھٹک نہ سکا۔ ارشان گھبرانے لگا۔ رات اور بھی خوف ناک سی ہو گئی تھی۔ ٹھنڈی تیز اور سرسراتی ہوئی ہوا چلنے لگی۔ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لگ یوں رہا تھا کہ آندھی آنے والی ہے۔

اچانک درخت کی ٹہنی پر بیٹھا مونی اڑا اور درخت کے چکر کاٹنے لگا۔ ارشان کو جانے کیوں یہ وہم ہونے لگا کہ وہ چکر کاٹتے کاٹتے اس پر جھپٹ پڑے گا۔ اچانک ارشان کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے فوراً زور سے اپنی گردن نفی میں ہلا دی۔

"نن...... نن...... نہیں...... نہیں...... مجھے یوں نہیں کرنا چاہیے...... مونی میرا اب سے بہترین دوست ہے...... میں اسے کیسے مار سکتا ہوں؟"

لیکن اس کا ان جانا ڈر اور خوف اس پر مسلط ہو گیا۔ لمحوں ہی میں یہ سفاک خیال اتنا پختہ ہو گیا کہ ارشان نے اسے مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کیا۔ دوسرے ہی لمحے مونی اس کی کلائی پر آ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں جھپکا کر محبت بھری نظروں سے ارشان کو تکنے لگا۔ ارشان دائیں ہاتھ سے اس کی گردن اور کمر سہلانے لگا۔ ارشان کا شفقت بھرا انداز محسوس کر کے مونی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سہلاتے سہلاتے ارشان کا ہاتھ اس کی گردن پر آ کر رک گیا اور فوراً ہی اس نے سختی سے اس کی گردن دبوچ لی۔ مونی نے سٹپٹا کر اپنی آنکھیں کھولیں، مگر ارشان کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی اور اب کا دباؤ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ مونی نے خود کو چھڑانا چاہا، مگر ناکام رہا۔ وہ ارشان کے ہاتھوں میں پھڑپھڑانے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکا۔ آخر وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ارشان نے اسے تب تک نہ چھوڑا، جب تک اسے یقین نہ ہو گیا کہ مونی مر چکا ہے۔ جب اس نے اسے دور پھینکا، تو یوں ہانپنے لگا، جیسے کافی دیر سے وہ کسی خونی درندے سے دو دو ہاتھ کرتا رہا ہو۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ اٹھ کر گھر جانے لگا، تو اس نے دیکھا کہ بہت سے کیڑے مکوڑے مونی کو گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ گھر آ کر وہ نیم گرم پانی سے نہایا اور سو گیا۔ جب وہ گھر آ رہا تھا، تو موسم ایک دم ٹھیک ہو گیا تھا۔ اسے راستے میں بار بار مونی کا خیال آ رہا تھا۔ کبھی اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا، تو کبھی اسے اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ اس منحوس الو سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ گئی ہے۔ جب اسے اطمینان محسوس ہوتا، تو اسے اس بات پر حیرت محسوس ہونے لگتی کہ اس نے اتنا عرصہ اس منحوس الو کے ساتھ کیسے گزارا۔ اس نے اس مکروہ صورت الو کو کیسے برداشت کر لیا؟

اگلی رات کی بات ہے کہ وہ گہری نیند سو رہا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے اپنے کمرے میں کسی پرندے کے پھڑپھڑانے کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، تو

ایک سفید الو دکھائی دیا، جو اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ ارشان کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ الو اس کی طرف بڑھا، مگر ارشان نے ساتھ والی میز پر پڑا گل دان اٹھایا اور کھینچ کر الو کو مارا۔ اس کا نشانہ درست لگا۔ گل دان الو کے سر پر لگا تھا اور وہاں سے خون بہنے لگا تھا، مگر الو کے انداز سے یوں لگ رہا تھا، جیسے اسے اس کی پروا ہی نہ ہو۔ اب تو وہ اور زیادہ تیزی سے اس کی طرف جھپٹا اور اپنی نوکیلی چونچ ارشان کے ماتھے پر ماری۔ اس نے جھک کر خود کو بچایا۔ اس کوشش میں ارشان کی نظر دوبارہ کھڑکی کی طرف پڑی، تو اس نے دیکھا کہ وہاں سے ایک اور الو اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ایک اور داخل ہوا۔ پھر تو یہ قطار بن گئی۔ ایک کے بعد ایک الو اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پورا کمرہ الوؤں سے بھر گیا۔ ان میں سفید، کالے، بھورے، بلکہ ہر رنگ کے الو شامل تھے۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ کمرے میں ذرا سی بھی جگہ نہ بچی۔ اس کے باوجود کھڑکی سے مزید الو اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

اب سب نے مل کر ارشان پر حملہ کر دیا۔ وہ کس کس سے خود کو بچاتا۔ سب اسے نوچنے کھسوٹنے لگے۔ پورا بستر خون سے بھر گیا اور آخر کار اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے بعد الوؤں نے اسے اپنے پنجوں میں جکڑا اور کھڑکی کے ذریعے باہر نکل گئے۔

وہ اس کی لاش لے کر ہوا میں اڑ رہے تھے اور پورے آسمان پر اب الو ہی الو دکھائی دے رہے تھے۔

الو ارشان کو لے کر کھنڈر میں پہنچے اور اسے نیچے پھینک دیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں بیٹھ کر وہ ناول لکھا کرتا تھا۔ جوں ہی لاش زمین پر گری، کھنڈر کے سارے کیڑے مکوڑے اس پر پل پڑے۔ چند لمحوں کے بعد وہاں ہڈیوں کا ایک ڈھانچا پڑا ہوا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مستقبل کا حال جاننا ہر شخص کا خواب ہوتا ہے دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو یہ جاننا نہ چاہے کہ کل کیا ہوگا سائنس آج بھی تجربوں میں مصروف ہے لیکن قرآن نے اس کو ثابت کیا ہے وقت کا سفر ممکن ہے۔
ایک شخص کی روداد اس نے ماضی کا سفر کیا تھا۔

خوب صورت تراشیدہ داڑھی سفید چشمہ لگائے صاف استری شدہ سفید کپڑوں میں ملبوس پروفیسر خالد شیخ طاہری نے لیکچر ختم کیا تو حسب معمول مسکرا کر کہا۔ ''کوئی سوال۔''

نصیر احمد نے کھڑے ہوکر پوچھا۔ ''سر کیا اسلامی نقطہ نگاہ سے ٹائم ٹریولنگ ممکن ہے؟''

''جی ہاں یہ ممکن ہے۔'' پروفیسر خالد شیخ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

پروفیسر خالد شیخ فزکس کے پروفیسر تھے ساتھ ساتھ انہیں دینی علوم پر بھی مکمل دسترس حاصل تھی۔ اسلام اور سائنس ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اپنے لیکچرز کے دوران وہ سائنسی اصول بیان کرتے اور پھر اسلامی نقطہ نظر سے اس کی تشریح کرتے چنانچہ اس نے کہنا شروع کیا۔

''قران کریم کے پارہ نمبر 15 میں اصحاب کہف کا ذکر ہے یہ چند نوجوان تھے جو شرک سے بیزار تھے۔ ایک ظالم مشرک بادشاہ سے بھاگ گئے اور ایک غار میں پناہ لی۔ آرام کی خاطر وہ سو گئے۔ جب بیدار ہوئے تو ان میں سے ایک نے سوال کیا کہ ہم یہاں کتنی دیر تک سوئے رہے کسی نے کہا ایک دن کسی نے کہا دن کا کچھ حصہ تھوڑی سی بحث کے بعد ان میں سے ایک کو کھانا خریدنے کے لیے بازار بھیجا گیا وہاں اس نے جب دکاندار کو سکے دیے تو وہ بہت حیران ہوا اس نے لوگوں کو جمع کر کے اسے پکڑا اور بادشاہ کے پاس لے گئے، وہاں اسے پتہ چلا کہ ظالم بادشاہ کو مرے ہوئے تین سو سال گزر گئے ہیں یعنی وہ اور اس کے ساتھی تین سو سال تک سوئے رہے۔

عزیز طالب علمو! اصحاب کہف جسمانی لحاظ سے بالکل بھی نہیں بدلے تھے جس حالت اور جس عمر میں وہ سو گئے تھے بالکل اسی حالت اور اسی عمر میں وہ بیدار ہوگئے یعنی اصحاب کہف کے لیے وقت بالکل رک چکا تھا جب کہ گردونواح کا وقت مسلسل چلتا رہا یہاں تک کہ تین سو سال گزر گئے۔

پورے کلاس پر اتنی گہری خاموشی چھائی تھی کہ اگر سوئی بھی گرے تو آواز آئے تمام طالب علم پروفیسر کی طرف ہمہ تن گوش تھے۔ پروفیسر نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گلا صاف کیا اور دوبارہ کہنا شروع کیا۔

قران کریم کے تیسرے پارے میں حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ مذکور ہے وہ جب ایک بستی سے گزر رہے تھے تو وہ بستی بالکل ویران تھی انہوں نے کہا کہ یہ بستی کیسے آباد ہوگی چلتے چلتے وہ ایک جگہ رک گئے وہاں انہوں نے کھانا کھایا کھانے کے بعد وہ لیٹ گئے کچھ دیر کے بعد ان پر نیند طاری ہوگئی وہ سوتے رہے اور وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ سو سال گزر گئے اس دوران وہ کھنڈر نما بستی آباد ہو گئی تھی حضرت عزیر علیہ السلام جب بیدار ہوئے تو ان کا خیال تھا کہ وہ چند گھنٹے سوئے رہے لیکن اللہ نے انہیں بتایا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کہ وہ سو سال تک سوتے رہے یہاں بھی وقت گویا عزیر علیہ السلام کے لیے رک گیا تھا جب کہ ارد گرد کا وقت چلتا رہا۔

عام نظریہ اضافیت کے مطابق جوں جوں ایکسلریشن کی مقدار بڑھتی ہے توں توں وقت کی رفتار آہستہ ہوتی ہے یعنی جہاں ایکسلریشن کی مقدار زیادہ ہوگی وہاں موجود گھڑی کی رفتار آہستہ ہوگی اور جہاں اس کی مقدار کم ہوگی وہاں موجود گھڑی کی رفتار زیادہ ہوگی آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے بتاتا چلوں کہ ایکسلریشن کشش ثقل ہی ہے۔ اس نظریے کو اس وقت تسلیم کیا گیا جب خلا میں موجود سٹلائٹ کی گھڑی کو تیز پایا گیا۔

اب آتے ہیں ان دو واقعات کی طرف جہاں اصحاب کہف اور حضرت عزیر علیہ السلام سوئے تھے وہاں گریویٹیشنل فیلڈ (کشش ثقل) کی مقدار گرد و نواح کی گریویٹیشنل فیلڈ سے بہت زیادہ تھی اس لیے وہاں وقت بہت کم گزرا برخلاف گرد و نواح کے کہ وہاں کشش ثقل کی مقدار کم تھی۔

سائنس اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ زمین کے کئی حصوں پر کشش ثقل کی مقدار ایک جیسی نہیں اور اس کا کم یا زیادہ کرنا خدا کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔

اگر آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن ان دو واقعات کا تعلق ٹائم ٹریولنگ سے ہی ہے۔ اب وقت ختم ہو چکا ہے اگر کسی کو مزید تفصیل کی ضرورت ہو تو پرسنلی مجھ سے ملے۔

......☆☆......

نصیر احمد کی ہمیشہ یہ خواہش تھی کہ وہ کچھ ایسا کرے جو دوسروں کے لیے ناممکن ہو وہ ہمیشہ ایسے کاموں کے بارے میں سوچتا رہتا بچپن سے وہ مطالعے کا شوقین تھا 9 سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے ابن صفی کی جاسوسی دنیا مکمل پڑھ لی تھی پچھلے دنوں اس نے ایم اے راحت کے

ناول پڑھے تو اس کے ذہن میں ٹائم ٹریولنگ کا خیال آیا اس وجہ سے کل اس نے پروفیسر خالد سے سوال پوچھا اور آج اس کے مطالعے کے کمرے میں موجود تھا کمرے کے تینوں اطراف لگی ہوئی الماریاں کتابوں سے بھری پڑی تھیں دائیں جانب ایک میز اور کرسی تھی میز پر لیمپ کے ساتھ چند کتابیں ترتیب سے رکھی گئی تھیں ایک کھلی ہوئی کتاب کو الٹا کر کے رکھا گیا تھا کمرے میں ایک بڑا اور دو چھوٹے صوفے تھے نیچے بھورے رنگ کا قالین تھا۔

''سر میں ٹائم ٹریولنگ کے متعلق مزید جاننا چاہتا ہوں۔'' نصیر نے سوال کیا۔

''بیٹے یہ کائنات رازوں سے بھری پڑی ہے کچھ راز انسانی دسترس سے بہت پرے ہیں جبکہ کچھ رازوں کے ابھی صرف سرے ہی ہاتھ آئے ہیں ان رازوں میں سے ایک راز ٹائم ٹریولنگ کا ہے۔'' پروفیسر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''جہاں تک اسلامی نقطہ نظر ہے تو واقعہ معراج سے اس کی مکمل وضاحت ہو جاتی ہے یہ واقعہ قرآن کے پندرہویں پارے کے شروع میں مذکور ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقت کے نہایت قلیل عرصے میں مسجد حرم سے بیت المقدس اور پھر وہاں سے آسمانوں اور سدرۃ المنتہی تک کا سفر کیا " . پروفیسر اتنا کہہ کے خاموش ہوئے تو نصیر نے کہا۔

''ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھا دیں۔''

''سمجھاتا ہوں بیٹے۔'' پروفیسر نے پنسل انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا . مسجد حرام سے بیت المقدس کا فاصلہ تقریباً پندرہ سولہ سو کلو میٹر ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فاصلہ براق کے ذریعے طے کیا براق وہ جانور تھا جس کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ تھی۔

''کیا کوئی چیز روشنی کی رفتار سے زیادہ حرکت کر سکتی ہے؟'' نصیر نے سوال کیا۔

''ہاں کر سکتی ہے جیسے سائنس دانوں کا ماننا ہے کہ ٹیکیون (Tachyon) پارٹیکل کی رفتار روشنی سے زیادہ ہے۔'' پروفیسر نے جواب دیتے ہوئے بات جاری رکھی۔ بیت المقدس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور پھر ایک سیڑھی کے ذریعے آسمانوں اور سدرۃ المنتہی تک گئے۔

''سیڑھی کے ذریعے کیسے؟''

اس سیڑھی کو وارم ہول (wormhole) کہتے ہیں وارم ہول وقت کے مختلف حصوں کو آپس میں جوڑتے ہیں یعنی سپیس میں پائے جانے والے ایسے ہول جو کھربوں کھربوں نوری سال کے فاصلے کو محض چند قدموں کے فاصلے میں تبدیل کرنے کی قوت رکھتے ہیں مثلاً اگر وارم ہول کا ایک سرا سن دو ہزار میں کھلتا ہو تو ممکن ہے اس کا دوسرا سرا سن تین ہزار یعنی مستقبل میں کھلے کیا تم بتا سکتے ہو کہ معراج کی رات محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دوزخ میں مختلف لوگوں کو سزا پاتے ہوئے دیکھا حالانکہ قیامت کے بعد مجرموں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو بتایا کہ میں نے تمہارے قدموں کی آواز جنت میں سنی تم مجھ سے آگے جا رہے تھے حالانکہ حضرت بلال زندہ تھے زمین پر تھے۔''

پروفیسر خالد خاموش ہو گئے . چند لمحوں تک جب نصیر نے کچھ جواب نہیں دیا تو پروفیسر نے خود کہنا شروع کیا اصل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مستقبل میں موجود تھے اور ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ کے ہاں ماضی حال مستقبل بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔

......☆☆......

پروفیسر خالد کی باتوں نے نصیر کے آتش شوق کو مزید بھڑکا دیا . پروفیسر سے جتنی معلومات وہ حاصل کر سکتا تھا اس نے حاصل کر لیں پھر وہ مختلف لوگوں سے ملتا رہا پیروں فقیروں کو بھی اس نے نہیں چھوڑا اس سلسلے میں بابا سیف الروف جلالی سے اس کی کء ملاقاتیں ہوئیں بابا جلالی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مستقبل میں جھانک سکتے ہیں۔

سفید لباس میں ملبوس خوبصورت داڑھی لمبی مونچھیں شانوں تک لمبے لمبے کالے بال جن میں سے سفیدی جھانک رہی تھی سر پر پگڑی باندھے بابا جلالی اپنے عقیدت مندوں کے درمیان آستانے میں بیٹھے تھے نصیر احمد ان کے سامنے دوزانوں بیٹھے تھے۔ اس نے ادب

سے کہا۔

"سرکار آپ تو مستقبل کے بارے میں جانتے ہیں مجھے میرے مستقبل کے بارے میں بتائیے۔"

"بیٹے مستقبل کے بارے میں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہاں کبھی کبھی وہ اپنے بندوں کو کچھ اشارے دے دیتا ہے تمہارے مستقبل میں ماضی ہے۔" بابا جلالی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"یعنی میں ماضی کا سفر کرسکوں گا۔" نصیر نے بے تابی سے کہا۔

"ہاں تم ماضی کا سفر کرو گے لیکن ایک بات یاد رکھنا گدڑی پر کوٹ پتلون کو ترجیح دو۔" بابا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں سرکار ذرا تفصیل سے سمجھا دیں۔" نصیر نے پوچھا۔

"مجھے اس سے زیادہ اجازت نہیں ہاں اگر کبھی کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ تو "حم لا ینصرون" کا ورد کیا کرو اللہ مشکل آسان کردے گا۔" بابا نے جواب دیا۔

......☆☆......

نصیر شہر کی سب سے بڑی لائبریری جانے لگا وہاں وہ ٹائم ٹریولنگ کے موضوع پر کتابیں پڑھتا وہ ہمیشہ ایک مخصوص گوشے میں بیٹھ کر مطالعہ کرتا جہاں کبھی کوئی نہیں بیٹھتا آج بھی حسب معمول وہ کتابیں ہاتھ میں لیے وہاں پہنچا لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں پہلے سے کوٹ پتلون میں ملبوس ایک دراز قد دبلا آدمی بیٹھا ہے نصیر بھی خاموشی سے وہاں بیٹھ گیا دبلا آدمی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا جانے اس شخص میں کیا بات تھی نصیر بار بار اسے دیکھتا آخر اس شخص نے جب اوپر دیکھا تو دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اس نے عینک اتار کر نصیر سے کہا۔

"کیا پڑھ رہے ہو بیٹے۔"

"ٹائم ٹریولنگ کے موضوع پر کتاب پڑھ رہا ہوں۔" نصیر نے جواب دیا۔

"بہت خوب میرا بھی یہ پسندیدہ موضوع ہے تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"میرا نام نصیر ہے۔"

"تم مجھے پروفیسر کہہ سکتے ہو یہ دو کتابیں لے لو آج رات اسے پڑھ لو کل میں اسی جگہ ملوں گا۔" پروفیسر نے اسے کتابیں دیں اور اٹھ کر کہا کتاب پڑھ کر اپنے ارادے سے آگاہ ضرور کرنا یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

......☆☆......

رات کو نصیر نے دونوں کتابوں کا مطالعہ شروع کیا پہلی کتاب کے پہلے حصے میں ٹائم ٹریول کے اسرار و رموز کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ دوسرے حصے میں ان لوگوں کا تذکرہ تھا جو یا تو ماضی میں گئے یا ماضی سے مستقبل میں آئے ساتھ ساتھ ان کی تصاویر بھی تھیں ایک تصویر کو دیکھ کے نصیر اچھل پڑا کیونکہ وہ تصویر اس کی تھی اس کے ساتھ جو تفصیلات تھیں اس نے اس کی نیند کو اڑا کے رکھ دیا نصیر کو یقین ہو گیا کہ پروفیسر ضرور ٹائم ٹریولر ہے اور کل ضرور اس سے اس کے متعلق بات کرے گا۔

صبح مقررہ وقت سے پہلے وہ لائبریری پہنچ گیا کچھ دیر بعد پروفیسر آ گیا اس نے پروفیسر سے کتاب کے بارے میں پوچھا تو پروفیسر نے بتایا یہ مقدس کتاب دیوتا آمون کی جانب سے مجھے عطا کی گئی ہے اس کی زبان ہر وقت اور زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے جب بھی کوئی ٹائم ٹریولر پیدا ہوتا ہے تو اس کا ذکر اس کتاب میں خود بخود لکھا جاتا ہے تم ماضی کا سفر کرو گے اس لیے تمہارا تذکرہ کتاب میں موجود ہے۔ ماضی میں ہمیں تمہاری بہت سخت ضرورت ہے اگر تم ہمارا کام کردو گے تو ہم تمہیں مالا مال کر دیں گے مقدس کتاب کے مطابق تم وہ کام کرسکو گے اور ہاں مقدس کتاب کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔" پروفیسر نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"وہ کام کیا ہے پروفیسر۔" نصیر نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں اب میں نہیں کہہ سکتا ہاں ماضی میں تمہیں تمام تفصیل بتا دی جائے گی۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

کچھ لمحے توقف کے بعد پروفیسر نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ آج سے تین دن بعد پورن ماشی کی رات ہے اس رات ماضی کا دروازہ کھلے گا رات دس بجے شہر سے باہر مجھ سے ملو 12 بجے کے بعد وہ دروازہ بند ہو جائے گا اگر تم نے تاخیر کی تو پھر تمہیں طویل انتظار کرنا

پڑے گا۔

ان شاء اللہ میں وقت مقررہ پر پہنچوں گا۔ نصیر نے کہا۔

☆☆

نصیر کچھ ضروری اشیاء خریدنے کے لیے جیسے ہی گھر سے نکلا اسے ایک ملنگ دکھائی دیا نصیر کو دیکھتے ہی ملنگ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔

"کچھ کھلاؤ بابا کل سے بھوکا ہوں۔" ملنگ نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

نصیر نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر کہا۔ "یہ لے بابا اس سے کچھ خرید کر کھا لے۔"

"تمہاری ماضی میں جانے کی خواہش پوری ہو بیٹا۔" ملنگ نے کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم بابا کہ میری یہ خواہش ہے۔" نصیر نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"ملنگ بابا بہت کچھ جانتا ہے تین دن بعد جاؤ گے نا اس پروفیسر کے ساتھ۔" ملنگ بابا نے کہا۔

نصیر بابا کی بات پر اچھل پڑا ہاں با...... با...... یہ...... ٹھیک ہے یہ نصیر نے بمشکل کہا۔

"تم پر بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔"

"کیسی مصیبت۔"

"پروفیسر مصر کے شاہی سلسلے کے آخری فرعون قارع کا شاہی جادوگر ہے اسے کاہن اعظم کہا جاتا ہے کاہن اعظم نے اپنے علم کے ذریعے معلوم کیا کہ پہلا شاہی سلسلہ ختم ہو جائے گا اس سلسلے کو بچانے کی خاطر اس نے کٹھن جاپ کیے تب اسے معلوم ہوا کہ اگر اماوس کی رات پیدا ہونے والے ایسے لڑکے کی قربانی دی جائے جس کے دل پر پیدائشی چاند تارے کا نشان ہو تو فرعونی حکومت بچ جائے گی کاہن اعظم کو اپنے علم کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لڑکا ابھی پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ وہ ہزاروں سال بعد مستقبل میں پیدا ہوگا اس لیے اس نے مستقبل کا سفر کیا کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ لڑکا کون ہے۔" ملنگ نے پوچھا۔

"نہیں۔" نصیر نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"اپنی قمیص کے بٹن کھول کر اپنے دل کے مقام کو دیکھو۔" ملنگ نے کہا۔

نصیر نے اپنے بٹن کھول کر جب اپنے دل کے مقام کو دیکھا تو چکرا کر رہ گیا اس لیے کہ وہاں چاند تارے کا نشان بنا ہوا تھا۔

"کاہن اعظم تمہاری قربانی دینا چاہتا ہے لیکن میں تمہیں بچا لوں۔" ملنگ نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے ملنگ بابا۔" نصیر نے پوچھا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ ماضی میں لے جاؤں گا۔" ملنگ بابا نے کہا۔

"کیا آپ کا تعلق بھی ماضی سے ہے۔" نصیر نے سوال کیا۔

"ہاں میرا تعلق بھی ماضی سے ہے ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں پورن ماشی کی رات میرے پاس آنا چلو میں تمہیں اپنا ٹھکانا دکھاؤں۔" ملنگ بابا نے نصیر کا ہاتھ پکڑ کر کہا اور شہر سے باہر جانے والے راستے کی جانب چل پڑا۔

☆☆

رات کی دیوی آہستہ آہستہ اپنے گیسو پھیلا رہی تھی . نصیر ملنگ بابا کے ساتھ شہر سے باہر قبرستان میں موجود تھا اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا ملنگ بابا کی نظریں چاند پر تھیں دو گھنٹے انتظار کے بعد اچانک انہیں قبرستان میں روشنی کا ایک نقطہ دکھائی دیا ملنگ بابا کی آنکھیں چمک اٹھیں روشنی کا نقطہ آہستہ آہستہ بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ اس نے ایک دروازے کی شکل اختیار کر لی۔

"اس دروازے کے پار ماضی ہے چلو اس میں داخل ہو جائیں۔" ملنگ بابا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی نصیر روشنی کے دروازے میں داخل ہوا اسے ایک جلتی ہوئی مشعل دکھائی دی وہ ایک غار میں موجود تھا غار میں زمین پر شیر کی کھال بچھی ہوئی تھی ایک طرف ضرورت کی چیزیں سلیقے سے رکھی گئی تھیں وہ غار کو دیکھ رہا تھا کہ ملنگ بابا کی آواز پر چونک پڑا۔

"یہ میرا ٹھکانہ ہے تم اس وقت ماضی میں موجود ہو تھوڑا آرام کرو میں ذرا باہر جاتا ہوں۔"

ملنگ بابا کے باہر جانے کے بعد نصیر کو باہر شور سنائی دیا ابھی وہ اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ چند آدمی اندر داخل

ہوئے شکل سے وہ جنگلی نظر آ رہے تھے انہوں نے جانوروں کی کھالوں سے ستر چھپا رکھا تھا ان کے ہاتھ میں نیزے تھے ان میں سے دو آدمیوں نے نصیر کو پکڑا اور ایک آدمی نے اس کے ہاتھ باندھ دیے انہوں نے نصیر کو گھسیٹ کر باہر نکالا نصیر چیخ رہا تھا وہ بار بار ملنگ کو پکار رہا تھا باہر آ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی باہر ملنگ بابا کھڑا تھا سیکڑوں لوگ تعظیماً اس کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے نصیر کے باہر آتے ہی انہوں نے جوشیلے انداز میں چلانا شروع کیا ملنگ نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو خاموش کر دیا اور اجنبی زبان میں کچھ کہا جس کی وجہ سے لوگوں نے خوش ہو کر دوبارہ نعرے لگانے شروع کیے کچھ دیر کے بعد ملنگ ایک طرف روانہ ہو گیا لوگوں نے اسے راستہ دے دیا پانچ آدمی نصیر کو پکڑ کر اس کے پیچھے چلنے لگے چلتے چلتے وہ ایک مندر نما جگہ پر پہنچ گئے وہاں ناگ کا ایک دیو قامت مجسمہ نصب تھا نصیر کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ کر اس کے سامنے لٹا دیا گیا ملنگ نے آدمیوں کو رخصت کیا سانپ کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنے اردگرد حصار کھینچا نصیر نے عاجزی سے کہا۔

''ملنگ بابا مجھے کھول دیجیے میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔''

''میں پاگل نہیں تھا کہ میں نے تمہاری خاطر ہزاروں سال کا سفر کیا ناگ دیوتا ہم سے ناراض ہے میرے علم کے مطابق آج رات ہم پر تباہی نازل ہو گی اماوس کی رات پیدا ہونے والے اس لڑکے کی قربانی اگر ہم دیں جس کے دل پر چاند تارے کا نشان ہو تو ہم ناگ دیوتا کے قہر سے بچ جائیں گے۔'' یہ کہہ کر ملنگ بابا نے آنکھیں بند کر لیں اور اجنبی زبان میں بدبدانے لگا۔

......☆☆......

کاہن اعظم (پروفیسر) نے نصیر کا بہت انتظار کیا جب وہ نہ آیا تو اسے تشویش لاحق ہوئی اس نے اپنے علم سے معلوم کیا تو اسے پتہ چلا کہ نصیر اس دنیا میں نہیں بلکہ وہ ماضی میں چلا گیا ہے کاہن اعظم بھی وقت ضائع کیے بغیر ماضی میں داخل ہو گیا۔

کاہن اعظم فرعون کے دربار میں داخل ہوا تو تمام درباری احتراماً کھڑے ہو گئے۔ فرعون ''قاع'' سونے کے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا تھا تخت کے دائیں بائیں دو سونے کی کرسیاں تھیں دائیں جانب کاہن اعظم جبکہ بائیں جانب وزیر اعظم بیٹھتا تخت اور کرسیاں اونچی جگہ پر تھیں اس سے نیچے دونوں طرف بھی کرسیاں رکھی گئی تھیں جس پر حسب مراتب وزراء بیٹھے ہوئے تھے۔

دبلے پتلے لمبے قد و قامت قاع پہلے شاہی سلسلے کا نواں بادشاہ تھا۔

3 1 0 0

قبل مسیح سے پہلے مصر میں تین حکومتیں تھیں شمالی وسطی اور جنوبی جب میناس جو نارمر کے نام سے مشہور ہے وسطی مصر کا حاکم بنا تو اس نے ایک بڑا لشکر جمع کیا اور جنوبی مصر کے حکمران سائت پر حملہ کر دیا سائت نہایت بے جگری سے لڑا لیکن بالآخر خونریز جنگ کے بعد میناس نے اسے شکست دے کر جنوبی مصر کو اپنی سلطنت میں شامل کر دیا اس کے بعد وہ شمالی مصر پر حملہ آور ہوا اور اسے بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا یوں پہلی بار مصر میں ایک متحدہ سلطنت قائم ہوئی۔ میناس نے ممفس شہر تعمیر کیا اور اسے پایہ تخت بنایا میناس کے بعد اس کا بیٹا حورا تخت نشین ہوا ہوتے ہوتے حکومت قاع کے پاس آ گئی۔

اباسوخ قاع کا بچپن کا دوست تھا اباسوخ نے کئی مواقع پر قاع کی مدد کی تھی اس لیے قاع اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا۔

اباسوخ کا بیٹا جلاتوخ شکار کا بہت زیادہ شوقین تھا وہ ایک ماہر شکاری تھا اکثر شکار پر جاتا تو کئی کئی دن غائب رہتا اس بار وہ شکار پر گیا تو دو ہفتے کے بعد بھی واپس نہ آیا اباسوخ نے اپنے طور پر اسے تلاش کیا لیکن کوئی کامیابی نہ ملی . مایوس ہو کر وہ بادشاہ قاع کے پاس آیا قاع نے خوشدلی سے اس کا استقبال کیا اور کہا۔ ''بہت دنوں بعد آئے ہو خیریت تو تھی۔''

''خیریت نہیں ہے اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔'' اباسوخ نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

''کیوں......کیا ہوا۔'' قاع نے بے تابی سے پوچھا۔

''جلاتوخ شکار پر گیا تھا عموماً وہ دو تین بعد واپس آتا ہے اس بار تین ہفتے ہونے کو ہے اس کی کوئی خیر خبر نہیں

ایک ہفتے سے میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا مایوس ہو کر آپ کے پاس آیا۔" اباسوخ یہ کہہ کر خاموش ہوا اور قاع کی طرف دیکھنے لگا قاع کچھ سوچتا رہا چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اس نے تالی بجائی تو ایک خادم دوڑتا ہوا آیا اس نے خادم سے کہا۔

"کاہن اعظم کو بلا کر لے آؤ۔"

کچھ دیر بعد کاہن اعظم آیا تو قاع نے اسے تمام صورت حال بیان کر کے کہا۔

"اپنے علم کے ذریعے معلوم کر کے بتاؤ جلاتوخ اس وقت کہاں ہے۔"

کاہن اعظم نے آنکھیں بند کرلیں بہت دیر تک وہ کچھ پڑھتا رہا اس کے چہرے کے خدوخال متغیر ہو گئے اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ اس نے آنکھیں کھول لیں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔

"کچھ پتہ چلا۔" قاع نے بے تابی سے پوچھا۔

کاہن اعظم نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"جلاتوخ سرزمین مصر کی سرحد پر واقع جنگل میں شکار کرنے گیا تھا۔ اتفاقاً وہاں پراسرار جزیرے کی ملکہ زنابیہ بھی آئی ہوئی تھی۔ زنابیہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ پراسرار جزیرہ بدروحوں اور شریر جنات کا مسکن ہے وہاں کسی انسان کا جانا ممکن نہیں اگر کوئی وہاں گیا بھی تو ملکہ زنابیہ کو دیکھتے ہی اپنا سر کاٹ دیتا ہے آج تک جس انسان نے بھی ملکہ زنابیہ کو دیکھا اس نے اپنا سر کاٹ کے خودکشی کی۔"

"جلاتوخ کی رہائی کا کوئی حل بھی تو ہوگا۔" قاع نے پوچھا۔

"صرف ایک شخص جلاتوخ کو رہائی دلا سکتا ہے لیکن اس وقت وہ پیدا نہیں ہوا وہ آج سے ہزاروں سال بعد اماوس کی رات پیدا ہوگا اس کے دل پر چاند تارے کا نشان ہوگا اور اسے مقدس منتر یاد ہوگا۔" کاہن اعظم نے جواب دیا۔

"یہ تو کوئی حل نہیں ہوا۔" قاع نے پریشانی سے کہا۔

"اسے لانے کے لیے میں مستقبل کا سفر کروں۔" کاہن اعظم نے کہا۔

اس کے دو دن بعد کاہن اعظم نصیر کی تلاش میں مستقبل میں آ گیا لیکن یہاں سے جب وہ اکیلے فرعون کے دربار میں گیا تو فرعون قاع حیران ہوا اور اس نے پوچھا۔

"لڑکے کو لے آئے؟"

"لڑکے کو میں اپنے ساتھ لے آرہا تھا لیکن مجھ سے پہلے شلازو جنگلی قبیلے کے روحانی پیشوا جاگون اسے دھوکے سے لے آیا۔ جاگون ناگ مندر میں آج اس کی بلی دے گا فوج کا ایک دستہ مجھے دے دو جاگوں کے ساتھ اس جنگلی قبیلے کا خاتمہ بھی ضروری ہے۔"

"جتنی تمہیں ضرورت ہو فوج لے لو۔"

کاہن اعظم نے فوج کا ایک دستہ لیا اور ان سب کو آنکھیں بند کرنے کا کہا ایک منتر پڑھنے کے بعد اس نے سب کو کہا آنکھیں کھول دو اب وہ سب جنگلی قبیلے میں موجود تھے کاہن اعظم کے ان کو حکم دیا۔

"اس سارے قبیلے کو نیست و نابود کر دو کوئی بھی بچنے نہ پائے۔"

سپاہیوں کو حکم دینے کے بعد وہ چند سپاہیوں کے ہمراہ ناگ مندر پہنچ گیا۔

جاگون آلتی پالتی مارے کسی منتر کا ورد کر رہا تھا سامنے ناگ دیوتا کے مجسمے کے سامنے نصیر بندھا پڑا تھا کاہن اعظم نے اسے کھولا اور اسے ایک خنجر دیتے ہوئے کہا۔ جاگون اس وقت حصار کے اندر ہے میں اس کا حصار نہیں توڑ سکتا تمہارے پاس مقدس منتر ہے وہ پڑھو حصار ٹوٹ جائے گا اور اسے فوراً ختم کر دو اگر اس نے منتر مکمل کر لیا تو مشکل ہو جائے گی۔

نصیر کو فوراً بابا سیف الروف جلالی کے الفاظ یاد آ گئے۔

"اگر کوئی مشکل در پیش ہو تو حم لا ینصرون کا ورد کرنا۔" نصیر نے اللہ کا نام لیا اور حم لا ینصرون کا ورد کرتے ہوئے حصار میں داخل ہوا جوں ہی وہ حصار میں داخل ہوا جاگون نے بدحواس ہو کر آنکھیں کھول لیں۔ نصیر نے اسے ہلنے کا بھی موقع نہیں دیا اور خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا فوجی دستے نے باقی قبیلے کا صفایا کر دیا۔

......☆☆......

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کاہن اعظم نے نصیر کو بدروحوں کے جزیرے پر پہنچا دیا ایک عمل کے ذریعے اس نے خود کو اور نصیر کو بدروحوں اور جنات سے پوشیدہ کر لیا وہ وہاں کے جنوں اور بدروحوں کو دیکھ سکتے تھے لیکن وہ انہیں نہیں دیکھ سکتے۔

نصیر اس جزیرے کو دیکھ کر حیران ہوا لمبے لمبے کالے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے جیسے دیو قامت جن کھڑے ہوں لمبے لمبے درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ نے جزیرے کو پراسرار بنا رکھا تھا۔

انہیں سب سے لمبے پہاڑ پر ایک کالا محل نظر آیا۔

''وہ ملکہ زنابیہ کا محل ہے۔ میں وہاں داخل نہیں ہوسکتا تم اندر جاؤ۔ دوسری منزل پر جلاتوخ ملکہ زنابیہ کے کمرے میں ہے وہاں داخل ہو کر مقدس منتر پڑھنا اور ہاں وہاں بہت ہوشیار رہنا کسی بھی تصویر کو مت دیکھنا۔'' کاہن اعظم نے نصیر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

نصیر محل میں داخل ہوا بہت پراسرار اور ڈراونا محل تھا ہر چیز کالی تھی دیواروں چھتوں یہاں تک کہ زمین کا رنگ بھی کالا تھا۔

مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا اسے سیڑھیاں نظر آ گئی وہ اوپر چڑھا دائیں جانب ملکہ زنابیہ کا کمرہ تھا سامنے دیوار پر مختلف تصاویر تھیں ایک تصویر کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا ایک خوب صورت عورت بال کھولے کھڑی تھی اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اس کے چہرے سے روشنی سی نکل رہی تھی اس کے سامنے ایک شخص کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر تھا جسے اس نے اپنے گلے پر رکھا تھا نصیر نے غور سے دیکھا تو عورت کے بال واقعی لہرا رہے تھے اچانک اس کی آنکھوں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے نصیر کو گھور کر دیکھا نصیر کو اپنے بدن میں سرد لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اچانک عورت مسکرائی سامنے کھڑے شخص کے ہاتھوں میں جنبش پیدا ہوئی اور اس نے خنجر سے اپنا گلا کاٹ دیا خون کا فوارہ نکلا اور نصیر کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے نصیر گنگ کھڑا اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہا تھا اچانک عورت نے قہقہہ لگایا نصیر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا وہ اس کا قہقہہ سن رہا تھا آدمی نے اپنا سر تن سے جدا کر دیا اور تصویر سے باہر آ گیا ایک ہاتھ میں خنجر جبکہ دوسرے میں اپنا سر پکڑے وہ نصیر کی طرف بڑھا عورت بھی تصویر سے باہر آ گئی سر کٹے انسان نے خنجر نصیر کے ہاتھ میں تھما دی مشینی انداز میں نصیر نے خنجر لیا اور گلے پر رکھ دیا وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو گیا وہ عورت کی طرف دیکھنے لگا گویا اس کے اشارے کا منتظر ہو۔

''مجھے ختم کرنے کے لیے آئے تھے میرے قیدی کو چھڑانے آئے تھے...... ہاہاہا......'' ایک طویل قہقہہ لگانے کے بعد اس نے کہا۔

''خنجر گلے پر پھیر دو۔'' اس سے پہلے کہ نصیر کا ہاتھ حرکت میں آتا اس کے کانوں میں آواز آئی۔

''ہوش میں آؤ مقدس منتر پڑھو۔'' یہ آواز کاہن اعظم کی تھی۔ نصیر کو یوں لگا جیسے وہ نیند سے بیدار ہوا اس نے فوراً جلالی بابا کا دیا ہوا ورد شروع کیا۔

عورت جو درحقیقت ملکہ زنابیہ تھی اس نے چیخنا شروع کیا اسے آگ لگ گئی وہ چیخ رہی تھی۔

''بند کرو بند کرو لیکن نصیر مسلسل ورد کیے جا رہا تھا زنابیہ جل کر رکھ ہو گئی ہوا کا جھونکا آیا اور راکھ کو اڑا دیا راکھ فضا میں پھیل رہی تھی کاہن اعظم آیا اور اس نے نصیر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''ملکہ زنابیہ ختم ہو چکی ہے ہمارے پاس وقت کم ہے آؤ اندر چلیں جب وہ اندر داخل ہوئے تو جلاتوخ بستر پر بے ہوش پڑا تھا۔ کاہن اعظم نے نصیر کو آنکھیں بند کرنے کا کہا جب اس نے آنکھیں کھول لیں تو وہ قارع کے محل میں تھے۔

دو مہینے تک نصیر وہاں رہا کاہن اعظم نے اسے ایک انگوٹھی دے کر کہا اسے پہن لو جہاں بھی ماضی یا مستقبل کا دروازہ ہو تو اس انگوٹھی کے نگینے میں چمک پیدا ہو گی۔ دو مہینے کے بعد کاہن اعظم اسے واپس مستقبل میں لے آیا وہ اسی قبرستان میں تھا وہی رات تھی نصیر گھر کی طرف چل پڑا۔

عمارہ خان

وہ ایک پرانا گھر تھا، جہاں ایک متروک کنواں بھی موجود تھا ہر ماہ کی پورے چاند کی رات ایک حسینہ کنویں سے نکل کر رقص کرتی تھی وہ کون تھی کیا تھی کسی کو نہیں معلوم نہیں تھا البتہ اس مکان کا مالک اس حقیقت سے آگاہ تھا۔

خوف ناک نمبر کے لیے ایک انوکھا ناول

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اگلی صبح پنڈت ہری پرساد کے مرنے کی خبر نے پورے گاؤں میں ماتم سی فضا پیدا کردی تھی۔ پنڈت کا بڑا لڑکا مدن پرساد پتا کو اگنی کے سپرد کرنے سے پہلے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ پورا گاؤں دیکھ رہا تھا کیسے مدن اپنے جنم داد کو آخری پرنام کررہا تھا۔ پھر رسم کے انوسار اسی کو پتا کی چتا جلانا تھی۔

عورتیں شمشان گھاٹ کے باہر بنے ہوئے کنویں سے نہا کے واپس چلی گئی تھیں اور اب مہا پنڈت لکشمی نارائن کے ساتھ مدن اور اشوک کھڑے رہ گئے تھے تاکہ ارستیاں لے جاسکیں اور یہ ارستیاں ڈھونڈنے کا کام حسب روایت شودر ہی کررہے تھے۔

کلو نے خاموشی سے باری باری پہلے پنڈت لکشمی نارائن کے قدموں میں سر رکھا اور آگیا چاہی ارستیاں اٹھانے کی اس کے بعد مدن کی باری آئی اور جیسے ہی وہ اشوک رانا کے قدموں میں سر جھکانے لگا اس نے بے اختیار اسے ٹھوکر رسید کردی۔

''حرام کے جنے دور ہوجا ہم کی نجروں سے۔ مت آیا کرہم کے سامنے تو۔''

''شما کردو مہاراج شما کردو۔'' کلو نے مزید جھکتے ہوئے کہا اور پھرتی سے پلٹ کے اپنا کام کرنے لگا۔

......❁❁......

جوان ہوتے ہی شالو کو اندازہ ہوگیا تھا وہ نیچ ذات کی چمارن ہے اور جیون بھر اس کا کام اونچی جات کا گند ہی صاف کرنا ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کو معلوم ہوگیا تھا اس کے پاس ایک ایسی چیز ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتی ہے ۔ وہ ہے اس کا طرحدار حسن اور ادائیں۔

شالو جیسے ہی چودہ کی ہوئی اس نے گاؤں بھر کے لڑکے بالکوں کی ہوس سے بھری ہوئی نگاہوں کو اپنی سمت تکتا ہوا پایا۔ بھگوان کی ہی کرپا تھی جو وہ ابھی تک کنواری تھی ورنہ اس کے ساتھ کے سکھیاں کب سے اپنے کنوارے پن سے دور ہوچکی تھیں۔ شالو سے دور رہنے کی ایک وجہ اس کی ماں کا ایکدم غائب ہونا بھی تھا تو دوسری طرف وہ گاؤں کی اور کم سے کم جاتی تھی۔ شالو اپنا زیادہ تر وقت جنگل میں رہنا پسند کرتی تھی۔ اس نے جان لیا تھا اگر زندہ رہنا ہے تو کسی طاقت ور کا سہارا لینا ہوگا اور وہ اس کے لیے اپنی جوانی کو دان کرنے پر بھی تیار تھی لیکن اپنی ماں کی طرح راتوں رات غائب ہونا پسند نہیں کرسکتی تھی۔

......❁❁......

''اے شالو۔ سن۔'' موٹے روی کی چھوٹی بیٹی روپا نے اپنی بچپن کی دوست کو پکارا۔

''کا ہے ری۔'' شالو نے تنک کے روپا کی سمت دیکھا۔

''وہ۔ وہ نا۔''

''بول بھی دے اب۔ ہم کا جانا ہے۔''

''وہ تم کا لیے پیغام ہے، آج رات تم کا......'' وہ روپا نے جھجک کے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن شالو کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

''کس نے بلایا ہے ہم کا۔'' شالو نے صاف سبھاؤ پوچھنا ہی بہتر سمجھا۔

''جنسی رانا......''

''اوہ۔ کتے کو یاد آہی گئی ہم کی۔'' شالو نے دانت پیستے ہوئے سر جھٹکا۔ ''حرام کا جنا نا ہوتو''

''اے ے ششش چپ کر جا نگی۔ کسی نے سن لیا تو۔'' روپا جی جان سے لرز گئی۔

''تو کا، ہم کو بھی مار دینگے، ویسے کون سا جندہ چھوڑ رکھا ہے ہم کا۔'' شالو نے تنک کے اپنی اکلوتی دوست کی سمت دیکھا۔

''ہم کی بات مان شالو۔ ایک ہی مرد کی ہوجا۔ جنسی مہاراج کو کھوش کردے تاکہ ادھم کو چھوڑے ای نا۔''

''دماغ سٹھیا گیا کا تم کا روپا۔ جس کے پتا نے ہماری ماتا کو ہم رے سے چھین لیا ہم او کے بیٹے کے ساتھ ہی۔ چھی چھی چھی۔ لاج نا آوے تم کا جوایسی......'' شالو نے غصے کی بدولت بات ہی ادھوری چھوڑ دی۔

''ارے ٹھنڈے دل سے ہم کی بات تو سن شالو۔ دیکھ آج تو جنسی کے پاس جائے گی۔ کل ہری رام کے پاس تو پرسوں اوم پرساد کے پاس۔ اچھا نہیں ہے تو ایک کے ہی پاس رہ لے۔ وہ آپ ہی باقی سب سے نمٹ لے گا اور آج بھی اشوک مہاراج سے طاقت ور پریوار کسی اور کا نا ہی ہے اس گاؤں میں۔''

''ہوں۔ بولتی تو ٹھیک ہی ہے روپا۔'' شالو نے اک

ذرا حقیقت سے جائزہ لیا تو اپنی دوست کی دوستی پر پیار آیا۔

''ہم تہاری دوست ہیں شالو بھی غلط بات نہیں بولیں گے۔'' اور شالو نے اپنی زندگی کا ایک ایسا فیصلہ کیا جو اس گاؤں کے واسیوں کے لیے ایک بھیانک انتقام ثابت ہونے والا تھا تو شالو بھی صدیوں تک اپرادھی کو سزا دینے کے لیے ہر حد سے گزرتی جائے گی۔

......❁❁......

''او شالو ہم کا معلوم ہی نا ہی تھا تو اتنی حسین ہے۔ جبردست ہے۔ بنسی رانا جو شالو کو اپنے سامنے دیکھ کے پہلے ہی بدحواس ہو گیا تھا تو رہی سہی کسر شالو کی پیش قدمی نے پوری کر دی تھی۔

''اب کب ملے گی دوبارہ۔'' بنسی نے دور کھڑی شالو کو چولی پہنتے دیکھ کے التجا کی۔

''مہاراج جانے تو دو پہلے ہم کا۔ پھر مل بھی لیں گے۔'' شالو نے معنی خیز انداز میں پلٹ کے بنسی کی سمت دیکھا۔

''وقت نہیں کٹے گا اب ہم کا۔'' بنسی نے خشک ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے ہار مان لی۔

''ابھی تو ہم کو اوم پرساد جی کا بھی پیغام ملا ہے۔ اوکی اور بھی جانا ہے ہم کا۔'' شالو نے مصروف انداز میں چولی کی ڈوریاں کستے ہوئے کہا۔ ''یہ جرا کس دیو تو ہم کا ہاتھ نہیں جا پا رہا۔''

بنسی جو اوم پرساد کا نام سن کے آپے سے باہر ہونے لگا تھا ایک دم ہی ریشہ خطمی ہو گیا۔

''نا ہی نا ہی شالو اب تم کہیں اور نہیں جا سکتیں۔ میں بات کر لوں گا اوم پرساد سے۔''

''دیکھ لیو سرکار۔ ہم چمارن کی خاطر۔''

''ایسا نہیں بولو۔'' بنسی رانا نے ایکدم شالو کو سینے سے لگا لیا۔

''کاش تم شودر نا ہوتی تو ہمار گھر کی میری دھرم پتنی بن کے رہتیں۔''

''ہم اپنی اوقات جانت رہے مہاراج۔ پرنتو آپ بھی نا بھول رہو ہم کون ہے۔'' شالو نے زخمی مسکراہٹ سے بنسی کی سمت دیکھا اور صبح ہونے سے پہلے ہی اپنی کٹیا کی جانب جانے کے لیے قدم بڑھانے لگی۔

''رکو ہم ساتھ چلت رہیں۔''

''ارے سرکار کا ہو گیا تم کا۔ ہم وہی شالو ہیں جو دن بھر ادھر پھرت رہیں۔''

''پہلے کی بات اور تھی اب تم ہم کے دل کی مہارانی ہو۔ سچی جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔ سوگند اٹھوا لو۔ ایسا سواد ہم کو سرلہ دیوی سے کبھی نہیں ملا جیسا تم کے پاس اتی سی دیر میں مل گیا۔'' بنسی رانا نے حسرت بھری نگاہوں سے شالو کے سراپا پر نظر دوڑاتے ہوئے اعتراف کیا تو شالو من ہی من میں مسکرائی۔

''اور ہم سے پوچھو بنسی جی، کس دل سے تم کا برداشت کیے رہے ہیں۔ تم اور تم کے پتا جی ہماری ماتا جی کے قاتل ہو کیسے بھول جائے اس بات کو۔ پرنتو کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔''

''اے رک تو۔ بوہت ای جلدی ہے تو کا ں کیا۔'' بنسی نے ایک کونے میں رکھے ہوئے ڈبے سے موتیوں کی مالا برآمد کی اور نہایت نرمی اور پریم کے ساتھ شالو کی نازک گردن میں پہنا دی۔

''بوہت ای سندر ہے بنسی جی۔'' شالو نے خوشی سے مالا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو بنسی ایک دم اسے سینے سے لگا گیا۔

''تو نے ہم پر جادو کر دیا ری شالو۔''

''کاشش تم ہم کی ماتا کے اپرادھی نا ہوتے تو ہم کھوش بھی ہو جاتے بنسی جی۔'' شالو نے ایک بار پھر من ہی من میں جواب دیا۔

''چلو شالو چلو ورنہ لوگ نکلنے لگیں گے۔'' بنسی نے خاموش کھڑی شالو کو اپنی سمت متوجہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے بھی سر ہلاتے ہوئے باہر قدم رکھے۔

قدرت کے انوکھے کام، جس بنسی رانا کے نام سے گاؤں کی جوان لڑکیوں نے بے پناہ مانگ رکھی تھی وہ کہاں جا کے دل ہارا ایک شودر کے ہاتھوں جس کی ماں کو اسی کے باپ کے کارن آتما ہتھیا کرنا پڑی تھی اور اب وہ دن رات شالو شالو کے نام کی مالا جپتا رہتا تھا۔

......❁❁......

''یہ تم کس اور نکل گئی ہو شالو۔'' روپا نے اپنی بچپن کی سنگ ساتھی سے فکرمندی سے پوچھا جو آج کل الگ ہی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جہانوں کی سیر کررہی تھی۔

''آگے آگے دیکھت جاؤ روپا۔ ہم کیا کرت ہیں۔ یہ تو سروعات ہی ہے۔'' شالو نے گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے روپا کو مزید سہمایا۔

''تو کا ڈرنا ہی لاگت ہے ری۔'' روپا نے شالو کو کچوکا لگایا۔

''ان اپرادھی کو لگا تھا کیا ہمری ماتا کو مارتے سمے یا تو کاں شادی سے پہلے دوبار ماں بنانے سے۔'' شالو کے لہجے میں بھری ہوئی ناگن کا سا انداز تھا۔

''وہ اوچی جات ہے پگلی۔ بھگوان نے سوئم ان کو بنایا ہے پگلی۔''

''ہم بھی وہیں ہیں ہم کا بھی اوہی بھگوان بنائے رہے۔''

''بس روپا بس۔ اب کی بار اپرادھی کو ہم کھود ای سجا دیں گے تو دیکھت رہے۔ نا ہی چھوڑیں گے ان کو۔ ایک ایک حرامی کو چن چن کے سجا دیں گے ہم۔''

……❁❁……

حسب معمول شالو جنگل میں چہل قدمی کررہی تھی کہ اچانک وہی پرانا سادھو بابا ایک درخت کی اوڑھ سے ایک دم نظروں کے سامنے آگیا۔

''غلط کیا دیوی جی غلط کیا۔ ہمارا انتظار تو کرتی۔''

''کیا ہوا سادھو مہاراج۔'' شالو کو جو چند سال پہلے کا وہ دن یاد آگیا جب یہ ہی سادھو رادھیکا کا پیغام دینے آئے تھے اور اپنا انتظار کرنے کا کہہ گئے تھے۔

''ہم کی ماتا۔'' شالو کو اپنی ماں یاد آئی۔ ''کیسی ہے وہ مہاراج۔''

''اس نے ہی ہم کو پھر بھیجا ہے، پرنتو تو نے اچھا نہیں کیا خود کے ساتھ۔''

''ہم اور کیا کرتے مہاراج۔ اپرادھی کو سجا تو ملنی ہی چاہیے نا۔'' شالو نے نفرت سے تھوکتے ہوئے کہا۔ ''ہم کی مرجی کی کیا ہوت رہی ادھر۔''

''پرنتو ہم نے کہا تھا ہمارا انتظار کرنا۔''

''ہم کے پاس دوجا کوئی چارہ ناہی تھا۔ اسی کارن ہم نے وہ کیا جو جروری تھا۔ اب کوئی دوجا جنا ہم کو میلی نجروں سے ناہی دیکھ سکت۔''

''اچھا نہیں کیا دیوی جی آپ نے۔ دوجی بار ایسا نہیں کرنا اور ہمارا انتظار کرنا۔ ابھی سمے نہیں ہے ان باتوں کا۔'' شالو کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ سادھو بابا جیسے آئے تھے ویسے ہی اچانک غائب بھی ہوگئے۔ اور پیچھے شالو ایک بار پھر اپنی ماتا کے بارے میں سوچنے لگی۔

……❁❁……

اشوک نے من ہی من میں اپنی ہمت بندھائی اور دھیرے دھیرے شمشان گھاٹ کی اور قدم بڑھانے لگا۔ سورج دیوتا کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی لیکن چاند کی جاتی تاریخیں تھی اسی لیے اندھیرا زیادہ ہی لگ رہا تھا۔ آسمان بھی عجیب سا ہو رہا تھا، بالکل بدرنگ کالا تھا۔ کمزور دل انسان دن کے وقت بھی ایسی ویران اور سنسان جگہ آنے سے کتراتے تھے کہ اس پہر آنا۔ ہر سو خاموشی اور عجیب سی ویرانیت طاری تھی۔ حالانکہ کل ہی اس جگہ پنڈت کی ارتھی جلائی گئی تھی۔ فضا میں جلنے کی ہلکی ہلکی سی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ اشوک رانا سدا جیوت رہنے کی خاطر اس عمر میں بھی ہر مشکل پار کرنے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا۔ جوانی دبنگ انداز میں گزارنے کے باعث وہ ابھی بھی جسمانی طور پر اپنی عمر سے کچھ کم ہی لگتا تھا لیکن وقت کے ساتھ یقیناً وہ توہم پرست اور کچھ کمزور ضرور ہوگیا تھا۔ اشوک کے جسم میں ایک لمحے کے لیے پھریری سی پھرگئی۔

خیر اس سے تو وہ خالی ذہن کے ساتھ خاموشی اور تیز رفتاری کے ہمراہ جلد از جلد اسی جگہ پہنچ جاتا تھا جہاں ارستیاں ایک جگہ کرنے کے بعد جمع کی جاتی تھیں۔ اس کے بالکل برابر میں ایک جوہڑ تھا جہاں بیٹھ کے ایک جاپ کرنے کا حکم جوگی مہاراج نے دیا ہوا تھا۔ سخت تاکید تھی کچھ بھی ہوجائے بات نہیں کرنی نا ہی جاپ ادھورا چھوڑنا ہے ورنہ نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہی ہوگا۔

اشوک رانا جس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سے کوئی حرکت کرتی ہوئی چیز یا کوئی بھی انہونی شے اس جوہڑ میں پائی جائے گی اسی لیے وہ سکون سے ساتھ لایا ہوا ململ کا کپڑا بچھا کے سکون سے بیٹھ گیا اور سوامی کا بتایا ہوا ایک مخصوص منتر پڑھ کے حصار باندھ لیا۔

من ہی من میں وہ جاپ ایک بار دہرایا جس کی ایک سو ایک بار گنتی کرنی تھی اور آنکھیں موندھ کے شروعات

طرح یہ جھنڈا نام کا بھوتنا سوریہ مہاراج کی بات مان لے۔
"ہمارا کیا بھلا ہوگا پھر یہ بتاؤ سوامی جی۔" جھنڈا نے سوچتی ہوئی آواز میں سودے بازی شروع کی۔
"بول تجھے کیا چاہیے۔"
"ہوں، اس بار بھی تم اس جاپ کو پورا نہیں کروا سکے ہو مہاراج جی۔ ہماری مانو وہ گیان چھوڑ ہی دو تم۔" جھنڈا نے سودے بازی سے پہلے سوریہ کا ایمان کرنا چاہا۔ "کوئی چار سو سال تو ہوگئے مہاراج جی، آپ کے پرش اسی جگہ سے آگے نہیں جا پاتے تو دوجے گیان کیسے کریں گے۔"
"یہ تیرا کام نہیں ہے جھنڈا۔ تو فکر نہیں کر اس کی۔ میرے پاس ایک دیوی بھی ہے بس ذرا سے دیکھ رہے ہیں اس کے پاس آنے کا۔"
ہاہاہاہا ایک بلند آواز قہقہے نے اشوک پر لرزہ طاری کردیا۔
"اس جگہ بڑے سے بڑا پرش بھی کچھ نہیں کرسکتا مہاراج جی ایک دیوی کے چکر میں ہیں۔ لوسن لیو بھئی۔ لگتا ہے مہاراج اب تمہارا انتم وقت آن ہی پہنچا ہے۔"
"تو اپنی بات کر جھنڈا اس کو چھوڑ رہا ہے یا نہیں۔"
"نہیں چھوڑیں گے تو تم ہم کو سزا دو گے کیا۔" ایک طنزیہ آواز اشوک کی سماعت سے ٹکرائی۔ "یہ تو ویسے ہی مرنے والا ہے کیوں اس کے پیچھے ہم سے بگاڑتے ہو مہاراج جی۔"
"یہ تیرے سوچنے کا کام نہیں ہے۔ تو اسے چھوڑ رہا ہے یا......"
"یا......؟"
"تم مہا گرو کو بھولے تو نہیں ہونا جھنڈا۔"
"اوہ۔ اب سوامی جی ہم کو مہا گرو کے نام پر مجبور کریں گے۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔"
"ہاں یا نہیں۔ دیکھ رات ختم ہونے کو ہے۔ تجھے بھی معلوم ہے تو دن میں نہیں رہ سکتا اور میں اس سے زیادہ اس کی رکھشا نہیں کرسکتا۔ سوریہ کی پہلی کرن پڑتے ہی یہ پرش اپنے دائرے سے آزاد ہوجائے گا اور تو اس کو بھوجن سمجھ کے ایک ہی بار ڈکار لے گا۔ تو اب بول کون سا سودا کرنا ہے تو نے لیکن اس کے مرنے کا تجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا یہ بھی سوچ لینا۔ پرنتو۔"
"سن رہے ہیں مہاراج جی سن رہے ہیں۔"
"پرنتو تجھے اگلی بار جوان کنیا دینا ہمارا کام ہے۔"
"یہ کی نا کام کی بات سوامی جی۔ دل خوش کردیا۔ جاؤ لے جاؤ اس کو پر اپنا وچن یاد رکھنا ورنہ اگلی بار۔"
اشوک نے سکھ بھری سانس لیتے ہی گھسٹنے کی آواز سنی اور اسی کے ساتھ کوئی جانور دھپ سے اس کے کھینچے ہوئے دائرے میں آگرا۔
"چلو اشوک جی ذرا جلدی چلو ادھر سے۔" اشوک نے گھبراہٹ کے عالم میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے رکھے کھڑے ہونے کی کوشش کی اور دھڑام سے گر گیا۔
"ارے ارے، سکون سے، اب وہ گیا۔" اشوک نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا اسے محسوس ہوا پاس سے کوئی بلی گزری ہے جیسے ہی اس کے دائیں بائیں اسے تلاشنا چاہا، یکا یک اشوک کے سر پر بیٹھی ہوئی کالی بلی نے اس کو دبوچ لیا۔
"چھوڑ ہم کو چھوڑ۔ کون ہو تو۔"
بلی نے اشوک کو بری طرح اپنے شکنجے میں لے کے بے ہوش کردیا۔

......❁❁......

"اب کب ملوگی دیوی۔" جنسی نے شالو کا گداز جسم تکتے ہوئے کہا۔
"جب آ گیا دوگے۔" شالو نے رجھاتے ہوئے انداز میں جنسی کو دیکھ کے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ مزید ریشہ خطمی ہوگیا۔
"ہم کا وچار ہے کہ اب پتا جی......"
"ناہی ناہی سرکار۔ ایسا انت ناہی کرنا۔ تم کا پاپ لگے گا۔"
"لگنے دو شالو۔ تمہارے کارن ہم نرکھ میں کودنے کو بھی تیار ہیں۔"
"سوچ لیو سوامی۔" شالو نے ذرا جھک کے ہاتھ جوڑے اور سوامی بولتے ہوئے جنسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
"ہوئی گیا فیصلہ اب تو ہماری دھرم پتنی بن کے ہی رہے گی۔"
"ہم تو تہار کی چرنوں کی دھول بھی ناہی سوامی۔" اور

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کی۔ کچھ دیر بعد ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آس پاس حرکت کررہا ہے، اشوک نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں لیکن جاپ جاری رکھا۔ ارد گرد دیکھ کے اندازہ لگانا چاہا لیکن کوئی ہوتا تو دکھائی دیتا۔ جیسے ہی وہ دوبارہ آنکھیں موندنے لگا تھا کہ دائیں سمت جوہڑ کے عین اوپر چند اچھلتے ہوئے اجسام پر اس کی نظریں ٹھہر سی گئیں۔

سامنے گندے پانی کے جوہڑ میں چھوٹے بڑے اعضا والے چند ڈھانچے چھلانگیں لگاتے ہوئے اشوک رانا کو اپنی طرف متوجہ کررہے تھے۔ ان میں سے کسی کا سر بہت بڑا تھا تو کسی کے کان ہی کان تھے۔ کسی کی آنکھیں پورے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں تو ایک کا صرف سر ہی تھا۔

اشوک ٹکٹکی باندھے ان کو دیکھتا رہا کہ اچانک اس کے کانوں میں سوریہ مہاراج کی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔

"بالک جاپ نہیں رکنا چاہیے۔"

اشوک نے ایک جھٹکے کے ساتھ دوبارہ پڑھنا شروع کردیا لیکن یہ بات الگ ہے کہ جوہڑ کی طرف سے آنکھیں پھیرنے کی ہمت نہیں تھی اس میں۔ زبان پتہ نہیں کیا کہے جارہی تھی لیکن وہ اپنے ہواس میں نہیں تھا کیونکہ اب اس جوہڑ سے ایک عجیب وغریب قسم کی مخلوق اسی کی سمت آرہی تھی۔

صاف چٹ سر جس کے عین بیچوں بیچ ایک ہی لیکن کافی لمبی آنکھ تھی بغیر بھوؤں کے وہ ایک ٹک اشوک رانا کو گھور رہی تھی دیکھتے ہی دیکھتے وہ عجیب سی مخلوق گھسٹتی ہوئی اشوک کی سمت بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ تو اشوک کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ اس کے چھ ہاتھوں کی بھی دس دس انگلیاں تھیں۔ جیسے ہی وہ رینگتی ہوئی نزدیک آئی اشوک نے زوردار جھرجھری لیتے ہوئے اپنی آواز بلند کردی۔ ہاتھوں کے نیچے کوئی دھڑ نہیں تھا۔ وہ چیز سکون سے گھسٹتی ہوئی اشوک کے دائرے میں آرہی تھی۔

"کیا کررہے ہو مہاراج۔ کیوں کشٹ اٹھا رہے ہو۔"

اس عمر میں ایک سرسراتی ہوئی چبھتی آواز اشوک کا دل دہلا گئی۔ "ہمارے پاس آجاؤ ہم آپ کی آگیا کا پالن اوش کریں گے۔"

اشوک جو شاید سانس لینا ہی بھول چکا تھا اسے اپنی آنکھوں کے عین سامنے رکتے دیکھ کے ایک دم خاموش سا ہوگیا۔

"بالک جاپ جاری رکھ۔ یہ تیرا متر نہیں ہے۔"

سوریہ مہاراج کی تیز گونج اشوک کے کانوں میں گونجی۔

اشوک ہکلاتے ہوئے دوبارہ جاپ کو یاد کرنے لگا لیکن وہ اب کتنی بھول چکا تھا۔

"آں ہاں لگتا ہے مہاراج جی کچھ بھول گئے ہیں۔ چلو پھر ہم ہی سواگت کرلیتے ہیں۔ آؤ متر وآؤ۔" یکایک اس ایک آنکھ والے سر سے مسکراتی ہوئی آواز نکل کے شمشان گھاٹ کے اس جوہڑ کے کنارے بلند ہوگئی۔

اشوک نے ڈرتے ڈرتے آس پاس دیکھا تو اس کے منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔ جوہڑ کے اندر سے مختلف سائز کے ڈھانچے اور کٹی پٹی نعشیں اچھل اچھل کے باہر آرہی تھیں۔

"اب ہم تیری سہاتا کیسے کریں نادان بالک۔"

"سوریہ مہاراج کی آواز میں نمایاں افسوس تھا۔

"ہمرے کو معافی دے دیو مہاراج پرنتو ادھر سے بچالیو بس۔" اشوک نے گھگھیاتے ہوئے بنتی کی۔ "جو تم بولو گے وہ ہم کریں گے بس ایک بار ادھر سے جندہ بچالیو ہم کا۔"

"ایک بار پھر سوچ لو مہاراج بہت بڑا وچن دے رہے ہو۔"

"ہاں ہاں ہم وچن دیتے ہیں۔" اشوک نے مہاراج کے انداز سے اندازہ لگایا وہ اسے بچا سکتے ہیں۔

"چلو پھر آنکھیں بند کرلو اور جب تک ہم آگیا نا دیں آنکھیں نہیں کھولنا ورنہ اس بار ہم بھی کچھ نہیں کرسکیں گے۔"

سوریہ مہاراج کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اشوک رانا نے تیزی کے ساتھ اپنی آنکھیں موندھ لی اور اپنے ہاتھ سے دونوں آنکھیں کو ڈھانپ بھی لیا۔

......

"نا نا نا۔ سوریہ جی اس بار نہیں جانے دینگے تم کو۔"

"اسے چھوڑ دے جھنڈا۔"

"ناہی سرکار اس بار کی نہیں ہو رہی۔"

"کام کا پرش ہے جھنڈا۔"

اشوک لرزتے ہوئے دونوں آوازیں صاف سن رہا تھا اور دل ہی دل میں سورج دیوتا سے مسلسل بنتی کررہا تھا کسی

سوامی سنتے ہی بنسی رانا اپنی سدھ بدھ کھو گیا۔

......۞۞......

دبے دبے ہوئے انداز میں پورے گاؤں میں سرگوشیاں ہورہی تھیں، شالو یعنی ایک شودر کی ایسی ہمت کیسے ہوسکتی ہے وہ برہمن ذات کے ساتھ رہنے لگے اور وہ اس کے کارن دوسروں سے لڑ بھڑ جائے۔

جب تک بات بنسی رانا کے ساتھ رات گزارنے کی تھی اس وقت تک کسی کے کانوں پر جوں نہیں رینگی تھی پرنتو اب شالو اپنے پر پرزے تیزی کے ساتھ نکالنے لگی تھی۔

مندر کے عقب میں برہموں کی عورتوں کے لیے ایک مخصوص تالاب بھی تھا جہاں اونچی ذات کی برہمن عورت ہی نہا سکتی تھی باقی ندی کے سنگ نہاتی تھیں۔ پہلے پہل شالو نے اس تالاب کے پاس جانا شروع کیا اور ایک دن وہ عین اس موقع پر جا پہنچی جب برہمن زادیاں نہا رہی تھیں۔ شالو کو وہاں دیکھتے ہی وہ سب کی سب حیران پریشان رہ گئیں اور ہش ہشش کرکے اسے بھگانے لگیں۔ لیکن شالو جو آئی ہی اپنا آپ دکھانے کے لیے تھی مسکراتی ہوئی تالاب کے پاس سے گزرتی چلی گئی۔

برہمن زادیوں کے لیے یہ بھی بہت تھا۔ فوراً ہی بات گاؤں کے مردوں تک جا پہنچی اور چند بڑے لوگوں نے مل کے طے کیا اگر اب بھی اس نیچ ذات کو سبق نہیں سکھایا تو دوسرا کوئی اور بھی یہ ہمت کرسکتا ہے اس بار عورت ہے اگر مرد نے ایسا کام کیا تو مشکل ہوجائے گی۔

سب سے پہلے کلو کو بلایا گیا اور اس کو اس کی اوقات یاد دلانے کے بعد فرمائش کی گئی فوراً ہی جاکے شالو سے بولو معافی مانگے اور آئندہ کے لیے یہ کام نہیں کرنے کا عندیہ دے۔ کلو جو یہ سن کے ہی حیران رہ چکا تھا فوراً ہی اپنی کٹیا کی سمت دوڑ لگا گیا۔

......۞۞......

”اشوک جی ہم آپ کی بہت عزت کرتے رہے پرنتو بنسی جی۔“

”ہوا کیا پنڈت جی۔“ اشوک جو دنوں میں ہی بیمار اور ایک دم بڈھا ہوگیا تھا پھولی ہوئی سانسوں کے درمیاں اپنی بات کرسکا۔

”آپ کے پرکھوں کے اتنے احسان ہیں اس گاؤں پر ہم نے مناسب جانا پہلے آپ کو ہی بتادیں، بنسی نے شالو کے ساتھ۔ چلو وہ تو کوئی بات نہیں لیکن شالو وہ نیچ جات بنسی مہاراج کی شہ پر اپنی اوقات بھول رہی ہے۔ کل وہ تالاب پر آدھمکی۔ جو کام بھی نا دیکھا نا سنا وہ اب اس گاؤں میں ہونے جارہا ہے اشوک جی اور وہ بھی آپ کے سپوت کے کارن۔“

”ایسا نہیں ہوسکتا پنڈت جی۔ میرا بنسی یہ نہیں کرسکتا۔“ اشوک نے بے یقینی سے پنڈت کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔

”میری نا مانیں مہاراج، گاؤں کے کسی بھی پرش سے پوچھ لے۔ وہ بتادے گا۔“

”ہے رام رام۔ کل یوگ ہے کل یوگ۔“ اشوک بوکھلا کے رام رام جپنے لگا۔

”آپ بھولے تو نا ہی ہوں گے نا مہاراج جی، یہ شالو اسی رادھیکا کی......“

”ہاں ہاں ہم کا سب یاد ہے۔ پرنتو اس کی سپتری اتنی بڑی کب ہوگئی۔“ اشوک نے اپنے ہاتھ کی سمت دیکھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گیا۔ جو بھی تھا وہ آج تک بھولا نہیں تھا کیسے ایک عورت وہ بھی نیچ ذات کی اس کے ہاتھ سے پھسل گئی تھی اور جاتے جاتے ایسا زخم دے گئی تھی جو رہتی زندگی ٹیس دیتا رہتا تھا۔

”کچھ کرنا ہی پڑے گا پنڈت جی۔“

”بس آپ آگیا دیں مہاراج۔“ پنڈت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اشوک یکایک چونک سا گیا۔ ”کیا کوئی سہاتا کر رکھی ہے آپ نے۔“ اور پنڈت نے دھیرے سے گاؤں والوں کا منصوبہ بتانا شروع کردیا جس کو سنتے سنتے اشوک کے چہرے پر اطمینان پھیلنے لگا۔

......۞۞......

”شالو۔“ کلو نے جھجکتے ہوئے اپنی جوان اور تنک مزاج بیٹی کو پکارا۔

”ہاں باپو۔“ شالو نے رانی سے کھیلتے ہوئے معروف انداز میں باپ کی پکار کا جواب دیا۔

”وہ ہم کا گاؤں کے مکھیا جی کچھ بتائے رہت ہو۔“ کلو نے دھیرے سے بات کا آغاز کیا۔ شالو نے بے ساختہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

چونک کے کلو کو دیکھا اور سر جھٹک کے رانی سے کھیلنے لگی جیسی کوئی اہم بات ہی نہیں تھی۔

کلو جو شالو سے اتنی دیدہ دلیری کی توقع نہیں کر رہا تھا، اسے ایک دم رادھیکا یاد آ گئی۔ وہ بھی ایسے ہی تنک مزاج اور خود کو کچھ سمجھتی تھی۔

''چھوڑ باپو۔ گاؤں والوں کی عادت ہو رہے ہے اناپ شناپ بکنے کی۔ تو ان کی باتوں پر دھیان نا دیا کر۔'' شالو نے اس بار کلو کو گم صم دیکھا تو خود ہی نرمی سے اس سے بات کرنے لگی۔

''پرنتو۔''

''اے شالو۔'' روپا کی تیز آواز سے شالو کی بات ادھوری رہ گئی۔

''پرنام کاکا۔'' روپا نے کلو کو دیکھ کے لحہ بھر رکنے پر ہی اکتفا کیا اور فوراً ہی شالو کا ہاتھ پکڑ کے باہر کی سمت کھینچنے لگی۔ ''جلدی چل جلدی چل۔''

''اری کا آفت آن پڑی تو کا بدجات۔ گھڑی بھر کو رک تو۔'' شالو نے فوراً ہی روپا کا ہاتھ جھڑکا۔

''ہم کا پاس وقت نا ہی۔ تو کا او بلاوت ہے۔'' روپا نے پھولی ہوئی سانس سے جواب دیا۔

''کون ہم کا بلاوت ہے ری۔'' شالو نے ناسمجھی سے کلو کے سوالیہ انداز کو دیکھا اور کندھے اچکاتے ہوئے پارو سے پوچھا۔

''وہ کٹیا والے جوگی تیرے کو بلاوت ہے پگلی۔ چل جلدی کر۔'' پارو نے شالو کو گھورتے ہوئے جواب دیا تو کلو سمیت شالو بھی چونک گی۔

''کا......ہم کا......؟ پرنتو۔''

''تو آ رہی ہے یا ہم جائیں؟'' پارو نے پاؤں پٹخ کے باہر جاتے ہوئے کہا۔

''رک نا۔ ہم آ رہے ہیں رک۔ اچھا باپو ہم جا رہے ہیں۔'' شالو نے آخری بار باپ اور چھوٹی بہن کو دیکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔

......❁❁......

''نمستے۔''

''تو نہیں آئی تو ہم کو بلانا ہی پڑا تجھے۔'' سوریہ مہاراج نے شالو کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو شالو نے سوالیہ نظروں سے پارو کو دیکھا۔

''مہاراج جی آپ اس کا پہلے سے جانت ہو کا۔''

''ہم تو اس کو جنم سے بھی پہلے سے جانتے ہیں اور آج یہ اپنی اصلی جگہ آ ہی گئی ہے۔'' مہاراج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چل تو جا...... یہ آ جائے گی۔'' سوریہ مہاراج نے ہاتھ اٹھا کے آگیا دینے کے انداز میں پارو کو جانے کا کہا۔

''پرنتو مہاراج جی۔''

''بس تو جا کہا نا۔''

''کیا کام ہے مہاراج جی ہم سے۔'' شالو نے ناگواری سے پارو کو جاتے دیکھا تو سوال کیے بنا نہیں رہ سکی۔

''کیا کام ہے ہمرے سے تہار کو۔''

بس یہ ہی انداز ہم کو چاہیے تیرا۔'' مہاراج خوش ہوتے ہوئے بولے تو شالو نے ایک بار پھر تیکھی نظروں سے ان کو دیکھا۔

''نا نا۔ نادان بالک۔ ہم کو وہ نہیں چاہیے تو جس سے تو بنسی کو......''

ادھوری بات سن کے جہاں شالو چونک گئی وہی دور سے چیختی ہوئی آواز سن کے سوریہ نے ایک بار پھر شالو کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھ اب تیرا سمے شروع ہو گیا ہے اور تو ہمارے ساتھ ہی رکے گی۔ بس تجھے خاموش رہنا ہو گا۔''

''یہ کیسی آوا جیں ہیں مہاراج جی۔'' شالو نے الجھے ہوئے انداز میں باہر جانے کو قدم تولے۔

''نا......نا نا اری او نادان۔ باہر نہیں جانا۔ تو جا اس کپڑے کے پیچھے کھڑی ہو جا اور جو سنے جواب نہیں دینا۔ دھیان سے سن۔ تیری کوئی آواز نا آئے۔ سمجھ پریکشا ہے تیری۔''

شالو حیران پریشان ہوتے ہوئے کھڑی ہوئی اور کٹیا کی ایک سمت لٹکے ہوئے ململ کے کپڑے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

''مہارج جی مہاراج جی۔''

''شالو جیسے ہی ململ کے کپڑے کے پیچھے چھپی اسی وقت پارو کی گھبرائی ہوئی آواز سن کے شالو چونک گئی۔

''وہ مہاراج جی، شالو کہاں ہے۔''

''وہ تو جا چکی بالک۔''

''پرنتو مہاراج ہم ابھی تو......''

''ہم جھوٹ نہیں بولتے۔'' سوریہ کے لہجے میں تپش سی تھی۔

''ناہی ناہی۔ ہم کا او مطلب ناہی تھا۔ پرنتو وہ۔ وہ کلو کا کا۔ وہ......''

شالو بے چین ہوگئی لیکن سوریہ کی بات کو نہیں بھولی تھی جو اس نے کہی تھی۔ ''خاموش رہنا۔''

''رام بھلی کرے گا۔ جو ہوتا ہے وہی لکھتا ہے۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا مہاراج۔'' پارو نے حیران ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''جیون لیکھا ہم پڑھ لیتے ہیں، تو جا۔''

''مہاراج۔ شالو کو کہاں ڈھونڈیں اب۔''

سوریہ کی جانب سے خاموشی سن کے شاید پارو خود ہی باہر چلی گئی تھی، جب کچھ سے کسی قسم کی آواز نہیں سنی تو شالو جھجکتی ہوئی باہر کی اور آئی لیکن سامنے کا منظر دیکھ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

مہاراج جس جگہ پدھارے ہوئے تھے عین اس مقام پر ایک خوفناک کالا بلا اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے شالو کو گھور رہا تھا۔

شالو نے ایک نظر بلے پر ڈالی اور سکون سے کٹیا سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ بلے نے بھی شالو کے ساتھ برابر کے قدم اٹھائے اور اس کے کٹیا کے باہر نکلنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی۔ شالو جو بے دھیانی کے عالم میں بھی بلے کی جانب متوجہ تھی یکا یک ایک سمت جھک گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیوں ہم کا ڈراتے ہو، ہم ویسے ہی پریشان ہیں۔''

کالا بلا جو اڑتا ہوا اس کے بے حد نزدیک سے گزرتا چلا گیا تھا ہوا میں ہی اپنا رخ بدل گیا اور تیزی کے ساتھ ایک بار پھر شالو کے پاس آ گیا۔ شالو نے تنک کے بلے کو دوبارہ اپنے پاس آتا دیکھ کے آنکھیں سکیڑی اور اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تم کا ہمری بات سمجھ نا آوے، چلو آؤ پھر ہم تم کا بتاتے ہیں، جب شالو کو جانا ہو تو وہ کسی کی پروا ناہی کرے۔''

کالا بلا جیسے ہی شالو کے پاس آیا اس نے ہاتھ بڑھا کے اس کو دے مارا۔ اسی وقت مہاراج کی آواز سن کے جہاں وہ بلا غائب ہوا وہیں شالو بھی چونک گئی۔

''اوش ہماری منو کامنا پوری ہونے کا سمے آ گیا۔ واہ واہ۔ دھنیئے ہو گیا سوریہ تیرا جیون۔ یہ آخری موقع تھا ہمارے پاس۔'' مہاراج خوشی سے بھرپور لہجے میں شالو کی سمت آئے اور اس کو آشیرواد دیا۔

''جا شالو تجھے آشیرواد دیتا ہوں۔ تجھے جو چاہیے وہ تجھے ملے۔''

''سوچ لو مہاراج بڑی بات کہوت ہو تم ہم کا۔'' شالو نے مسکراتے ہوئے مہاراج کی سمت دیکھا۔

''تجھے رادھیکا کا اپرادھی چاہیے نا۔'' مہاراج نے شالو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تو وہ چونک گئی۔

''تمرے کو کیسے معلوم ہوا جی۔''

''ہم کو کیا نہیں معلوم بالکے۔ پرنتو تو ہمارے لیے ایک جاپ کرے گی تو وہ اپرادھی تیرے قدموں میں ہوگا۔ بول سودا منظور ہے۔''

مہاراج نے وقت ضائع کیے بغیر ہی شالو سے سودا بازی کرنی چاہی۔

''جاپ؟ مہاراج جی تم کا معلوم ناہی ہو، ہم نیچ جات ہیں مندر کے اندر نہیں جا سکت تو جاپ کہاں سے کریں گے۔''

''مندر والے جاپ ہم کو چاہیے بھی نہیں شالو دیوی۔ تجھے نہیں معلوم تو کیا ہے۔ بس یاد رکھنا۔ اشوک چاہیے تو ہماری ایک بات ماننی ہے تجھے۔''

شالو نے ناسمجھی سے سر ہلایا اور آ گیا چاہی جانے کی۔

''اور سن۔ ابھی جو بھی تو دیکھے گی باہر اس سے ہمت نہیں ہارنا۔ واپس چلی آنا میری اور۔ اسی کٹیا میں پڑی رہنا پرنتو کچھ کرنا نہیں۔''

سوریہ نے گمبھیر لہجے میں شالو کے چلتے قدم روکے۔

شالو نے گھبراتے ہوئے سوال پوچھا۔ ''کا ہوا ہے باہر؟ مہاراج جی تمرے کو معلوم ہے تو بتا دو کا ہے کو تنگ کرت ہو۔''

''بس تو جا۔'' مہاراج نے اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے آنکھیں موندھ لی تو شالو نے بھی باہر جانے میں ہی عافیت

دیکھی۔

......۞۞......

"ہکا کام کرت ہو نا پنڈت جی۔" اشوک نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اپنی تسلی کرنی چاہیے۔"

"اوش اشوک جی۔ ایسے کام میں کوئی کوتاہی نا ہی ہوسکت ہے۔" پنڈت جی نے پرشاد کا لڈو کھاتے ہوئے سکون سے اشوک کو جواب دیا۔

چلو اب سکون سے بھوجن کرت ہیں۔ حرام کے جنوں نے نیچ جات ہو کے بھی ہم کا جینا دوبھر کرت رکھا۔" اشوک نے مندر کے اندر جاتے ہوئے پنڈت جی سے مزید بات کرتے ہوئے گالیاں دیں۔

......۞۞......

"تم کا کس نے بتایا پارو؟" بنسی رانا نے گھبرائے ہوئے انداز میں سوال پوچھا۔

"ہم اپنی آنکھوں سے دیکھت رہے مہاراج جی۔ دور سے ہی اگنی کی تپش آئے رہی۔"

"پرنتو شالو۔"

"مہاراج شا چاہتے ہیں۔ اس کا جواب نا ہی ہم کے پاس۔"

"وہ کہاں گئی پارو۔ وہ کہاں گئی۔ ہمارا جیون نرشٹ ہوجائے گا اس کے بنا۔" بنسی نے تڑپتے ہوئے روپا سے فریاد کی۔

"کسی بھی طرح اوکاں ڈھونڈو پارو، ہم تم کا پیسہ دیئے رہے۔ جاؤ جاؤ۔"

ہیجان آمیز لہجے میں بنسی نے تقریباً روتے ہوئے روپا سے منت کی تو وہ شالو کی قسمت پر ناز کرتے ہوئے بنسی کی تسلی کرانے لگی۔

"ہم اس کا ڈھونڈت رہے مہاراج۔"

......۞۞......

شالو پھٹی ہوئی آنکھوں سے اپنی کٹیا کی جگہ آگ کی لہروں کا ظالمانہ ناچ دیکھ رہی تھی۔ ابھی اسی جگہ کچھ دیر پہلے باپو کے ساتھ رانی بھی تھی جس کے ساتھ وہ کھیل رہی تھی تو ساتھ باپو کے سوال کے جواب بھی دے رہی تھی اور اب ادھر صرف تپش تھی، آگ تھی اور چیخیں تھیں۔

شالو کی آنکھوں میں خون کی سرخی لہرا گئی۔

"نہیں نہیں۔ شالو نہیں۔ ہمارا وچن یاد رکھ۔" شالو کے کانوں میں سوریہ مہاراج کی آواز گونجی تو وہ چونک گئی۔

مہاراج کو سب علم تھا اور اسی وقت شالو کو پارو کا گھبرائے ہوئے انداز میں واپس کٹیا میں آکے شالو کے متعلق پوچھنا یاد آیا۔

"تو یہ اونچی جات کے مہاپرش کا کام ہے۔ ہم نیچی گندی جات ہیں تو ہم کا کوئی بھی مار دے، ہماری کوئی جگہ نہیں اس سنسار میں، پہلے ماتا او کے بعد پتا اور رانی۔"

رانی کی یاد آتے ہی شالو کو اس کی قلقاریاں اپنے دل میں ماتم کی آواز میں سنائی دی۔

"ہم نہیں چھوڑیں گے تم کا، چن چن کے ماریں گے۔" شالو نے غصے سے ایک طرف تھوک کے تہیہ کیا اور تیز قدموں کے ساتھ واپس سوریہ کی کٹیا کی جانب بڑھی۔

......۞۞......

"دیکھ شالو۔ اس جاپ کے بعد میں تیرے ساتھ مل کے ان اپرادھیوں کو سزا دونگا۔ پرنتو پہلے تو میرا کام کر۔"

"مہاراج جی۔ جب ہم ادھر سے شانت ہوں تب ہی تمہار کا کام کرتے ہیں نا۔" شالو نے ایک ہاتھ سے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ "ہمری راتوں کی نیند ہم سے روٹھ گئی ہے۔ سوتے جاگتے اگنی ہی اگنی نجروں کے سامنے رہے ہمرے۔"

"پرنتو۔" سوریہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"ہم جی جان لڑا دیں گے تمہار خاطر، پہلے ہمارے اپرادھی ہم کا دے دیو مہاراج۔ ہم بنتی کرت ہیں تمہار کی۔"

"اری نادان بالک۔ ہم تم کو وچن دے چکے ہیں اور کیا چاہیے تم کو۔" مہاراج نے شالو کو تسلی دیتے ہوئے کہا لیکن شالو جس نے جیون بھر اپنا استحصال دیکھا تھا ایسے کیسے کسی پر یقین کر سکتی تھی کہ وہ اپنا کام ہونے کے بعد شالو جیسی دلت کو پہچانے گا بھی۔

"ہم پروشواس کرینگی۔"

"ہم کرتے ہیں مہاراج جی۔ پرنتو ہمری بنتی ہے اپنے بھگوان کی کھاطر ہی ہم کا اپرادھی ہم کے حوالے کر دیو پہلے پھر بھلے سے ہمری پران بھی لے لیو۔"

"ہم نہیں ماننے کی تو ایسے۔ اپنی ہی منوائے گی۔"

"ہمری جگہ پر آن کے دو چار کرو مہاراج جی۔ جوالہ مکھی

بنے بیٹھے ہیں ہم۔ اک اک کو بھسم کرنے کا من ہے ہمارا شالو کا بس نہیں چل رہا ہے وہ کس طرح فوراً سے پیشتر اشوک رانا اور پنڈت کا ستیاناس کردے۔"

"تم کو وچن دینا ہوگا ہم کو۔" سوریہ نے کچھ سوچتے ہوئے شالو کو پرکھا۔

"ہمری پران بھی تم کی مہاراج جی۔ یہ شالو کا وچن ہے شالو کا۔" شالو نے فخر سے گردن اٹھا کے وچن دیا۔ "جو بولو گے کریں گے ہم۔"

......❁❁......

"اے روپا۔ سن ری ہم کی بات۔"

بکھرے ہوئے بالوں والا بنسی روپا کو دیکھتے ہی اس کی سمت لپکا۔

"مہاراج جی۔ ہم کو باپو کی سوگندھ، شالو کا کچھ اتہ پتہ نہیں۔" روپا نے ڈرے سہمے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں شما کردیو مہاراج جی۔ جان دیو ہم کو۔ کوئی دیکھ لے گا تو ہم کو بھی شالو کی طرح۔"

"شالو کی طرح۔ کیا مطلب تم کا؟" بنسی بے شک عورتوں کے معاملے میں گرا ہوا تھا لیکن وہ سیاست سے کوسوں دور ہی تھا۔

روپا نے آہستگی سے اسے بتایا، ارستیاں ڈھونڈتے ہوئے اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ شالو اس سے وہاں نہیں تھی۔ لیکن یہ راز شودر والوں نے اپنی جات برادری کی ایک مظلوم کنیا کو بچانے کی خاطر منظر عام پر نہیں آنے دیا۔ روپا سے بنسی کا اداس چہرہ نہیں دیکھا گیا اور اپنی دوست کا گھر بسانے کی معصوم خواہش کے چکر میں وہ اسے بتا گئی۔

"تو وہ اگنی جان کے لگائی گئی تھی روپا۔ میری شالو کی پران اتنی سستی تو نا ہی تھی ری۔" بنسی نے اپنے پتا کے منصوبے کا سن کے دکھ کے ساتھ زیر لب کہا۔

"مہاراج جی ہم کا نام آپ کے سنگ آیا تو ہمری پران بھی۔" اور بنسی رانا نے سر ہلاتے ہوئے اپنے گھر کی اور قدم بڑھا دیے۔

......❁❁......
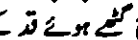
سوریہ مہاراج گٹھے ہوئے قد کے ساتھ عجیب سی جسامت کے مالک تھے، گیروے رنگ کی دھوتی نچلے دھڑ پر تھی، جٹاؤں کی طرح بکھرے بال، بہت ملا اوپری دھڑ اور چندن کا بڑا سارا تلک۔ بڑے بڑے خرگوش کی مانند باہر کو نکلے ہوئے کان۔

سوریہ جس کی دس ہزار سال کی عمر مختلف جاپوں اور کالے جادو سمیت صدیوں کی تپسیا تھی، لیکن انسانی فطرت کے عین مطابق مزید خواہشات کے لالچ میں مبتلا ہو کے وہ اب بہروپ بدلنے کی شکتی پانے کے چکر میں تھا۔ تین ہزار سال کی عمر وہ کرچکے تھے، ابھی ان کے پاس سات ہزار سال تھے جیوت کے اور اب ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا وہ بہروپ بدلنے پر قادر ہوجائیں اور مہا گرو کی کرسی ان کی ہوجائے۔

مہا گرو جو صدیوں کی تپسیا کے بعد بہروپ بدلنے پر قادر ہوچکے تھے اور اب مہا گرو کی کرسی پر بیٹھ کے اپنے چیلوں کو سکھاتے تھے، انہوں نے اس جاپ کی ایک کڑی آزمائش رکھی ہوئی تھی کہ کسی عام پرش کو تین دن کے لیے ایک مخصوص جاپ کے بعد ہی اس کالے جادو کی وہ شکتی دیں گے تاکہ مہا گرو کا خطاب مل سکے۔ مہا گرو ایک وقت میں ایک ہی ہوسکتا تھا اور وہ جاپ اس کے ہی ہاتھ میں ہوتا تھا کہ اپنے سے نیچے آنے والے کو سکھا دیں۔ جتنا مشکل امر عمل ہوتا اتنا ہی مہا گرو رہنے کا موقع رہتا تھا۔ اسی لیے ہر نیا مہا گرو اپنے چیلے کو مشکل سے مشکل عمل بتاتا تھا اور اس بار چیلہ تھا سوریہ۔ جو پرش کے چکر میں پھنس کے رہ گیا تھا لیکن اب اس کے عمل کے مطابق شالو ہر کٹھن مرحلے کی چابی تھی اور وہ عنقریب مہا گرو بننے جا رہا تھا۔

......❁❁......

"مہاراج جی آگیا دیجیے۔"

"آؤ آؤ اشوک جی آؤ۔"

اشوک پھولی ہوئی سانسوں کے سوریہ کی کٹیا میں داخل ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

"تم کو یاد ہے نا، یہ جیون ہماری دین ہے تم کو۔"

"اوش مہاراج اوش۔" اشوک رانا کو وہ ہیبت ناک رات یاد آگئی جب وہ لمبے جیون کے لالچ میں کالا جادو سیکھنے کا ایک جاپ کرنے لگا تھا اور چھ ہاتھ والی عجب مخلوق نے اس کو بہکا دیا تھا۔

"ہمارا ایک چھوٹا سا کام ہے۔"

اشوک رانا ہمتن گوش ہو گیا اور مزید مودب ہو کے بیٹھ گیا۔ شاید اس کام کے بعد مہاراج جی خوش ہو کے اسے کوئی اہم خصوصیت دان کر دیں۔

"پرانے شمشان گھاٹ کے پاس جو کنواں ہے......"

"مہاراج وہ تو خشک ہے سالوں سے......"

"ہماری بات پوری ہونے دو اشوک جی۔" سوریہ نے ناگواری سے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"شما چاہت ہیں۔"

"اس پر ایک جاپ کرنا ہے ہم کو، تمہاری ضرورت ہوگی ہمیں۔" اشوک اس بار خاموشی سے بات سنتا رہا۔

"اس پورن ماشی کی رات ہم وہاں پدھاریں گے، تم خاموشی سے وہیں آجانا اور اس سے پہلے ہم تم کو چند کام بتائیں گے وہ کر لینا۔"

"پرنتو مہاراج وہ جھنڈا۔"

"تم کو یاد ہے وہ بھوتنا۔" سوریہ نے مسکراتے ہوئے اشوک کی سمت دیکھا اور ہاتھ بڑھا کے ایسا اشارہ کیا جیسے کسی کو بلایا ہوا۔

"وہ بھولن لاگن چیز ناہی تھی سوامی جی۔ بوہت خوفناک تھی سسری۔" اشوک نے چور نگاہوں سے پیچھے کی سمت دیکھنا چاہا، لیکن ایک دم ہی ڈر کے چیخ اٹھا۔ اس کے بالکل برابر کالا بڑے سکون سے چلتا ہوا سوریہ کی جانب جا رہا تھا۔

"ہوں بس سمجھو اسی سے ایک آخری بار ہماری ملاقات ہے۔"

"وہ ہمرے کو کچھ کہے گا تو ناہی نا مہاراج جی۔" اشوک کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ کالا بلا سوریہ کے برابر جا کے بیٹھ گیا اور اپنی زبان سے دم کو چاٹنے لگا تھا۔ "ہم چلت ہوں۔" اشوک رانا اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا شاید"

"یاد رکھنا بالک، پورن ماشی کی رات"

......۞۞......

"شالو ہمری جان۔ ہم کی یاد نا آوت رہی تم کا۔" بنسی رانا نے شالو کو دیکھتے ہی اپنی بانہوں میں چھپانا چاہا۔

"یاد تو ہم کو رانی اور باپو کی بھی آوت رہی سوامی جی۔" شالو نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا تو بنسی نے بے ساختہ منہ پھیر لیا۔ کس دل سے بتاتا اس کا پتا ہی اس کام میں شامل تھا۔

"ہم اپرادھیوں کو سجا دینگے سوامی۔ تم ہم کا ساتھ دوگے۔" شالو نے بنسی کو آزماتے ہوئے کہا۔ جو بھی تھا وہی پہلا پرش تھا جو جسمانی طور پر اتنا قریب رہ چکا تھا، ایک انسیت ہوگئی تھی اس سے شالو کو۔

"ہیں؟" بنسی رانا نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا زندگی میں ایسا وقت بھی آئے گا کہ پتا کے خلاف ہی جانا پڑے گا۔

"بس اتنی ہی ہمت تھی سوامی جی۔ آپ کی شالو، آپ کی چاہ میں اتنی آگے چلی گئی کہ ماتا پتا کے اپرادھی کے بیٹے کے ساتھ ہی اور......" شالو نے ایک دم ہی تیکھے لہجے میں بنسی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ بات نہیں ہے پرنتو۔"

"اور کا بات ہے مہاراج جی۔ مان لیو، ہم بچ جات کے لیے تم کے پاس ہمت نا ہی ہے۔ بس رات کے سمے ہی سارا پریم یاد آوت ہے۔"

"ناہی ناہی۔ بھگوان کی سوگند ایسا ناہی ہے۔ ہم تم کو سچے من کے ساتھ پریم کرت ہیں شالو۔" بنسی رانا نے ہکلاتے ہوئے بات مکمل کرنے کی کوشش کی۔ "پرنتو باپو کے خلاف......"

"ہم ہی نادان ٹھہرے سوامی، جو اپنے ماتا پتا کے قاتل کے ساتھ ہی......"

شالو نے بلند آواز میں بنسی کو دھمکایا۔ "پرنتو یاد رکھت رہے۔ ہم اپنے کھاندان کے اپرادھیوں کو ناہی چھوڑے رہے۔ تو خود ای فیصلہ کرتے رہے، ہم کا ساتھ دوگے یا اپنے باپو کا......"

......۞۞......

"اور کتنا سے انتجار کراؤگے مہاراج جی"۔ شالو نے بے صبری سے سوریہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے اسے صبر کی تلقین کی۔

"دھیرج رکھو دھیرج۔ گرم کھائے گی تو منہ جل جائے گا۔"

"ادھر پورا بدن اگنی پر دھرا ہے مہاراج جی۔" شالو نے چبھتے ہوئے لہجے میں سامنے رکھی ہوئی کالی ماتا کی مورتی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

”یہ بھگوان بھی ہم کا ناہی سنت رہے۔کیوں پران دیئے رہے ہم کو بھگوان جی جب بجزت ہی ناہی دھری ہم کی ریکھاؤں میں۔“

”چھتا ناہی کر،سزا دے کے تو سکھ پالے گی نا۔“

”پرنتو ماتا پتا کو تو کھو دیئے نا ہم۔رانی بھی گئی۔ہمرے پاس بچا کا ہے اب کھونے کو۔“

”شکتی مان ہونے کے کارن تجھے اتنا بتا دیتے ہیں،تو ایک مضبوط ناری ہے۔جو چاہے کرسکتی ہے۔پرنتو اکیلے نہیں۔“

”ہم کا بتاؤ مہاراج جی۔ہم شکتی لینا چاہتے ہیں تا کہ چن چن کے ان اونچی جات کے لوگاں کو سجا دیں۔بوہت ہی دکھ دیے ہی وہ ہم کا۔سارا جیون ان کا ٹٹی صاف کیے رہے اور آخر میں بھی ٹٹی ہی بن گئے۔“

”کرلے گی تو وہ جاپ؟“

”ہم کے اندر اتنا آگ ہے سوامی جی۔سب بھسم کردیں گے پرنتو شکایت ناہی کریں گے۔“

”ہوں۔چل پھر رات کا انتظار کرتے ہیں۔پورن ماشی میں ابھی سے ہے جب تک تو کچھ عمل سیکھ لے تا کہ خود ہی سزا دے لے اپنے اپرادھیوں کو۔“

”پورن ماشی ماں ایسا کا کھاس ہے۔“شالو نے ناسمجھی سے سوریہ سے سوال کیا۔

”چندرما ہی تو ہم سب کا مائی باپ ہے شالو دیوی۔تجھے سمجھ نہیں آئے گی۔بس تجھے آ گیا کا پالن کرنا ہے یہ بات یاد رکھنا۔“اور جواب میں شالو کا وشواس بھراہلتا سر سوریہ کو اپنی منزل سے قریب کرتا محسوس ہوا۔

......❁❁......

شالو جو رات آنے تک کٹیا کے اندر بیٹھی وقت گزار رہی تھی اچانک اس کے من میں باہر جانے کی خواہش مچلی وہ سونے جاگنے کی کیفیت میں اٹھ کے باہر نکل گئی۔باہر کی تیز ہوا نے اسے ہوش میں آنے کی دوا سا کام کیا۔

”ارے ہم ادھر کیسے آگئے بھیا۔“شالو نے زیرلب خودکلامی کی۔

”منع کیا تھا تجھے نادان منع کیا تھا۔“

کٹیا کے پاس سے ہی اسی پرانے جوگی بابا کی آواز سن کے شالو کی رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔یہ واحد آواز اس سنسار میں ماتا کی خیر خبر دیتی تھی۔

”جوگی مہاراج ہم کی ماتا۔“

”اب کا ہے کی ماتا۔تجھے منع کرکے گئے تھے ہم یا نہیں۔کیوں نا سنی ہماری بات۔“جوگی نے اداس لیکن غصے سے بھرپور نگاہوں سے شالو کا جائزہ کیا۔”سے کا انتظار کرنے کا کہا تھا تجھ سے۔رادھیکا نے سالوں او پواس رکھ کے مہاراج سوامی پرتاب جی کو راضی کیا تھا اپنی سہاتا کے لیے تو نے پل بھر میں ایک ایک چیز نرکھ میں ڈال دی۔“

”اری بالک۔ماتا کی بات مانتے ہیں یا ناہی۔اب بتا وہ کیا کرے،اس چندرما کا انتظار وہ جنم جلی سالوں سے کررہی تھی۔اس کو وچن دیا تھا مہاراج پرتاب نے۔پرنتو تو نے سوریہ کے ساتھ مل کے جو ناٹک رچایا اس نے ستیاناس کردیا۔“

”ہمیں آگیا دیجئے جوگی مہاراج جی۔پرنتو اتنا سے ہم سے نہیں دیکھا جاتا۔“شالو نے تنک کے جواب دیا۔”ماتا جی کو ہمارا پیغام دے دینا،چھتا ناہی کرے،ہم ایک ایک پاپی سے حساب لینگے اور بتا دینگے چمارن کی بھی عجت ہوتی ہے۔“

......❁❁......

بالآخر رات ہو ہی گئی اور شالو کے ساتھ سوریہ پرانے شمشان گھاٹ کے پاس جا پہنچا۔

”اس کے پار تو نہیں جائے گی اور ناہی کسی بات کا جواب دے گی۔“سوریہ نے صاف کپڑا بچھا کے اس پر شالو کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود انگلی سے دائرہ بنادیا۔

”پرنتو۔“

”دھشش اس سے کیول ہماری بات سن کسی کی بات پر دھیان نا دینا نا ہی کسی کو جواب دینا۔جاپ کسی صورت نہیں رکنے پائے ورنہ ہم ذمہ دار ناہی ہونگے۔“

شالو نے ناسمجھی سے سر ہلایا اور دل ہی دل میں سوریہ کا بتایا جاپ دہرانے لگی۔

”جیسے ہی چندرما اپنی سمت بدلے گا تو جاپ بند کردینا میں تیری سہاتا کروں گا۔یہ تیری پہلی پریکشا ہے۔“

......❁❁......

شالو نے سوریہ کے جانے کے بعد سکون سے آلتی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پالتی ماری اور جاپ شروع کردیا۔ وہ جاپ پڑھتی رہی، رات گزرتی رہی اور اس کا ذہن کئی قسم کے وچار میں مصروف رہا۔

"اب ہم سب کا دیکھت رہے۔ اِک اِک کونرکھ یاترا کرائے رہت۔ اشوک رانا جی۔ اونچی جات ہونے کا مطلب یہ ناہی تو ہمرے کھاندان کو مار دے۔ ہم کی اک ای منو کامنا رہی۔ پنڈت اور اشوک کے پران اپنے ہاتھوں سے نکالنا۔ بوہت جلم کیا رے ہمرے ساتھ بوہت۔"

شالو کی زبان بے شک جاپ کررہی تھی لیکن اس کا ذہن مکمل طور پر اس جگہ سے کٹا ہوا تھا شاید یہی وجہ تھی وہ ڈرے بنا ہی بیٹھی رہی۔

وقت گزرتا رہا اور شالو روانی کے ساتھ سوریہ کا بتایا ہوا جاپ کرتی رہی لیکن ڈھلتی ہوئی رات کے ساتھ ساتھ اس کو محسوس ہورہا تھا جیسے اس کے ارد گرد کچھ لوگ منڈلا رہے ہیں۔ یہ انسانی ہیولے تھے جو اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ شالو چلتی زبان کے ساتھ حیران نظروں سے ان کو دیکھتی رہی کیونکہ وہ دور دور سے ہی اسے بلا رہے تھے لیکن کوئی بھی سوریہ کی کھینچی ہوئی لکیر کے پار نہیں آرہا تھا۔

شالو کے لیے یہ سب ایک ڈراؤنے خواب کی مانند تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتی رہی لیکن جاپ نہیں روکا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہیولے ایک ایک کرکے غائب ہوگئے تو شالو بھی کندھے اچکا کے دوبارہ سکون سے آنکھیں موندھ کے چندرما کے جانے کا انتظار کرنے لگی لیکن یہ تو ابتدا تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا شالو کو لگ رہا تھا سانپ نیولے اور بچھو ایک ایک کرکے اس کے اوپر سے چھلانگ لگا رہے ہیں۔ شالو نے سہمی ہوئی نظروں سے ان کو دیکھا لیکن زبان نہیں روکی اور بالآخر خشک ہوتی زبان اور ڈری ہوئی نگاہوں نے چندرما ڈوبتے دیکھ ہی لیا۔

......❂❂......

"دھنی ہوگیا دیوی دھنی۔ ہوگیا تیرا جیون۔" شالو جو غنودگی میں چلی گئی تھی ایک دم ہی سوریہ کی تیز آواز سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا مہاراج۔" شالو نے مندھی مندھی نظروں سے آس پاس دیکھا۔ ہر چیز وہی تھی پرانی لیکن شالو کو اپنے اندر کچھ بدلا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ کچھ تھا الگ بتانے کے لیے نہیں تھا لیکن محسوس کیا جاسکتا تھا۔

"ہم کو معلوم تھا تو یہ کردے گی۔ ہم کو معلوم تھا۔ دھنے ہو دیوی کی۔"

"ہوا کیا سوامی جی۔" شالو نے بے زار ہوکے پوچھا۔ پوری رات بیٹھے بیٹھے پہلے ہی بدن ٹوٹ سا رہا تھا۔

"وہ دیکھ شالو وہ دیکھ۔" سوریہ نے مسکراتے ہوئے دور گاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا دیکھت رہے مہاراج جی۔ ہم ادھر جنم لیے ہیں۔ ایک ایک کوس جانت رہے۔"

"ارے بالک۔ غور سے دیکھ۔"

اب جو شالو نے آنکھیں سکیڑ کے دیکھا تو دور بہت دور روپا جھاڑو لگاتے ہوئے نظر آئی۔ پرنتو۔ کیسے وہ تو بہت دور ہے۔ مندر کے پاس اور سوریہ کی کٹیا گاؤں کی حدود سے باہر شمشان گھاٹ کے پاس تھی۔

شالو نے الجھی ہوئی نگاہوں سے سوریہ کو دیکھا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے اس کی تسلی کرائی۔ "اب تو دور کی چیز بھی دیکھ سکتی ہے شالو۔ رات کا جاپ اسی طاقت کے لیے تھا۔"

"ہائے رام۔" شالو نے بے ساختہ سوریہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ کا بولت رہے ہو مہاراج جی۔"

"ہماری بات مانتی رہ اور دیکھ پھر یہ سنسار تیرے چرنوں میں ہوگا۔"

......❂❂......

اگلا دن شالو نے دور دور کی چیزوں کو پاس آتے دیکھا اور بہت دیر تک اسی چیز سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ ایک شکتی مان کا سا احساس بھی بہت دلفریب تھا اس جیسی دلت کے لیے اور اس سے اگلے دن وہ اس عمل سے بھی بے زار ہوگئی۔ کب تک ایک ہی چیز سے دل بہلا سکتی تھی۔ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ اونچی پروان اڑنا چاہتی تھی وہ۔

"مہاراج جی ہم کا لاگن ہے وقت ضائع کرت رہے ہم۔"

"ہم تجھے بول رہے ہیں، گرم گرم ناہی کھا۔"

"آپ ہم کا کوئی دوسرا عمل بتائے رہو نا سوامی جی۔ وقت بھی گجرے گا اور شکتی بھی ملت رہی۔" شالو نے خود

کو مزید طاقتور بنانا چاہا۔

”سسری بوہت ہی تیز ہے تو۔“ سوریہ نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے شالو کو تکا۔

”ہم کو کوئی غلام دو سوامی جی۔ جو ہماری بات مانت رہے اور ہماری سہاتا بھی کرے۔“

”تیرا ایسا دماغ کہاں سے آیا ری۔“ سوریہ نے حیران ہوتے ہوئے شالو کی فرمائش سنی۔

”نیچ جات ہے نا سوامی جی۔“ سنسار کو بوہت ای دیکھ لیت رہے۔“ شالو نے دھیرے سے اپنی اوقات خود کو ہی یاد دلائی۔

”پرنتو وہ سخت جاپ ہے۔ دو دن کا ہے، تو ڈر تو نا ہی جائے گی۔“ سوریہ شالو کی جگہ ہمیشہ اپنی مہا گرو ہونے کی خواہش کو ہی دیکھتا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا مہا گرو بننے سے پہلے شالو کو کوئی نقصان پہنچے۔

”پہلے ڈرے تھے کیا رے سوامی۔ تو ہمرے کا جانت نا ہی کا؟“ شالو نے ناگواری سے سوریہ کو تکا۔

”چل پھر سمے کا انتظار کر اور رات کو چل اپنے ٹھکانے سوریہ کو بھی پہلی ہی بار شاید ایسا کوئی متر ملا تھا جو بہادری کے ساتھ خوبصورت بھی تھا اور ڈر جس کی گھٹی میں ہی نہیں تھا۔

......۞۞......

”دیکھ دیوی۔ اس جاپ میں تجھے بہت کچھ دکھائی دے گا۔“

”ہاں ہم کا یاد ہے، جاپ نہیں رکنے کا۔ پھکر نہیں کرو۔“

”شالو اتنا بھی اترانا اچھا نا ہی، منہ کی نہیں کھانی پڑے۔“ سوریہ نے لگے ہاتھوں نصیحت بھی کی۔

”مہاراج جی۔ اب ہم کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ عجت اپنے ہی ہاتھوں سے گنوا دی سالی۔ پران بچے ہیں، جس کو لینے ہیں لے لیوے پرنتو ہم شکتی حاصل جرور کرت رہے اس بار۔“

”چل پھر شروع ہو جا۔“ جاتے جاتے سوریہ ایک بار پھر دائرہ بنانا نہیں بھولا۔ ”چند ماں کے اس جگہ آتے ہی آ جاؤں گا۔ تو اگر جندہ رہی تو۔“

شالو کو اپنے بدن میں سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

......۞۞......

جاپ کو شروع کیے کچھ ہی وقت ہوا تھا کہ شالو کو ایسا لگا وہ دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ہڑبڑا کے اس نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا لیکن وہ ایک ہی جسم کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ سر جھٹک کے اس نے آنکھیں موندھ لی تا کہ یکسوئی سے جاپ کر سکے۔ پرنتو اتنا آسان ہوتا تو سنسار میں ہر ایک ہی کالا جادوگر کے شکتی مان نہیں بن جاتا۔

شمشان گھاٹ کے پاس جو جوہڑ تھا اس میں سے اچانک بلبلے نکلنے شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ وہ بلبلے تیزی سے ایک ہیولہ بنانے لگے اور بالآخر اونچا چوڑا ہیولہ تیار ہو کے سبک قدمی سے جوہڑ سے باہر نکل آیا۔ شالو نے جاپ جاری رکھتے ہوئے بغور اس ہیولے کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا وہ زمین پر نہیں بلکہ کچھ بلندی پر ہوا میں تیرتا ہوا اس کے پاس آ رہا تھا۔

”او ہو دیوی جی گیان میں معروف ہیں۔“ ایک چبھتی ہوئی آواز شالو کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”آ گیا ہو تو عرضی پیش کر دوں آپ کے چرنوں میں۔“

شالو جو ساری زندگی گندے سے گندے القاب سنتی آئی تھی، اس عزت کے پکارنے پر بے ساختہ لحہ بھر ٹھٹھر گئی۔ اسی کے ساتھ سوریہ کی تیز آواز نے اس کا ذہن جھنجوڑ دیا۔

”اپنا دھیان نہیں بانٹ نادان۔“

شالو نے جھرجھری لیتے ہوئے ایک بار پھر اپنا جاپ جاری کر دیا۔

”ارے دیوی جی۔ کچھ تو ہماری طرف بھی توجہ دے دو۔ بوہت دور سے آئیں ہیں آپ کے پاس۔“

ہیولے نے جب دیکھا شالو اس کی طرف متوجہ نہیں ہو رہی تو یکا یک اس کے منہ سے شعلے نکلنے لگے۔

”اچھا تو دیوی جی، پریم سے بات نہیں مانتی آپ تو ایسے ہی سہی۔“

ہیولے نے شعلوں کے ساتھ اس کے گرد پھیرے لگانے شروع کر دیے، اس کی تپش شالو کو صاف محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی، ایک بار پھر سوریہ کی کھینچی ہوئی لکیر سے وہ آگ اندر نہیں آ رہی تھی۔

"دیوی جی ۔ ہم کو بالکل ہی نظر انداز کر رہی ہیں۔" اچانک شالو کو پیچھے سے ہنسی کی آواز سنائی دی تو بے ساختہ پلٹ گئی۔

"ہم ادھر ہیں شالو۔ من کی آنکھوں سے دیکھو نا۔" اشوک کی آواز اس بار سامنے سے آئی تو شالو ٹھٹک گئی۔

اشوک کو سامنے دیکھ کے اسے اپنی ماتا کا خیال آ گیا۔

"اوہو شالو کاہے ایسے بیٹھی رہو۔ ای لو۔" اشوک نے ہاتھ میں پکڑا چاقو اس کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا "اپرادھی تم کا سامنے کھڑا ہے، ہمت ہے۔" اشوک نے زہریلی مسکراہٹ سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے للکارا۔

شالو کی سانسیں تیز ہونے لگیں تھی۔ کچھ اپنے طاقت ہونے کا احساس اور اشوک کے کمزور جسم کے ساتھ چاقو کی تیز دھار اس کا من اچاٹ کر رہی تھی۔

"شالو بچ جات، تو کا اندر غیرت ناہی۔ بیٹھی بڑ بڑ رٹ رہی، آ جا باہر نکل آ جا۔" اچانک اشوک کے لہجہ بدلا ہوا چبھتی ہوئی آواز شالو کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کا دھیان واپس ہوا۔

"اچھا تو ایسے ہم کا دھیان ہٹانے آ گیا سسری کا ذات۔" شالو کو غصہ آ گیا اور غصہ آتے ہی اس نے محسوس کیا وہ جو بڑا اپنی پرانی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ شالو نے سر جھٹک کے ایک بار پھر اپنا دھیان جاپ پر لگایا اور بیتتی رات کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

"شالو او شالو۔ ہم کا بچالے۔" اچانک روپا کی آواز پہ شالو نے بند آنکھیں کھولی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"ادھر شالو ادھر۔" جو بڑ کے عین اوپر روپا ہوا میں معلق تھی۔

شالو کی سانس رک سی گئی۔ اس سنسار میں ایک روپا ہی تو بچی تھی جو اس کی دوست تھی، بہن تھی۔

"کیسی دووِدھا میں پھنسا دیا ہم کا مہاراج جی۔" شالو نے گہری سانس لے کے جاپ جاری رکھا لیکن ایک ٹک سامنے روپا کو دیکھتی رہی۔

"شالو تو ہم کو بچانے نہیں آوت؟ کیسی دوست ہے ری تو۔" روپا بری طرح سسکتے ہوئے شالو کی منتیں کرتی رہی۔ شالو نے سر جھٹک کے جاپ کو زور زور سے دہرانا شروع کر دیا۔ اس سے روپا باہر نہیں نکل سکتی تھی اور اتنی دور یعنی شمشان گھاٹ کے پاس مر جاتی لیکن نہیں آتی۔ وہ اندھیرے سے ڈرتی تھی۔

"ناہی ناہی۔ ای روپا ناہی اے۔" شالو نے بلند آواز میں جاپ کا ورد جاری رکھا تو آہستہ آہستہ روپا بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کچھ وقت سکون سے گزرا ہی تھا کہ۔ بالکل پیچھے سے رانی کی قلقاری سن کے شالو کو سکتہ ہو گیا۔

"دیدی۔ دیدی۔" رانی نے آہستگی سے شالو کو پکارا۔

شالو نے سسکی لیتے ہوئے بے ساختہ پلٹ کے دیکھا سامنے ہی رانی اسے دیکھ کے دونوں بانہیں پھیلائے بلا رہی تھی۔ شالو فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔

"یہ رانی نہیں ہے۔ چھل ہے چھل۔" سوریہ کی تیز آواز بھی شالو کو نہیں روک سکی۔

رانی بنا کچھ کہے صرف شالو کو دیکھ کے مسکراتی رہی اور اپنی سمت بلاتی رہی۔ شالو نے کھڑے ہوتے ہی اپنی اوڑھنی درست کی اور جیسے ہی دائرے سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھایا ایک دم سوریہ کی آواز نے اسے روک دیا۔

"منزل کے قریب پہنچ کے تو بھی باؤلی ہو رہی ہے بالک۔ یہ فریب ہے من کی آنکھیں کھول۔"

شالو کو ایک جھٹکا لگا اور اس نے ترسی ہوئی نگاہوں سے سامنے کھڑی رانی کو دیکھا اور بھیگتی ہوئی آنکھوں سے رانی کے پاؤں بھی غور سے دیکھے جو چندرما کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہے تھے کہ دھرتی سے کچھ بلند ہیں۔

شالو دھیرے دھیرے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دوبارہ جاپ کرتی اپنی جگہ آ بیٹھی۔ رانی جو مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی یکا یک دیوہیکل ہیولے میں بدل گئی۔

"بہت ہی چالاک ہو دیوی جی۔ لگتا ہے مہاراج نے پکا کر کے بٹھایا ہے۔" اس بار شالو نے آنکھیں موندھ کے جاپ جاری رکھا۔

"چلو دیکھتے ہیں کب تک وہ سہاتا کر سکتا ہے۔ ہم بھی ادھر ہی ہیں۔" چبھتی ہوئی آواز آہستگی سے دور ہوتی چلی گئی اور شالو خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔

پیاس کی شدت سے شالو کی زبان سوکھ کے چمڑا بن گئی تھی لیکن وہ رک نہیں سکتی تھی اور نا ہی دائرے سے باہر نکل

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سکتی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے سوریہ کو تلاش کرنا چاہا لیکن ہر سو ویرانی ہی تھی۔ چندرما بھی شاید آج ایک ہی جگہ چپک گیا تھا۔

شالو کا ذہن پیاس کی وجہ سے سن سا ہو رہا تھا اسی وقت شالو کو سوریہ نظر آیا جو اس کی سمت فخر سے دیکھ رہا تھا۔

شالو نے احتیاط سے آکاش کی سمت دیکھا اور مسکراتی ہوئی اپنی ایک اور کامیابی کی طرف بڑھتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

سوریہ نے ہاتھ سے نفی کا اشارہ کیا تو شالو ٹھٹک گئی۔

''اسی دائرے میں رہنا ہے تجھے۔''

''ہم کا پیاس لگی ہے مہاراج جی اور ساتھ ہی.....'' شالو جھجک کے خاموش ہوگئی۔ ''وہ بھی تو ناری جات کیسے بتاتی اسے حاجت ہو رہی ہے۔''

''دائرے سے باہر نہیں شالو۔ بالکل بھی نہیں۔''

''مہاراج جی وہ......''

''سب ادھر ہی کرلے شالو۔ یہ معمولی چیزیں ہیں۔ ایک بار سنسار کی گپت شکتیاں ہاتھ آ جائیں تو ان کو کون پوچھتا ہے اور ہے بھی کون تجھے دیکھنے والا۔ دائرہ دیکھ بڑا ہے، گڑھا کھود لے اور فارغ ہو جا۔ رہی پیاس تو اپنے دائیں اور دیکھ۔'' شالو نے بے ساختہ دیکھا تو جوہڑ قریب ترین تھا۔

''جوہڑ سے ہی اپنی پیاس بجھا لے۔ رہی بھوک تو وہ دو دن برداشت کر اور بس پھر تیسرے دن تو جو چاہے گی تو اسی جگہ ملے گا تجھے۔''

''کیا.....دماغ چلت گیا تو کا مہاراج جی؟'' شالو حیران پریشان جوہڑ کا گندہ ترین بدبودار پانی دیکھ رہی تھی جس پر برسوں پرانی جمی ہوئی کاہی کے اوپر بھی چھوٹے چھوٹے سفید کیڑے تیر رہے تھے۔

''جوہڑ کے لیے باہر کیسے نکلے گی نادان کنیا۔'' شالو جو پہلے ہی حیران پریشان تھی یہ بات سن کے سوریہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اس کا ایک ہی حل ہے۔ جو تیرے جسم سے جل نکلے......''

''کیسی گندی باتیں کرت ہو مہاراج جی۔ چھی چھی چھی چھوٹی جات جرور ہیں پرنتو ای کام......'' شالو کو ابکائیاں آنے لگی۔

''ابھی تو تجھے بہت سی کٹھنائیوں کا سامنا کرنا ہوگا شالو۔ یہ تو پہلا پڑاؤ ہے۔''

''پرنتو مہاراج جی۔'' شالو کو ایک بار پھر ابکائی آئی۔

''تجھے معلوم ہے ہم کہاں کھڑے ہیں۔'' سوریہ نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ شالو کا دھیان بانٹا۔

''ہم سمجھے ناہی۔''

''پگلی ہم اپنی کٹیا کے پاس ہیں اور دیکھ تو کیسے ہم سے بات کر رہی ہے۔ یہ ایک رات کے جاپ کا تجھے پرشاد ملا ہے تو سوچ جب دوسری رات کا کام کرلے گی تو کیا شکتیاں ملے گیں تجھے۔''

شالو نے حیران ہوتے ہوئے تقریباً پاس ہی کھڑے سوریہ کو دیکھا اور غور سے مہاراج کے پیچھے اس کی کٹیا کو بھی۔

''جیون بھر کی محرومیاں ختم ہونے والی ہیں خاص طور پر تیری خاندان کے اپرادھی تیرا انتظار کر رہے ہیں اور تو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے پیچھے پڑی ہے۔'' سوریہ نے تیز آواز میں شالو کو دھتکارتے ہوئے کہا۔ ''جا تیرے بس کی بات نہیں ہے یہ کالا جادو حاصل کرنا۔ تو جا بنسی کے پاس اس کے ساتھ رات گزار اور بس۔ پر سوچ، کلو کے بارے میں سوچ۔ کیسے تڑپ تڑپ کے اپنے پران دیئے ہوں گے رانی کا سوچ۔ بیچاری چھوٹی سی بچی۔ مرنے کی عمر تو نہیں تھی اس کی۔ تو جا۔ گھر جا۔ بنسی ابھی بھی تیری ہی راہ دیکھ رہا ہوگا۔''

غصے میں گھری ہوئی شالو نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اشوک رانا کے ساتھ پنڈت کو اپنے تصور میں ہی پھانسی کے تختے پر لٹکے ہوئے دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے اس نے جوہڑ کی اور دیکھا۔

''شالو ہمت ناہی ہارنا سسری کہیں کی۔ یہ تہار کا پریکشا ہے۔ جرا سا کٹھنائیں ہیں پرنتو وجے تہار کی ہی ہوئے ہو۔'' شالو نے خود کی تسلی کراتے ہوئے بلند آواز میں کہا اور اِدھر اُدھر دیکھ کے اپنی حاجت پوری کرنے لگی۔

''سورگ باشی ماتا کی سوگندھ کھاتے ہیں اشوک مہاراج جی۔ تو کاں تو اپنے ہاتھوں سے گلہ دبائیں گے۔'' شالو نے ایک ہاتھ سے ناک دبائی اور اپنی پیاس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بجھاتے ہوئے بے ساختہ رونا برداشت کیا۔ ”ناہی چھوڑئیں گے تو کا پنڈت جی۔ بڑا انیائے کرت ہو ہم چھوٹی جات سے۔“ شالو نے پلکیں جھپکاتے ہوئے آنسوں کو بہنے سے نکلنے نہیں دیا لیکن اپنی ہچکیوں کا کیا کرتی جو اس کی اجازت کے بنا ہی، بے بسی کا اظہار کر گئی۔

”ناہی ناہی۔ ہم بھی ناہی روتے۔ ہم کم جور ناہی تو کاں بتائے رہے، عورت جات ہیں تو کا ہوا، پریوار کے لیے سارے جتنے ایک ہی ہو جائیں ہیں۔“ شالو نے دائرے کو دیکھ کے اپنے پاؤں پھیلائے اور اونگھتی کیفیت میں بھی خود کا سہارا بنی رہی۔

شام کے سائے پھیلے تو ایکدم شالو مہاراج سوریہ کی آواز سے ہڑبڑا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اری اٹھ جا بالک۔ دیکھ سے ہو گیا تیرے دوسرے دن کے جاپ کا۔“

شالو نے بمشکل اپنی مندھی مندھی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی اور تین چار انگڑائیاں لے کے جسم کو کھولنا چاہا۔

”تو بہت بھاگے شالی ہے شالو۔ اس جاپ کے دوسرے دن بہت کم لوگ جا پاتے ہیں۔ میں نے تجھے کہا تھا نا، تیرے اندر ایک شکتی ہے جو تجھے کبھی ہارنے نہیں دیتی۔ اب تو دیکھنا کیسے اس سنسار میں راج کرے گی تو۔“

”ہم کو اس پاپی سنسار سے کیا لینا دینا مہاراج جی۔ بس آپ ہم کو جلدی سے وہ شکتی دے دیو تا کہ ہمارے پریوار کے اپرادھی کو تڑپا کے جیون سے مکتی دے دیں ہم۔“

شالو نے سکون سے دائرے کے ایک کونے میں فارغ ہو کے پہلے اپنی پیاس بجھائی اور پھر گہری سانس لے کے دوبارہ دائرے میں آ بیٹھی۔

سوریہ نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ شالو کو دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے زیرلب دائیں سمت بیٹھے کالے بلے کو کہا۔

”دیکھا تو نے ہم کیسے اپنی منزل کے قریب جا رہے ہیں۔ بس کچھ ہی دن بعد ہم اس سنسار کے سب سے شکتی مان مہاراج بن جائیں گے۔“ بلند و بالا قہقہہ لگاتے ہوئے مہاراج نے شالو کو جاپ کی تیاری کرتے دیکھا اور واپس اپنی کٹیا کی جانب قدم بڑھا دیے۔

......❁❁......

”آہا دیوی جی۔ آپ بھی آ گئیں ادھر۔ کیسے پدھاری۔“

شالو نے بے زار ہو کے جیسے ہی جو ہڑ سے آتی آواز کو سن کے اس کو دیکھنا چاہا یکا یک اس کے سارے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

چندرما کی ٹھنڈی روشنی میں، بالوں سے صاف چٹ سر جس کے بالکل بیچوں بیچ لمبی آنکھ تھی وہ بھی بغیر بھوؤں کے وہ ایک ٹک شالو کو دیکھ رہی تھی۔ شالو نے غور سے دیکھا تو ایک بار پھر اسے اپنے جسم سے ٹھنڈے پسینے بہتے محسوس ہوئے۔

اس عجیب سے منہ والی مخلوق کی ایک ہی آنکھ تھی، ناک کان ماتھا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ آنکھ کے عین نیچے صرف ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ جہاں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی تو شالو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اچھل گئی۔

”کیوں دیوی جی۔ زیادہ پسند آ گئے ہم تم کو۔ آ جاؤ باہر۔“

”اے بھگوان ای کا ہے۔“ شالو نے کپکپاتے ہوئے جسم کو سنبھالتے ہوئے بنتی سی کی۔ ”ہماری سہاتا کرو مہاراج جی۔“

”کچھ نہیں ہوتا شالو۔ یہ تجھے کچھ نہیں کر سکتا۔“ سوریہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”دیوی جی، سوریہ مہاراج کی باتوں میں نا آنا۔ ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“ سوراخ سے ایسی آواز آئی جیسے وہ ہنسا ہو۔

شالو دم بخود رہ گئی۔ من کی باتوں کو کیسے پڑھ لیا اس نے۔

”ہم تو بہت کچھ پڑھ لیتے ہیں شالو جی۔ آپ ہمیں منورنجن کا سمے تو دیں۔“

ایک آنکھ والی مخلوق نے کچھ آگے آتے بولا تو شالو پلکیں ہی جھپکنا بھول گئی۔ چھ ہاتھ مختلف جگہوں سے نکلے ہوئے تھے تو اس چھ ہاتھ کی بھی دس دس انگلیاں تھیں۔ جیسے ہی وہ رینگتا ہوا دائرے کے پاس آیا تو شالو نے گھبرا کے پہلی بار جاپ روک دیا اور ہڑبڑا کے کھڑی ہو گئی کھڑی ہو کے بغور ایک بار پھر اسے دیکھا اور کانپ کے رہ گئی۔ چھ ہاتھوں کے نیچے کوئی دھڑ نہیں تھا۔ شالو لرزتے ہوئے جاپ بھول کے سوریہ کو پکارتی رہی، شاید وہ بلند آواز میں بلا بیٹھتی لیکن

اتہاس ایسے ہی نہیں رچ جاتا۔ اگر شالو جاپ کے درمیان کچھ اور بول جاتی تو آج یہ کہانی اسی وقت اپنے انجام کو ختم ہو جاتی لیکن شالو بدحواس ہو کے اپنی گویائی ہی کھو بیٹھی تھی اور یہی چیز اب اتہاس لکھنے لگی تھی۔

"دیوی جی۔ آجاؤ کچھ نہیں دھرا سوریہ کے جاپ میں۔"

"شالو چپ۔ کچھ نہیں بولنا۔" سوریہ مہاراج دہاڑ کے شالو کو حواس میں لائے۔

"ہم تیرے بچن ہیں دیوی جی۔"

"چلا جا مجنڈا چلا جا۔"

"ناہی مہاراج ناہی۔ اب ہر بار تو آپ کی نہیں چلے گی نا۔"

شالو دم سادھے بیٹھی رہی۔

"یہ وہ نہیں ہے۔" سوریہ گھبرا کے بول پڑے کہیں شالو غلط نہیں سمجھ جائے۔

"کیوں جھوٹ باندھتے ہو مہاراج جی۔ شوبھا نہیں دیتا۔ ہمارے من کو بھا گئی ہے کنیا۔"

سوریہ مہاراج کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس بھوتنے کو جوہڑ کے اندر پھینک دیں لیکن وہ بھی مجبور تھے۔ اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے تھے۔

"سوریہ۔ تم نے وچن دیا تھا اگلی بار جوان کنیا کا بلیدان دو گے ہمیں۔ بس اب اپنی بات سے نہیں پھرو۔"

شالو نے حیرت سے اپنی کٹیا کے پاس کھڑے سوریہ کی طرف دیکھا جو گھبرائے ہوئے انداز میں اسی کی سمت دیکھ رہا تھا۔

"پرنتو یہ وہ کنیا نہیں ہے۔"

"اب وشواس گھات نہیں کرو۔" ایک آنکھ والا چہرہ لمحہ بہ لمحہ دائرے کے انتہائی قریب ہوتا جا رہا تھا۔

شالو نے بے یقینی سے پہلے مہاراج کو دیکھا اور اچانک بلند آواز سے جاپ کا ورد کرنے لگی۔ جہاں ایک طرف مجنڈا حیرت کی زیادتی سے رک گیا وہیں مہاراج کا چہرہ جوش سے لال پڑ گیا۔

"شالو بولتی رہ۔ بولتی رہ۔ رکنا نہیں۔"

"اب شالو نہیں رک سکتی مہاراج جی۔" پرنتو شالو نے من ہی من میں مہاراج کو جواب دینا جاری رکھا لیکن زبان سے جاپ کرتی رہی۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

"رہن دیو مہاراج جی رہن دیو۔ ہم کو تہار سے ایسی چھوٹی بات کی......"

"ناہی ناہی۔" شالو مسلسل بہتی آنکھوں کے ساتھ سر نفی میں ہلاتی رہی۔ "ہم چھوٹی جات تو جنمے ہی سنسار کے لیے ہیں۔"

سوریہ ہونٹ بھینچ کے رہ گیا۔ اب کچھ بھی بول لیتا لیکن وہ شالو کا من صاف نہیں کر سکتا تھا۔

مجنڈا غصے سے پہلے شالو اور پھر مہاراج کی سمت دیکھنے لگا۔

"مہاراج جی۔ وشواس گھات۔"

"مجنڈا یہ وہ نہیں ہے۔ تو جا ابھی۔"

"اس بار بھی جا رہے ہیں پرنتو......" مجنڈا نے شالو کی آنکھوں میں اپنی اکلوتی آنکھ سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اچھا دیوی جی۔ تو ہمارے من کو بھا گئی ہے۔ آنا تو ہمارے پاس ہی ہے تو نے۔"

شالو نے بہتے آنسوؤں سے اس چھ ہاتھ والی چیز کو رینگتے ہوئے جوہڑ کے اندر جاتے ہوئے دیکھا اور جاپ پڑھنے لگی۔

......❁❁......

"روپا۔ اے روپا۔"

"جی باپو۔" روپا نے ادھیڑ عمر روی کو جواب دیا جو جھگی کے باہر بیٹھا اپنے بچپن کے دوست کلو کی جھگی کی جگہ کالی راکھ کو دیکھ رہا تھا۔

"شالو کہاں ہے ری۔"

"ہم کا جانت باپو۔"

"وہ ہمری جمہ داری ہے اب۔ اوکاں کھیال رکھت۔"

"باپو اوسایئد۔ سوریہ مہاراج کے......"

"رام رام رام اوتو......" روی گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔

"کا ہوا باپو۔ کچھ گڑبڑ ہے کا۔" روپا نے روی کا سہما سا روپ دیکھ کے سوال پوچھا۔

"وہ ہم سنے ہیں......" روی نے اپنی آواز پست کی۔

"وہ کالا جادو کرت اے۔" روپا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''وہ گندے کام کرت ہے، بلی بھی چڑھاوے ہے۔ کہی شالو......؟'' روی نے پریشان ہو کے روپا کی سمت دیکھا جو پہلے ہی سہمی سی کھڑی تھی۔

''بالو اب؟''

''ہم کی تو بدھی ہی کھتم ہو گئی ہے۔ جنم جلی ہم کے گھر ناہی رہی۔'' روی نے تنک کے بات جاری رکھی۔ کا منہ دکھائے گئے کلو کو اب۔ ہائے رام۔ شما کر دے ہم کو۔ ہائے کلو بڑی بھول ہوئی۔'' جہاں ایک طرف روی کا رونا جاری تھا تو دوسری طرف روپا بھی اپنی دوست کے لیے پریشان ہو گئی تھی۔

......❁❁......

اشوک رانا خاموشی سے سوریہ کے کہے ہوئے احکامات کے مطابق کام کرتا رہا، اور بالآخر اس رات کے قریب آ پہنچا جب اس نے سوریہ مہاراج کے کسی مخصوص جاپ کے لیے کنویں والی جگہ جانا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ اس کا دل اس کو جانے سے روک رہا تھا۔ کچھ تھا جو اندرونی طور پر اسے منع کیے جا رہا تھا لیکن وہ سوریہ کو منع کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں جٹا پا رہا تھا اسی لیے خاموشی سے اپنی چھٹی حس کی آواز سن کے بھی ان سنی کرنے پر مجبور تھا۔

''پنڈت جی۔'' اشوک نے بالآخر دن ڈھلتے ہی سوریہ کے احکامات کے مطابق پنڈت کو گھیرا۔

''وہ حکم مہاراج۔'' پنڈت نے پوجا کی تھالی سے سیندور اٹھا کے اشوک کے ماتھے پر کلش بناتے ہوئے کہا۔

''آج رات آپ کو اور ہم کو......'' اشوک نے ایک دم بات ادھوری چھوڑ دی۔

''سنت رہے مہاراج۔'' پنڈت نے سوالیہ نظروں سے اشوک کی سمت دیکھا۔

''او ہم کہت رہے، آج رات جرا کنویں والی جگہ ملئے ہم سے۔''

''کھیریت ہے اشوک جی۔'' پنڈت نے پریشان ہو کے پوچھا۔

''شام کو ہی وہ جگہ اتنی ویران اور عجیب ہو جاتی ہے، رات کو تو رام جانے کیا لگتی ہو گی۔''

''او ہم ادھر ہی بتائے گئے تو کاں۔ اچھا چلت رہے جرا جلدی ہے ہم کو۔'' اشوک نے گھبراتے ہوئے بات پوری کی اور مندر سے باہر نکل گیا۔ سامنے ہی کالا بلا اسے مسلسل گھور رہا تھا اسی کارن وہ بات بھی صحیح نہیں کر سکا۔

''ہے بھگوان کیا ہم کے پیچھے لگ گیا یہ۔ سہاتا کر وہم کی۔ اگلی پوجا میں دودھ سے اشنان کرائیں گے تو کاں۔''

اشوک من ہی من میں باتیں کرتا ہوں سوریہ کی کٹیا کی جانب تیز قدموں سے چلتا چلا گیا۔

......❁❁......

سوریہ بھی اپنی جگہ پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ساری آس صرف شالو تھی جو اسے مہا گرو کی کرسی تک لے جاتی لیکن وہ جتنا شالو کے متعلق جانتا تھا اسے اندازہ ہو رہا تھا، شالو کو رام کرنا اب مشکل کام ہے۔ وہ ویسے ہی احساس کمتری کا شکار تھی اور بمشکل ہی سوریہ پر وشواس کرنے کے لیے تیار ہوئی تھی، لیکن اب رہی سہی کسر مجنڈا کی باتوں نے پوری کر دی تھی۔

''ہوں لگتا ہے اب اشوک کی بلی دینی ہی ہو گی ورنہ شالو ہاتھ سے نکل جائے گی۔ لیکن پھر ایک ہزار سال تک انتظار کرنا ہو گا۔ اوپر والا جانے پھر کوئی شالو ملے گی یا نہیں۔''

سوریہ کے لیے فیصلہ کرنا بے حد مشکل تھا۔ ہر ہزار سال بعد ایک خاص رات ایسی آتی تھی جس میں چاند کے گرد مخصوص ہالہ ہوتا تھا اور یہ کالا جادو کرنے والوں کے لیے بے حد قیمتی رات ہوتی تھی کچھ تو کرنا پڑے گا سوریہ ورنہ اور اس ورنہ کے آگے سوریہ بھی مجبور تھا کا تب تقدیر کے ہاتھوں۔

......❁❁......

شالو یاسیت کا شکار ہو کے پرانے شمشان گھاٹ کے بنے ہوئے کنویں کے پیچھے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اب اس جگہ سے انسیت ہو گئی تھی۔ جہاں کچھ ہی دن پہلے وہ لرزتی ڈرتی بیٹھی جاپ کر رہی تھی اب دن ہو یا رات وہ باآسانی ادھر آ جاتی تھی۔ شالو محسوس کر رہی تھی سوریہ اس سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ہر ایک چیز سے بے زار ہو چلی تھی۔ بالآخر اس تلخ حقیقت کو مان ہی لیا تھا کہ وہ نیچ ذات کی ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں چاہے وہ جتنی بھی شکتی حاصل کر لے۔ ہر ایک اس کا استعمال کرتا ہے۔ شالو نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر ہی دیا تھا لیکن صرف

ایک چیز پر وہ صبر نہیں کر رہی تھی۔ وہ تھا اشوک کا جیون اپنے ہاتھ سے لینا۔ سوریہ کو ڈھکے چھپکے الفاظ میں اپنی بات پہنچا دی تھی اور اب وہ بے چینی سے اگلی پورن ماشی کا انتظار کر رہی تھی تاکہ اپنے انتقام کی آگ بجھا سکے اور پھر جو سوریہ کہتا ہے بلا چوں کیے مان جائے۔

"ہم تہار سے پوچھت جرورر ہے بھگوان۔ کا ہے ہم کا بنایا اور اس سنسار ماں بھیجت رہو۔ کون سی سسری کی ہوگئی تیرے اس کھبصورت سنسار میں ہم گندے لوگاں کے بنا۔"

شالو نے دبی دبی ہچکیوں سے آخری بار آکاش کی سمت دیکھ کے گیلی آنکھوں سے شکوہ کیا اور سر منہ لپٹ کے اسی کنویں کے پاس لیٹ گئی۔

......❁❁......

"آپ کی آگیا کے انوسار ہر چیز ہوگئی ہے سرکار۔ دیکھت لیئو ے اک بار۔" اشوک نے دھیرے سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بات مکمل کی۔

"ہوں۔ ہم سوچ رہے ہیں تمہیں بھی، من چاہی چیز دے ہی دیں۔" سوریہ نے اشوک کو لالچ دیتے ہوئے کہا۔

"جیسا سرکار چاہیں۔ مترکی کا مرجی مہاراج جی۔" اشوک نے دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہیں سماتے ہوئے فوراً ہی کہا۔

"تو ایسا کرو راناجی۔ اس چندر ماتم بھی آجاؤ۔"

"ہیں......؟" اشوک کی سانس رک گئی۔ اسی وقت سوریہ کے پیچھے سے دو چمکتی ہوئی آنکھیں باہر نکل کے عین اشوک کی نظروں کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"پرنتو۔ پرنتو مہاراج۔ وہ......" اشوک کی سانس پھولنے لگی۔

"کچھ پانے کے لیے کٹھن راستے تو پار کرنے ہوتے ہیں نا۔" سوریہ نے اس بار سرسری انداز اپناتے ہوئے کالے بلے کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"ہم کا لمبا جیوت مل جائیگا نا مہاراج جی۔" اشوک مکڑی کے جالے میں پھنس ہی گیا۔

"اوش۔"

......❁❁......

"تو کا ہماری جیون کی سوگندھ ہے روپا۔" شالو نے روتے ہوئے اپنی بچپن کی دوست کے ہاتھوں کو تھام کے بنتی کی۔

"بس یہ آخری بات مان لے ہم کی۔ پھر جیون بھر کوئی بات ناہی منوائیں گے تہارے سے۔" شالو نے روپا سے نظریں چراتے ہوئے من ہی من میں بات مکمل کی۔

"اگر جندہ رہے تو۔"

"شالو چھوڑ دے نا ای سب کا۔ چل ہم کے ساتھ چل۔" روپا نے بھی دوست کے چہرے سے ناامیدی بھانپتے ہوئے سہارا دیا۔

"ناہی روپا۔ اب ناہی۔ کچھ بچا ہی کا ہے ہم کے پاس۔"

"ہم ہیں نا تہار کے دوست۔"

"اک تم کا ہی تو وشواس رہ گیا ہم کے پاس روپا۔ ہم کا ناہی چھوڑ دیو۔" شالو نے آس بھری نگاہوں سے روپا کو دیکھا تو بے ساختہ اسے گلے لگا گئی۔

"بس یہ اک اخری بار تو کو آزمارہے ہیں روپا۔ ہم تہار کو پریم کرت رہے بگلی۔"

شالو نے روپا کے ہاتھوں میں کچھ دیتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے بند کیا۔

......❁❁......

"ہم کی جمہ داری کھتم ہوگئی بنسی جی۔" روپا نے سسکی روکتے ہوئے بنسی تک شالو کا پیغام پر چا دیا۔ لیکن بنسی تو خلاؤں میں تک رہا تھا۔

"سنت رہے ہونا مہاراج؟"

"تو کا کہت ہے، ہم کا وشواس ناہی ہوئے۔ روپا، ہاں روپا کہاں ہے ری۔ بتا ترنت بتا ہم کا۔ بنسی بھول گیا وہ اونچی ذات کا برہمن تھا اور سامنے جمنوں کی چمارن روپا کھڑی تھی۔ بتادے ہم تو کا بوہت کھوش کر دیں گے، بول حرام کی جنی بول۔" بنسی سے برداشت نہیں ہوا تو دونوں کندھے دبوچ کے روپا کو جھنجوڑ ہی دیا۔

"مہاراج ہم تو کا گلام ہیں، چاہو تو پران لے لو۔ پرنتو وشواس کرو ہم کی بات کا۔" روپا نے سسکتے ہوئے کہا تو بنسی بھی اپنے ہواس میں آیا۔ "چندرما کے بعد شمشان گھاٹ پر وہ بگلی انتجار کرت رہی تو کا۔ تہارے پریم میں پاگل ہوگئی

ہے وہ باؤلی۔"

بنسی کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ جس کے لیے سنسار تیاگ گیا ہے وہ بھی اس سے پریم کرتی ہے۔

"درگا ماں کی سوگندھ کھا کے کہت ہیں اس میں سے جرا بھی کمی ہوئی تو کاں اپنے ہاتھوں سے نرکھ میں ڈالیں گے۔"

روپا نے بنسی کے ہاتھوں میں شالو کی دی ہوئی بوٹی دھری اور خاموشی سے واپس باہر نکل گئی۔

......۞۞......

"ہماری بات غور سے سنو شالو۔"

سوریہ نے شالو کو اپنے سامنے بٹھا کے نرمی سے بات کا آغاز کیا۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ بھی شالو کی نگاہوں میں بے یقینی دیکھ رہا تھا۔

"کچھ بھی ہو جائے تو بیچ جاپ کے نہیں رکنا۔ انرتھ ہو جائے گا نہیں تو۔ میں تجھے صاف بتا رہا ہوں۔ تو میرے کام کی ناری ہے۔ وہ مجنڈا تجھے بہکا رہا تھا۔"

"رہن دیو مہاراج جی۔ نا ہی محنت کرو ہم بیچ جات پر۔ اب تو بیوپار ہوئے۔ تو ہم کا اشوک بابو دیو ہم تو کا اپنا جیون دیوے رہے۔"

"کان کھول کے سن لے شالو۔ اشوک کو میں دیکھ لونگا۔ پھر کہے رہے ہیں۔ اشوک کو ہم خود ہی دیکھ لینگے۔ کل کا چندرما ہم کیول تیرے کارن کھو رہے ہیں۔ اب تجھے نہیں معلوم ہم کو کتنی پرتگیا کرنی پڑے گی۔"

شالو بے پرواہی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ سوریہ سب سمجھ رہا تھا لیکن کچھ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ ایک طرف شالو تھی جو اس کی آخری امید تھی تو دوسری طرف اشوک تھا جس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن شالو اس کے لیے کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"تو کیول جاپ کرے گی۔ سن رہی ہے نا کیول جاپ۔ باقی کام میرا ہے تو اس اشوک کے کارن میری تپسیا بھی بھرشٹ نہیں کر دینا۔" سوریہ کو کسی حال سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کس طرح اس چھوٹی لیکن ہٹ دھرم کنیا کو سمجھائے۔

......۞۞......

"ہم کی بنتی ہے تہار سے واپس چل ری۔" روپا نے شالو کی ایک بار پھر بنتی کی۔

"تو کا یہ اپوار ھار ہم کبھی نا ہی بھول سکت روپا۔" شالو نے بے ساختہ روپا کو اپنے سینے میں چھپا لیا۔

"چل نا حرام جادی واپس چل۔ بہری ہے کا۔ سنتی نہیں ہم کی بات۔" روپا روتے ہوئے مسلسل شالو کو اصرار کرتی رہی۔

"نا ہی۔ روپا۔ اب نا ہی۔ ہم کا اپرادھی کل ہم کے سامنے ہوئے۔ اس کو نرکھ میں دھکا دے کے ہم بھی ماتا پتا کے پاس۔"

"چپ کر سسری کی ناتی۔ کھاموس۔ ایسی بات کرے گی تو ہم ابھی بابو کو بلا لائیں گے۔" روپا نے سہم کے شالو کو روی کا نام لے کے دھمکایا تو شالو نے ایک بار پھر چٹاچٹ روپا کے گال پر پیار کرنے لگی۔

"تو جا۔ اب تو جا۔ ہم کا یاد رکھنا روپا۔ بھول تو نا ہی جائے گی نا ہم کا۔" شالو نے روپا کے دونوں ہاتھوں کو تھام کے آس بھری نگاہوں سے سوال کیا تو وہ بھی اپنی ہچکیاں برداشت کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا گئی۔

......۞۞......

"ہم کو لگتا ہے شالو کچھ تو ضرور کرے گی۔ تو کیا کہتا ہے رے۔" سوریہ نے پاس بیٹھے کالے بلے کو سہلاتے ہوئے خود کلامی سی کی۔ "پرنتو ہم کو یہ بھی لگتا ہے وہی ہماری مہا گرو بننے کا آخری اپوائے بھی ہے۔"

کالا بلا سکون سے بیٹھا ہوا اپنی زبان سے دم کو چاٹ رہا تھا۔

"اگر اس نے جاپ کو خراب کرنے کی کوشش کی تو ہم کیا کریں گے۔ بس یہ ہی سمجھ نہیں آ رہا ہے۔ اس کی بلی نہیں دے سکتے پرنتو سزا تو دینی ہی پڑے گی۔"

"میاؤں۔"

"ہم۔ تو بھی ٹھیک بولتا ہے، اس کا جیون ہماری لیے ضروری ہے ورنہ کب کا مجنڈا کے حوالے کر دیتے سسری کو ہوں۔ پر کل کا کچھ تو کرنا ہی پڑے گا نا ہم کو۔"

"میاؤں......میاؤں"

"چل اٹھ پہلے اس جگہ کو مجنڈا سے دور کرتے ہیں کہیں وہ آ کے سارا کام بگاڑ دے۔"

سوریہ مہاراج نے آہستگی سے اٹھتے ہوئے کہا تو دروازے کی اوڑھ کھڑی شالو پھرتی سے مزید کونے میں

ہوگئی۔

......❁❁......

اور بالآخر اماوس کی کالی راتوں کے بعد پورن ماشی آہی گئی، ساتھ ہی سوریہ کی کٹیا میں بھی ایک افراتفری سی مچ گئی۔

"دیکھ شالو ہم تجھے ایک بار پھر صاف الفاظ میں حکم دے رہے ہیں۔ تجھے کیول جاپ کرنا ہے، باقی ہم ہیں نا تیرے ساتھ۔" سوریہ کا بس نہیں چل رہا تھا شالو سے سوگندھ لے لے، لیکن سوگندھ کھانے کے لیے بھی آتما کا صاف ہونا اوش ہوتا ہے۔ کالا جادو کرنے والے کے لیے کسی چیز کی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ سنسار بھر کا فریب، دھوکا دینے کے لیے ہی وہ یہ عمل سیکھتے ہیں تو کس پر وشواس کر سکتے تھے پھر بھلا۔

"تو ہم پر اپنا وشواس بنائے رکھو مہاراج جی۔" شالو نے بے زار انداز میں اسے جواب دیا تو سوریہ کے اندر طیش کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"پرنتو، ہم کو اشوک بابو کے پران ہی نہیں چاہیے اس کو تڑپا تڑپا کے......"

"ہاں ہاں ہم کو یاد ہے تو فکر کاہے کرتی ہے۔" سوریہ نے بھی اس بار سرسری انداز اپنایا۔

شالو نے بے صبری سے کٹیا سے باہر جھانکتے ہوئے آکاش کی اور دیکھا کب چندر ما کے گرد ہالہ بنے گا تو وہ شمشان گھاٹ کی سمت جائے گی۔

"چل شالو چلنے کی کر۔" سوریہ نے سکون سے باہر نکلتے ہوئے کہا تو شالو کے اندر ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

......❁❁......

دور تلک چندر ما کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جس میں شمشان گھاٹ ایک الگ ہی انداز میں نظر آ رہا تھا۔ تھا کچھ انہونا جو سوریہ کو بھی بوکھلا رہا تھا۔

ایک ہزار سال بعد یہ رات ملتی تھی جس میں دنیا کے ہر کونے میں کالے جادو والا سرگرم ہو جاتا تھا۔ بڑے سے بڑا عامل بھی اس رات میں گھبرا جاتا تھا لیکن یہ شالو تھی جس کے لیے اپنے پریوار کا انتقام ان سب چیزوں پر حاوی نظر آ رہا تھا۔ شالو کے لیے آج وہ سپھل ہو جاتی اگر اشوک رانا کے ساتھ وہ بھی بے شک اپنے انجام کو پہنچ جاتی افسوس نہیں ہوتا۔

دوسری طرف اشوک رانا، نئے پنڈت کے ہمراہ خاموشی کے ساتھ پرانے کنویں کی سمت بڑھ چکے تھے۔ نئے پنڈت کو بھی مہاپنڈت بننے کی چاہ تھی تو اشوک رانا کو ہمیشہ زندہ رہنے کی۔ دونوں اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے کنویں کے نہایت نزدیک پہنچ چکے تھے۔

......❁❁......

روپا کے پیغام دینے کے بعد بنسی رانا کو کسی حال چین نہیں مل رہا تھا۔ اس کی شالو مشکل میں تھی اور وہ سکون سے رہ جائے، ممکن نہیں تھا لیکن روپا نے سختی سے منع کیا تھا جب تک چندر ما پوری پوری طرح ڈوب نہ جائے بنسی شمشان کی طرف بالکل نہیں آئے۔ ورنہ اس کی شالو اس سے خفا ہو جائے گی۔

......❁❁......

"یہ باندھ دیا تیرا حصار۔ اب تو اس سے باہر نہیں نکلنا اور جاپ شروع کر دے۔" سوریہ نے شالو کو جوہڑ کے نزدیک بٹھاتے ہوئے تاکید کی لیکن وہ محسوس کر رہا تھا، ایک بغاوت سی نظر آ رہی ہے شالو کے جسمانی اعضاء سے۔

"تو نے ہماری بات سن لی نا؟"

"پھکر ناہی کرو مہاراج جی۔ شالو نے تہار کی بات اچھے سے سن لی ہے۔" شالو نے معنی خیز انداز اپناتے ہوئے سوریہ کی نظروں میں نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھ تیرے اپرادھی بھی آ گئے۔ پرنتو دھیان رکھنا ان کے سامنے ہرگز نہیں آنا جب تک یہ جاپ نہیں ختم ہو جائے ورنہ جنڈا اسے تجھے نہیں بچا سکوں گا میں۔" سوریہ نے جاتے جاتے ایک بار پھر شالو کو ڈراتے ہوئے کہا۔ شالو نے بھی نظریں پھیر کے دور سے دو سائے دیکھتے ہوئے گہری سانس لی۔

اپرادھی کو سزا دینے کا وقت آ گیا تھا یا شاید شالو ہی قسمت کی چکر پھیری میں آنے والی تھی۔

......❁❁......

"دیر تو ناہی ہوئی سوامی جی۔" اشوک رانا نے سوریہ کو دیکھ کے سکون بھری سانس لی اور پھر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہی۔

"تہار کے حکم کے انوسار پنڈت بھی ساتھ لیے آئے ہیں۔"

"ادھر آجاؤ اور جب تک میں نا کہوں باہر نہیں نکلنا۔" سوریہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے دونوں کو پرانے کنویں کے پاس بلاتے ہوئے کہا تو اشوک کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

"مہاراج جی۔ آ گیا ہو تو......"

"پوچھو پوچھو پنڈت۔" سوریہ نے بنارس کے پنڈت کو مخاطب کیا۔

"وہ سرکار۔ اس سے کچھ شوبھا نہیں دیتا ایسی جگہ براجمان ہونا۔ وہ ہم کا مطلب تھا، بھوت پریت......"

سوریہ نے بمشکل اپنا قہقہہ روکا۔

"ہم ڈرتے تو ناہی پرنتو ایسی جگہ سے دور ای رہنا......"

"ڈرو نہیں پنڈت میں ہوں تمہارے ساتھ۔ دیکھو اس کنویں کے پاس بیٹھ جاؤ اور جب تک میں نا کہوں کچھ بولنا نہیں۔" اچانک اشوک رانا کو اپنی سانس بھاری ہوتی محسوس ہوئی۔

"کیا ہوا اشوک جی۔" سوریہ کی نظروں سے اس کے ہلکے قدم چھپے نہیں رہے۔

"ہم کو سانس لینے میں دقت......" اشوک نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بمشکل جواب دیا اور ساتھ ہی اپنا سینہ مسلنے لگا۔

"ڈرو نہیں اشوک میں ہوں نا۔" سوریہ نے سمجھا شاید ماحول کی وجہ سے اشوک کی طبیعت خراب ہو رہی ہے لیکن اسے نہیں معلوم تھا، اسی کی ناک کے نیچے شالو اپنا کام کر چکی ہے۔

"ہم۔ ہم کو سانس......" اشوک نے پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے اچانک کنویں کے پاس ہی ڈھیر ہوتے ہوئے پنڈت کا ہاتھ تھام لیا۔

"کچھ کرو پنڈت جی کچھ کرو۔ کوئی چیز ہم کا اندر سے کاٹ رہی ہے۔"

پنڈت جو پہلے ہی آس پاس کے ماحول سے گھبرا رہا تھا رہی سہی کسر اشوک کے گرنے سے پوری ہو گئی۔

"مہاراج مہاراج۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے پریشان ہوتے ہوئے سوریہ سے بنتی کی۔ "واپس چلے چلو اشوک جی۔ ہم کو جانے دو سوامی جی۔"

"ابھی سے نہیں تمہارے جانے کا۔" سوریہ نے چڑتے ہوئے پنڈت کو جھڑک دیا۔ "خاموشی سے ادھر بیٹھ جاؤ۔"

پنڈت نے سوریہ کا نیا روپ دیکھا تو ششدر ہی رہ گیا لیکن خاموشی کے ساتھ اشوک رانا کو سہارا دیتے ہوئے ایک طرف لٹا دیا۔ اور خود بھی کنویں کے پاس ہی جا بیٹھا اور سہمی سہمی نظروں سے آس پاس دیکھنا نہیں بھولا۔

......❁❁......

"دیوی جی ایک نظر ہم پر ڈال لیں۔ یہ کیا آوت جاوت لگا رکھی ہے۔"

سرسراتی ہوئی آواز نے بالآخر شالو کو گہری سانس لینے پر مجبور کر ہی دیا۔

"ہم کب سے تیرا انتجار کرت رہے جھنڈا۔"

"آہ ہاں۔ بھاگ جاگے ہمارے، اک سندر کنیا ہماری راہ تک رہی ہے۔"

"بیوپار کرے کا جھنڈا۔"

خاموشی نے روپا کو بات مکمل کرنے کا عندیہ دیا۔

"ہم کو ایک پاپی پرش کے پران چاہیے بدلے میں تو ہم کا جیون لے لے۔"

"کاہے اپنا جیون نرگ کرتی ہو دیوی جی۔ اچھی بھلی چل رہی ہے جیون کی کشتی چلنے دو۔"

"ہم جو کہہ رہے اس کا جواب دے جھنڈا۔ سے ناہی ہے، کسی بھی پل وہ سوریہ مہاراج......"

"ہنہ سوریہ مہاراج......"

"منجور ہے تو بولو۔ ہم ابھی جاپ شروع نہیں کیے ہیں تہار کے ہی کارن۔ پرنتو تو ہم کی بات ناہی سنتا تو ہم جاپ شروع کرت رہے۔" شالو نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تو جھنڈا نے اپنی اکلوتی آنکھ سے اسے گھورا۔

"بڑی ہشیار ہو سندری۔ اگر ہم کو تمہارے جوان خون کی آوش شکتا نہیں ہوتی تو بتاتے تمہیں۔"

جھنڈا کی بات پوری ہوتے ہی شالو کے جسم میں ایک خوف کی لہر دوڑ گئی۔

"اپنی بات سے پھر و گی تو نہیں دیوی جی۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"پہلے تو ہم کو بتاؤ، ہم کا کام پورا ناہی کیا تو؟"
"اب اتنا اپرادھ نہیں کرو دیوی جی۔ جھنڈا نام ہے ہمارا۔ دھرتی پر ایسا کون سا کام ہے جو جھنڈا ناہی کرسکے۔"
"سوگندھ کھا کے کہو۔"
"اوہو اتنا بھی وشواس نہیں، تو رہنے دو۔"
"پکا کام کرت رہے، ناراج ناہی ہو جھنڈا جی۔"
"اچھا تو چلو، مہا گرو کی سوگندھ کھا کے بولتے ہیں۔ اب تو وشواس کرلو دیوی جی۔" جھنڈا نے شالو کے جسم کو گھورتے ہوئے کہا۔

......❁❁......

"سمے کا ہے آگے ناہی بڑھت رہا۔ ہے بھگوان میری شالو کی رکھشا کرنا۔ ہم سارے گندے کام سے دور بھاگ جائیں گے۔ اک بار شالو ہم کو دے دو۔"
بنسی رانا جلے پیر کی بلی کی مانند ٹہل ٹہل کے تھک سا گیا تھا۔ لیکن وقت تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
"ہے بھگوان اے بھگوان۔ دیا کرو ہم پر۔ جلدی چندرما کو دوجی اوڑھ کرو تاکہ ہم اپنی شالو کے پاس جاسکیں۔"
بنسی نے دالان میں بیٹھ کے ایک ٹک آکاش کی سمت نظر لگا دی۔
"نجانے ہماری شالو کس حال میں ہوگی۔" ایک آہ سی نکلی بنسی کے دل سے۔

......❁❁......

"دیکھ شالو، اپنے اوپر قابو رکھنا۔" سوریہ نے آخری بار اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ایسا ناہی ہو تو جذبات میں آکے سارا کام خراب کردے۔ تو بہت قیمتی ہے ہمارے لیے۔"
شالو نے جوہڑ سے اپنی نظریں ہٹا کے سوریہ کی سمت کی اور سر ہلاتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔
"پھکر ناہی کرو مہاراج جی۔ آج سے پہلے ہم کو معلوم ہی ناہی تھا، چمارن بھی کسی کے لیے جروری ہوسکتی ہے۔"
"تجھے نہیں معلوم تیرے اندر ایسی شکتی ہے جو کسی کسی کے پاس ہوتی ہے۔ اس کا درست جگہ استعمال کرنے سے ہی تو اور شکتی مان ہوسکتی ہے۔ دیکھ شالو اس سنسار میں وہی جیوت ہے جو اپنی بدھی کے کارن کھیل ہے۔ سمجھ رہی ہے نا ہماری بات۔ یہ وقت بھی کسی کسی کو ہی مل سکتا ہے۔ تو سنبھلنا اٹھا لے اس سمے سے۔ سن رہی ہے بالک۔"
سوریہ نے شالو کو اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے اسے ہلایا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے بے ساختہ وہ ہاتھ جھٹک دیا۔
"سنت رہے ہیں مہاراج جی۔ جو کہا او بھی جو ناہی کہا او بھی۔" شالو نے پرانے کنویں کے پاس قدم بڑھاتے ہوئے سرسری سا انداز اپنایا "کا ہم کا اپرادھی آچکا؟"
"ہاں۔ پرنتو۔"
"یاد ہے ہم کا یاد ہے۔"
سوریہ کو لگ رہا تھا کچھ ہونے والا ہے لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا شالو کیا کرنا چاہتی ہے۔

......❁❁......

"اشوک جی۔ اشوک جی۔" پنڈت نے بے دم ہوئے اشوک کو زور زور سے ہلاتے ہوئے پکارا۔ "آنکھیں کھولو بھگوان کے لیے آنکھیں کھولو۔"
"پنڈت کی اپنی جان اندھیرے میں نکل رہی تھی، سوریہ بھی غائب تھا سامنے لیٹا اشوک ہلکی ہلکی سانس لیتا ہوا بے سدھ ہو چکا تھا۔
"ہے رام ہے رام۔ کرپا کرائی۔"
"پنڈت جی۔" اشوک نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "لگتا ہے انتم سمے آگیا ہے۔"
"ایسی باتیں ناہی کرو اشوک جی۔ ہم کو چھوڑ کے ناہی جاؤ۔"
"وہ دیکھو روپا کھڑی ہم کا بلاوت ہے۔" اشوک نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھتے ہوئے کہا تو پنڈت کی بھی سانس رک سی گئی۔
"شما کردے روپا شما کردے۔" اشوک نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔ "ہم تیرے اپرادھی ہیں روپا، شما کردے۔"
"کیا اناپ شناپ بولے جا رہے ہو اشوک جی۔" پنڈت نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اشوک کو ہلایا۔ "ہوش میں آؤ بھگوان کے لیے۔"
"ہم بہک گئے تھے روپا۔ پرنتو تو بھی تو جالم نکلی رے۔ دیکھ کیسے ہم کا ہاتھ کاٹا آج تک ایک ہی ہاتھ سے......" اشوک نے دھیرے سے ہنس کے کہا۔ "کاٹا جاتا

تیرا اگر ہم کی بات مان لیتی ری۔ تو بھی سکھی رہتی ہم بھی۔"
پنڈت اشوک کی سمت ڈری ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہوا، واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سوریہ کی آواز سن کے اس کی جان میں جان آئی لیکن اس کے ساتھ شالو کو دیکھ کے طیش کی ایک لہر جسم میں دوڑ گئی۔

"گھور پاپ، گھور پاپ۔ ایسی بدجات ناری کے ساتھ ہم ایک ہی جگہ نا ہی رہ سکت مہاراج جی۔"

"چپ کے بیٹھے رہو پنڈت۔" سوریہ نے ایک ہی جھٹکے میں اس کی اوقات یاد دلائی۔ "ہم بھی جانت ہیں تم کیا کرتے ہو بھگوان کے گھر میں، یہ وہی روپا کی بٹیی ہے جس کو تم جیسے پنڈت نے اس اشوک کے چکر میں پھنسا دیا تھا اور اس کے باپ کے ساتھ چھوٹی بہن کو بھی زندہ جلایا تھا۔"

پنڈت کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سامنے شالو بھی اس کو خونی نگاہوں سے تک رہی تھی۔

"اسے کیا ہوا رے؟" سوریہ نے لپک کے اشوک کو دیکھا۔

"ہم کا جانت۔" پنڈت نے روکھے انداز سے جواب دیا جسے سوریہ نے کوئی اہمیت نہیں دی۔

"اس کا انت سمے آ گیا ہوا مہاراج جی۔ کیوں پنڈت جی۔ تم کا سوئم بھگوان نا ہی بتائے رہے کا اس بار؟" شالو نے طنزیہ نگاہوں سے پنڈت کی سمت دیکھا۔ "بتاؤ جرا اپنے بھگوان سے پوچھ کے، کا ہوا ان کو؟ سایدپرساد میں تو کچھ نا ہی ملا کے کھلا دیا ان کو۔"

اشوک نے لیٹے لیٹے روپا کی سمت گردن گھمائی اور سر ہلاتے ہوئے بمشکل کہا۔

"کا کرا تو نے، یہ ہم کی حالت تو کے کارن ہوئی ہے نا؟"

"بنسی نے نا ہی بتایا تو کا اشوک بابو؟ وہ بھگوان کا پرساد ہم ہی بھجوائے رہے، اس سے کے کارن کب سے آوش شکتا میں تھے۔" سوریہ کا ماتھا ٹھنکا۔

"کیا کیا تو نے شالو۔ بتا مجھے بنسی سے کیا کرایا۔"
بہکی ہوئی ہنسی کے ساتھ ایک دم شالو نے سوریہ کو ایک سمت دھکیلا اور تیز قدموں سے نیچے لیٹے ہوئے اشوک کی سمت بڑھی۔

"کیسا لاگت ہے رے مہاراج جی۔ ایسے جمین پر پڑے ہوئے؟ اب اپنے بھگوان سے پوچھت رہو نا، کس کارن یہ حالت ہوئی تم کی۔ ہم بتائے رہت ہیں۔ ہم نے تم کے ہی بنسی رانا بڑی جات سے اس پرساد میں بوٹی ملا دی تھی۔ کچھ ہی سمے بعد تو بھی ہم کی ماتا پتا کے پاس پرلوک سدھاروگے۔ پرنا نا نا۔ ہم تو چمار ہیں، پرلوک بھی تو تم کا ہی ہے نا؟ ہم گندی چھوٹی جات ادھر بھی نا ہی جا سکت بھیا۔ وہ بھی تم کا یہ جمین بھی تم کی۔ ہم کا ہے جنے سمجھ نا ہی آوے یہ بات۔ پرنتو ہم سوگندھ کھائے رہے ہیں، ایک بار اس بھگوان کا آمنا سامنا ہو جائے تو پوچھت رہے۔ کا ہے بنایا ہم کو کیوں بنا رہے ہم چمارن کو۔"

"کیا اناپ شناپ بک رہی ہے۔ صاف بتا۔"

"ہم زہر دلائے ہیں اس کا مہاراج جی۔" شالو نے سینہ تان کے سوریہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

سوریہ نے بے ساختہ کچھ پڑھ کے شالو کی سمت پھونکا جس سے اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ لیکن شالو ہنستی ہی رہی۔

"ہم کو کوئی پھکر نا ہی مہاراج جی۔ یہ جیون تو ہم کے لیے اک سجا ہی تھی۔ مکتی دے دو ہم کو اس جیون سے۔"

سوریہ نے جھٹکے کے ساتھ پھونک ماری، آگ تو بجھ گئی لیکن اب شالو تقریباً برہنہ حالت میں کھڑی ہوئی تھی۔

"کیوں شالو کیوں۔ ہم پر دشواس نا ہی تھا تم کو۔"
سوریہ نے چیختے ہوئے کہا۔ سے نکل رہا تھا اور یہ مسائل اففففف۔

"نا ہی مہاراج جی نا ہی۔ شالو نے آج تک سارے ہی کام کھود ہی کیے رہے تو اپنے کھاندان کے اپرادھی کے لیے کسی پر وشواس کیسے کرتے۔" شالو نے اپنی برہنگی سے نظریں چراتے ہوئے جسم چرایا۔

"سزا تو تجھے اوش ملے گی شالو۔ پرنتو اس کے بعد۔"
سوریہ نے چیختے ہوئے لہجے میں اسے دیکھا اور شکستہ قدموں سے اشوک کی سمت بڑھا جس کے منہ سے اب جھاگ نکلنے لگی تھی۔

"ہم کو سب منجور ہے سوامی جی۔" شالو نے مسکراتے لہجے میں ایک بار پھر سوریہ کو غصہ دلایا تو اس نے بائیں ہاتھ کو ایک جھٹکے سے شالو کی سمت کیا دوسرے ہی سمت وہ الٹی

لٹکی ہوئی نظر آئی کنویں کے بیچوں بیچ۔ پنڈت یہ دیکھ کے بے قابو ہو گیا اور منہ سر لپیٹے اندھا دھند بھاگتا ہوا نکل گیا۔

"ہے رام ہے رام۔ ہے رام رام۔" بالآخر دو پل بعد ہی یہ آواز بھی گم ہو گئی۔

ڈھلتے چندرما کی روشنی میں شالو سکون سے کنویں کے اوپر الٹی لٹکی ہوئی تھی، آس پاس ڈھول تاشے بجنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی پرنتو شالو کو کوئی پرش یا ناری نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوریہ آنکھیں بند کیے کنویں کی منڈیر پر بیٹھا جاپ پڑھ رہا تھا، ساتھ ہی اشوک رانا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ نیچے لیٹا یہ سب اٹکی ہوئی سانس کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

......❁❁......

"بس کرو مہاراج جی بس کرو۔ سے ختم ہو رہا ہے۔ اب ہماری باری ہے۔"

سوریہ آنکھیں بند کیے جاپ پڑھ رہا تھا کہ اچانک جھنڈا کی آواز سن کے وہ سکتے میں چلا گیا۔

"تو......"

"کیوں حیران ہو گئے ہو ہم کو دیکھ کے سوریہ جی۔ جہاں تم وہی ہم۔ جنم جنم کا ساتھ ہے ہمارا تمہارا تو......" جھنڈا نے اپنی ایک آنکھ کو سوریہ پر ٹکاتے ہوئے سکون سے جواب دیا۔

"تو ادھر کیسے آیا جھنڈا، یہ میرے جاپ کا سے ہے جا تو ادھر سے۔"

"بھول گئے مہاراج جی۔ جھنڈا کا کام ہی جاپ تمام کرنا ہے۔"

"پرنتو۔" سوریہ نے سوالیہ نظروں سے شالو کی سمت دیکھا۔

"اسے کا ہے دوش دیتے ہو سوریہ جی۔ ہم سے پوچھ لو۔ سودا ہو گیا ہے ہمارے اس کنیا کے بیچ۔"

"کیا......؟" سوریہ نے حیران نظروں سے ایک بار پھر شالو کو دیکھا۔

"تم صحیح تھے مہاراج جی۔ یہ بہت بدھی مان ہے۔ دیکھو کیسے ایک عام ناری ہوتے ہوئے ہم جیسے جھنڈا کو راضی کر لیا اور تم جو تین ہزار سال سے جیوت ہو ہار گئے۔" فضاء میں لاکھوں بین کی آواز گونج گئی یقیناً یہ جھنڈا ہنستا تھا۔

سوریہ نے طیش میں آ کے جھنڈا کو گھورا۔ "ایسے نہیں ہو سکتا جھنڈا۔ میرے پاس یہ آخری موقع ہے۔ تو اسے لے لے۔"

"کیسے مہاراج جی۔" جھنڈا نے اشوک کے بے جان جسم کو اپنے ایک ہاتھ سے ہلاتے ہوئے پوچھا تو اشوک کو یاد آیا وہ اسی اشوک کے جیون کے لیے جاپ پڑھ رہا تھا جو جھنڈا اور شالو کی ملی بھگت سے ادھورا رہ گیا۔

"آہ شالو۔ تو نے یہ کام بھی کر ہی دیا۔"

"مہاراج جی، اسے ہم کے کھاندان کا اپرادھی تھا۔ ہم پہلے ہی کہت رہے، اپنے ہاتھوں سے سجا دیئے گے پرنتو تم نے وچن توڑا تو ہم کا ہے تم کی دم سے بندھ کے رہیں۔" شالو نے اس حالت میں بھی جواب دینا بند نہیں کیا۔

"مہاراج جی، چندرما کی اور بھی دیکھتے رہو۔ ایسا نا ہو پھر ایک ہزار سال بعد ہم ایسے ہی ملیں تو کوئی شالو بھی تم کے پاس نا ہی ہو۔" جھنڈا نے ایک بار پھر سوریہ کو چھیڑا۔

"تو نے اچھا نا ہی کیا شالو۔ یہ رات بھی گئی میری۔" سوریہ کو شدید دکھ ستا رہا تھا۔ اس کی عمر کم ہو رہی تھی اور سے بھی ہاتھ سے جا رہا تھا۔

"مہاراج جی۔ یہ تو اپنے اپنے جیون رکھشا کی بات تھی نا۔ ہم تم کے ساتھ ہیں پر اب جھنڈا سے تم کھود ہی نمٹ لو۔ ہم ٹھہرے چھوٹی جات، مرنا اوش ہے، پرنتو اپنی مرجی سے جیوت نا ہی ہوئے تو کا ہوا مرن تو ہم کے ہاتھ میں ہے نا۔"

شالو نے خود کو بیچ سے نکالتے ہوئے سکون سے جواب دیا۔ اس کی حالت دیکھ کے قطعی نہیں لگ رہا تھا وہ کنویں کے بیچوں بیچ الٹی لٹکی ہوئی ہے۔

"مرتے سے ہم کو کھوشی ہے، اپنے اپرادھی کو کھود ہی سجا دے کے جا رہے ہیں۔ اب یہ جان اور جسم تم لے لیو۔ جس کو جیون چاہیے رہے اور جیون لے لے،، جس کو ہمارا جسم چاہیے او وہ لے لے۔ ہم کو کوئی اوشکتا نا ہی ہے۔"

"خاموش ہو جا خاموش۔" سوریہ نے دہاڑتے ہوئے اسے چپ کرایا۔ "تجھے اندازہ نہیں تو نے میرا کتنا سے برباد کیا ہے نادان بالک۔"

"مہاراج جی۔ اب اس طرح تو ہوتا ہے۔" جھنڈا نے

قریب آتے ہوئے دھیرے سے پکارا۔ ''ابھی بھی سمے ہے جلد ہی کوئی فیصلہ کرلو تاکہ......'' جھنڈا نے شالو کی سمت دیکھتے ہوئے اپنے ایک بے جان ہوتے ہوئے ہاتھ کی سمت اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے جھنڈا۔ تو لے لے اس بار۔ پرنتو مرنے نا پائے پوری۔ ہم کو اس کی ضرورت ہے۔ اب ہم اگلے ہزار سال بعد ملیں گے۔ اس وقت یہ جیوت رہنا چاہیے جھنڈا ورنہ مہا گرو کی سوگندھ ہم تم کا نا ہی چھوڑیں گے۔''

''پھکر نا ہی کرو مہاراج جی۔ کوئی پہلی بار ایسا کام نا ہی کر رہے ہم۔''

جھنڈا نے تیزی سے آگے رینگتے ہوئے اپنی بات ختم کی اور شالو نے گہری نظروں سے چندرما کی سمت دیکھتے ہوئے آخری بار بنسی رانا کا تصور کیا اور آنکھیں موندھ لیں۔

......❁❁......

صبح کا سورج اپنی ٹھنڈی روشنی سمیت سنسار کے لیے باہر نکلا تو پورا گاؤں ہی ہل کے لاٹھی بھالے سمیت تیز قدموں سے پرانے کنویں کی اور بھاگتا چلا جارہا تھا۔

سب سے آگے ماتھے پر پٹی باندھے بنسی رانا کے ساتھ پنڈت تھا۔

بنسی جو شالو کے دیے ہوئے وقت پر شمشان گھاٹ کی سمت چلا جارہا تھا کہ اچانک سامنے سے پنڈت حواس باختہ انداز میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور زبردستی کرنے کے بعد اشوک رانا سے وفاداری نبھاتے ہوئے، پاس پڑا ہوا پتھر اٹھا کے بنسی کے سر پر مار دیا۔ جس کے کارن وہ نیم بے ہوش ہوگیا تو بمشکل گھسٹتے ہوئے اسے گاؤں لے آئے۔

ہوش میں آتے ہی ایک گھمسان کی جنگ ہوئی دونوں کے بیچ، جہاں ایک طرف پنڈت سوگند کھا کھا کے رات کی کہانی سنا رہا تھا تو دوسری سمت شالو کی بات بنسی کے ذہن میں بار بار گونج رہی تھی۔

''ہم تم کا انتجار کرت رہے سوامی۔ دھوکا نا ہی دینا۔''

''شالو ہم کو معاف کر دیو۔ پرنتو اس پنڈت کو ہم اپنے ہاتھ سے سجا دیئے رہے۔'' بنسی نے پنڈت کی سمت دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اپنا وچن یاد کیا۔

......❁❁......

''پنڈت جی کہاں ہیں اشوک جی؟''

گاؤں کے مکھیا نے کنویں کے آس پاس ہر سمت دیکھنے کے بعد سوال پوچھا تو پنڈت بھی حیران نظروں سے اس جگہ کو دیکھنے لگا جہاں سوریہ کے ساتھ شالو بھی تھی لیکن اس وقت وہ جگہ کچھ ایسی ویران تھی کہ کبھی کوئی آیا ہی نا ہی ہو اس طرف۔

''کوئی سپنا تو نا ہی دیکھے رہے پنڈت جی۔'' کسی نے پھبتی کسی تو سب کے ہی چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ہم۔ وہ۔ ہم......'' پنڈت کی اچانک سانس پھولنے لگی۔

''کیا ہوا مہاراج جی۔ کیا ہوا۔'' مکھیا نے فوراً ہی پنڈت کی سمت بڑھتے ہوئے پوچھا جو ایک ٹک کنویں کی سمت دیکھ رہا تھا۔

''وہ...... وہ۔ وہ ہم کا بولا رہی ہے۔ روکو ہم کو۔ نا ہی نا ہی شالو ہم کو شما کر دے۔''

بنسی جو حیران نظروں سے پنڈت کو دیکھ رہا تھا ایکدم چونک گیا۔

''ہاں ہاں ہم ہی اپرادھی ہیں تم کے کھاندان کے۔ پرنتو ہم کو مہا پنڈت بننا تھا، اشوک جی ہم کا بولے وہ بنا دینگے۔''

گاؤں والے خاموش کھڑے اعتراف سن رہے تھے۔

''بھگوان کے لیے شما کر دے شالو۔''

پنڈت جو بے اختیار ہی کنویں کی سمت بڑھ رہے تھے اچانک رونے لگے۔

''کوئی ہم کو روکے بھیا۔ وہ بلا رہی ہے۔ ہم مرنا نا ہی چاہت رہے ابھی۔''

مکھیا سمیت کچھ اور لوگ بھی آگے بڑھے ہی تھے کہ بنسی نے دہاڑتے ہوئے سب کو روک دیا۔

''کھبر ادار جو کوئی آگے آیا۔ ماں قسم اس کو چیر دینگے ہم۔ یہ اپرادھی ہے اس کو سجا ملنی چاہیے۔''

دوسری سمت پنڈت بالکل ہی کنویں کی منڈیر تک جا پہنچا تھا ایک دم لمبی چیخ کی آواز سے بنسی نے پلٹ کے دیکھا تو پنڈت کہیں نہیں تھا۔

''ہائے رام۔'' گاؤں والے بھاگتے ہوئے کنویں کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سمت لپکے مگر وہاں پڑی ہوئی جھاڑ جھنکار کے باعث کوئی نیچے دیکھ نہیں سکتا۔

"یہ کیا کرت رہے بنسی جی۔" کھیا نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے۔

"ہم کو شما کر دے شالو۔ پرنتو ہم آئے تھے رات کے سمے۔ یہ پنڈت ہی ہم کو دھوکے سے واپس لے گیا۔"

بنسی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "ہم تم کا انتجار کرت رہے شالو۔ ہم کا بھی شما کر دیو دیوی جی۔"

"دیوی جی گھور پاپ گھور پاپ۔ ایک گندی جات کے لیے دیوی پاپ ہے پاپ۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے اشوک جی ادھر۔"

"کالا جادو لگے ہے ہم کو تو۔"

"بنسی جی کا دماغ الٹ گیا کا۔"

"یہ شالو کلو کی سپتری ہے نا۔"

"ہاں یاں وہی نیچ جات رادھیکا، جس کو بھگوان نے سوئم سجا دی تھی۔"

"ہے رام۔ کل یوگ ہے۔"

بنسی ہر ایک کی بات کو بغور سن رہا تھا لیکن بے تابی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ شاید کہیں سے شالو کی ایک جھلک دکھائی دے جائے کہ اچانک...... کہ اچانک ایک تیز ہوا کی لہر نے اس کے کانوں میں سرگوشی سی کی۔

"سوامی جی۔ دوسرے جنم میں ہم تم کے ہی بن کے جنمے گے۔ ہم کا انتجار کرنا۔"

......❁❁......

"ٹھک ٹھک ٹھک۔ ٹھک ٹھک"

"ارے کہاں رہ گئی ہو بھئی کب سے دروازہ بجا رہا ہوں۔ سلمیٰ سلمیٰ۔ کھول بھی دو دروازہ۔"

زاہد کی تیز آواز نے میرے ہاتھوں سے وہ پرانی خستہ حال کتاب نیچے گرا دی اف میں کہاں تھی، یہ کیا تھا۔ کچھ وقت لگا واپس ہزاروں سال پرانی کہانی سے نکلنے کے لیے۔

"کچھ تو خیال کیا کرو۔" زاہد نے تنک کے کہا۔ پوری رات کی ڈیوٹی لگا کے آ رہا ہوں تم دروازہ کھولنے میں اتنا وقت لگا رہی ہو۔ ارے کیا ہو گیا تم کو۔ اتنی پیلی ہو رہی ہو جیسے کسی بھوت سے مل کے آئی ہو۔" زاہد نے گم صم کھڑی سلمیٰ کو دیکھ کے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں۔" میں واقعی اس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھی، گلا الگ خشک ہو رہا تھا تو دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"کک...... کچ...... کچھ بھی تو نہیں۔"

"سلمیٰ۔" زاہد نے کندھے تھام کے صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر بٹھایا۔ کیا ہو گیا ہے، بتاؤ مجھے سب خیر ہے۔"

"ہاں ہاں سب ٹھیک ہے وہ بس گہری نیند سے اٹھی ہوں تو شاید۔" میں نے ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آتے ہوئے زاہد کو بغور دیکھا جو پریشان کھڑے مجھ سے سوال کر رہے تھے۔ "ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی آپ فکر نہ کریں۔" میں نے بالآخر مسکرانے کی ناکام سی کوشش کی لیکن شاید زاہد مطمئن ہو چکے تھے اسی لیے خاموشی سے پلٹ کے غسل خانے کی جانب قدم بڑھا گئے اور میرا دھیان صحن کے اس پار دوسری سمت کنویں کی جانب ہو گیا۔

"کیا واقعی رات بھر میں نے جو پڑھا تھا وہ حقیقت تھا یا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔" میں نے خود سے سوال کیا اور جواب نا پا کر سر تھام کے بیٹھ گئی۔

"سلمیٰ طبیعت خراب ہے تو ڈاکٹر کے چلو بھئی۔ ایسے کیوں بیٹھی ہوئی ہو تم۔" زاہد غسل خانے سے نکل کے ایک

افسانچہ

تمہارے لوٹ آنے سے میرے چہرے پر عجب ہی رنگ کھلتے ہیں، تمہارے لوٹ آنے کا انتظار بہت عرصہ سے رہتا ہے ہر برس ہی تم آتے ہو اور پھر جاتے جاتے دکھوں کے سایوں اور اندھیروں میں مجھے دھکیل جاتے ہو، تمہارے بن گزرتا ہر اک پل قیامت ہی ٹھہرتا ہے۔ تمہارا گورا سپید رنگ، الہڑ مٹیار جیسی چال، جھانجھر جوں جوں میں دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں آنکھوں سے اشک رواں سا جاری ہو جاتا ہے۔ سنا ہے اب پھر تم آؤ گے تمہارے آنے سے قبل ہی میرا ہر پل تمہاری آمد کی تیاری کی نذر ہے، ہزاروں باتیں، وسوسے دل میں پنہاں ہیں جنہیں تم سے براہ راست کہنا ہے "میرے پیارے بکرے" سنا ہے کل ابو تمہیں لے آئیں گے سو باقی باتیں تمہاری آمد تک ادھار۔

سمیرا غزل صدیقی...... کراچی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بار پھر میری طرف متوجہ ہوگئے۔

”کیا ہوا؟“ میں نے بے دھیانی میں ان کی سمت دیکھا۔

”کیوں پریشان کررہی ہو یار۔ جاؤ منہ ہاتھ دھو کے آؤ تاکہ ہوش میں آؤ تم۔“ زاہد نے کہنی پکڑ کے مجھے کھڑا کیا اور غسل خانے کی جانب دھکیلا۔ میں مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی اندر گئی اور جیسے ہی آئینے پر نظر گئی میں خود چونک گئی۔ ستا ہوا سا چہرہ، اڑی اڑی رنگت، بکھرے ہوئے بال۔ یاخدا یہ میں ہی ہوں یا کوئی اور اب زاہد کا پریشان ہونا سمجھ آیا مجھے۔ جلدی سے منہ پر چھپاکے مار کے باہر نکلی تو ابھی تک زاہد پریشان ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

”اب بتاؤ کیا ہوا۔ کیا پھر پڑوس میں کچھ دیکھ لیا جو......“

”نہیں نہیں۔ بس وہ حاجی صاحب کی وجہ سے کچھ ذہنی طور پر......“

”پکی بات ہے نا دیکھو اگر تم کو اس گھر میں کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ، آج ہی سپروائزر بتا رہا تھا اس نے اپنا گھر دو منزلہ کروایا تھا اور اچھے کرائے دار کی تلاش میں ہے۔“

میری سانسوں کی روانی بے ساختہ تیز ہوگئی۔

”اگر تم چاہو تو ہم وہاں شفٹ ہوسکتے ہیں اور ادھر کے لیے میں خود کسی اچھے اور شریف کرائے دار کو ڈھونڈ دوں گا۔ اب حاجی صاحب تو ہیں نہیں لیکن اچھے انسان تھے وہ اگر ہم بھابھی کے لیے اتنا بھی نہیں کرسکے تو فائدہ کیا“ زاہد نے سکون سے لیٹتے ہوئے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”کیا کہتی ہو پھر بیگم گھر بدلنا ہے یا نہیں۔“

”دیکھ لیں جیسی آپ کی مرضی۔“

”ہماری کیا مرضی چلنی ہے آپ کے آگے سرکار۔ جو تم ہم کو آگیا دیوے، ہم اس کا ہم پالن کرت رہے بھیا۔“ زاہد نے شگفتہ لہجے میں کہا تو میں بے ساختہ چونک گئی۔ ”اس پاپی سنسار میں تم اور ہم ہی تو ایک دوجے کا سہارا ہیں۔“

”کک...... ککک...... کیا؟ ایسے کیوں بول رہے ہیں آپ زاہد۔ کیا ہوگیا آپ کو۔“

”ارے بے سلی۔“ زاہد میرا ری ایکشن دیکھ کے ایک دم حیران رہ گئے ”پچھلے ہفتے جو فلم دیکھی تھی، اس میں وہ ہیرو ایسے ہی تو بول رہا تھا بس وہ آج فیکٹری میں بھی لگی ہوئی تھی تو ایسے ہی اس کا ڈائیلاگ دہرا دیا لیکن تم تو ایسے پریشان ہوگئی ہو جیسے میں سوریہ مہاراج ہوں اور تم شالو ہو۔“

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے زاہد کو دیکھتی رہ گئی اور بالآخر میرا ذہن اندھیروں کی نذر ہوگیا۔

......❁❁......

پورے چاند کے گرد عجیب سا دائرہ بنا ہوا تھا جیسے کسی نے چاند کو اپنے حلقے میں لے رکھا ہو۔ کچھ الگ تھا اس چاند میں جیسے وہ اپنی جسامت سے کچھ گنا بڑھ گیا ہو۔ فضاء میں بھی نامانوس سی اجنبیت تھی اور میں جیسے ہوا سے بھی ہلکی ہو کے بادلوں کے گرد گھوم رہی تھی۔ دور کہیں دور جنگل کا سا ماحول تھا جیسے بہت سے درخت آپس میں لہرا لہرا کے باتیں کرنے میں مشغول ہوں، انہیں درختوں کے پاس چاند کی روشنی کے علاوہ بھی کچھ تھا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہو اور وہ اس کوشش میں ہو میں بھی اسے دیکھ لوں۔ مگر وہ تھا کیا لیکن مجھے لگ رہا تھا وہ ایک ایک چیز میری دیکھی ہوئی ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے بھلا۔ سوئے سوئے ذہن میں سوال ابھرا۔ میں اس پورے منظر کو کیسے دیکھ سکتی ہوں پہلے۔

اچانک میری نظر ایک الٹے لٹکے ہوئے جسم پر پڑی اور میں ہکا بکا رہ گئی۔ ”ہاں یہ شالو ہے یہ شالو ہے۔“ میرے دل نے گواہی دی۔ ”وہی شالو جو کہیں بہت دور ہزاروں سالوں سے اپنی سزا بھگت رہی ہے، کب وہ سوریہ مہاراج اپنا جاپ مکمل کرکے مہا گرو بنے تو شالو کو مجنڈا لے جائے لیکن اس سے پہلے وہ اپنی سزا جھیلتی رہے گی۔“

یقیناً آج بھی وہی چاند کی چودھویں رات تھی جس کے گرد مخصوص ہالہ کالے جادو والے کرنے کے لیے اہم ہوتا ہے اور کنویں کی منڈیر پر وہی لمبے بالوں والا آدمی بھی تھا جو کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کے برابر کالا بلا اور اف بلے کے برابر......

میری آنکھیں اپنے حلقے سے باہر آنے کے لیے بے چین ہورہی تھی۔ ”یہ ممکن نہیں نہیں نہیں۔ ایسا ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔“ وہ کیا تھا۔ ایک آنکھ والا دھڑ جس کے ان گنت ہاتھ نکل رہے تھے ہر ہاتھ میں انگلیاں تھیں جو لہرا لہرا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کے شالو کی سمت لپک رہی تھی، جیسے اجازت ملتے ہی وہ اس پر ٹوٹ پڑے گا لیکن میں کیوں یہ سب دیکھ رہی ہوں میرا کیا واسطہ ان سب سے۔ میں نے خود کو باور کرانا شروع کرایا۔ یہ ایک بھیانک خواب ہے۔ یہ ایک خواب ہے سلمیٰ۔ ابھی تم جاگ جاؤ گی۔ جاگو، آنکھیں کھولو۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔" میں ابھی زیر لب خود کی تسلی کرا ہی رہی تھی کہ۔ دور الٹی لٹکی شالو نے دھیرے سے اپنی آنکھیں مجھ پر مرکوز کیں اور ہلکے سے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا ساتھ ہی سکون سے آنکھیں بند کر لی میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی کیونکہ اس کے عین اوپر وہ عجیب سی مخلوق چھلانگ مار کے چڑھ گئی تھی۔

اچانک ترش سی بو نے میرے سوتے جاگتے ذہن کو جھنجوڑا۔

"امی...... امی، آنکھیں کھولیں نا امی۔ نرس چیک کریں ان کو مجھے لگا ابھی انہوں نے کسی کو پکارا ہے۔"

"ارے یہ ہوش میں آ گئی ہیں۔"

"سلمیٰ۔"

"امی...... امی۔"

"شالو نے مجھے کیسے دیکھا۔ چمارن رادھیکا کی بیٹی نیچ ذات شالو۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میری سانس رک سی گئی۔ کلو شودر جو ہزاروں سال پہلے ہندوستان کے کسی قصبے میں رہتا تھا۔ اس کے پورے خاندان کو ذات پات کے چکر میں مار دیا گیا۔ لیکن۔ ایسے کیسے۔ وہ تو۔ وہ تو ایک کہانی تھی نا، تو یہ کیسے۔ میں ہوں کہاں۔ میں سلمیٰ زاہد ہوں تو یہ کیا ہے پھر۔ شالو تو کلو کی بیٹی تھی۔ ہاں کلو وہی کلو جس کی بیوی رادھیکا کو پنڈت اور اشوک نے مل کے مار دیا تھا یا اس نے خودکشی کر لی تھی کسی کنویں میں کود کے۔ اوہ یہ وہی کنواں تو نہیں لیکن شالو کنواں، گھر، شمشان گھاٹ۔ ہندو۔ پنڈت۔ میرے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ شالو نے مجھے مسکرا کے کیوں دیکھا۔ کیا میں جس گھر میں رہتی ہوں وہ شمشان گھاٹ تھا کسی زمانے میں، اور برابر والا گھر جس میں پرانا کنواں ہے وہی شالو اور اس کی ماں......

اور ایک بار پھر مجھے ہر ایک چیز اندھیرے میں ڈوبی ہوئی لگی۔

......❁❁......

بجلی کا بل

روشنی کی ہے سزا بجلی کا بل
یا مقدر کا لکھا بجلی کا بل
تُو جو چکرا کر گرے تو خیر ہے
پر محبت سے اٹھا بجلی کا بل
وقت سے پہلے ہی قربانی ہوئی
اپنے بکرے پر گرا بجلی کا بل
اڑ گئے ہاتھوں کے طوطے دفعتاً
جو نہی ہاتھوں میں لیا بجلی کا بل
ڈس کنکشن کا بھی نوٹس ساتھ ہے
کس قدر ہے بے وفا بجلی کا بل
خون دشمن کا نہ لے تُو اپنے سر
بس اسے جا کر دکھا بجلی کا بل
تھا مریضِ دل بے چارا چل بسا
دیکھتا ہی رہ گیا بجلی کا بل
کی شکایت میں نے بجلی کی
دیکھتے ہی جل گیا بجلی کا بل
روشنی کو لوگ ترسیں گے یہاں
اب اندھیرے لائے گا بجلی کا بل
جاں کے لالے پڑ گئے تہذیب خان
اس قدر مہنگا پڑا بجلی کا بل

راؤ تہذیب حسین تہذیب...... رحیم یار خان

"دیکھیں آپ کی وائف کا ذہن ابھی بھی اسٹیبل نہیں ہے۔ کسی بہت خطرناک شاک سے گزری ہیں یہ۔"

میرے سوتے جاگتے ذہن نے انجان آواز سنی۔

"لیکن ایسا تو کچھ نہیں ہوا ڈاکٹر صاحب، ہم دونوں باتیں ہی کر رہے تھے جب اچانک وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب تو اس بات کو بھی دو ہفتے گزر چکے ہیں۔ یہ ہوش میں کیوں نہیں آ رہی۔"

مجھے گھبرائی ہوئی لیکن واضح طور پر پریشان آواز سنائی دی۔

"پلیز ہمیں صاف بتا دیں مسئلہ کیا ہے تاکہ اسی حساب سے علاج کرایا جائے۔ بچے اور میں بہت پریشان ہو چکے ہیں۔ نا وہ اسکول جا رہے نا ہی میں فیکٹری جا رہا ہوں۔

پلیز کچھ کیجیے ڈاکٹر صاحب۔"
"بچے۔" میرے کانوں میں اپنی ہی آواز ایسے سنائی دی جیسے وہ کسی اور کی ہو۔
"اوہ۔ان کو پھر ہوش آگیا ہے۔" نرس ڈاکٹر نے بلند آواز میں کسی کو پکارا۔"ہری اپ۔ان کو دیکھو"
میں نے اپنی پوری جان لگا کے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو سامنے ہی دھندلاتے ہوئے زاہد اور بچے نظر آئے میں نے ان کو دیکھ کے مسکرانے کی کوشش کی تاکہ وہ جان سکیں میں ہوش میں آگئی ہوں اور ان کو پہچان بھی رہی ہوں لیکن وہ جیسے ہی میرے پاس آتے میری آنکھوں کے گرد ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا۔

......❁❁......

"تم نے ہم سب کو اتنا پریشان کیا ہے سلمی۔" زاہد نے میرے ساتھ گھر کا سامان پیک کرتے ہوئے کوئی دسویں بار کہا تو میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔
"اچھا نا بس۔"
"تم بہت قیمتی ہو میرے لیے سلمی۔ آئندہ ایسا نہیں کرنا پلیز۔" زاہد نے فوراً سے پیشتر مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تو میری بھی پلکیں بھیگ گئیں۔"مت پوچھو تم کو ایسے بیڈ پر لیٹے دیکھ کے میرا کیا حال ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کوئی خنجر سے کلیجہ کاٹ رہا ہے۔" شادی کے اتنے سالوں بعد زاہد نے پہلی بار اعتراف محبت کیا بھی تو کب، جب میں موت کے منہ سے واپس آئی تھی۔
"چلیں اسی بہانے آپ کو میری قدر تو آئی نا۔" میں نے ماحول بدلنے کی خاطر شگفتگی سے کہا تو وہ بھی مصنوعی ناراض ہوگئے ۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے اچانک دروازے پر دستک ہوئی ۔میں نے ان کو باہر کی جانب دھکیلا اور سامان کی جانب متوجہ ہوگئی۔
سامنے ہی وہ کھڑکی تھی جہاں سے شام کے وقت بھی چاند اپنی جوبن پر دکھائی دے رہا تھا۔ اف وہی چودھویں کی رات جو کبھی میری بڑی پسندیدہ ہوتی تھی اب اس کو دیکھ کے ہی ہول اٹھنے لگتے ہیں۔
"نہیں نہیں اب نہیں۔ مجھے کچھ نہیں سوچنا میں نہیں چاہتی تھی کہ ایک بار پھر وہی سوچیں مجھے اسپتال لے جانے کا سبب بن جائیں اور زاہد پریشان ہو جائیں مجھے یاد ہے کیسے وہ دن رات اسپتال میں میری پٹی سے لگے رہتے تھے۔سائٹ ایریا کے سب سے مشہور سائیکاٹرسٹ سے چوبیشن بھی کرائے اور جاب کے ساتھ ساتھ بچے بھی دیکھے۔حاجی صاحب کے انتقال کے پورے چار ماہ بعد میں واپس اپنے گھر پہلی والی کیفیت میں آئی تھی لیکن اب زاہد کا اس گھر میں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں بھی جاننا چاہتی تھی اور گزری ہوئی ساری باتیں ایک خواب کی طرح ہی بھلا دینا چاہتی تھی تاکہ ایک بار پھر نارمل زندگی گزار سکیں۔
آج ہم نے یہ گھر مکمل طور پر خالی کر دینا تھا۔ بھاری سامان پہلے ہی ہم نئے گھر بھیج چکے تھے اب صرف چھوٹی موٹی چیزیں رہ گئی تھیں جو ہم گاڑی میں لے جاسکتے تھے۔اسی لیے زاہد اپنے دوست کی گاڑی لے آئے تھے تاکہ سکون سے ہم گھر کا جائزہ بھی لے لیں کہ کہیں کوئی چیز تو نہیں رہ گئی۔
"کون تھا زاہد۔" میں نے زاہد کو واپس کمرے میں آتا دیکھ کے سوال پوچھا۔
"حاجی صاحب کی بیگم تھیں۔بول کے گئی ہیں وہ اپنے بیٹے کے پاس جا رہی ہیں، ابھی کچھ دیر بعد ایک شادی شدہ جوڑا آئے گا تو ان کو چابی دے دیں تاکہ وہ گھر دیکھ لیں کہ کیا کیا کام کروانا، کب سے بند ہے نا وہ گھر۔" زاہد نے کن انکھیوں سے برابر والا گھر دیکھتے ہوئے کہا اور چابی میرے حوالے کی۔
"اوہ ہو اب پتہ نہیں کب تک وہ لوگ آئیں گے۔" میں نے پریشان ہو کے باہر ایک نظر ڈالی جہاں رات اپنے پر پھیلانے والی تھی۔
"عجیب لوگ ہیں بند گھر لے رہے ہیں، یہ والا پورشن لے لیتے تو آسانی رہتی نا ان لوگوں کو۔"
"ہمیں کیا یار۔چھوڑو بھی ۔ ارے ویسے بھی صرف میاں بیوی ہی تو ہیں۔ بتا رہی تھیں کہ نیا نیا شادی شدہ کوئی جوڑا ہے خاص اصرار کر کے وہ مکان لیا ہے۔" انہوں نے کہا بھی تھا کہ یہ والا پورشن لے لیں لیکن مرضی ان کی۔"
"ہوں۔واقعی ہمیں کیا۔لیکن پتہ نہیں کب تک آئیں گے اب وہ۔" میں نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔ بچے بھی انتظار کر رہے ہوں گے نا ہمارا۔"

"خیر ہے یار۔ جاتے جاتے اب کیا میں ان کو منع کرتا۔ کچھ دیر بیٹھ جائیں گے ادھر ہی۔"

"جی نہیں بیٹھنے کی نہیں ہو رہی۔ آپ یہ سامان گاڑی میں رکھنا شروع کر دیں۔" میں نے مصنوعی غصے سے کہا تو وہ بھی مسکراتے ہوئے سامان اٹھا کے باہر کی سمت بڑھے۔

ابھی زاہد کو باہر گئے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ دروازے پر ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"اوہ شکر وہ لوگ آ گئے۔ میں نے پھرتی سے چادر اوڑھی اور چابی لیے دوازہ کھولنے کے لیے لپکی۔

"جی جی۔ یہ وہی کنویں والا گھر ہے۔" زاہد کی زندگی سے بھرپور آواز نے مجھے ٹھٹک کے رکنے پر مجبور کر دیا۔

"وہ ہم......!"

"میں چابی لے کے آتا ہوں آپ دو منٹ رکیں۔ بلکہ چاہیں تو اندر آ جائیں میری بیوی ہے۔ کوئی چائے پانی" زاہد کو بڑے غلط وقت پر مہمان نوازی یاد آئی تھی۔ مجھے تپ چڑھ گئی۔ ایک تو ویسے ہی دیر ہو رہی تھی اب جو یہ لوگ اندر آ گئے تو پتہ نہیں کتنا اور لیٹ ہونا پڑے گا۔"

"نہیں کرپا ہو گی آپ چابی دے دیں۔" میں جو دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھا رہی تھی ایکدم بے جان سی ہو گئی۔

"آپ کو بھی دیر ہو رہی ہے اور ہم اب مزید صبر نہیں کر سکتے۔"

"یہ آواز یہ سنی سنی سی ہے......" میں نے لرزتے ہوئے خود کی تسلی کرانی چاہی۔

"نہیں نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے سلمی۔"

"لگتا ہے آپ دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے؟" زاہد کی آواز بے حد قریب سے آئی یقیناً وہ لوگ پاس آ رہے تھے۔

"جی ابھی ہی ہوئی ہے۔" کھلکھلاتی ہوئی آواز میں کیا تازگی تھی کیا جوانی تھی۔ لیکن میرے جسم میں انجانی سی کپکپی دوڑ رہی تھی۔

"آپ اندر آ جاتے تو اچھا تھا لیکن چلیں میں ایک منٹ میں چابی لے کے آتا ہوں۔"

"دراصل بس اب انتظار کا ایک لمحہ بھی بھاری ہے ہم پر۔" مردانہ شرارتی آواز گیٹ کے پاس ہی سنائی دی تو میں بے ساختہ دروازے کی آڑ میں ہو گئی۔

"سلمی لاؤ چابی دے دو۔" زاہد نے اندر آتے ہی مجھے پکارا میں دروازے کی آڑ میں تھی انہوں نے بے دھیانی میں مجھے نظر انداز کیا اور سیدھے ہی اندر کی سمت چلے گئے۔ "ارے کہاں رہ گئی یہ بندی بھی۔"

زاہد کے جاتے ہی کھلے دروازے سے جو آوازیں میری سماعت سے ٹکرائی اس کے سننے کے بعد مجھے آج بھی یقین نہیں آ رہا کہ میں پاگل کیوں نہیں ہوئی۔ کیسے اب تک ہوش و حواس برقرار ہیں میرے۔ لیکن۔ اگر آپ میں سے کسی کو اس سوال کا جواب ملے تو مہربانی کر کے مجھے بتائیں۔

کیا ایسا ہونا ممکن تھا جو ہوا۔

......❁❁......

"بھگوان کی کرپا سے ہم مل ہی گئے ری شالو۔" چہکتی ہوئی آواز فضاء میں بکھری۔

"ملنا تو تھا ہی جنسی جی۔ بڑی تپسیا کرت رہے ہم۔" شالو نے چلبلے انداز میں اونچی آواز میں کہا لمبا سے انتجار کیئے رہے ہیں۔"

"اب ہم کو کوئی الگ نا ہی کر سکت نا شالو۔" جنسی راج نے محبت پاش لہجے میں اپنی دھرم پتنی سے تائید چاہی ہو جیسے۔"

"نا ہی سوامی جی۔ اب کوئی ہم کا تم سے الگ نا ہی کر سکت۔ کڑی آجا مائش ختم ہوئی ہم کی۔ اب تم ہو گئے مہاراج جی اور تم کی شالو ہو گی۔"

مردانہ ہنسی کے ساتھ شرمیلی سی ہنسی نے جہاں مجھے چونکایا اپنا نام سن کے میں سکتے میں کھڑی رہ گئی۔

......❁❁......

"سلمی جی جرا جلدی چابی دے دیو اب ہم کو۔ زاہد جی کو کیسے ملے گی ادو تو تم کے پاس ہے نا۔"

ایک مسکراتی ہوئی آواز فضاء میں بکھری۔

"ہم کو اپنے سوامی کے پاس جانا ہے رے۔"

(ختم شد)

واپسی

مظہر سلیم ہاشمی

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

جو چپ رہے گی زبان خنجر

لہو پکارے گا آستیں کا

ایک قتل کی روداد، جس کا صرف ایک ہی عینی شاہد تھا اور وہ بھی خاموش تھا چنانچہ قاتل پر کوئی کیس نہ بنا مگر مقتول اپنے قتل کا بدلہ لینے کے لیے دوبارہ زندہ ہوگیا۔

انگریزی ادب سے ایک دلچسپ پر اسرار کہانی

انیس سو چھیاسٹھ کی بات ہے۔ میں تیئیس سال کا ہو چکا تھا اور الی وقومی ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا تا کہ درس وتدریس کا شعبہ اختیار کر سکوں۔ یہ ستمبر کی ایک ہلکی گرم صبح تھی جب میں اپنے کمرے میں ایک کتاب کے مطالعے میں مستغرق تھا۔ علاقے میں ہم لوگ ہی صرف اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے جو کہ تیسری منزل پہ واقع تھا۔

مجھ پر سستی غالب آ رہی تھی اور بار بار ارتکاز ٹوٹنے پر میری نگاہ کھڑکی سے باہر دوڑ جاتی تھی۔ سڑک کے پار پیدل گزرگاہ تھی اور اس سے آگے میں ڈون سیزارو کے محل نما مکان کے وسیع اور خوبصورتی سے آراستہ باغ کو دیکھ سکتا تھا۔ یہ مخمس شکل کا مکان سڑک کے کونے پر واقع تھا اور اپنی خوبصورتی کی آپ ہی مثال تھا۔

ڈون سیزارو کے مکان کے ساتھ والے گھر میں پرسکون خاندان رہائش پذیر تھا۔ مہربان چہروں اور خوش اخلاق مزاج والا خاندان علاقے کے لوگوں میں پسندیدہ ترین شمار ہوتا تھا۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں اور میں سب سے بڑی ایڈریانا کے یک طرفہ عشق میں مبتلا تھا۔ اس کی دید کی آس میں بار بار نگاہ بھٹک کر کوئے یار کی جانب مڑ جاتی تھی لیکن ابھی تک ترسنے کے علاوہ کچھ میسر نہ آیا تھا۔ اتنی صبح اس کا دیدار ناممکنات میں سے تھا لیکن اس کوشش میں دماغ سے زیادہ دل کی خواہش پیش پیش تھی۔

بوڑھا ڈون سیزارو تنہا رہتا تھا اور حسب معمول صبح صادق کے اس پہر بھی اپنے باغ کی تزئین وآرائش میں مصروف عمل تھا۔ تین چار سیڑھیوں کی بلندی پر واقع گیٹ باغ میں ہی کھلتا تھا جس سے ایک پیدل راستہ مکان کی طرف جاتا تھا۔

رہائشی علاقہ ہونے کے سبب یہاں پیدل ٹریفک نہ ہوتا تھا اس لیے میری نگاہ میں وہ شخص فوراً ہی آ گیا جو لنگڑاتا ہوا سڑک کے ایک جانب سے نمودار ہوا تھا۔ اور میری توجہ اس کی جانب کیوں نہ جاتی۔ وہ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس تھا اور حلیے سے کوئی بھک منگا یا فقیر لگ رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اسی پیدل گزرگاہ پر چل رہا تھا جو سیزارو کے گھر کے سامنے سے گزرتی تھی۔ مدقوق چہرے پر کھچڑی داڑھی تو عجیب تھی ہی لیکن اس کے سر پہ سجا زرد تنکوں والا ٹوٹا پھوٹا ہیٹ عجیب تر ہی تاثر دے رہا تھا۔ گرمی کے باوجود اس نے ایک بوسیدہ اور پیوند لگا لمبا سا ہرمچی رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ ایک میلی کچیلی سی کپڑے کی گٹھڑی بھی اس نے اٹھا رکھی تھی ۔۔۔ جس میں، میرے اندازے کے مطابق وہ اپنا جمع شدہ چندہ اور خوراک سنبھال کے رکھتا تھا۔

میں اسے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ ڈون سیزارو کے باغ کے سامنے وہ رک گیا اور لوہے کے جنگلے کو پکڑ کر بھیک مانگنے لگا۔ سیزارو ایک کنجوس ترین شخص تھا اور علاقے کے ناپسندیدہ لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس بھکاری کی جانب دیکھے بغیر ہی اس نے دھتکارنے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

والا ایک اشارہ کیا اور اپنے پودوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔ بھکاری بھی اس بات پر باز نہ آیا اور دھیمی آواز میں اپنی مدد کی درخواست کرتا رہا۔ اس کا اصرار جاری ہی تھا کہ سیزارو پھٹ پڑا۔

"تمہیں ایک بار کی بات سمجھ نہیں آتی دفع ہوجاؤ ادھر سے اور میرا دماغ چاٹنا بند کرو۔"

اس چلانے کا بھکاری پر الٹا اثر پڑا اور وہ سنگِ مرمر کی سیڑھیاں چڑھ کر آہنی گیٹ سے چھیڑ خانیاں کرنے لگا۔ وہ بھی اب بلند آواز میں بھیک کا مطالبہ کررہا تھا۔

سیزارو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا، ویسے بھی وہ غصے کو ضبط کرنے والا انسان نہیں تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور گیٹ کو ایک زوردار دھکا رسید کردیا۔ بھکاری نے سنبھلنے کی پوری کوشش کی اور ایک ہاتھ سے جنگلے کی سلاخ کو تھامنے کی بھی کوشش کی لیکن سیڑھیوں کا پتھر بے حد چکنا تھا اور وہ پھسل کر سخت فرش پر گر گیا۔ آنِ واحد میں، میں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں آسمان کی سمت ہوئیں اور سیڑھی کے کنارے سے سر ٹکرانے پر ہڈی ٹوٹنے کی بے حد بلند آواز آئی۔ وہ چاروں شانے چت ادھر ہی ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

سیزارو تیزی سے دوڑتا ہوا باہر کی جانب آیا اور جھک کر بھکاری کا سینہ ٹٹولنے لگا، غالباً دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ موت کی تصدیق ہونے پر اس کے جھریوں زدہ چہرے پر پریشانی ثبت ہوکر رہ گئی تھی۔ خوفزدہ سی صورت کے ساتھ اس نے فوراً بھکاری کی لاش کو پاؤں سے پکڑا اور گھسیٹ کر اپنے مکان کی سیڑھیوں سے دور کر کے پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے مکان میں چلا گیا اور دروازہ بھیڑ کر اندرونی حصے میں غائب ہوگیا۔ اس کے چہرے پر ایسا اطمینان تھا جیسے اس کی اس مجرمانہ غفلت کا کوئی گواہ موجود نہ ہو۔

میں اس واقعے کا اکلوتا عینی شاہد تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک راہ گیر سڑک پر آیا اور بھکاری کی لاش کے پاس رک گیا۔ اس کے بعد لوگوں کا مجمع اکٹھا ہونے لگ گیا۔ پھر پولیس آئی اور اس نے سب کو منتشر کیا اور لاش اٹھوائی۔ ایک ایمبولینس آئی اور فقیر کی لاش کو لے کر چلی گئی اور یہ واقعہ بھی بنا گواہ کے حادثہ شمار ہوا۔

اور ایسا ہی رہا اس معاملے پر آئندہ کسی نے کوئی گفتگو نہ کی۔

میں نے بھی کبھی اس معاملے پر منہ کھولنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ یہ شاید میری زیادتی تھی لیکن ایک بوڑھے شخص کو جیل میں سڑانے سے مجھے کیا فائدہ ہوتا؟ بدمزاجی ایک طرف لیکن قبر میں پاؤں لٹکائے اس بوڑھے کی زندگی کے آخری ایام قانونی کارروائیوں میں الجھا کر میں بددعائیں نہیں سمیٹنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جو کچھ ہوا وہ ایک حادثہ ہی تھا اور سیزارو کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا۔ میرے نزدیک ضمیر کی خلش ہی اس کے لیے کافی سزا تھی۔

آہستہ آہستہ یہ واقعہ میرے ذہن سے بھی محو ہونے لگا۔ البتہ جب بھی میرا سامنا ڈون سیزارو سے ہوتا تو ایک عجیب سنسنی کی لہر میرے بدن میں دوڑ جاتی تھی۔۔۔ اس کی زندگی کے بھیانک راز سے میں واقف تھا جبکہ اسے اس بات کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس واقعے کے بعد سے میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ اس سے کہیں ٹکراؤ نہ ہو اور نہ ہی مجھ میں کبھی اتنی ہمت آئی کہ اس معاملے پر اس سے بات کرتا۔

☆☆☆

تین سال بعد انیس سو اسّی کی بات ہے میں چھبیس برس کا ہو چکا تھا اور اپنی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ہسپانوی زبان و ادب کی تدریس میں مصروفِ عمل تھا۔ ایڈریانا برسکونی کا بیاہ میری بجائے ایک اور شخص سے ہو چکا تھا، اور کون جانے کہ اگر مجھ سے ہوا ہوتا تو میں کیسا اسے اپنے دل کی رانی بنا کے رکھتا۔ یہ جاننے کی

تو حسرت ہی رہی کہ وہ شخص ایڈریانا کے قابل بھی تھا کہ نہیں؟

ایڈریانا ان دنوں ماں بننے والی تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی اپنے آبائی مکان میں شوہر کے ساتھ رہائش پذیر تھی اور بخدا دن بدن حسین سے حسین تر ہوتی جا رہی تھی۔

دسمبر کی اس بھیگی شام میں، میں اپنے کمرے میں چند لڑکوں کو پرائیوٹ ٹیوشن دے رہا تھا جن کا امتحان قریب تھا۔ اس تیاری کے دوران میں بوجھل فضا سے نجات پانے کے لیے گاہے بگاہے نظر کھڑکی سے باہر دوڑا لیتا تھا۔

اچانک میرا دل قلابازی کھا کر رہ گیا اور ایک لمحے کے لیے تو یہ محسوس ہوا کہ جیسے میرے دماغ کو دھوکا ہوا ہو۔

اسی گزرگاہ پر، اسی طرح لنگڑاتے ہوئے، انہی بوسیدہ چیتھڑوں والے لمبے سرمئی کوٹ میں ملبوس، ڈون سیزامرو کے ہاتھوں جاں بحق ہونے والا بھکاری اپنے سر پر دھری زرد تنکوں والی ہٹ کو درست کرتا چلا آ رہا تھا۔

اپنے شاگردوں کو بھول کر میں کھڑکی سے چپک کر رہ گیا۔ بھکاری کے قدموں میں سستی آ گئی تھی جیسے وہ اپنی منزل کے قریب آ گیا ہو۔

"وہ واپس آ گیا۔" میں نے سراسیمہ ہوتے ہوئے سوچا۔

"وہ سیزامرو سے انتقام لینے کے لیے پھر سے زندہ ہو کر لوٹ آیا ہے۔"

ٹہلنے کے انداز میں چلتا فقیر لوہے کے جنگلے پر ایک نگاہ ڈالتا رکا نہیں اور آگے بڑھ گیا۔ ایڈریانا کے گھر کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے کنڈی ہٹائی اور اندر داخل ہو گیا۔

"میں ابھی واپس آیا۔" اپنے شاگردوں کو میں نے کہا جو حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے اور تیزی سے اپنے فلیٹ سے نکل آیا۔

سیڑھیاں پھلانگتا ہوا میں جلدی سے نیچے اترا اور ایک ثانیے میں سڑک پار کر کے ایڈریانا کے گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ اپنی تیز رفتاری پر مجھے خود بھی بڑی حیرت ہوئی۔ بلا اجازت اندر لیونگ روم میں داخل ہوا تو ایڈریانا کی ماں سے سامنا ہو گیا جو باہر جانے کے لیے تیار لگ رہی تھی۔

"اوہ...... پیارے پڑوسی...... کیا حال ہیں؟ بڑے دنوں بعد نظر آئے...... خیر معجزے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔" وہ نرمی سے بولی۔

وہ چھوٹے قد کی ایک نرم مزاج خاتون تھی جو کہ مجھ پر اکثر مہربان رہتی تھی۔ ایڈریانا کی شادی کے بعد میں نے میل ملاقات کم کر دی تھی اس لیے اس کی حیرت بجا تھی۔ اس نے مجھے گلے لگایا اور اندر بیٹھنے کی دعوت دی۔

مجھے سمجھ نہیں آئی کہ یہ ہو کیا رہا تھا۔ پھر مجھ پر وہاں لوگوں کی موجودگی سے انکشاف ہوا کہ ایڈریانا کے ہاں ایک پیارے سے بیٹے کی ولادت ہوئی ہے اور سب اس کی خوشی منا رہے تھے۔ میرے رقیب نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور میں نے بادل نخواستہ اسے مبارک باد دی۔

میں شش و پنج کا شکار ہو گیا کہ ان لوگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کروں یا پھر خاموش رہوں۔ آخر چپ نہ رہا گیا تو میں نے بات بنائی۔

"دراصل میں بیل بجائے بغیر اس لیے داخل ہو گیا کیونکہ میں نے یہاں ایک مشکوک حلیے والے شخص کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ گداگر اپنی کپڑے کی پوٹلی کے ساتھ آیا تو مجھے ایسا لگا کہ چوری کی نیت سے نہ آیا ہو۔" میں نے ٹکڑوں میں اپنی بات مکمل کی۔

وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے: بھکاری، تھیلا، چوری؟ کیا اوٹ پٹانگ باتیں تھیں۔ وہ سب لوگ بہت دیر سے لیونگ روم میں تھے اور کسی کی بھی ایسی آمد سے یقیناً واقف ہوتے۔ میری باتیں انہیں کسی دیوانے کی بڑ سے زیادہ نہیں لگ رہی تھیں۔ ان کی اس خاموش حیرانگی نے مجھ پہ اثر کیا اور میں خود کو شرمسار سا محسوس کرنے لگا۔

"لگتا ہے مجھے کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی۔" میں نے خفت مٹانے کے لیے کہا۔

ان لوگوں نے بھی مجھے مزید شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی گھریلو تقریب میں مدعو کر لیا۔ ایڈریانا اپنے کمرے میں بچے کے ساتھ موجود تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میں اس صورت حال میں اسے کیا کہوں؟ اپنی محبت کو رقیب کی اولاد تھامے دیکھ کر کیا کہا جا سکتا ہے۔

"کیا نام رکھا ہے بچے کا؟" میں اسے مبارک باد دیتے ہوئے بولا۔

"گستاو۔" وہ مسکرائی۔ "اس کے دادا کے نام پر۔"

میں مسکرا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اگر یہ میری اولاد ہوتا تو میں نے اس کا نام فریڈرک رکھنا تھا لیکن والے قسمت وہ میری اولاد نہیں تھا۔ مجھ پر اداسی طاری ہو گئی۔

گھر واپس آ کر بھی میں یہی کچھ سوچتا رہا۔

"بوڑھا بھکاری سیزامرو سے انتقام لینے نہیں آیا تھا بلکہ وہ تو

ایڈریانا کے بیٹے کی صورت میں نیا جنم لینے آیا تھا۔" میری سوچ عجیب انداز میں بھٹک رہی تھی اور ایڈریانا کے خیالوں سے نجات کے لیے میں کچھ بھی الٹا سیدھا سوچ رہا تھا۔

دو تین روز بعد مجھے اپنے ان مضحکہ خیز خیالات پر خود ہی ہنسی آنے لگی اور میں انہیں ذہن سے جھٹک کر زندگی کے سفر میں محو ہو گیا آہستہ آہستہ یہ باتیں میرے ذہن سے محو ہو گئیں۔

☆☆☆

میں اس واقعے کو شاید ہمیشہ کے لیے بھول جاتا اگر دس سال بعد میری زندگی میں یہ انوکھا دن نہ آتا۔

سفرِ حیات نے تھکانا شروع کر دیا تھا اور میں خود کو اب ویسا تازہ دم محسوس نہیں کرتا تھا جیسے کچھ سال پہلے تھا۔ اس سہ پہر میں تھکن اتارنے کے لیئے ایک دلچسپ کتاب مطالعہ کر رہا تھا۔ سامنے موجود کھڑکی کو کھول کر میں تازہ ہوا سے بھی پوری طرح محظوظ ہو رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً نگاہ باہر کی جانب بھی دوڑ جاتی تھی۔

ایڈریانا کا بیٹا، گستاو اپنے گھر کی چھت پر کھیل کود میں مگن تھا۔ اپنی عمر کے حساب سے وہ بالکل بچکانہ کھیل میں مصروف تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے باپ کی طرح کند ذہن واقع ہوا تھا اگر وہ میرا بیٹا ہوتا تو اپنے فارغ وقت میں یقیناً کوئی کارآمد کھیل میں اپنی دلچسپی کا سامان ڈھونڈتا۔

اس نے دیوار کی منڈیر پر مشروب کے خالی ٹین پیک ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے اور چھوٹی کنکریوں سے ان پر نشانہ بازی کر رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب ایک بھی کنکر نشانے پر نہیں لگ رہا تھا اور سارے کے سارے پتھر دیوار کے پار ڈون سیزارو کے باغ میں گر رہے تھے۔

سیزارو کا غصے سے بھرا چہرہ تصور کر کے میں نے بمشکل قہقہہ روکا کیونکہ وہ اس وقت باغ میں نہیں تھا اور جب آتا تو اپنے پھولوں کی اجڑی حالت دیکھ کر یقیناً آپے سے باہر ہو جاتا۔

کہتے ہیں شیطان کو یاد کرو تو وہ فوراً حاضر ہو جاتا ہے۔ میں ابھی اپنے خیال سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہیں ہو پایا تھا کہ سیزارو اپنے مکان سے باہر نکلتا نظر آیا۔ وہ اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور چھڑی کے سہارے وہ آرام سے چل رہا تھا۔ اپنے پھول بوٹوں کی حالتِ زار دیکھ کر وہ ششدر گیا اور تیزی سے چلنے لگا تاکہ وجہ جان سکے۔ اپنے گیٹ کی سیڑھیوں کے پاس والے پودوں کا جائزہ لینے کے لیے وہ کچھ زیادہ ہی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

گستاو نے ابھی تک بوڑھے سیزارو کو نہیں دیکھا تھا اور وہ اپنے کھیل کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ عین اسی لمحے اس کا ایک کنکر نشانے پر لگا اور ٹین کا ڈبہ زوردار آواز پیدا کرتا ہوا باغ میں آن گرا۔ سیزارو جو اب ماربل کی سیڑھیوں پر تھا اس زوردار دھماکے نما آواز سے بدحواس ہو گیا۔ چھڑی ایک دم اس کے ہاتھ سے نکل کر گر گئی اور وہ پھسل کر زمین بوس ہو گیا۔ آخری قدمچے کے کونے سے اس کا سر ٹکرا کر کھل گیا تھا اور اسے تڑپنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔

اپنی آنکھوں کے سامنے یہ بدترین حادثہ دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ بچے کو بوڑھے کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی اور نہ ہی سیزارو اپنی موت کا سبب بننے والے لڑکے کو دیکھ پایا۔ بنا کسی وجہ کے گستاو اسی لمحے چھت سے اتر گیا۔ لوگ جائے حادثہ پر اب جمع ہونے لگے تھے۔ لاش کی حالت سے واضح تھا کہ وہ عجلت کے باعث پھسل کر گرا تھا۔

اگلے دن تدفین کی تقریب سیزارو کے گھر میں ہی منعقد ہو رہی تھی۔ گلی میں کافی لوگ تماشا کو خوشی کے لیے ٹھہرے تھے اور باقی سب اندر تابوت کے گرد جمع تھے۔ ان میں بے چینی پائی جاتی تھی کہ کب یہ پادری مناجات ختم کرے اور کب وہ اپنے کام کو واپس لوٹیں۔

اس وقت میری آنکھوں نے جو دیکھا وہ کبھی نہ بھولنے والی بات تھی۔ برسکونی کے گھر سے لنگڑا بھکاری اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں نمودار ہوا۔ کپڑوں کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھی اور بوسیدہ کوٹ بھی ویسے ہی اوڑھا ہوا تھا جیسے میں نے کئی سال قبل دیکھا تھا۔ وہ لوگوں کے بیچ جگہ بناتا اسی سمت روانہ ہو گیا جہاں سے دو بار اس کی آمد ہو چکی تھی جبکہ میں ہونقوں کی طرح اس کو جاتے تکتا رہا۔ اس نے ایک بار مڑ کر میری جانب دیکھا اور مسکرا دیا میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گیا۔

دوپہر کو ایک افسوسناک خبر میری منتظر تھی جس نے مجھے دکھی تو کیا لیکن کوئی حیرانگی نہیں ہوئی۔ گستاو اپنے گھر سے غائب تھا۔ برسکونی خاندان نے اپنے لڑکے کو تلاش کرنے کے لیئے بڑی دوڑ دھوپ کی لیکن مجھے ایک بار بھی حوصلہ نہیں ہوا کہ ایڈریانا کو جا کر بتا سکوں کہ یہ سب فضول ہے۔ وہ جس مقصد کے لیے دنیا میں آیا تھا اسے پورا کر کے جا چکا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کی ہولناک تباہیوں سے کشید... تین وطن پرست لڑکیوں کی داستان جنہیں زمانہ معاشرتی غلاظت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم جاری تھی اور نازی فوجوں نے فرانس کو جہنم بنادیا تھا۔ جرمن طوفان کی طرح پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے شہروں پر قبضہ کررہے تھے اور اس تلخ حقیقت نے فرانسیسی جرنیلوں کی نیندیں اُڑادی تھیں۔ ہر شخص فکر مند تھا۔ ہر دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔ حکومت نے عوام سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنے اپنے طور جہاں اور جیسے مناسب سمجھیں دشمن کا مقابلہ کریں۔ جو شخص اپنی خدمات جس انداز میں بھی فوج کو پیش کرسکتا ہو دیر مت کرے۔ ملکی دفاع کے لیے ہر شہری کو اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ چنانچہ بڑی تعداد میں نوجوان فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ بوڑھے اور خواتین بھی جہاں اور جیسے ممکن تھا فوج کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

اس روز جنرل ساتراں اپنے شہریوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ایک فوجی کیمپ میں موجود تھا کہ تین خوب صورت لڑکیاں اس سے ملاقات کے لیے آئیں۔ مختصر کارروائی کے بعد محافظوں نے انھیں جنرل ساتراں سے ملنے کی اجازت دے دی۔ جب تینوں لڑکیاں جنرل ساتراں کے دفتر میں داخل ہوئیں تو وہ ان کے بھڑکیلے لباس اور چہروں کا میک اپ دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ شہر کی شریف عورتیں ہرگز نہیں۔ یہ وہی عورتیں تھیں جو فرانس کی بدنام زمانہ گلیوں میں بیباک حرکتیں کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں شہوانیت کی چمک ضرور تھی مگر چہروں پر نسوانیت کا وقار کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جنرل ساتراں ان کے چہرے پڑھنے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ بے تکلفی سے آگے بڑھیں اور کرسیاں گھسیٹ کر میز کے اردگرد بیٹھ گئیں۔ حالانکہ کسی شخص کو یہ جرات نہیں تھی کہ جنرل کے سامنے یوں بے تکلفی کا مظاہرہ کرے۔ کمرے میں چند لمحے خاموشی چھائی رہی اور پھر ان میں سے ایک لڑکی ہونٹوں میں سگریٹ دبا کر سلگاتے ہوئے بولی:

''میرا نام لیورا ہے جب کہ یہ میری سہیلیاں لزی اور شیزا ہیں۔ ان دونوں نے آپ سے گفتگو کرنے کے لیے مجھے اپنا لیڈر منتخب کیا ہے۔''

''جی فرمائیں! میں آپ کی بات توجہ سے سن رہا ہوں۔'' جنرل ساتراں نے سنجیدگی سے کہا۔ چونکہ وہ لڑکیاں فوجی زندگی کے اصولوں سے ناواقف تھیں اس لیے جنرل ساتراں ان کی بہت سی گستاخیوں کو نظر انداز کررہا تھا۔

''آپ نے یقیناً اندازہ لگالیا ہوگا کہ ہمارا تعلق پیرس کی ان بدنام گلیوں سے ہے جن کے بارے میں سن کر آپ جیسے مہذب اور شریف لوگوں کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں.... مگر یہ نفرت صرف سورج کی روشنی تک محدود رہتی ہے۔ چاند نکلتے ہی شریف زادوں کی نظروں میں ہماری قدرو قیمت بدل جاتی ہے اور دن بھر تنقید کا نشانہ بنانے والے شام ڈھلتے ہی ہمارے حسن کے قصیدے پڑھنے لگتے ہیں۔''

''میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں.... یہ بتائیں! میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔'' جنرل نے کہا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ یہ ملک ہمارے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کسی شریف شہری کے لیے۔ اس مٹی کی خوشبو ہمارے خون میں بھی رچی ہوئی ہے۔ صرف شرافت کا تمغہ حاصل کرنے والے ہی وطن پرست کہلانے کے مستحق نہیں ہیں، ہمارا بھی اس پر اتنا ہی حق ہے۔'' لیورا نے گردن اکڑا کر کہا۔

''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ یقیناً یہ ملک آپ کے لیے بھی اتنا ہی معتبر ہے جتنا کہ کسی دوسرے شہری کے لیے.... اب براہ کرم یہ بتا دیں کہ آپ چاہتی کیا ہیں۔'' جنرل ساتراں کے لہجے میں اب تک وہی نرمی تھی۔ اس نے ان کی تلخ باتوں کا قطعاً برا نہیں منایا تھا۔

''ہم تینوں نے ملکی دفاع کے لیے ایک اہم قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔'' لیورا نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھی بات ہے.... کیا بتانا پسند کریں گی کہ آپ کس طرح ملکی دفاع میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتی ہیں؟'' جنرل ساتراں نے پوچھا۔

''اس سلسلے میں ہم نے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ ممکن ہے آپ کے نزدیک یہ مضحکہ خیز ہو.... لیکن ہمیں اپنی کامیابی کا اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ اپنے اور آپ کے وجود کا۔''

''کیسا منصوبہ....؟'' جنرل ساتراں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا تو لیورا نے اپنی جیب سے خوشبو میں رچا بسا ایک لفافہ نکال کر ادب سے اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

جنرل ساتراں نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھایا اور چشمہ لگا کر اس میں سے کاغذ نکال کر پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ کاغذ پر لکھی تحریر پڑھ رہا تھا اس کے چہرے پر حیرت کے نقوش گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ تحریر پڑھ کر اس نے کاغذ واپس میز پر رکھا اور سامنے بیٹھی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے بولا:

''کیا میں یقین کرلوں کہ یہ سب مذاق نہیں.... اور ہم ایک دوسرے کا وقت برباد نہیں کر رہے۔''

''اس وقت ہمارا ملک جن حالات سے گزر رہا ہے، مذاق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جنرل.... براہ کرم آپ صرف یہ بتائیں کہ یہ منصوبہ کس حد تک قابل عمل ہے۔ کیا تکنیکی لحاظ سے یہ سب کچھ ممکن ہے جو ہم تینوں نے سوچا ہے۔''

''تکنیکی لحاظ سے اس منصوبے کو جانچنے کے لیے مجھے ہر شعبے کے ماہرین سے مشاورت کرنا ہوگی۔ لیکن پیاری لڑکیو! کیا تم نے یہ فیصلہ نشے کی حالت میں کیا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''ہاں جنرل....'' لیورا نے آنکھیں بند کرلیں ''ہم نے یہ فیصلہ نشے کی حالت میں کیا ہے۔ لیکن شراب کے نہیں، حب الوطنی کے نشے میں۔ یقین کریں یہ نشہ ہر اس نشے سے بڑھ کر سرور انگیز ہے جو آج تک ہم نے کیا ہے۔''

''فوج تمہارے اس جذبے کو سلام پیش کرتی ہے۔ میں تمہیں وطن کے لیے قربانی دینے سے نہیں روکوں گا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ فوج کی مدد کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں جہاں تم تینوں اپنے فرائض احسن طریقے سے انجام دے سکتی ہو۔'' جنرل ساتراں کے لہجے میں ان کے لیے محبت تھی۔

''بے فکر رہیں جنرل! آج فوج کا ہر سپاہی موت سے نبرد آزما ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کب دشمن کی گولی اس سے زندگی چھین لے۔ کب وہ بارودی سرنگ پر قدم رکھ کر اپنی موت کے پروانے پر دستخط کردے.... وطن کے لیے جان دینا کوئی نیا کام نہیں۔ یہ کام تو ملک کا ایک ایک سپاہی کر رہا ہے۔ لہٰذا آپ ہمیں موت سے خوفزدہ کرنے کی کوشش مت کریں۔''

''بے شک تمہارا جذبہ قابل تعریف ہے.... اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں آج ہی اپنے ماہرین کو طلب کرکے ان سے مشاورت کرتا ہوں۔ اگر اس منصوبے میں کوئی تکنیکی خامی نہ ہوئی تو میں تمہاری درخواست منظور کرلوں گا۔'' جنرل نے باوقار لہجے میں کہا اور تینوں لڑکیاں کمرے سے باہر چلی گئیں۔

-☆-

ہال کمرے میں اہم میٹنگ جاری تھی جس میں جنرل ساتراں اپنے فوجی ماہرین سے لڑکیوں کے بتائے ہوئے منصوبے پر گفتگو کر رہا تھا۔

''پلان منفرد ضرور ہے مگر ناممکن نہیں.... ہم بہت مختصر وقت میں ایسے نہایت حساس اور تباہ کن بم تیار کرسکتے ہیں جو ہماری ضرورت کے مطابق ہوں۔ بموں کی تیاری میں اس بات کا خاص خیال بھی رکھا جائے گا کہ وہ اپنے حجم سے بہت زیادہ تباہی پھیلائیں.... لیکن جنرل! حیرت اس بات کی ہے کہ لڑکیاں خود کو اس مشن کے لیے کیسے پیش کرسکتی ہیں۔ جبکہ وہ جانتی ہیں کہ اس مشن میں ان کی موت یقینی ہے۔ کہیں وہ سب نشے میں تو نہیں تھیں۔''

''لڑکیوں نے یہی کہا کہ وہ واقعی نشے میں ہیں لیکن شراب کے نہیں وطن کی محبت کے نشے میں۔''

جنرل کا جواب سن کر ہال میں سناٹا چھا گیا۔ وہاں موجود سب لوگ محب وطن تھے۔ وہ سب دشمن کے دانت کھٹے کردینے کے لیے ہمہ تن تیار تھے مگر ان تین لڑکیوں کے جذبے کے سامنے وہ اپنی حب الوطنی کو ہیچ محسوس کر رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر ایک فوجی افسر نے ادب سے پوچھا:

''اب ہمارے لیے کیا حکم ہے جنرل؟''

''فرانس جل رہا ہے۔ دور دراز کے علاقوں سے جو خبریں مل رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جرمن بھیڑیوں کی نگاہوں میں فرانسیسیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے.... ایسی صورت میں ہم ہر اس پروگرام پر عمل کرنے کو تیار ہیں جو جرمن یلغار کو روک سکے، انہیں تباہ کرسکے.... آپ اس مشن کے ہر پہلو کو مدنظر رکھ کر طے شدہ منصوبے کے مطابق بم تیار کریں۔ ساتھ ہی دشمن کے اہم لوگوں اور حساس مقامات کی فہرست بھی تیار کی جائے جن کو براہ راست نشانہ بنا کر ہم اس مشن کو احسن طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔''

جنرل ساتراں نے اپنے افسروں کو حکم دیا اور پھر ضروری کارروائی کے بعد یہ اہم ترین میٹنگ ختم ہوگئی۔

-☆-

وہ ایک اجلی صبح تھی جب تینوں لڑکیوں کو فوجی ہیڈ کوارٹر میں طلب کرلیا گیا تھا۔ لڑکیوں کے چہروں پر خوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ اس خفیہ عمارت کے اردگرد فوج کا ایک خصوصی دستہ پہرا دے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

رہا تھا اور کسی غیر متعلقہ شخص کو اس طرف آنے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔

عمارت کے ہال کمرے میں بم سیکشن کے چار سائنسدان، پلاسٹک سرجری کے دو ماہرین اور تین سرجیکل ڈاکٹر بھی موجود تھے۔

جنرل ساتراں خود اس اہم موقع پر لڑکیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے وہاں موجود تھا۔ ماہرین اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جبکہ لڑکیاں آپس میں خوش گپیاں کررہی تھیں۔

ایک گھنٹے بعد عملے کے ایک رکن نے جنرل ساتراں کو تیاری مکمل ہونے کی اطلاع دی تو اُن تینوں کی طرف متوجہ ہوا:

''منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تمام تیاریاں مکمل ہوچکی ہیں مادام لیورا.... آپ میں سے کون پہلے آپریشن کے مرحلے سے گزرنا چاہے گا؟''

''یوں تو ہم سب کی خواہش ہے کہ پہلے یہ مقام حاصل کیا جائے۔ بہر حال میں سب پر سبقت لے جانا پسند کروں گی۔ کیونکہ میں ان سب کی لیڈر ہوں اور چاہتی ہوں کہ پہلے خود کو اس قربانی کے لیے پیش کروں۔''

لیورا نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر اعتماد سے چلتی ہوئی آپریشن تھیٹر میں چلی گئی۔ جہاں عملہ اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ آپریشن ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

معاون عملہ آلات کی ٹرالی لے کر اس کے نزدیک پہنچ گیا تو لیورا نے بنا کسی جھجک کے اپنا بالائی لباس اتار کر قریب کھڑی نرس کو تھما دیا۔ لیورا کی آنکھوں میں اس لمحے وہی فطری بے حجابی تھی جو جسم فروشی کے پیشے کے دوران دوسروں کے سامنے بے لباس ہونے پر ہوتی تھی۔

آپریشن ٹیبل کے گرد جمع ڈاکٹروں کے دل یہ سوچ کر تیزی سے دھڑکنے لگے تھے کہ ابھی چند لمحوں بعد یہ مرمریں وجود والی خوب صورت حسینہ ہمیشہ کے لیے اپنے نسوانی حسن سے محروم ہوجائے گی.... وطن سے محبت کا یہ کیسا جذبہ تھا، کیسی لگن تھی جو اسے یہ قربانی دینے پر مجبور کررہی تھی....

مگر اسی لمحے انھیں اپنی یہ سوچ بے معنی معلوم ہونے لگی اور اک نیا خیال ان کے ذہن پر دستک دینے لگا:

''جب یہ سر پھری لڑکیاں اپنی جان دینے پر تل گئی ہیں تو پھر جسم کا کوئی ایک حصہ کیا معنی رکھتا ہے۔''

کچھ اسی قسم کے خیالات جنرل ساتراں کے ذہن میں تھے جو اس مرحلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے آپریشن تھیٹر میں داخل ہوچکا تھا۔ اس نے جنگ میں انسانی لاشوں کے ڈھیر دیکھے تھے۔ خود اس کے اپنے ہاتھوں سے نہ جانے کتنی زندگیاں ختم ہوئی تھیں.... لیکن ایک نازک اندام حسینہ کے اس انوکھے آپریشن کا منظر اس سے دیکھا نہیں جارہا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے چہرے کا رُخ دوسری جانب موڑ لیا۔

ڈاکٹر اور بم سیکشن کے ماہرین لیورا کے گرد جمع ہوچکے تھے۔

''کیا آپریشن سے قبل مجھے بے ہوش کیا جائے گا؟'' لیورا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں مس لیورا! بے ہوش تو کرنا پڑے گا۔'' ایک ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''مس؟'' لیورا ہنس پڑی تو ڈاکٹر جھینپ سا گیا۔

''خیر.... اگر مناسب سمجھیں تو بے ہوش کرنے سے پہلے مجھے ایک سگریٹ پلا دیں۔'' لیورا نے سنجیدگی اختیار کی۔

''جی ضرور مادام لیورا۔''

ڈاکٹر نے سگریٹ کا پیکٹ لیورا کی طرف بڑھا دیا۔ لیورا نے سگریٹ سلگا کر ہونٹوں میں دبایا اور آپریشن ٹیبل پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ جبکہ آپریشن ٹیبل کے اردگرد سب لوگ ادب سے نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ اس پل کسی شخص کے لیے سامنے بیٹھی لیورا ایک فاحشہ نہیں تھی۔ کسی کے دل و دماغ میں اسے برہنہ دیکھ کر ہیجان برپا نہیں ہوا تھا کیونکہ اب یہ حسین و جمیل وجود ملک و ملت کے حوالے کردیا گیا تھا۔

لیورا نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور پھر اس کا دھواں ہوا میں تحلیل ہوتے ہی اطمینان سے آپریشن ٹیبل پر لیٹ گئی۔

آپریشن کا آغاز ہوا تو ایک شخص نے پلیٹ میں رکھا ہوا ایک خاص قسم کا بم لاکر ڈاکٹروں کے پاس رکھ دیا۔ یہ بم عورت کے سینے کی ساخت کا تھا جس کی تیاری میں فرانسیسی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ماہرین نے اپنی تمام تر مہارت صرف کر دی تھی۔ بم بہت طاقتور تھا۔ اس معمولی جسامت کے بم سے ہونے والی تباہی کا عام انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

لیورا کو بے ہوش کیا جا چکا تھا اور ڈاکٹر ماہرانہ انداز میں اپنا کام کر رہے تھے۔

انھوں نے لیورا کے سینے کا ایسا آپریشن شروع کر دیا تھا جو عورت سے اس کا نسوانی حسن چھین لے۔ ڈاکٹرز کے لیے یہ زندگی کا سب سے عجیب و غریب آپریشن تھا۔ انھوں نے لیورا کا ایک سینہ جسم سے جدا کر کے اس کی رگیں بند کیں اور پھر اس کی کھال اتار کر پلاسٹ بم پر چڑھا دی گئی۔ پلاسٹک سرجری کے ماہرین نے اس کام کو بخوبی انجام دیا تھا اور آپریشن کے ذریعے لیورا کے جسم کو بالکل ویسا ہی کر دیا گیا جیسا وہ پہلے تھا...... لیکن اب اس کے سینے میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والا ایک بم نصب تھا جسے کسی طور تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

آپریشن تھیٹر میں اذیت ناک خاموشی تھی۔ ڈاکٹر بھی اس آپریشن کے اختتام پر الجھن میں تھے۔ آپریشن مکمل ہونے پر لیورا کا اسٹریچر اٹھا کر دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تو جنرل ساتراں لزی اور شنزا کے پاس آیا اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"فرانس کی عظیم بچیو! میں جانتا ہوں تمہارے عزم میں کسی کمزوری کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا...... اس کے باوجود میری پیش کش ہے کہ اگر تم اب بھی چاہو تو مزید آپریشن روکے جا سکتے ہیں۔ تمہاری خدمات فوج کے لیے کسی دوسرے ذریعہ سے بھی حاصل کر لی جائیں گی۔"

"کیا آپ کو ہمارے چہروں پر خوف کے آثار نظر آ رہے ہیں جنرل..... اگر ایسی بات ہے تو ہماری خواہش ہو گی کہ ہمارے خدوخال مسخ کر دیے جائیں جو ہمیں کمزور ظاہر کر رہے ہیں۔"

"نہیں میری بٹی! میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تمہارے چہروں پر عظیم فرانس کی جگمگاتی قسمت دیکھ رہا ہوں۔ تم جیسی بہادر لڑکیاں تو ملکوں کی تاریخ ترتیب دیتی ہیں۔" جنرل ساتراں نے جواب دیا۔

"تو پھر ہمیں اس قربانی سے نہ روکا جائے.... ہم بخوشی آپریشن کے لیے تیار ہیں۔" لڑکیوں نے بیک وقت کہا اور جنرل ساتراں کی آنکھیں ان کی محبت میں پرنم ہو گئیں۔

-☆-

تینوں لڑکیاں مطمئن تھیں۔ ان کے آپریشن کو تین ماہ گزر چکے تھے۔ قریباً ایک ماہ کے بعد وہ مکمل صحت یاب ہو کر مختلف قسم کی تربیت حاصل کرنے لگی تھیں۔ ہیڈ کوارٹر میں سوائے چند لوگوں کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ بظاہر حسین و جمیل دکھائی دینے والی یہ لڑکیاں دراصل بارود کا ڈھیر بن چکی ہیں۔ ڈاکٹرز اور بم سیکشن کے سائنس دان اپنے اپنے کام سے مطمئن تھے۔ ان کے مصنوعی سینے میں نصب بم کس طور بھی محسوس نہیں کیے جا سکتے تھے۔ پلاسٹک سرجری کے ماہرین نے کمال کر دکھایا تھا۔ تینوں لڑکیوں کو وہ خاص طریقہ بھی سمجھا دیا گیا تھا جس کے ذریعے وہ بم کو بلاسٹ کر سکتی تھیں۔

ان تین ماہ کے دوران جنرل ساتراں کی خصوصی ٹیم نے لڑکیوں کے لیے ان اہداف کا انتخاب بھی کر لیا تھا جن کی تباہی سے فرانس کو فائدہ ہو سکتا تھا۔

آج کا دن بہت اہم تھا۔ لڑکیاں اپنے اپنے مشن پر روانگی کے لیے تیار تھیں۔ جنرل ساتراں خود انھیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھا۔ سب کے چہروں پر موت کا سکوت تھا مگر لڑکیاں مسکرا رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر وہی کھلنڈرا پن تھا جو ان کی پہچان ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے بے چین دکھائی دے رہی تھیں۔

"میں اور میرے ساتھی تم سب کو دلی دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ فرانس کی تاریخ میں تمہارا نام سنہرے حروں سے لکھا جائے گا۔" جنرل نے کہا۔

"ہم نے کوئی انوکھا کارنامہ انجام نہیں دیا جنرل.... فرانس کا ہر سپاہی اور ہر شہری اس وقت اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہے۔ البتہ ہمارا پیغام ان لوگوں تک ضرور پہنچا دیں، جنھوں ابھی تک وطن کے تحفظ کے لیے اپنی خدمات کا تعین نہیں کیا ہے۔ ہم وطن کی مٹی کا قرض اتارنے جا رہی ہیں۔ ہم نے اسی مٹی سے جنم لیا اور اسی مٹی میں شامل ہونے جا رہی ہیں۔"

لیورا کی بات مکمل ہوتے ہی لڑکیوں نے ہوائی بوسے فوجی افسروں کی طرف اچھالے اور پھر ایک خصوصی گاڑی انہیں لے کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ لڑکیوں کو دشمن کی صفوں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں داخل کرنے کا خفیہ منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچنے والا تھا۔

☆

لزی کا حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا اور پانی کا دور دور تک کوئی نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُسے بھوکے پیاسے اس سنسان راستے پر آگے بڑھتے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ بہت دیر پہلے اس نے پانی کی وہ آخری بوند بھی اپنے حلق میں ٹپکا لی تھی جو اس کی بوتل میں محفوظ تھی۔ سفر نے اس کی حالت خراب کر دی تھی.... درحقیقت وہ چاہتی بھی یہی تھی کہ اس کی حالت زیادہ سے زیادہ ابتر ہو جائے اور وہ بہت مظلوم دکھائی دے۔ اس کا لباس بھی چیتھڑوں کی شکل میں تھا۔ لیکن چیتھڑے اس انداز کے تھے کہ لزی کے جسمانی خطوط کا اندازہ پہلی ہی نظر میں لگایا جا سکے۔

لزی ایک اچھے خاندان کی لڑکی تھی۔ باپ کے مرتے ہی اس کے خاندان پر تباہی نازل ہو گئی۔ یہاں تک ان کا مکان بھی نیلام ہو گیا۔ جب کوئی سہارا نہ رہا تو لزی نے ایک ہوٹل میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کی اجرت نہایت معمولی تھی اور گزارہ بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ پھر ہوٹل کے مالک ولیم کی نظر کرم نے لزی کی بہت سی مشکلات دور کر دیں۔ اس نے لزی کو تحائف پیش کرنا شروع کر دیے جنھیں وہ بخوشی قبول کرتی رہی۔ چنانچہ جب ان تحائف کے بدلے میں ولیم نے اپنی اصل خواہش کا اظہار کیا تو لزی انکار نہ کر سکی.... یوں جلد ہی وہ ولیم کی ضرورت بن گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ مگر ایک شام ولیم نے لزی کو حکم دیا کہ وہ اس کے دوست کے ساتھ وقت گزارے۔ یہ سن کر لزی کو شدید غصہ آیا مگر ولیم کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ اس واقعے کے بعد اسے ولیم سے نفرت ہو گئی لیکن حالات اس قدر ابتر تھے کہ لزی اسے چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ یوں اسے ولیم کے سامنے جھکنا ہی پڑا۔ ولیم ایک خالص کاروباری آدمی ثابت ہوا تھا اور لزی کی مجبوریوں کو دیکھ کر اس پر بہت سی شرائط اور پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ لزی کے لیے ان حالات میں کسی صورت انکار ممکن نہیں تھا لہٰذا اس نے ولیم کی ہر شرط منظور کر لی.... اب ولیم ہر رات اپنے ساتھ ایک نئے دوست کو لانے لگا۔ جن کے بارے میں لزی کو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ولیم کا کوئی دوست نہیں تھا۔ یہ سب وہی تھے جو لزی کے

ساتھ رات گزارنے کے عوض ولیم کو بھاری رقم ادا کرتے تھے۔
جب لزی کو یہ معلوم ہوا تو اس کی نفرت انتہا کو پہنچ گئی۔ ایسے میں لزی کی ایک سہیلی نے اسے مشورہ دیا کہ اگر یہی کام کرنا اس کا مقدر ہے تو پھر ولیم کا سہارا کیوں لیا جائے۔ لزی نے سہیلی کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے پیرس کی ان بدنام گلیوں کا رخ کرلیا جو جسم فروشی میں بہت شہرت رکھتی تھیں۔
ماں کے مرنے پر لزی بالکل آزاد ہوگئی تھی۔ اب وہ چالاک مردوں کو بے وقوف بنا کر ان کی جیبیں خالی کرلیا کرتی تھی.... لیکن جب لیورا نے اسے وطن کے لیے جان دینے والوں میں شامل ہونے کی پیش کش کی تو نہ جانے کیوں لزی سے انکار نہ ہوسکا۔ لیورا کا منصوبہ بہت بھیانک تھا جسے لزی نے بخوشی قبول کرلیا اور اس کاغذ پر اپنے خون سے دستخط کر دیے جس پر دو مزید دستخط دکھائی دے رہے تھے۔ اس فیصلے کے بعد اس نے خود کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ اب وہ اپنی ہر سانس کو وطن کی امانت سمجھتی تھی اور اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے تیار رہنے لگی تھی۔
لزی کی پیاس بڑھتی چلی جارہی تھی۔ دوران سفر اس نے کئی جرمن دستے بھی آتے جاتے دیکھے تھے مگر وہ اس انداز سے آگے بڑھ رہی تھی کہ کسی نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ جرمن طیارے بھی مسلسل فضائی نگرانی کررہے تھے۔
لزی کا گزر جن بستیوں سے ہوا تھا وہاں سوائے تباہی کے کچھ نہیں بچا تھا۔ تباہ شدہ عمارتیں اور جلی ہوئی فصلوں کے ڈھیر ہرسو اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ فرانس کے شہریوں کی لاوارث لاشیں دیکھ رہی تھی اس کے سینے میں انتقام کی آگ بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اسے انتظار تھا تو صرف کیمپ نمبر بیس تک پہنچنے کا اور یہ موقع اسے دوسرے دن ملا جب وہ بھوک پیاس سے نڈھال اس کیمپ کی طرف جانے والی سنسنان سڑک پر فصلوں کے نزدیک پڑی تھی۔
یہ دوپہر کا وقت تھا جب اسے اپنے سر پر دہاڑتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ لزی نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ہیلی کاپٹر بہت نیچی پرواز کرتے ہوئے اس کے اردگرد چکر لگا رہا تھا۔ لزی کو معلوم تھا کہ اس علاقے کی بہت سخت نگرانی کی جاتی تھی۔ ہیلی کاپٹر میں بیٹھے جرمن فوجی نیچی پرواز کرتے ہوئے اسے قریب سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر ہیلی کاپٹر اس سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے اتار لیا گیا۔ اسی وقت سٹین گنوں سے لیس تین جرمن فوجی کود کر ہیلی کاپٹر سے باہر نکلے اور محتاط انداز میں اس کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔
لزی نیم وا آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی مگر اس نے اپنے جسم کو حرکت نہیں دی تھی۔ بھوک پیاس کے باعث اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اسٹین گن بردار فوجیوں نے کچھ فاصلے پر رک کر لزی کو جرمن لہجے میں للکارا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ان کی زبان سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گئی تھی۔ جب فوجیوں کو یقین ہوگیا کہ لزی واقعی لاچار اور بے ضرر ہے تو ان میں سے دو اپنی بندوقیں کندھوں سے لٹکا کر آگے بڑھے اور اسے بازوں سے پکڑ کر کھڑی کردیا۔ اس مہربانی پر لزی کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں شکریہ کہنے کے لیے جنبش ضرور پیدا ہوئی مگر چہرہ بدستور جذبات سے عاری رہا۔ جرمن سمجھ گئے تھے کہ لزی فرانسیسی ہے اور اسے جرمن زبان نہیں آتی۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے ہیلی کاپٹر کے پاس لے آئے۔ ہیلی کاپٹر میں بیٹھا باوردی فوجی افسر کرنل ریتک کا تھا۔
اب کرنل جرمن زبان میں اپنے فوجیوں سے گفتگو کرنے لگا۔ پھر اس نے گہری نظر سے لزی کے پرکشش خدوخال کا جائزہ لے کر ایک فوجی کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا۔ حکم ملتے ہی فوجی لزی کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ مگر جھولتے ہوئے ان چیتھڑوں کے نیچے سوائے ایک مرمریں بدن کے کچھ برآمد نہ ہوسکا.... اوکے کی رپورٹ ملتے ہی کرنل نے لزی کو ہیلی کاپٹر میں سوار ہونے کی اجازت دے دی۔
کچھ دیر بعد ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہوا تو لزی کرنل کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ بھوک پیاس کی شدت اور تھکن نے اس کے چہرے پر جو قدرتی آثار پیدا کردیے تھے وہ بے حد فطری تھے۔ کرنل نے کئی بار بہانے سے اس کا جسم ٹٹول کر اپنی تسلی بھی کرلی تھی۔
لزی کے خشک ہونٹوں پر اب دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی دلکش آنکھوں میں ایسی قندیلیں روشن تھیں جن کا مطلب صرف وہی جانتی تھی۔

نازی کیمپ نمبر بیس میں پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔اس کیمپ سے پورے مقبوضہ فرانس کو اسلحہ سپلائی ہوتا تھا ۔یہاں ایک بہت بڑی ورکشاپ میں تباہ شدہ جنگی مشینری کی مرمت کر کے اسے دوبارہ قابل استعمال بنایا جاتا تھا۔ نازی فوج کو اسلحے کی سپلائی یہاں سے ٹرینوں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے پہنچائی جاتی تھی۔ کیمپ میں اسلحے کے بہت بڑے بڑے گودام تھے۔کیمپ نمبر بیس کئی میل کے علاقے میں پھیلا ہوا تھا اور اس کی سخت نگرانی کی جاتی تھی۔یہاں کسی عام آدمی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی ۔جنرل ساتراں نے لزی کو یہی کیمپ تباہ کرنے کا مشن سونپا تھا۔

لزی نے ہیلی کاپٹر میں ہی بھانپ لیا تھا کہ کرنل اسے دیکھ کر دیوانہ ہو گیا تھا۔لیکن کرنل خود بھی کیمپ میں کسی کو بلانے کے لیے اعلیٰ حکام سے اجازت لینے کا پابند تھا۔کسی اجنبی کو کیمپ میں لے جانے کا اختیار اس کے پاس بھی نہیں تھا۔مگر لزی جیسی حسن کی دیوی کو آسانی سے حاصل کرنے کے بعد کیمپ سے باہر چھوڑ جانا خود اس کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔

''اب میں تمہیں اپنے ساتھ کیمپ لے جاؤں گا۔ کاش کہ تم تھوڑی بہت جرمن سمجھ سکتیں۔'' کرنل نے ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں سرگوشی کی تو لزی اس کا دل لبھانے کے لیے مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔حالانکہ ٹریننگ کے دوران وہ کافی حد تک جرمن زبان سمجھنے اور بولنے کے قابل ہو گئی تھی۔

ہیلی کاپٹر کیمپ میں پہنچا تو کرنل کے وفادار فوجیوں نے لزی کو اسلحے ایک خالی صندوق میں بند کر کے کندھوں پر اٹھا لیا اور ایک بیرک میں لے گئے۔کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی کہ کرنل ایک خوب صورت لڑکی کو اپنے ساتھ کیمپ میں لے آیا تھا۔

بیرک میں داخل ہوتے ہی فوجیوں نے لزی کو صندوق سے باہر نکال لیا۔اس کی حالت پہلے سے بھی غیر تھی۔جلد ہی اسے نہایت لذیذ کھانا پیش کر دیا گیا جو درحقیقت اس وقت لزی کی اشد ضرورت تھا....لزی کھانے پر یوں ٹوٹ پڑی کہ جرمن فوجی اسے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگے تھے۔

کھانے کے بعد لزی نے سکون کا سانس لیا تو ایک فوجی اسے بازو سے پکڑ کر اندرونی کمرے میں لے گیا اور وہاں بچھے ہوئے بستر پر لٹا کر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ لزی اس قدر تھک چکی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گہری نیند آ گئی۔جانے کتنی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو جسم ابھی تک درد سے چور چور تھا۔ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے اسے اپنے مصنوعی سینے میں بھی درد کی ٹیسیں محسوس ہوئی تھیں اور ایک عجیب سے وزن کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔یہ ایک سادہ سا کمرہ تھا۔ جس میں ضرورت کی معمولی چیزوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔وہ بستر سے اتر کر دروازے کے نزدیک پہنچ گئی اور ہاتھ بڑھا کر ہلکی سی دستک دی۔پہلی دستک کے جواب میں ہی دروازہ کھل گیا اور جانے پہچانے فوجی نے اسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دروازہ ایک مرتبہ پھر بند کر دیا۔

لزی شانے اچکا کر واپس بستر پر آ بیٹھی۔جلد ہی دروازہ ایک مرتبہ پھر کھلا اور ایک درمیانے قد کی کرخت چہرے والی عورت اندر داخل ہوئی۔اس نے سرتاپا لزی کا جائزہ لیا اور ڈانٹنے والے انداز میں بولی:

''کیا تم فرانسیسی ہو؟'' اس نے فرانسیسی زبان میں پوچھا۔

''ہاں۔'' لزی نے غمزدہ انداز میں سر ہلا دیا۔

''کرنل ایڈمن سے تمہاری ملاقات کہاں اور کن حالات میں ہوئی تھی۔''

''مجھے احساس نہیں انھوں نے مجھے کہاں سے ہیلی کاپٹر میں منتقل کیا۔میرا گھر اور خاندان تباہ ہو چکا ہے اور میں فرطِ غم سے نڈھال جانے کن راستوں سے ہوتی ہوئی ایک ویران سڑک پر آ نکلی تھی۔اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہ میرے ساتھ کیا بیتی....'' لزی نے روتے ہوئے بتایا۔

''ہوں! لیکن شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہاں تمہیں کوئی نئی زندگی نہیں ملنے والی....'' عورت نے کرخت لہجے میں کہا۔

''مجھ میں اب جینے کی کوئی امنگ نہیں رہی۔مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اب مجھے کس طرح قتل کیا جائے گا۔'' لزی نے خالی نظروں سے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''زندگی بہت قیمتی شے ہے لڑکی.... تم جوان اور خوب صورت ہو۔ اس لیے میں چاہوں گی کہ تم اپنی جوانی پر رحم کرو.... میرے پاس ایک ایسی تجویز ہے جس پر عمل کرکے تم اپنی جان بچاسکتی ہو۔'' وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

''کیسی تجویز۔'' لزی نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر تم کرنل ایڈیسن کو خوش کرنے میں کامیاب ہوگئیں تو وہ تمہاری جان بخش دے گا۔ یاد رکھو تمہاری زندگی اور موت اس وقت کرنل کے ہاتھ میں ہے۔'' عورت کی تجویز سن کر لزی نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کے دل میں جینے کی امنگ جاگ اٹھی ہو۔ چنانچہ وہ دھیمے مگر آس بھرے لہجے میں بولی:

''مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے.... براہ کرم ایک عورت ہونے کے ناتے میری مدد کرو۔ میں واقعی ابھی مرنا نہیں چاہتی۔''

''ٹھیک ہے....'' عورت اسے راستے پر آتا دیکھ کر مسکرائی ''اب تم غسل کرکے یہ لباس پہن لو۔ میں ضروری انتظامات کرکے آتی ہوں۔ یاد رہے تمہاری یہاں موجود کا علم سوائے چند لوگوں کے کسی کو نہیں۔''

یہ کہتے ہی اس نے باہر کھڑے فوجی کو آواز دی تو وہ ایک نیا لباس لزی کے قریب بستر پر رکھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی عورت نے لزی کو چند مزید ہدایات دیں اور واپس چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی لزی بھی لباس اٹھا کر کمرے سے ملحق باتھ روم میں چلی گئی۔ جب وہ نہا کر باہر نکلی تو دھول مٹی اتر جانے سے اس کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ ابھی وہ اپنے گیلے بال سکھا رہی تھی کہ جرمن عورت واپس آگئی اور دلچسپ نگاہوں سے لزی کو گھورتے ہوئے بولی:

''یقیناً کرنل ایڈیسن تمہیں پسند کرے گا۔ تم جسمانی لحاظ سے بہت خوب صورت ہو۔''

لزی اپنی تعریف سن کر یوں شرمائی کہ عورت اس کی اداؤں سے محظوظ ہوتے ہوئے قہقہہ لگانے پر مجبور ہوگئی۔ پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی:

''کیا تم تیار ہو....''

سوال سن کر لزی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر عورت اسے لے کر کمرے سے باہر آگئی۔ یہ ایک طویل خالی راہداری تھی جس میں بہت سے کمرے تھے۔ عورت اسے ہمراہ لیے محتاط انداز میں آگے بڑھتی رہی۔ جیسے ہی اسے کسی خطرے کا احساس ہوتا تھا وہ لزی کو کسی ستون یا دروازے کی اوٹ میں کردیتی تھی۔

ایک کمرے کے سامنے پہنچتے ہی عورت نے پھرتی سے دروازہ کھولا اور لزی کو اندر دھکا دے کر خود بھی تیزی سے پیچھے آگئی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کرلیا۔ یہ روشن کمرہ شاید اس کا بیڈ روم تھا۔ بیڈ پر اس کی چیزیں بکھری ہوئی تھیں جبکہ سامنے دیوار پر نصب آئینے کے پاس میک اپ کا کچھ سامان ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔

''میں نے کرنل کو تمہاری کہانی سنا دی ہے۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ تم اسے خوش کرنے میں کامیاب ہوجاؤ.... اب تک یہاں لائی جانے والی تمام لڑکیوں نے کوئی نہ کوئی ایسی حماقت کی جس سے کرنل کا موڈ خراب ہوا اور نتیجہ لڑکیوں کی موت کی صورت میں سامنے آیا.... میرے نزدیک وہ سب بے وقوف تھیں۔ زندگی بہت قیمتی شے ہے۔ اسے پانے کے لیے اگر وقتی طور پر کچھ کھونا پڑے تو انکار نہیں کرنا چاہیے.... مجھے دیکھو! کرنل مجھے بے حد پسند ہے لیکن میں اس کی پسندیدہ عورت نہیں ہوں۔ کیونکہ وہ تم جیسے نازک اور نفیس شاہکار پسند کرتا ہے۔''

پھر اس نے لزی کا میک اپ شروع کردیا اور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی:

''بلاشبہ تم بہت حسین ہو۔ مجھے یقین ہے تم کرنل کا دل جیت لوگی۔''

''ہاں میں پوری کوشش کروں گی۔'' لزی نے معصومیت سے کہا اور دل میں اپنے جھوٹ پر قہقہے لگانے لگی۔

میک اپ سے فارغ ہوتے ہی عورت نے لزی کے بال درست کیے اور اسے کمرے سے باہر لے آئی۔ کرنل کی رہائش زیادہ دور نہیں تھی۔ مقررہ وقت پر عورت لزی کو لے کر ایک دفتر نما کمرے میں پہنچ گئی۔

کرنل اپنے کاموں سے فارغ ہوکر آگیا تھا۔ وہ ایک چوڑی میز کے پیچھے بیٹھا شراب سے بھرے جام کی چسکیاں لے رہا تھا۔

"بہت خوب لوشا...." حسن کی دیوی لزی پر نظر پڑتے ہی کرنل کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں "بلا شبہ میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔ میں نے مٹی اور دھول میں اٹے بھوک پیاس سے تڑپتے حسن کو بخوبی پہچان لیا تھا۔" وہ خود کو داد دے رہا تھا۔

"آپ کی خوشی میں ہی میری خوشی ہے کرنل...." عورت جس کا نام لوشا تھا ادب سے جھک گئی۔

"مجھے تمہارے جذبات کی قدر ہے لوشا....اور اس وفاداری پر تمہیں بہت جلد بڑے انعام سے نوازا جائے گا۔"

"شکریہ کرنل....اب میرے لیے کیا حکم ہے۔" انعام کا سن کر لوشا کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔

"اب تم جاسکتی ہو....." کرنل نے لزی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لوشا کو ہاتھ سے اشارہ کیا تو اس نے باہر نکل کر دروازہ جھٹکے سے بند کردیا۔ جس میں حکم کی تعمیل سے زیادہ حسد کی آمیزش تھی۔

لوشا کے جاتے ہی کرنل کرسی اٹھ کر نشے کی حالت میں جھومتا ہوا لزی کے پاس آبیٹھا۔ اس نے خالی جام میز پر رکھ کر لزی کو بانہوں کے حصار میں لے لیا اور نرم لہجے میں بولا:

"ایک نئی زندگی ملنے اور یہاں آنے پر تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"میں ان مہربانیوں پر بہت خوش ہوں کرنل اور دل و جان سے تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گی.... مگر ڈرتی ہوں کہ یہاں دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ کیسے رہ سکوں گی۔" لزی نے مصنوعی گھبراہٹ کا اظہار کیا۔

"بے فکر رہو! اس عمارت میں کوئی نہیں آئے گا.... میں اپنے دفتری امور یہاں سے کچھ دور دوسری عمارت میں انجام دیتا ہوں۔" کرنل نے اس کے تراشیدہ ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا تو لزی بے اختیار اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

اس ایک ہی رات میں لزی نے کرنل کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ کرنل شراب کا بہت رسیا تھا اور لزی اس کی کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔ وہ کسی بھی وقت اس کا جام خالی نہیں ہونے دیتی تھی۔ دوسرے ہی دن نشے میں دھت کرنل نے اسے کیمپ کے راز بتانے شروع کردیے۔ لزی رات بھر کرنل کو جگائے رکھتی تھی۔ صبح جب وہ ڈیوٹی پر جاتا تھا تو لزی کو اپنی رہائش گاہ میں بند کرکے باہر سے لاک کر دیتا تھا۔ جہاں لوشا اسے کھانے پینے کی اشیا مہیا کرتی رہتی تھی۔

تین روز مسلسل جاگنے اور مے نوشی کے باعث کرنل کے اعصاب جواب دینے لگے۔ اب وہ کیمپ سے متعلق لزی کے ہر سوال کا جواب دینے لگا تھا۔

اس شام کرنل مقررہ وقت سے پہلے کمرے میں داخل ہوا تو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھا۔ وہ اندر آکر خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور بغور لزی کی جانب دیکھنے لگا۔ آج اس کا انداز بہت عجیب تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کا رویہ دیکھ کر لزی کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یقیناً کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ اس نے اپنے حواس پر قابو رکھا اور کرنل کے عقب میں جاکر اس گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"آج تمہیں کیا ہوگیا ہے کرنل....تم یوں خاموش ہو جیسے مجھ سے اکتا گئے ہو۔"

وہ منہ بنا کر بولی۔

"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو لزی؟" کرنل نے براہ راست سوال کیا۔

"یہ کیسی باتیں کررہے ہو تم.....کیا تم نہیں جانتے کہ کون ہوں میں۔" لزی نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

"کچھ دیر قبل ہمیں اپنے ہیڈ کوارٹر سے ایک سنسنی خیز رپورٹ ملی ہے۔" کرنل نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

"کیسی رپورٹ؟"

"محکمہ جاسوسی نے اطلاع دی ہے کہ فرانسیسی فوج نے چند نوجوان لڑکیوں کو جرمن فوج میں تباہی پھیلانے کے لیے بھیجا ہے۔ ہمیں ان نامعلوم لڑکیوں سے محتاط رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔" کرنل نے بتایا۔

"تمہارے خیال میں میں بھی ان لڑکیوں میں شامل ہوں۔ تم مجھ پر اتنا شک کرتے ہو کرنل۔" لزی نے وقت ضائع کیے بغیر آنسو بہانے شروع کردیے۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا.....لیکن خود سوچو میری تشویش جائز ہے۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''اگر میرے ساتھ اتنی راتیں گزارنے کے باوجود تمہیں مجھ پر شک ہے تو گولی مار دو مجھے۔ دور کرلو اپنا شک۔'' اس نے بلکتے ہوئے کہا۔

میں تمہیں کوئی اذیت نہیں پہنچانا چاہتا لزی.... مگر اب تمہیں کیمپ میں رکھنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں رہا۔ اگر کسی طرح یہ خبر اعلیٰ حکام تک پہنچ گئی کہ ایک اجنبی فرانسیسی لڑکی میرے ساتھ اتنی حساس جگہ پر مقیم ہے تو نہ صرف مجھے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ تمہیں بھی موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' کرنل نے اسے خطرے سے آگاہ کیا۔

''میں تمہاری مشکل سمجھ گئی ہوں.... بتاؤ اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' لزی نے کہا۔

''تمہیں فی الحال کیمپ سے واپس بھیجنا پڑے گا.... میں مسلسل تم سے رابطے میں رہوں گا۔ جیسے ہی حالات کچھ بہتر ہوں گے میں تمہیں اپنے ساتھ جرمنی لے جاؤں گا۔'' کرنل کچھ زیادہ ہی لزی کا گرویدہ ہوگیا تھا۔

''میں کسی طور تمہیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی.... لیکن اگر میری وجہ سے تمہاری جان اور عہدے کو خطرہ ہے تو میں بخوشی یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے تم تیاری کرو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں ہیلی کاپٹر کی تیاری کا حکم دیتا ہوں۔ ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' کرنل نے اٹھتے ہوئے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

مشن کی تکمیل کا وقت قریب آچکا تھا۔ اس کے جاتے ہی لزی کی نگاہیں کمرے میں موجود سامان کا جائزہ لینے لگیں۔ جلد ہی اسے پیتل کا بنا ہوا ایک گلدان نظر آگیا۔ لزی نے آگے بڑھ کر گلدان اٹھایا اور دروازے کے عقب میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی پوزیشن کا مکمل اندازہ لگا لیا تھا۔

کرنل جلد ہی واپس آگیا۔ جیسے ہی وہ لاک کھول کر اندر داخل ہوا لزی کے جسم میں بجلی سی بھر گئی۔ اس نے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑا ہوا گلدان ہوا میں بلند کیا اور پھر دانت بھینچ کر پوری قوت سے کرنل کے سر پر دے مارا۔ بے خبر کرنل کے لیے ایک ہی ضرب کافی ثابت ہوئی تھی۔ لزی کو خود بھی اپنی بے پناہ طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ کرنل کی کھوپڑی پچک کر رہ گئی تھی اور اس میں سے غلیظ خون فوارے کی مانند پھوٹ پڑا تھا۔ لزی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں کانپتا ہوا ریوالور کھینچا اور پھر پیٹ میں زوردار لات رسید کرکے اسے ہمیشہ کے لیے زمین بوس کردیا۔

اب لزی کا وہاں رکنا خطرناک تھا۔ لوٹا کسی بھی وقت وہاں آسکتی تھی۔ وہ محتاط انداز میں کمرے سے باہر نکلی تو رُخ اسلحے کے ان گوداموں کی طرف تھا جن کے بارے کرنل سے مکمل معلومات حاصل کرچکی تھی۔ گودام وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ جلد ہی وہ اپنے ہدف کے نزدیک پہنچ گئی۔ اسلحہ خانے کی عمارت کے باہر چند فوجی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے شاید خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کوئی اجنبی لڑکی اس جگہ آسکتی تھی۔

لزی نے ایک ستون کے پیچھے چھپ کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ پھر وہ ان فوجیوں کے اس قدر قریب پہنچ گئی کہ آسانی سے گودام کے اندر داخل ہوسکتی تھی۔ فوجیوں کے نزدیک پہنچ کر لزی نے اس قدر بھیانک چیخ ماری کہ پہرے دار ہڑبڑا کر بندوقیں سیدھی کرنا بھول گئے۔ یہی وہ موقع تھا جب لزی ایک لمبی جست لگا کر گودام کے اندر گھس گئی۔

جیسے ہی فوجیوں کی نظر لزی پر پڑی وہ سٹپٹا کر رہ گئے اور پھر حواس بحال ہوتے ہی تیزی سے بندوقیں سنبھال کر اس کے پیچھے لپکے۔ اتنی دیر میں لزی گودام میں ترتیب سے رکھے ہوئے ان طاقتور بموں کے قریب پہنچ چکی تھی جو اس کا مقصد پورا کرنے کے لیے کافی ثابت ہوسکتے تھے۔

اپنی منزل پر پہنچ کر لزی گہرے سانس لینے لگی۔ اسی لمحے باہر سے آنے والے فوجیوں نے اسے گھیر لیا اور خالی ہاتھ دیکھ کر زمین پر لیٹ جانے کا حکم دینے لگے۔ وہ سب جرمن زبان میں اس سے سوالات کررہے تھے۔ لزی کو اب کسی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے آخری وقت میں اپنی آنکھیں بند کرکے فرانس کی فتح کے لیے چند دعائیہ کلمات ادا کیے اور پھر اس کا ہاتھ اپنے سینے کے بائیں سمت رینگ گیا.... اگلے ہی لمحے اس نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر سینے کو خاص انداز سے دبایا تو نازی فوج کے کیمپ نمبر بیس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ دھماکے اس قدر شدید تھے کہ میلوں تک سوائے آگ کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لزی کا

مشن پورا ہو چکا تھا اور اس نے اپنی جان وطن کے لیے قربان کر دی تھی۔

اتنے اہم کیمپ کی تباہی معمولی بات نہیں تھی۔ اسلحے کے ساتھ کیمپ میں موجود قیمتی مشینری بھی تباہ ہو گئی تھی.... حقیقت یہی تھی کہ نازی فوج طویل عرصہ تک کیمپ نمبر بیس کے نقصان کو پورا نہ کر سکی اور یوں فرانسیسی فوج کو پیش قدمی کا سنہری موقع مل گیا۔

-☆-

دھواں اُڑاتا ہوا سیاہ انجن بوگیوں کی لمبی قطار کو کھینچتا ہوا دھیرے دھیرے چھوٹے سے ویران ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ مقبوضہ علاقہ تھا۔ جہاں جرمن فوجوں کا مکمل کنٹرول تھا۔ جرمن طیارے ہر وقت یہاں کی فضائی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ اتحادی فوجیں یہاں سے اتنی دور تھیں کہ طیاروں کے علاوہ اس علاقے کو اور کوئی خطرہ نہیں تھا۔

لڑی کی دوسری سہیلی شیزا جن راستوں سے گزر کر اس ویران ریلوے اسٹیشن تک پہنچی تھی وہاں اس نے گلی سڑی لاشوں اور سڑکوں پر جا بجا خون کے دھبوں کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا تھا۔ یہ لاشیں ان معصوم شہریوں کی تھیں جن کا جنگ سے دور کا واسطہ نہیں تھا۔ یہ علاقہ چیخ چیخ کر نازی فوج کے جنگی جرائم کی گواہی پیش کر رہا تھا۔ شیزا نے یہ سب دیکھ کر اثر تو لیا تھا مگر اپنے حواس نہیں کھوئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ حوصلہ کھو دینے سے انتقام نہیں لیا جا سکتا۔ ریلوے اسٹیشن کی تباہ شدہ عمارت میں قدم رکھتے ہی شیزا پر سکون سی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

پھر دور فضاء میں بلند ہوتا دھواں دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ اس ٹرین کی آمد آمد ہے جس کے استقبال کے لیے فوج نے اسے یہاں بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ نہایت سکون سے پلیٹ فارم پر رکھے ہوئے بینچ پر لیٹ گئی۔

اسٹیشن پر پہنچ کر جب ٹرین کی بریکیں چرچرائیں تو بھی شیزا نے گردن گھما کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر دکھ اور کرب کے سائے منڈلا رہے تھے۔ یوں ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنا بہت کچھ کھو کر یہاں تک پہنچی ہو۔

ٹرین رکنے تک بوگیوں سے جھانکتے فوجیوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر کھڑکی سے کئی کئی گردنیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ پھر کسی کے حکم پر چند فوجی تیزی سے باہر نکلے اور انھوں نے شیزا پر بندوقیں تان لیں۔

ان کی للکار پر شیزا گھبرا کر اٹھ بیٹھی، جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں فوجیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں.... کون ہے یہ لڑکی؟“ ٹرین کی ایک بوگی کے دروازے میں کھڑے ادھیڑ عمر میجر کی آواز سنائی دی۔ وہ ٹرین سے اتر کر ان کے قریب آ گیا اور شیزا پر نظر پڑتے ہی معنی خیز انداز میں مسکرایا:

”ہمارے پاس وقت بہت کم اور سفر طویل ہے.... اسے فوراً میرے کیبن میں پہنچا دو۔“

میجر حکم دے کر واپس مڑا تو فوجی دانت پیستے رہ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی قیدی کی حیثیت سے ان کے درمیان رہے گی۔ دو فوجیوں نے لڑکی کو بازو سے پکڑ کر میجر کے کمپارٹمنٹ میں دھکیل دیا اور سب اپنی اپنی پوزیشنوں پر چلے گئے۔

ٹرین میں کل سات ڈبے تھے۔ جن میں سے چار میں گولہ بارود بھرا ہوا تھا۔ دو ڈبوں میں فوجی سوار تھے جبکہ انجن کے ساتھ والی بوگی فوجی افسروں کے لیے مخصوص تھی۔

شیزا نے کمپارٹمنٹ میں داخل ہو کر دیکھا تو وہاں میجر کے رینک سے بڑا کوئی افسر نہیں تھا۔ گاڑی آگے بڑھی تو نوجوان فوجی افسروں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔

”لڑکی خوب صورت ہے اور میں تم سب کے دلی جذبات کو سمجھتا ہوں.... لیکن میرا خیال ہے فی الحال اس سے صرف رقص کروایا جائے۔ جب تک اسلحہ کیمپ تک نہیں پہنچ جاتا ہمیں محتاط رہنا ہو گا۔“ میجر نے اپنے افسروں کے عزائم دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

”کیا نام ہے تمہارا....؟“ ایک نے خستہ فرانسیسی میں پوچھا۔

”شیزا۔“

”اچھا نام ہے.... مجھے یقین ہے تم جیسی دلکش حسینہ رقص میں بہت مہارت رکھتی ہو گی.... ویسے کیا تم نے کبھی جرمن موسیقی پر رقص کیا ہے؟“

”پلیز مجھے چھوڑ دو.... میں بہت مصیبت زدہ لڑکی ہوں اور یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“ شیزا نے خوف کا

اظہار کیا۔
"تمہاری زندگی ہمیں خوش کر کے ہی محفوظ رہ سکتی ہے شیزا!...اپنا ماضی بھول کر ہم سے دوستی کر لو....اور ہم سب چاہتے ہیں کہ اس دوستی کی ابتدا بہترین رقص سے ہونی چاہیے۔" اس نے شیزا کے سنہری بالوں کو چھوتے ہوئے کہا تو اسی پل جرمن موسیقی کا ریکارڈ لگا دیا۔
موسیقی تیز اور دلوں میں جوش پیدا کرنے والی تھی جس کے بجتے ہی سب لوگ اس کے گرد دائرہ بنا کر تالیاں پیٹنے لگے تھے۔ جب شیزا نے کوئی حرکت نہ کی تو میجر نے اپنا ریوالور اٹھا کر رُخ اس کی جانب کر دیا:
"شروع ہو جاؤ لڑکی! نوجوان گھروں سے دور ہیں ،ان کا دل بہلاؤ....اس کے سوا تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں۔"
یہ سن کر خود کو لاچار ظاہر کرنے والی شیزا کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ مہارت سے رقص کرنے لگی۔ رقص اس قدر ہیجان خیز تھا کہ سب لوگ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے تھے۔ اگر میجر نے انہیں اسلحہ اتارنے تک شیزا کو چھونے سے روک نہ دیا ہوتا تو اب تک وہ ان کی درندگی کا نشانہ بن چکی ہوتی۔
جب شیزا نے دیکھا کہ سب کچھ ویسا ہو رہا تھا جیسا کہ وہ چاہتی تھی تو وہ رقص کرتی ہوئی کمپارٹمنٹ کے کونے میں جا پہنچی جہاں ایمرجنسی استعمال کے لیے کچھ اسلحہ اور طاقتور بم رکھے گئے تھے۔
وطن کی خاطر مر مٹنے اور دنیا چھوڑنے کا لمحہ آ گیا تھا.... چنانچہ اس نے بنا وقت ضائع کیے فرانس کے حق میں نعرہ بلند کیا اور خود کو دھماکے سے اڑا لیا.... پہلے دھماکے کے ساتھ ہی مسلسل دھماکوں کا آغاز ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پوری ٹرین شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی جن میں سے نازی فوجیوں کے اڑتے ہوئے پرخچے صاف دیکھے جا سکتے تھے۔

-☆-

ان تین بہادر لڑکیوں میں سے آخری لیورا تھی جو اس وقت ایک آہنی شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس نازک اور نفیس جلد جگہ جگہ سے ادھڑ چکی تھی۔ ریشمی بالوں کو جگہ جگہ سے نوچ کر نکالا گیا تھا اور انگلیوں کے ناخن اکھاڑ دیے گئے تھے۔
اس وقت لیورا کے سامنے چار درندہ نما نازی کھڑے تھے۔ جن میں ایک میجر اور تین سپاہی شامل تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے لیورا کے رہے سہے بالوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا:
"کیا تم اب بھی انکار کرتی ہو کہ کیمپ نمبر بیس اور اسلحے سے بھری ٹرین تباہ کرنے والے گروہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں؟"
"میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں بھی اسی ٹیم کا حصہ ہوں....مگر یہ غلط ہے کہ ان تباہ کن کارروائیوں کے پیچھے کوئی گروہ موجود ہے....یہ دونوں مشن صرف ایک ایک لڑکی نے مکمل کیے ہیں۔" شدید تکلیف کے باوجود لیورا کی گردن فخر سے تن گئی تھی۔
"ایک لڑکی....اگر ہم تمہاری بات مان لیں تو بھی تمہیں بتانا ہوگا کہ ایسا کیا جادو تھا ان لڑکیوں کے پاس جس کی مدد سے انھوں نے سب کچھ بھسم کر دیا۔" دوسرے فوجی نے پوچھا۔
"ان کے ساتھ پورے فرانس کی طاقت تھی۔" لیورا نے مختصر جواب دیا۔
"یعنی تم بھی ان لڑکیوں کی ٹیم حصہ ہو۔" میجر نے کہا۔
"ہاں! اور مجھے اس پر فخر ہے۔" لیورا نے جواب دیا۔
"تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتانا ہوگا....یہ بھی کہ اس قسم کی مزید کتنی کارروائیاں کی جائیں گی۔"
"میں یہ سب ضرور بتاؤں گی ....مگر یہاں نہیں تمہارے جنرل کے سامنے۔ تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ ہم اپنے وطن کی حفاظت کے لیے کس حد تک سوچ سکتے ہیں۔" لیورا کے چہرے پر چٹانوں کی سی سنجیدگی تھی۔
"مجھے لگتا ہے یہ لڑکی پاگل ہو گئی ہے۔" ایک سپاہی نے کہا۔
"اگر یہ پاگل ہو گئی ہے تب بھی ہمارے فائدے کی باتیں کر رہی ہے....تم اسے تیار کرو میں جنرل کو صورت حال سے آگاہ کرتا ہوں۔" میجر نے باقی ساتھیوں سے کہا اور باہر چلا گیا۔
لیورا کی قوت ارادی دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ صرف جنرل کے سامنے ہی اپنی زبان کھولے گی۔ ورنہ ہر قسم کا وحشیانہ تشدد برداشت کر کے اپنی جان دے دے گی۔

سپاہیوں نے لیورا کو آہنی شکنجے سے آزاد کر کے وہیل چیئر پر منتقل کر دیا۔ اب وہ اس کے زخموں کی ڈریسنگ کر رہے تھے تاکہ جنرل کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا سکیں۔

دو گھنٹے بعد لیورا کو جنرل اور کئی دوسرے فوجی افسران کی ایک خصوصی میٹنگ میں پیش کر دیا گیا۔ انہیں یقین تھا کہ لیورا اپنے اعتراف جرم کے دوران کئی اہم انکشافات کرے گی۔

لیورا کو وہیل چیئر پر میٹنگ روم میں پہنچایا گیا وہاں موجود سب لوگ اسے حقارت بھری نظروں سے گھورنے لگے۔ وہ شدید زخمی حالت میں تھی۔

''تمہیں کیوں یہ غلط فہمی ہے کہ اپنی زبان بند رکھ کر تم فرانس کی قسمت بدل سکتی ہو؟'' جنرل نے اسے دیکھتے ہی تکبر سے سوال کیا۔

''میں تو اب بھی یہی سمجھتی ہوں جنرل۔'' لیورا کے انداز میں خوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

''بتاؤ کہ وہ کیا منصوبہ تھا جس سے اتنی تباہی پھیلی.... اور فرانسیسی فوج نے ان لڑکیوں سے کام کس طرح لیا۔''

''منصوبہ.... ان کا منصوبہ کچھ بھی ہو۔ میں تمہیں صرف یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ فرانس تمہاری اس آخری میٹنگ کے بعد ناقابل تسخیر بن جائے گا.... ہماری قوم کا بچہ بچہ تمہارے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا، جبکہ صرف تین لڑکیوں نے تمہاری ساری قیادت کو سر جوڑ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''جو پوچھا گیا ہے صرف اسی کا جواب دو۔'' جنرل غرایا۔

''تم شاید اپنی زندگی سے کچھ زیادہ ہی بے زار ہو جنرل.... اگر تمہیں یہ دنیا چھوڑنے کی اتنی ہی جلدی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

یہ کہتے ہی لیورا کا زخمی ہاتھ غیر محسوس انداز میں اپنے سینے کی جانب رینگ گیا....

اس سے قبل کہ نازی فوج کے ان ذہین افسروں میں سے کوئی ایک بھی لیورا کی اس حرکت کو سمجھ پاتا.... وقت گزر چکا تھا۔

میٹنگ روم میں ہونے والا دھماکا اس قدر شدید تھا کوئی ذی روح محفوظ نہ رہ سکا.... لیورا کا حسن ریزہ ریزہ ہو کر فضاء میں بکھر گیا تھا اور ملبے میں سوائے لاشوں کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

-☆-

دوسری جنگ عظیم ختم ہوئے برسوں بیت گئے.... لیکن بوڑھے فرانسیسیوں کو ان تین لڑکیوں کی لہو رنگ داستان آج بھی یاد ہے.... آج بھی جب ان کا گزر برف پوش چوٹیوں کے دامن سنگ مرمر سے بنی ان تین قبروں کے نزدیک سے ہوتا ہے تو انہیں وہ تین فاحشائیں یاد آجاتی ہیں جن کا خون فرانس کو بچانے میں ہزاروں شرفاء سے کہیں زیادہ قیمتی ثابت ہوا تھا۔

اب بھی وہ ان تین فاحشاؤں کو یاد کرتے ہیں جو پیرس کے متعدد گھرانوں کی بربادی کا باعث بنی ہوں گی، جو کسی زمانے میں سماج کے ناسور کی حیثیت رکھتی ہوں گی۔ جنھوں نے اپنی اداؤں سے نہ جانے کتنے دلوں میں ہلچل مچائی ہوگی.... لیکن جب انسانیت نے انھیں پکارا تو وہ سب کچھ بھول کر دوڑ پڑیں اور اپنی جانیں ملک قوم پر قربان کر دیں۔

سب جانتے ہیں کہ ان قبروں میں صرف خالی تابوت دفن ہیں.... البتہ تدفین کے وقت ان تابوتوں میں کچھ سستے قسم کے رنگین اور بھڑکیلے لباس ضرور رکھے گئے تھے جنھیں پہن کر یہ فاحشائیں مردوں کو لبھایا کرتی تھیں۔ یہ لباس فرانسیسی فوج نے سر توڑ کوشش کے بعد تلاش کیے تھے اور بہت احترام سے انھیں خالی تابوتوں میں رکھ کر دفن کر دیا تھا.... یہ تدفین پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ہوئی تھی اور اپنے وقت کے دلیر جنگجوؤں کے سر بھی ان لباسوں کے احترام میں جھک گئے تھے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

انجام

ایم زیڈ شیخ

روحانیت کے ایک طالب علم کی روداد......
وہ ایک سنگین غلطی کر بیٹھا تھا

وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی...... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی آن کی آن میں موت اسے دبوچ لے گی۔ ایک تو غیر انسانی مخلوق، اوپر سے اتنی بھیانک شکل...... کہانیوں اور فلموں میں دکھایا گیا منظر، اس منظر کے سامنے کچھ نہیں تھا وہ اس کی ایک نظر کی تاب نہ لا سکا وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا۔

''بچاؤووووو...... استاد جی بچاؤوووو۔'' دیکھنے والوں نے دیکھا وہ ہوا میں اڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے کوئی پرندہ ہوا کے دوش پر اپنی منزل مقصود کی طرف جا رہا ہو۔

''مجھے بچاؤ...... استاد جی بچاؤ اس سے بچاؤ یہ یہ...... یہ مجھے کھا جائے گی......'' وہ چلا رہا تھا۔

وہ بھاگتا ہوا آیا اور استاد کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دماغ میں وہ چڑیل گھس آئی ہے خدا کی پناہ...... اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے اس پر نزع کی کیفیت کا گماں ہوتا تھا۔

......☆❀☆......

خلیل کو بچپن ہی سے کچھ الگ کرنے کا شوق تھا۔
''کمزور دل افراد یہ نہ پڑھیں۔'' یہ جملہ جہاں بھی لکھا ہوتا اسے ہنسی آ جاتی تھی اسے لگتا کہ اس طرح کے جملے اسے چیلنج کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں وہ چیلنج قبول کر لیا کرتا تھا اور پھر رفتہ رفتہ اسے ان چیزوں کی عادت ہو گئی...... شروع شروع میں وہ انہیں فرضی چیزیں سمجھتا تھا مگر آہستہ آہستہ اس نے معلومات لینی شروع کر دی...... اسے جنات اور ان کی اقسام کے بارے میں پتہ لگنا شروع ہوا اسے ایک دن خبر ملی کہ ایک عامل ایسے بھی ہیں جو جنات کو قابو کرنا سکھاتے ہیں وہ فی الفور ان کی خدمت میں پہنچا اور اپنا مدعا ان سے بیان کیا۔

انہوں نے اسے تین دن سوچنے کے لیے دیے اور ساتھ گھر سے تحریری اجازت نامہ بھی لانے کو کہا۔

وہ تین دن بعد تمام چیزوں کے ساتھ دوبارہ وہاں پہنچا۔

''بیٹا! جس چیز کی طرف تم جا رہے ہو وہ انتہائی حساس کام ہے۔ تم اگر غیر شادی شدہ ہوتے تو میں کسی قیمت پر اس طرح کے علم کو سیکھنے کے لیے تمہیں اجازت نہ دیتا میں اب بھی تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ یہ بہت حساس کام ہے ذرا سی غلطی زندگی کی آخری غلطی ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے ایک بار پھر سوچ لو......!

''میں کشتیاں جلا کر آیا ہوں بابا جی۔'' وہ بولا تو اس کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

''چند باتیں ذہن نشین کر لو...... اگر ان پر عمل نہیں کرو گے تو سب کیے کرائے پر پانی پھیر دو گے سب سے پہلے تو یہ یاد رکھنا کہ اپنے علم کے حوالے سے کسی کو بھی راز دار نہیں بناؤ گے تم کیا کر رہے ہو کیا کیا واقعات پیش آ رہے ہیں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کھانے پینے کے حوالے سے انتہائی محتاط رہو گے اور کسی بھی قسم کی گرم تاثیر رکھنے والی شے کا استعمال ان دنوں ترک کر دو گے عمل کے دنوں میں فقط ایک کھجور صبح شام کی تمہاری خوراک ہو گی اور بغیر وضو اپنے دائرے سے ایک انچ بھی باہر نہیں آؤ گے ڈر اور خوف کو کسی بھی حال میں اپنے قریب نہیں آنے دو گے۔

جب تک علم پر پوری طرح عبور حاصل نہیں کر لیتے، کسی قسم کی شعبدہ بازی سے اپنے آپ کو دور رکھو گے اور سب سے اہم بات کہ علم کے حصول اور عبور کے بعد اپنے علم کو کسی بھی طرح کی منفی سرگرمیوں میں استعمال نہیں کرو گے جتنی دیر جاگتے رہو گے وضو کے بغیر رہنا خطرناک ہو گا۔

وہ سر جھکا کر ان تمام باتوں کو اپنے اندر اتارنے لگا۔

اسے مزید دو دن آرام کے لیے مل گئے اس نے تیسرے دن سے ایک چلہ شروع کرنا تھا..... پہلے دس دنوں کے بعد اسے اپنے آپ کو مزید کڑے امتحانات سے گزارنا تھا، وہ پر عزم تھا۔

......☆❁☆......

یہ چلہ شروع کیے خلیل کا ساتواں دن تھا وہ اپنے استاد کے کہنے کے مطابق فقط ایک کھجور پر صبح سے شام گزار دیتا تھا ابھی تک تمام اعمال کے نتیجے میں اس کا واسطہ کسی بھی مافوق الفطرت چیز سے نہیں پڑا تھا سردیوں کی رات تھی اور چھ بجے اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا ہوتا تھا اسے عمل شروع کیے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اسے یوں لگا کہ قرب و جوار میں زلزلہ ہو رہا ہے وہ ثابت قدم رہا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سب بہکاوے ہیں اس نے نگاہ اٹھائی تو اسے سامنے والے درخت پر اژدھا نظر آیا وہ اندر تک لرز گیا۔ اژدھا کے گرد کئی رنگ و نسل کے

چھوٹے بڑے سانپوں نے حصار قائم کیا ہوا تھا چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ ایک ایک کر کے سانپوں کو نگل گیا کچھ سانپ اس کے منہ سے گر کر زمین پر آتے اور ساتھ ہی ساتھ مزید نئے سانپ پرانوں کی جگہ لے لیتے نیچے آنے والے سانپ خلیل کے خودساختہ حصار سے دو تین فٹ کے فاصلے پر گرتے اسے یوں لگتا کہ جیسے اژدھا یا ان نیچے والے سانپوں نے اس پر حملہ کر دینا ہے مگر وہ اپنا ورد جاری رکھے ہوئے تھا۔

آہستہ آہستہ سانپوں کے اس منظر سے اس نے توجہ ہٹالی اور اپنا دھیان صرف ذکر واذکار کی طرف لے گیا بقیہ تین دن اس نے اس سے بھی کٹھن حالات میں گزارے۔ کٹی پھٹی لاشیں، انتڑیوں کے بغیر انسان، سر کٹے جانور اور خون آلود قریبی لوگ اس کے سامنے آتے رہے گر اس نے ہمت نہ ہاری۔

یہ پہلا مرحلہ تھا اسے اب دوسرے عشرے کے لیے مزید مشکل حالات سے گزرنا تھا اس نے صبر وتحمل سے اور نہایت بے خوفی سے اگلے دس دن بھی گزار دیے اب اسے ایک آسانی میسر آ گئی تھی اسے اگلے دس دن عصر اور مغرب کے درمیان مخصوص وظائف کرنے تھے مغرب کے بعد اسے گھر جانے کی اجازت تھی پچیسویں دن وہ گھر پہنچا تو ایک ہنگامہ اس کا منتظر تھا۔

"میری بچی کو بچالو بہن...... اس کے ساتھ جن چمٹ گیا ہے، سنا ہے خلیل میاں نے چلہ وغیرہ کیا ہوا ہے۔" یہ زرینہ خالہ تھیں۔

"کیسے اور کب......؟ ہاں چلہ تو کر رہا ہے میرا بیٹا ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا دومنٹ کا کام ہے جن بھوت سب ہوا ہو جائیں گے۔" خلیل کی والدہ فخر سے بولی۔

"ارے اماں بی اللہ آپ کی زبان مبارک کرے مسجد کے مولانا صاحب سے حساب کتاب کروایا تھا انہوں نے کہا کوئی خطرناک جن آ گیا ہے اس کے ساتھ اللہ تمہارے بیٹے کی عمر دراز کرے کالا بکرا دوں گی لا کر میری بچی کو ٹھیک کروا دے ہائے اللہ میری بچی......!" وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی جبکہ دوسری جانب خلیل کی والدہ نے بکرے کا سن کر مسکراتی نگاہوں سے اپنی بہو کو دیکھا۔

"ارے بہن روتی کیوں ہو ہم ہیں نا...... روئیں تمہارے دشمن جلدی سے جا کر بچی کو لے آؤ خلیل آتا ہی ہوگا بے چارہ چلہ کر کے کمزور ہو گیا ہے کسی سے دیسی انڈے ملیں تو بتانا۔"

چند منٹوں کے بعد چیختی چلاتی لڑکی چارپائی پر بندھی پہنچ گئی جسے تین چار افراد نے اٹھایا ہوا تھا گھر والوں کے بھی ہوا س جواب دینے لگے تھے کہ اتنے میں خلیل میاں پہنچ آئے۔

اس کی والدہ نے مختصراً ساری بات خلیل کو بتائی تو خلیل مسکرانے لگا اسے لگا کہ ایک اور چیلنج اسے پکار رہا ہے وہ بچی کے قریب بیٹھ گیا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا غالباً وہ کوئی ورد کر رہا تھا ابھی ایک منٹ ہی گزرا تھا کہ لوگوں نے عجیب منظر دیکھا لڑکی نے عجیب زبان کے دو الفاظ ادا کیے تو خلیل کا چہرہ سرخ ہو گیا وہ زور زور سے ورد کرنے لگا تو لڑکی نے دوبارہ وہی الفاظ غصے سے ادا کیے لڑکی کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ تھا اس کی آنکھیں الٹ گئی تھی اور منہ سے جھاگ نکل رہی تھی خلیل کو مزید ایک منٹ گزرا تو لڑکی نے چیخ مار کر ایک لات خلیل کو دے ماری خلیل اڑتا ہوا جا کر سامنے دیوار پر لگا۔ اور پھر پلٹ کر باہر کو بھاگا لڑکی اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگنے لگی تو سب نے اسے پکڑ کر دوبارہ چارپائی سے باندھ دیا خلیل کا کچھ پتہ نہیں تھا وہ چیختا چلاتا باہر کی طرف بھاگا تھا۔

......☆❁☆......

"کیا ہوا بیٹا کیا ہوا؟" وہ متفکر انداز میں پوچھنے لگے۔

"استاد جی یہ...... یہ میرے سامنے آ آپ کے سامنے یہ بیٹھی ہوئی ہے دیکھیں آنکھوں سے سانپ نکل رہے ہیں اس کی یہ دیکھیں انگارے چبا رہی ہے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی ہے استاد جی بچاؤ یہ کھا جائے گی مجھے۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

معلوماتِ دنیا

- بلجیئم واحد ملک ہے جہاں ننگے پاؤں چلنا جرم ہے۔
- پارسی ایک ایسا مذہب ہے جس میں مردے کو چھونا حرام ہے وہ لوگ اسے اپنے ایسے خصوصی قبرستان میں ڈال دیتے ہیں جہاں گدھ اور چیلیں مردے کا گوشت کھا جاتی ہیں۔
- ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک لفظ لکھنے سے 125 آدمی مارے گئے اور اس کا ایک باب لکھنے سے 12 لاکھ افراد کی جانیں گئیں وہ کتاب ہے ہٹلر کی کتاب "میری سوانح عمری"۔
- کتا ایک ایسا جانور ہے جس کی زبان پر پسینہ آتا ہے۔
- دنیا کی سب سے بڑی کتاب برٹش میوزیم (لندن) میں ہے یہ کتاب چارلس دوئم کے عہد میں لکھی گئی اس کے اوراق کی لمبائی تقریباً ▼ فٹ اور چوڑائی سوا تین فٹ ہے اس کی جلد آٹھ بکریوں کی کھال سے تیار کی گئی ہے۔
- مراکش کا ایک ایسا حکمران تھا جو 888 بچوں کا باپ تھا' اس کا نام شاہ مولائے اسماعیل تھا اس کے دورِ حکومت میں ایک ایسی رجمنٹ تھی جس میں 540 سپاہی تھی اور یہ تمام اس کے اپنے بیٹے تھے۔
- دنیا میں سب سے لمبا درخت امریکہ میں پایا جاتا ہے جس کی اونچائی 673 فٹ ہے اور گہرائی 101 فٹ ہے اگر اس درخت کو کاٹ کر دیا سلائی بنائی جائے تو دنیا کے ہر شخص کو ایک ڈبیا مل سکتی ہے۔
- سعودی عرب وہ واحد ملک ہے جس کا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔
- برونائی ایک ایسا ملک ہے جہاں عورت مرد کی نسبت زیادہ رہائش پذیر ہیں۔
- انسانی جسم سے ▼ چمچ نمک ایک پیالہ چینی اور دس گیلن پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔
- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مہندی کے پھول اور ریحان کی خوشبو پسند تھی۔
- امریکی صدر ابراہم لنکن ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔

راشدہ تیما......ملتان

وہ عامل کے گلے لگ کر رونے لگا اور پھر آہستہ آہستہ سو گیا۔

"تباہ کردی تو نے اپنی زندگی میرے بچے......!" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

"کہا تھا کہ نہ کرنا غلطی نہ کرنا وہ کام جو بس سے باہر ہو۔" وہ مایوسی سے سر جھٹکنے لگے انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی بھیانک غلطی سرزد ہو چکی ہے اس سے اور ایسے اعمال میں غلطی کی گنجائش موجود نہیں ہوتی ذرا برابر بھی غلطی باعثِ موت ہوتی ہے تھوڑی دیر بعد اس کے گھر والے پہنچ گئے اور سارا واقعہ ان کے گوش گزار کیا۔

"میں نے سمجھایا تھے اسے کہ جب تک کسی علم پر عبور حاصل نہ ہو اسے استعمال کرنے کی کوشش یا غلطی نہ کرنا اس کی ماں دہائی دینے لگی مگر بے سود......ایک غلطی نے اس کا مستقبل تاریک راہوں میں بھٹکا دیا تھا۔

اکثر ہم آتے جاتے بہت سے ایسے افراد دیکھتے ہیں جو کبھی ریت اپنے بالوں میں ڈال رہے ہوتے ہیں یا پھر عجیب و غریب حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں ایسے افراد کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے مت گزر جایا کریں کیونکہ وہ لوگ ہمدردی کے طلب گار ہیں ان سے اسی طرح کی ایک غلطی سرزد ہوئی ہوتی ہے ایک غلطی جو ساری زندگی کا روگ بن جاتی ہے۔

لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں ہاں میں پاگ ہوں اپنے اور دوسروں کے مستقبل کو تباہ کرنے والا پاگل ہی تو ہوتا ہے بھاڑ میں یہ زمانہ بھاڑ میں جائے اس زمانے کے دوست میں وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا۔
ایک نوجوان کی روداد وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔

میں اس وقت قصبے کی مشہور ملک شیک والی دکان سے باہر نکل رہا تھا، جب اپنے بہترین دوست راشد فرحان المعروف راشو کو دیکھا۔ وہ دکان کے باہر لگے فروٹ چاٹ کے ٹھیلے والے کی ایک کرسی پر بیٹھا، فروٹ چاٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گرچہ میں اسے کافی عرصہ بعد دیکھ رہا تھا۔ مگر ایک بات تو طے ہے کہ دو گہرے دوست ہوں، کافی عرصہ بعد بھی گر اچانک آمنا سامنا ہو تو ایک جھلک پہچاننے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ میں نے بھی اسے ایک جھلک سے پہچان لیا۔

ہماری نظریں ایک لمحہ کے لیے ٹکرائیں، مگر اچانک اس نے انجان بنتے ہوئے آنکھیں دوسری طرف گھما لیں۔ جیسے اس نے مجھے دیکھا نہ ہو، یا شاید پہچانا نہ ہو۔ میرے دل میں دکھ کی لہر اٹھی۔ آہ! کتنے دعوے تھے، کتنا مان تھا دوستی پر۔ کیا اس دور کی یہی دوستی ہوتی ہے؟ میں نے سوچا۔ کیا جب تک سانس تب تک آس والا محاورہ یہاں صحیح بیٹھتا ہے کہ جب تک ساتھ تب تک دوستی۔ جوں ہی دور ہوئے نہیں، ساتھ چھوٹا نہیں، بڑے بڑے دعوے کرنے والے دوست بھی بھول گئے۔ یاد کیا تو مرضی، نہ کیا تو بہت اچھا کیا۔ کیا اسکول، کالج، یونیورسٹی کے، سب دوست تا عمر پاس ہیں؟ ویسے دوستی ہوتی کیا ہے؟ اس زمانے میں دوستی کی صحیح معنوں میں تعریف کون کر سکتا؟ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو، جو دوستی کی تعریف کر سکتا ہو کہ دوستی تو محبت سے بھی طاقتور جذبہ ہے۔

مجھے یاد آیا کہ سات سال پہلے، کالج کے پہلے دن ہی، راشد فرحان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ بہت خوبصورت تھا۔ کندھے پر دھری خوبصورت زلفوں والا، نسوانی کشش سے ملا مال لڑکا۔ اس میں عجب کشش تھی۔ جو ہر دیکھنے والے کو ایک لمحہ میں مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ اس میں فطری جھجک تھی۔ جب تک کوئی خود اس سے بات نہ کرتا، وہ دوسروں سے کنی کتراتا تھا۔ جب اسے دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ شاید پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، پہلے بھی ہم کہیں مل چکے ہیں۔ مگر یہ سب وہم تھا۔ شاید اس کی شکل میرے کسی جاننے والے سے تھوڑی بہت مل رہی تھی۔

کالج کی گیلری میں چار پانچ لڑکے ایک کمرے کے باہر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر لیکچر ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں سلام کیا اور نسوانی کشش والے خوبصورت لڑکے سے پوچھا۔ "فرسٹ ایئر کی کلاس یہی ہے۔"

اس نے حیران ہو کر، ہونٹ سکیڑ کر سر ہلایا۔ میں اندر جانے کے لیے دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔ فوراً ایک لڑکا بولا۔ "او یار اردو کا لیکچر ہو رہا۔ پروفیسر بہت سخت ہے۔ باہر رک جاؤ ابھی ......ورنہ تمہاری خیر نہیں۔"

میں رک گیا۔ ویسے بھی اس خوبصورت لڑکے کو دیکھ کر اندر جانے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ اس کی کشش بار بار اپنی طرف دیکھنے پر اکسا رہی تھی۔ میں وہیں رکا رہا۔ دو تین بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف متوجہ تھا۔ میں ہلکے سے گھبرا گیا۔ گرچہ میری طبیعت بھی راشد فرحان سے کافی میل کھاتی تھی۔ اس لیے ہم جلد ہی ایک قدرتی کشش کی بدولت، اگلے چند دنوں میں ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوتے گئے اور گہرے دوست بن گئے۔ ہماری جوڑی کالج میں مشہور ہو گئی۔ خیر پرانے زخم، پرانی باتوں کو چھیڑنے کا کیا مقصد؟

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں نے ذہن جھٹک کر راشد کی طرف دیکھا۔وہ سڑک پر پیدل آنے جانے والوں اور موٹر سائیکلوں کے رش کی طرف متوجہ تھا۔میں اس کی طرف بڑھ گیا۔مجھے اس سے بہت سی باتیں پوچھنا تھیں۔بہت سے حساب چکتا کرنے تھے۔

میں اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔انجان بنتے بنتے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی۔میں ہلکے سے مسکرایا۔مجھے مسکراتا دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوئے اختر زماں کے بچے تو....." میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔وہ میز کی دوسری سائڈ سے تیزی سے آتے، گرم جوشی سے مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

"ہاں راشد فرحان جی.....میں!" میں اسے زور سے بھینچتے بولا۔

"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔" وہ شکوہ کرتے بولا۔"میں تو بھول گیا تھا کہ کوئی میرا دوست بھی تھا۔"

میں جوابی شکوہ کرتے بولا۔"ہاں اس زمانے کے دوست بہت جلد بھول جاتے ہیں۔"

"بیٹھو یار....." وہ مجھے کرسی کی طرف اشارہ کرتے بولا اور خود دوسری طرف، کرسی کی طرف بڑھتے فروٹ چاٹ والے سے متوجہ ہوا۔"یار جلدی سے دو ڈبل پلیٹ اور بھیجو......"

"نہیں نہیں یار!" میں نے اسے تیزی سے ٹوکا۔"تو جانتا مجھے اس تکلف سے سخت الرجی ہے۔"

"اف یہ تکلف.....اب تو اتنا عرصہ ہو گیا۔مگر لگتا تیری عادتیں نہیں بدلیں۔"

اس نے فروٹ چاٹ والے کو منع نہیں کیا۔میں خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم فروٹ چاٹ سے لطف اندوز ہوتے، ہنستے مسکراتے ماضی کو یاد کر رہے تھے۔

میں دور خلا میں گھورتا بولا۔"یار یہ ماضی کتنا خوبصورت ہوتا ہے؟"

"ہاں شاید۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔"گزر چکا ماضی، چھن چکی قیمتی اشیاء، بھول چکے لوگ، وقت گزرنے کے بعد ہی خوبصورت لگنے لگتے ہیں۔"

میں مسکرایا۔"ہاں یہ تلخ حقیقت ہے۔"

وہ سنجیدہ ہوتے بولا۔"دیکھ اختر زماں.....ہمارے آس پاس تو سب تلخ حقیقتیں ہی بکھری پڑی ہیں۔گزر رہا، آج بھی تو کل ماضی بن جائے گا۔اب بھی دیکھو ہمارے سارے کالج کے دوست بھی ماضی کا حصہ بن چکے ناں! کبھی کبھی کسی سے ملاقات ہو بھی جائے تو سب رسمی انداز میں کنی کترا کر گزر جاتے ہیں۔سب سوچتے ہیں شاید دوستی کا واسطہ دے کر اس مشکل دور میں کوئی کچھ مانگ نہ لے۔سچی بات تو یہ ہے کہ بھی، تمہیں دیکھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" وہ ہنس پڑا۔

میں پھیکے انداز سے مسکرایا۔وہ اب بھی حقیقت پسند تھا۔میں نے کہا۔"دیکھا جائے تو عملی زندگی کا تصور ہی تلخ ہوتا ہے۔"

"ہاں مگر اس وقت کون سمجھتا تھا کہ عملی زندگی میں بھی، ہم نے آنا ہے۔ایک دوسرے کو تو ہم سمجھاتے تھے، لیکچر جھاڑتے تھے۔مگر چند ایک کو چھوڑ کر تو سب بے فکرے تھے اور وہی کرتے تھے جو دل چاہتا تھا۔خیر چھوڑو میں بھی کن لغویات میں پڑنے لگا۔" وہ سر جھٹکتے بولا۔"اب سنا کیسی گزر رہی؟"

اس کی آخری بات سے میں چونکا۔ایک لمحہ میں کئی یادیں، کئی مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔مجھے یاد آیا، کالج کا تیسرا سال تھا۔ان دنوں جوانی کا جوش، پاگل پن کی انتہا، عروج پر تھی۔دل کچھ اچھوتا کرنے، کچھ کر دکھانے کو اکساتا تھا۔دل چاہتا تھا کہ اس عمر میں کچھ ایسا بڑا کام کیا جائے کہ چند دنوں میں مشہور ہو

جائیں۔مارک زکربرگ کی طرح امیر ہوجائیں۔خیال آتا تھا کہ یہی عمر تو ہوتی ہے کچھ کر دکھانے والی۔اپنی اس خواہش کا اظہار اکثر میں اپنے دوستوں سے کرتا رہتا تھا۔راشو اکثر سمجھاتا کہ سب بیوقوفانہ باتیں ہیں۔حقائق کی دنیا میں رہو خیالی دنیا سے کچھ نہیں ہوتا۔مگر دل بے چارہ ہر نصیحت کی نفی کردیتا تھا۔

ایک دن فری پیریڈ میں ہم کالج کے گراؤنڈ میں پڑی، سیمنٹ کی بینچوں پر بیٹھے تھے۔بہار کے موسم کی ٹھنڈی ہوا میں سب کے جسم تھکان کا شکار نظر آرہے تھے۔مگر سوچیں پرجوش تھیں۔میں نے راشو سے کہا۔"یار بے مطلب زندگی سے تنگ آگیا ہوں میں، مجھے کچھ نیا کرنا ہوگا۔مجھے ایک مقصد بنانا ہوگا۔ایک منزل متعین کرنا ہوگی۔شہرت، دولت، عزت ایسے تو نہیں ملتیں۔مانا مقصد حاصل کرنے میں ہزار ہا رکاوٹیں، خاردار جھاڑیاں راہ میں ہوں گی۔مگر مجھے دامن بچا بچا کر ان سے گزرنا ہوگا۔اپنا مقصد حاصل کرنا ہوگا۔بے مقصد، مایوس زندگی سے تو موت اچھی۔مگر مجھے ایسی موت نہیں چاہیے۔مجھے کچھ نیا کرتے ہوئے، اچھوتا کرنے کے بعد، مقصد حاصل کرنے کے بعد موت چاہیے۔ہاں مجھے اپنا مقصد حاصل کرنا ہوگا.....اپنا مقصد حاصل کرنا ہوگا۔"میں نے پرجوش انداز میں اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارا۔

راشو نے ہنستے ہوئے میرے کندھے پر ایک زوردار چپت رسید کی۔"ابے سالے، آخر تمہارا مقصد ہے کیا؟ خیالی دنیا کے بے تاج بادشاہ، اپنا مقصد تو بتا؟"

میں دور خلا میں بادلوں کے سفید ٹکڑوں کو تیرتے دیکھتا بولا۔"مقصد بتانے والا تھوڑی ہوتا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔"پھر بھی.....ہمیں تو بتا۔ہم تمہارے دوست ہیں۔"

"میں کوئی نئی چیز ایجاد کروں گا۔"

"کیا ایجاد کرو گے؟"

"یہ بتانے والی بات نہیں۔اگر بتا دیا تو کچھ نہ کر پاؤں گا۔"

وہ پھر ہنسنے لگا اور مذاق اڑاتے بولا۔"تم نے پھر انجینئرنگ کالج، یونیورسٹی میں داخلہ کیوں نہیں لیا؟ وہاں تو تمہارے پاس کچھ کرنے کے لیے وسائل بھی ہوتے سکھانے کے لیے استاد بھی ہوتے، اس چھوٹے سے کالج میں کیا رکھا؟"

"مجھے پتا تھا تم ہنسو گے۔"میں فلاسفرانہ انداز میں بولا۔"کچھ نیا کرنے کے لیے وسائل کی ضرورت نہیں، صرف جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ جذبہ ہے میرے پاس۔دیکھنا ایک دن.....ایک دن میرا نام ہوگا۔"

"اچھا.....ابے سالے تُو تو پھر بڑا آدمی بن جائے گا۔ہمیں یاد رکھے گا کہ نہیں....."

"ہاں تم سب دوستوں کے لیے بھی کچھ کروں گا۔"

وہ ایک بار پھر میرے کندھے پر چپت رسید کرتے بولا۔"دیکھیں گے.....ہمارے خیالی دنیا کے بے تاج بادشاہ دوست؟ اپنا یہ جذبہ سلامت رکھنا۔"اگلے پیریڈ کی گھنٹی بجی تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان باتوں کو صرف ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ میں نے ایک ایجاد کر ڈالی۔اس ایجاد سے میری شہرت کو پر لگ گئے۔میں مشہور ہوتا گیا۔ہاں میں نے ایجاد ہی کچھ ایسی کر ڈالی تھی۔محبت کی ایجاد.....ہاں انسان جب کچھ نہ کرسکے تو محبت کرلے۔میری ایجاد کچھ ایسی خاص نہ تھی۔مگر اس میں بہت اچھوتا پن تھا۔میں اپنی منگیتر عائشہ کو بھگا لے گیا تھا۔ہاں محبت کی خاطر، اپنا مستقبل، اپنے سب رشتے داؤ پر لگا دیے تھے۔جب محبت پر پہرے بٹھائے جائیں، انہیں الگ کرنے کا سوچا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

ہر جواری احمق ہوتا ہے کیوں کہ وہ جوا کھیلتا ہے۔میں بھی احمق تھا۔دو سال ہم بھاگتے رہے، چھپتے رہے۔تیسرے سال راضی نامہ ہوا۔اس دوران ہمارا ایک بچہ ہو چکا تھا۔جوں ہی راضی نامہ ہوا۔عائشہ چلی گئی۔بچہ لے کر خلع لے کر۔وہ تھک چکی تھی۔اپنی بے وقوفی پر، پشیمان تھی۔اس وقت میرا مستقبل تباہ تھا۔تین زندگیاں میری ایجاد کی نذر ہو چکی تھیں۔کچھ بھی تو باقی نہ تھا۔بعد میں ایجاد بھی کسی اور نے اپنے نام کرلی۔تین سال برباد کرکے میں وہیں کا وہیں تھا۔اگلے تین سالوں میں کیسے جیا، کیسے میں نے اپنی پڑھائی مکمل کی۔یہ تو بس مجھے پتہ تھا۔

☆.....☆

راشد فرحان نے میرا بازو پکڑ کر ہلایا تو میں چونک پڑا۔"کہاں کھو گئے یار، میں پوچھ رہا تھا کہ کیسی گزر رہی ہے؟"

میں نے سر ہلایا۔"ہاں.....یار وہ، بس شکر ہے۔اچھی گزر رہی ہے۔"

"ہوں.....میں نے سنا تھا کہ عائشہ تمہیں چھوڑ گئی تھی۔"

"ہاں....."میں نے دکھ سے سر ہلایا۔

"دوبارہ شادی کی....."

"نہیں تو۔"میں پھیکے انداز سے مسکرایا۔

"یار میں نے تمہیں اپنی شادی کا کارڈ بھیجا تھا۔مگر تم نہیں آئے۔میں سمجھا تم سب کی طرح مجھے بھی بھول چکے۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔"اچھا آج کل کیا کررہے ہو؟"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"جاب کی تلاش....." میں نے خوشگوار لہجہ اپنانے کی کوشش کی۔ "اور تم.....؟"

"ابو کا بزنس سنبھال رہا ہوں۔"

"اچھا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"یار برا نا مانو تو ایک بات کہوں؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ہاں، اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے آخر ہم دوست ہیں۔" میں ماضی کو یاد کرتے پرجوش انداز میں بولا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں دوست تو ہم ہیں ہی۔ مگر ماضی میں تم نے میری کسی بات کو کبھی اہمیت نہ دی تھی اور آخر میں تو اپنی بے وقوفی کی وجہ سے بہت مایوس ہی کیا تھا۔ مگر مجھے پتہ ہے اب تم میچور ہو گئے ہو۔ خیالی دنیا سے باہر آ گئے ہو۔ ایسا ہے ناں؟" اس نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا تو میرے دل میں دکھ کی لہر سی اٹھی۔

میں نے تاسف سے سر ہلایا۔ "ہاں.....شاید۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "یار دراصل بات یہ تھی۔ مجھے ایک قابل اعتماد منیجر کی ضرورت ہے۔ سیلری بھی پرکشش ہے اور تم ان دنوں جاب کی تلاش بھی کر رہے ہو۔ اگر تمہارا دل مطمئن ہو تو مجھ پر مہربانی فرما کر یہ آفر قبول کر لو۔"

میں نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ اس نے میز پر سے میرا ہاتھ دبایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دیکھنا دوست اب منع نہیں کرنا۔ یہ میری درخواست ہے۔ بلکہ یہ تمہارے لیے بہت اچھا ہوگا۔"

اس کی بات سے، اچانک میرا دل بجھ سا گیا۔ کوئی تیر سا دل کو آ لگا۔ مجھے لگا وہ میرا دوست نہ ہو بلکہ کوئی امیر آدمی ہو جو میری حالت پر ترس کھا کر بھیک دے رہا ہو۔ میرے دماغ میں چنگاری سی چھوٹی۔ خیال آیا۔ اے دوست اب تو بھی میری انا کو مجروح تو نہ کر۔ انا ماضی میں صرف بلند و بانگ دعوے کرنے کے علاوہ، کچھ نہ کر سکا۔ انا میں پاگل تھا۔ انا میں اندھا تھا۔ مگر ہاں..... مگر میں خوددار بھی تو تھا ناں..... ہاں خوددار۔ افسوس دوست تم نے مجھے غلط سمجھا، غلط جانا..... اتنا غلط تو میں نہ تھا۔ ہاں اتنا غلط تو میں نہیں ہوں۔

اس نے ایک بار پھر میرا ہاتھ دبایا تو میں ایک بار پھر چونکا۔ "ہاں تو اختر زمان....." وہ باس کا لہجہ اپناتے بولا۔ "میں سمجھوں کہ تمہیں میری درخواست منظور ہے۔"

میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ ایک دوست کا چہرہ تو نہ تھا۔ اس چہرے پر میرے لیے فکر بھی تو نہ تھی۔ صرف ترس تھا۔ ہاں ترس..... ایک امیر کے چہرے پر غریب کے لیے ترس۔ اور اس بار تو اس نے، مجھے سالا بھی تو نہ بولا تھا۔ یہ بھلا کیسا دوست تھا؟ جو انتہائی سنجیدگی سے ترس کھا کر میرے مسائل حل کرنے کے درپے تھا۔ میرے دل میں ایک بار پھر ایک ہول سا اٹھا۔ دل لرز اٹھا۔ ہاں دوست، میرا دوست..... نہیں، کوئی نہیں میرا دوست، میرا دوست کوئی نہیں۔ سب نے مجھے چھوڑ دیا تو بھی مجھے چھوڑ دے۔ کوئی ضرورت نہیں اب دوبارہ میری زندگی میں گھسنے کی۔ کوئی حق نہیں۔ بلکہ نہیں، گھس تو میں رہا تھا تمہاری زندگی میں، کہ تمہیں نظریں چراتا دیکھ کر بھی، متوجہ کر بیٹھا۔ اپنے ماضی کو چھیڑ بیٹھا۔ اپنی رسوائی کو یاد کر بیٹھا۔ اے دوست ترس کھانا ہی تھا تو اس وقت کھاتا جب میں دربدر ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ ذلیل ہو رہا تھا۔ تو اس وقت میرے لیے کچھ کر سکتا تھا۔ اپنے ابو کو کہہ کر مجھے کسی گھٹیا جاب پر رکھوا سکتا تھا۔ مگر اب..... مگر اب کیا کرنا تیرے اس ترس کا، تیری اس دوستی کا۔ دوستی گئی بھاڑ میں، میرا کوئی دوست نہیں۔ میں سب کو آزما چکا۔ ہاں آزما چکا۔

میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑے، نیچے پہلی بار اس کا ہاتھ دبایا۔ وہ میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اپنے جذبات کو کنٹرول کرتے آہستہ سے بولا۔ "معاف کرنا دوست، میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے جانا ہوگا....." میں آہستہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی درخواست قبول نہیں کر سکتا۔ میری انا اس کو گوارا نہیں کرے گی۔ امید ہے تم برا نہیں مانو گے۔" وہ حیران ہوتے ہوئے میری طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے جانے کے لیے آخری مصافحہ کیا۔ اس نے شش و پنج میں جتلا مجھے مصافحہ کیا۔

میں تیزی سے قدم بڑھاتا سڑک پر آ گیا۔ فروٹ چاٹ کے پیسے اس نے بہت پہلے ادا کر دیے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ پیچھے وہ طنزیہ انداز سے مجھ پر مسکرا رہا ہوگا۔ اور دل میں مجھے پاگل کہہ رہا ہوگا۔ میں نے سوچا، جو سوچتا سوچے وہ، جو کہتا کہے وہ۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں سچائی کو نہیں جھٹلا سکتا۔ اپنے مستقبل اور دوسروں کے مستقبل کو تباہ کرنے والا پاگل ہی تو ہوتا ہے۔ ہاں میں مانتا ہوں۔ میں پاگل تھا، ہوں اور رہوں گا۔ میں اب بھی وہی کروں گا جو میرا دل کرے گا۔ بھاڑ میں جائے یہ زمانہ..... بھاڑ میں جائیں اس زمانے کے دوست۔

کالے بھوتوں کے بسیرے

ڈاکٹر ریاض توحیدی

ڈاکٹر ریاض توحیدی صاحب کا تعلق مقبوضہ وادی کشمیر کے علاوہ ہند واڑہ سے ہے جہاں بچے بوڑھے جوان حتیٰ کہ خواتین تک آزادی کے لیے جانیں قربان کر کے ایک نئی تاریخ رقم کر رہی ہیں اسی وادی بے نظیر کے پس منظر میں ایک علامتی تحریر۔

غروب آفتاب کے ساتھ ہی کالی رات کے دہشت ناک سائے بستی کے گلی کوچوں میں سنسناہٹ کے بین بجانا شروع کر دیتے تھے۔ بین کی خوفناک چیخوں نے بستی کو شب عاشور میں تبدیل کیا تھا اور برسوں سے چھائے ہوئے خوف و دہشت کے ان پراسرار سیاہ سایوں نے بستی کو کالے بھوتوں کا بسیرا بنائے رکھا تھا۔ بستی کے بے بس مکین اپنی خوف زدہ نئی نسل کو ان کالے بھوتوں کے خونین پنجوں سے بچائے رکھنے کے جتنے بھی گر آزما لیتے وہ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی اس وقت سراب ثابت ہو جاتے جب کسی اور بچے کے غائب ہونے کی منحوس خبر گھر گھر پھیل جاتی۔ لوگوں کے ذہنوں میں انتشار کی رو تیز ہو رہی تھی کہ رات کے سیاہ سایوں میں کون سے غیبی ہاتھ ان کی معصوم نسل کو اُن سے چھین لیتے ہیں۔

اُس دن..... طلوع آفتاب کے ساتھ ساتھ..... موبائل پر شمشیر دیوانہ کو مبارک بادی کے پیغامات آنے شروع ہو گئے۔ ہر پیغام پر شمشیر دیوانہ خوشی سے جھوم اٹھتا کیونکہ پچھلے چند برسوں سے امن دشمن، عوام دشمن اور دیش دشمن عناصر کا خاتمہ کرتے ہوئے اُس نے جو بہادرانہ، ایماندارانہ اور منصفانہ کارکردگی دکھائی تھی۔ اُس کے اعتراف میں سرکار نے انھیں فرض شناس پولیس آفیسر قرار دیکر "ستارۂ امن" کے میڈل سے نوازنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کریم چاچا..... شمشیر دیوانہ کا پرانا گھریلو خدمت گار..... بچپن سے ہی اس گھر میں ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ اپنا فرض نبھاتے ہوئے اب بڑھاپے کی سرحد پر کھڑا تھا۔ وہ مالک کی ترقی پر گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے میں فخر محسوس کر رہا تھا۔ "یوم امن" کی تقریب شروع ہونے والی تھی اور شمشیر دیوانہ کو اس تقریب میں اعزازی میڈل ملنے والا تھا۔ وہ تقریب میں جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ کریم چاچا نے اُسے اپنے گمشدہ بیٹے کی یاد پھر دلائی۔ کریم چاچا کے بڑھاپے کا سہارا کچھ دنوں سے غائب تھا اور اُس کی امیدیں اپنے آقا اور نامور پولیس آفیسر سے وابستہ تھیں۔

"نئے عہدے کا چارج سنبھالتے ہی میں اُسے تلاش کروں گا" شمشیر دیوانہ نے مسکراتے ہوئے کریم چاچا کو دلاسہ دیا۔

"اس وقت تم اسپتال چلے جاؤ۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ منا کی حالت بگڑ رہی ہے۔"

کریم چاچا اپنے گمشدہ بیٹے کا غم بھول کر مالک کے بیٹے کی دیکھ بھال کے لئے اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

شمشیر دیوانہ جب اس محل نما حویلی سے نکل کر لان کی طرف بڑھنے لگا تو گاؤں کے لوگ قطار میں کھڑے ہو کر اس کے استقبال میں کھڑے تھے۔ مبارک، مبارک کی صدائیں ہر طرف سے آ رہی تھیں اور وہ شکریہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ گاؤں کے بزرگ اُس کی طرف آس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور گمشدہ بچوں کی مائیں

آبدیدہ نگاہوں سے امید کا دامن پھیلا رہی تھیں۔لوگوں کے غمزدہ چہروں کو دیکھ کر وہ ہمدردانہ لہجے میں انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہنے لگا:

"آپ کے بچے میرے اپنے بچے جیسے ہیں۔" شمشیر دیوانہ نے ہمدردانہ لہجے میں ان سے کہا۔

"میں سرکار سے خصوصی اختیارات حاصل کر کے انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔"

شمشیر دیوانہ سرکاری گاڑی میں سوار ہو کر تقریب کی جانب روانہ ہوا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی درجن بھر سفید و سبز رنگ گاڑیاں سائرن بجاتے ہوئے قافلے کی صورت میں اُس کے ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ شمشیر دیوانہ اسپیشل فورس کا آفیسر تھا۔اس کو جس جگہ کا بھی چارج دیا جاتا تو وہ اپنا فرض اس سلیقے سے انجام دیتا تھا کہ ڈیپارٹمنٹ میں وہ انکاونٹر ماسٹر کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اور وہاں پر کسی انسان کو لا اینڈ آرڈر کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہ رہ جاتی تھی۔

تقریب شروع ہونے کے ساتھ ہی شمشیر دیوانہ کو اسٹیج پر بلایا گیا۔وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ جلسہ گاہ میں لوگوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ پولیس آفیسرز اور سیاست دان اپنے اپنے مخصوص انداز میں شمشیر دیوانہ اور دوسرے پولیس آفیسرز کی فرض شناسی، امن دوستی اور وطن پرستی کی داستانیں بڑھا چڑھا کر سُنا رہے تھے۔تقریب کے آخر پر شمشیر دیوانہ کو ڈائس پر بلایا گیا۔وہ تالیوں کی گونج میں جذباتی انداز سے تقریر کرنے لگا:

"کچھ شر پسند اور دیش دشمن عناصر اپنے حقیر مفادات کی خاطر ہمارے معصوم اور بے گناہ نوجوانوں کو دہشت گردی کے جال میں پھنساتے ہیں اور ان کی معصوم زندگیوں سے کھیلتے ہیں جس کا عذاب سارے ملک کو جھیلنا پڑتا ہے۔آپ لوگ ہمارے محکمے پر پورا بھروسہ رکھیں وہ سب بے ضمیر درندے اور انسانیت کے دشمن جلد ہی بے نقاب ہو جائینگے اور یہاں پھر سے امن و امان بحال ہو گا۔"

تقریر ختم کرنے کے بعد شمشیر دیوانہ کو "ستارۂ امن" سے نوازنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اچانک میڈیا کی ایک گاڑی جلسہ گاہ میں نمودار ہوگئی اور اسٹیج کے سامنے رک گئی۔ میڈیا کے افراد ایک زخمی نوجوان کو سہارا دیتے ہوئے اسٹیج پر چڑھ گئے۔نوجوان کے لباس پر خون کے دھبے تھے۔ سبھی لوگ اس غیر متوقع صورت حال سے حیران ہو گئے اور جلسہ گاہ پر سناٹا سا چھا گیا۔

خاموش سمندر میں سونامی کی لہریں اٹھنے لگیں۔لہروں نے کالے بھوتوں کے بسیرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔تبھی ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو گیا۔ شمشیر دیوانہ کے چہرے پر خوف کی ہوائیں اڑنے لگیں۔ یہ غیر متوقع حادثہ دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو گیا اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔

"کریم چاچا کا گمشدہ بیٹا......زندہ......؟"

ذوقِ آگہی

سباس گل

یوم مئی مزدور ڈے

"مما!
آج نہ تو آپ اسکول گئیں اور نہ ہی پاپا آفس گئے ہیں۔" عامر کے پوچھنے پر میں نے بتایا۔
"بیٹا آج یوم مزدور کی چھٹی ہے۔"
"کیا پاپا مزدور ہیں۔" عامر نے معصومیت سے پوچھا۔
میں ہنسی۔"ہاں انجینئر بھی مزدور ہوتا ہے۔"
"اور آپ بھی؟"
"ہاں بیٹا، ٹیچر بھی مزدور ہوتا ہے۔"
"ہر محنت کرنے والا مزدور ہوتا ہے۔" عامر کچھ دیر بعد بولا۔
"مما! ہماری ماسی بھی محنت کرتی ہے مگر اس کو آج چھٹی نہیں۔" مجھے سو واٹ کا جھٹکا لگا۔
فوراً ماسی کو آواز دی۔
"عذرا! برتن چھوڑ دو آج تمہاری چھٹی ہے۔"
"کیوں باجی۔" عذرا نے حیرت سے پوچھا۔
میرے بجائے عامر نے جواب دیا۔
"کیونکہ آپ بھی مزدور ہیں۔"

ملک جواد نواز ...... ڈی آئی خان

بڑے لوگوں کی نظر میں محبت کیا ہے؟

ہم سب نے دنیا کے ساتھ محبت کر لینے میں صلح کر لی ہے جس کی وجہ سے کوئی شخص کسی کو نہ اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور نہ بری باتوں سے روکتا ہے۔ (مالک بن دینار)
مجھے موت سے محبت ہے اپنے مولا سے ملاقات کے شوق میں (حضرت ابوداؤد انصاری)
محبت کی راہ میں ہر بیٹا اپنے باپ کی نظروں میں یوسف ہے (بوعلی سینا)
انسانوں میں محبت اور الفت بھی نجات کا ایک ذریعہ ہے (گوتم بدھ)
نفرت کو نفرت سے نہیں، محبت سے جیتا جا سکتا ہے (گوتم بدھ)
کسی انسان کے دماغ میں اندیشہ اور دل میں محبت بیک وقت نہیں رہ سکتے۔ (شیکسپیئر)
محبت ایک ایسی آگ ہے جو تمام میل کچیل کو بھسم کر دیتی ہے (شیخ بہاؤالدین ذکریا)
مجھے محبت ان جوانوں سے ہے جو ستاروں پر کمند ڈالتے ہیں (علامہ اقبال)
تم اپنے دشمن سے بھی محبت رکھو اور ستانے والوں کے لیے دعا مانگو کیونکہ خداوند کریم اپنے سورج کو نیک و بد دونوں پر چمکاتا ہے۔ (حضرت عیسیٰ)
محبت میں وہ صادق ہے جو دوست کی بھیجی ہوئی بلا کو بسر و چشم قبول کرے۔ (چینی کہاوت)

ریاض بٹ ...... حسن ابدال

بے نمازی

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا میں نے پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں میں رکھ دیا ہے لوگ انہیں دوسری چیزوں میں تلاش کرتے ہیں۔
میں نے رضا کو مخالفت نفس میں رکھ دیا ہے وہ اسے موافقت نفس میں تلاش کرتے ہیں بھلا کیسے پائیں گے۔
میں نے راہ جنت کو جنت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔
میں نے علم و حکمت کو بھوک میں رکھ دیا ہے لوگ اسے سیری میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔
میں نے عنایت و سکون کو قناعت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے دولت میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔
میں نے عنایت و سکون کو قناعت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے دولت میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔
میں نے مسرت کو اپنی اطاعت میں رکھ دیا لوگ اسے بڑے بڑے مرتبوں اور جھوٹے جاہ و جلال میں تلاش کرتے ہیں وہ بھلا کیسے پائیں گے۔
نبی کریم کا فرمان ہمارے مشعل راہ ہے اسے اپنا کر ہی دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

ایم حسن نظامی ...... قبولہ شریف

ہنسیں مسکرائیں

زندگی ملتی ہے ایک بار، موت آتی ہے ایک بار، پیار ہوتا ہے ایک بار، سچا دوست ملتا ہے ایک بار، دل ٹوٹتا ہے ایک بار، جب سب کچھ ہوتا ہے ایک بار تو لائٹ کیوں جاتی ہے بار بار۔

......☆☆......

تمہیں ابو سے ہر روز کتنے پیسے ملتے ہیں؟
شاگرد سے معصومیت سے جواب دیا جناب مجھے کیا ملیں گے میرے ابو تو خود میری امی سے ادھار لے کر جاتے ہیں۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

مائیکل انجیلو

مائیکل انجیلو 6 مارچ 1475ء کو پیر کے دن اٹلی کے علاقے اریزو میں پیدا ہوا، چھ برس کی عمر میں اس کی ماں چھوڑ گئی، اسے پینٹنگز سے زندگی کی حد تک محبت تھی مجسمہ سازی میں وہ اس قدر ماہر تھا کہ اب تک شاید ہی کوئی اتنا کاریگر ہو اس کی دو سوانح حیات منظر عام پر آئی تھیں اور ان کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے یہ سوانح پینٹروں، مجسمہ سازوں میں وہ اس قدر ماہر تھا کہ اب تک شاید ہی کوئی اتنا کاریگر ہو، اس کی دو سوانح حیات منظر عام پر آئی تھیں اور ان کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے یہ سوانح پینٹروں مجسمہ سازوں اور انجینئروں کی اب تک رہنمائی کرتی ہیں اس کا شاگرد کونڈیوی اور دوسرا اس کا دوست واساری تھا۔ واساری نے اس کی زندگی کے نشیب و فراز و حوادثات کو دو جلدوں میں قلمبند کیا۔

اس کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ وہ دراز قامت تھا مگر اس کی پیٹھ میں درد رہتا تھا۔ اس لیے وہ آگے کو جھکا رہتا تھا اس کے سر کے بال خاکستری، آنکھیں سیاہ پلکیں بے حد چمکدار اور دل میں اتر جانے والی تھیں انجیلو نے مصوری، مجسمہ سازی اور نقشی نویسی کے بے شمار منفرد کام کیے ہیں جن کی تفصیل بہت لمبی ہے اس نے متعدد ایسے منصوبوں کی ڈرائنگ بنا کر چھوڑ دی جنہیں بعد میں مکمل کیا گیا اس کا سب سے اہم کارنامہ 1530 میں فلورنس کی لائبریری کا ڈیزائن ہے اسی لائبریری میں یونانی شاعر ہومر کی کتاب ایلیڈ رکھی ہے جس کا ورق انجیلو نے بنایا ہے۔

1544ء میں انجیلو پر بیماری نے حملہ کیا اور اسے اسٹروزی محل منتقل کر دیا گیا ذرا طبیعت سنبھلی تو 1546ء میں اس نے کلیسا کی تعمیر کرائی 1550ء میں جب وہ 70 برس کا ہو چکا تھا اس نے کلیسا کے اندرونی حصے میں وہ مجسمہ تراشا جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب ہوتے دکھایا گیا اپنی موت سے صرف چھ روز پیشتر وہ میدان میں چرچ کے لیے مجسمہ تراش رہا تھا کہ فرشتہ اجل نے اسے مہلت نہ دی اور مجسمہ نامکمل رہ گیا۔

انجیلو اپنے مقبرے کی تعمیر کے سلسلے میں 1545ء میں سخت بیمار پڑ گیا اسے فالج کا حملہ ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا اور وہ 18 فروری 1554 کو 89 برس کی عمر میں آنجہانی ہو گیا اس کی وصیت پر اسے مشہور شاعر دانتے کے پہلو میں فلورنس میں دفن کیا گیا اس کے آخری کلمات یہ تھے میں اپنی روح خدا کے ہاتھ دیتا ہوں اور اپنا جسم مٹی کے سپرد کرتا ہوں۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف

علم کی افادیت و نقصان

علم حاصل کرنا ہر انسان کا حق ہے علم کا مطلب ہے معلومات کا خزانہ یہ وہ خزانہ ہے جسے کوئی چور چرا نہیں سکتا حکم یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے تمہیں چین جانا پڑے تو جاؤ علم کا مفہوم یہ نہیں کہ کتابوں کے کیڑے بن جاؤ اور عمل نہ کرو عمل ضروری ہے ورنہ علم بے کار ہے ایک جوگی کے پاس سانپ کے دانت کھٹے کرنے کا علم ہوتا ہے وہ زہریلا سانپ خون نصیب ہوتا ہے جس پر جوگی کی نگاہ پڑ جائے جوگی سانپ کو پکڑ کے اس کے دانت کھٹے کر دیتا ہے اسے جان سے نہیں دیتا پھر وہ سانپ جوگی کے پاس اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کی طبعی موت واقع نہ ہو جائے ایک زہریلے سانپ پر ایسے لوگوں کی نگاہ پڑ جاتی ہے جو جوگی کی فنی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں وہ تمام لوگ سانپ سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ڈنڈوں، اینٹوں سے اسے کچل کے رکھ دیتے ہیں کیونکہ ان کے پاس سانپ کے دانت کھٹے کرنے کا علم نہیں ہوتا یہ اس سانپ کی بد نصیبی ہوتی ہے کہ وہ دانت کھٹے نہ کرنے والوں کے سامنے آکے زندگی سے محروم ہو جاتا ہے جو جوگی دانت کھٹے کرنے کا علم جانتے ہیں وہ سانپ کو جان سے نہیں مارتے یوں ایک سانپ مرنے سے بچ جاتا ہے اسی طرح

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

حکمت اور ڈاکٹری ہے ایک ڈاکٹر کروڑوں جاہل انسانوں پر بھاری ہے کوئی انسان تکلیف میں ہو تو ڈاکٹر علاج سے اس کی تکلیف دور کر کے مسیحا بن جاتا ہے جبکہ کروڑوں آدمی جو حکمت اور ڈاکٹری سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ تکلیف میں مبتلا انسان کو تڑپتے تو دیکھ سکتے ہیں اس کی مدد نہیں کر سکتے اسی طرح دینوی علم ہے اور دنیاوی علم ہے کچھ لوگ علم سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں کچھ لوگ نقصان اٹھاتے ہیں علم سے انسان جنت میں جا سکتا ہے اور یہی علم اسے دوزخ میں لے جانے کا سبب بھی بن جاتا ہے کچھ لوگ علم حاصل کر کے اچھی پوسٹ پر تعینات ہو کے راشی بن جاتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے علم وبال بن جاتا ہے کئی لوگ علم حاصل کر کے اچھی پوسٹ پر تعینات ہو کے با ایمان رہتے ہیں اور جنت پا لیتے ہیں خدا ہمیں ایسا علم عطا کرے کہ ہم اس علم سے جنت حاصل کریں اور جہنم کے دردناک عذاب سے بچا جائیں۔ آمین ثم آمین

بشیر احمد بھٹی...... بہاول پور

اعمال نامہ

انسان کو اس دنیا میں بھیجنے والے نے اپنی عبادت ہی کے لیے بھیجا ہے ہر شخص کو اس عبادت کے لیے ایک طے شدہ مدت دی ہے مدت مکمل ہوتے ہی ہر حال میں بھیجے جانے والے کی واپسی ہے جہاں جا کر وہ اس عبادت کے حوالے سے حساب دے گا۔ اس حساب کے لیے جس چیز کو بنیاد بنایا گیا ہے اسے اعمال نامہ کہتے ہیں یہ اعمال نامہ بھی بھیجنے والا ہی تیار کرا رہا ہے غلطیوں سے پاک، اس اعمال نامے میں انسان کا بالغ ہونے سے لے کر موت تک کیے جانے والا ہر چھوٹا بڑا عمل لکھا ہوگا۔

ایس حبیب خان...... کراچی

وجوہات غربت اور محتاجی

غربت اور محتاجی چار چیزوں سے آتی ہے۔

☆ جلدی جلدی نماز پڑھنے سے

☆ کھڑے ہو کر پانی پینے سے

☆ منہ سے چراغ بجھانے سے

☆ آستین یا دامن سے منہ صاف کرنے سے

ناہید اختر...... احسان پور

اچھی بات

جب تم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہو تو سر سے آسمان تک رحمت الٰہی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے

فرشتے تیرے چہرے کی طرف جمع ہو جاتے ہیں

ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ اے نمازی! اگر تُو دیکھ لے تیرے سامنے کون ہے اور تُو کس سے بات کر رہا ہے تو اللہ کی قسم تُو قیامت تک سلام نہ پھیرے۔

کائنات اشرف...... یوسال سکھا

اہلیت

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس ایک وفد آیا، وفد میں شامل ایک نوجوان اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے لگا۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا "تم خاموش رہو نوجوان! کسی بزرگ کو بولنے دو۔"

"امیر المومنین!" نوجوان نے کہا۔ "عقل و دانش کا تعلق سن و سال سے نہیں ہوتا ورنہ آپ کی مسند پر کوئی بزرگ تر آدمی نظر آتا۔"

طیبہ نذیر...... شادیوال گجرات

قرآنی معلومات

قرآن پاک کی سب سے بڑی سورۃ البقرہ ہے۔

قرآن پاک کی سب سے چھوٹی سورۃ الکوثر ہے۔

قرآن پاک میں 30 پارے، 114 سورتیں اور 558 رکوع ہیں۔

قرآن پاک کی عروس القرآن سورۃ رحمٰن کو کہا جاتا ہے۔

قرآن پاک کا دل سورۃ یٰسین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن میں 6666 آیتیں ہیں۔

قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت "آیۃ الکرسی" ہے۔

سورۃ التوبہ قرآن پاک کی ایسی سورۃ ہے جس کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی جاتی۔ قرآن پاک میں کل لفظ 323760 ہیں۔

سورۃ الناس قرآن پاک کی ایسی سورۃ ہے جو حرف "س" پر اپنی آیت ختم کرتی ہے۔ قرآن پاک کی سات منزلیں ہیں۔

قرآن پاک میں قل سے شروع ہونے والی کل سورتیں ہیں سورۃ الجن، سورۃ الکافرون، سورۃ الاخلاص، ▲

سورۃ الفلق' سورۃ الناس۔

رابعہ ساحر...... جہانیاں

سچے موتی

☆محبت بانٹنے سے بڑھتی ہے۔
☆درد بانٹنے سے کم ہوتے ہیں۔
☆مسکراہٹ درد چھپانے کا اوزار ہے۔
☆جو سوچو گے وہی پالو گے اس لیے اپنی سوچ مثبت اور تعمیری رکھیں۔
☆شک رشتوں کو کھوکھلا اور جذبات کو پامال کر دیتا ہے۔
☆بامقصد زندگی انسانیت کا پتا دیتی ہے۔
☆دنیا سے مانگ کر شرمندگی اٹھانے کے بجائے رب کائنات سے مانگ کر سرخرو ہونا بہتر ہے۔
☆نیکی صرف مغرب کی جانب منہ پھیر لینا نہیں کسی کی آنکھ سے اشک چرالینا' چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنا بھی نیکی اور صدقہ ہے۔

سیدہ جیا عباس کاظمی...... تلہ گنگ

طرز تخاطب

ایک تاجر نے ایک بہلول کو دیکھا تو کہنے لگا۔
"یا شیخ میں کون سا مال خریدوں کہ مجھے فائدہ ہو؟"
بہلول نے جواب دیا۔
"روئی اور لوہا خرید لو۔"
تاجر نے ایسا ہی کیا کچھ عرصے میں اس کی قیمت کئی گناہ بڑھ گئی اور تاجر کو بہت زیادہ فائدہ ہوا۔ کافی عرصے کے بعد تاجر نے ایک بار پھر بہلول کو دیکھا تو کہنے لا۔
"اے پاگل بہلول! اس سال میں کون سا مال خریدوں کہ مجھے فائدہ ہو۔"
"اس سال پیاز اور تربوز خرید لو۔" تاجر نے ایسا ہی کیا لیکن کچھ ہی دن میں پیاز اور تربوز سڑ گئے' اس مرتبہ تاجر کو بہت نقصان ہوا۔ تاجر نے بہلول سے جا کر اس غلط مشورے کے بارے میں دریافت کیا تو بہلول نے کہا۔
"اے تاجر تم نے پہلی بار مجھے یا شیخ کہہ کر پکارا تھا' اس لیے میں نے عقل و منطق کے ساتھ تمہیں مشورہ دیا تھا لیکن دوسری بار مجھے پاگل کہہ کر مخاطب کیا' اس لیے میں نے تمہیں اپنے پاگل پن میں مشورہ دیا ہے' پس تم اپنے نقصان کے خود ذمہ دار ہو کیونکہ کوزے میں سے وہی نکالا جاتا ہے جو اس میں ڈالا گیا ہو۔"

فوزیہ سلطانہ...... تونسہ شریف

میراثی

دو میراثی ایک بارات کے ساتھ گئے وہاں جا کر بیٹھ گئے تو ان کو بار بار پانی پیش کیا گیا۔
ایک میراثی نے تنگ آ کر کہا۔
"بھئی تھوڑے سے چاول دے دو پانی حلق میں پھنس گیا ہے۔"

عریشہ ناز...... خانیوال

واصف علی واصف

☆جاگنے والے زندہ ہوں تو سونے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔
☆جاگنے والے نہ رہیں تو سونے والے بھی نہ رہیں گے' گڈریا سو جائے تو بھیڑیے ریوڑ کھا جاتے ہیں۔
☆لوگ فوری نتیجوں پر غور کرتے ہیں اور اس طرح انتہائی نتائج سے بے خبر رہتے ہیں۔
☆ہم شاید جانتے ہیں کہ ہمارے فیصلوں کے اوپر ایک اور فیصلہ نافذ ہو جایا کرتا ہے' یہ وقت کا فیصلہ ہے۔
☆تذبذب اس مقام کو کہتے ہیں جہاں آگے جانے کی ہمت نہ ہو اور واپس جانا ممکن نہ ہو۔
☆جب زمانہ امن کا ہو اور حالات جنگ جیسے ہو تو سمجھو عذاب ہے۔
☆منافق وہ ہوتا ہے جو اسلام سے محبت کرے اور مسلمانوں سے نفرت۔

ارم کمال...... فیصل آباد

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

مسجدیں چپ ہیں مزار اور کبوتر چپ ہیں
حضرتِ غیب ترے سارے سخنور چپ ہیں
اے خدا بھیج کوئی ایسا جو ہم جیسا نہ ہو
اے خدا بول کہ اب تیرے قلندر چپ ہیں
خط پڑھا کرتے تھے پانی بھی سنا ہے میں نے
بات کرتے تھے مگر آج تو پتھر چپ ہیں
یہ جو رسوائی ہے نا ، اس کو قبولا گیا تھا
ورنہ یونہی تو نہیں گالیاں سن کر چپ ہیں
ہم نے اک عمر گزاری ہے سمندر کے قریب
ہم سمجھتے ہیں اگر چپ ہیں تو بہتر چپ ہیں
بولتے ہیں تو گرجتے ہیں کہاں بولتے ہیں
اور اگر چپ ہیں تو آواز کے اندر چپ ہیں

ندیم بھابھہ......

سچی کہانی

سچی ایک کہانی ہم تم
بچپن بوڑھی نانی ہم تم
جنگل بارش تیز ہوائیں
موسم کی من مانی ہم تم
نیلی جھیل کا ایک کنارا
ہنستی رات کی رانی ہم تم
سات سروں کا اپنا سنگم
سارے گا مادھانی ہم تم
یاد کی الماری میں رکھے
سوکھے پھول نشانی ہم تم
وصل کی منظوری دینے میں
وقت کی آناکانی ہم تم
ریزہ ریزہ ہوگئے آخر
آب نقرہ یعنی ہم تم
دریاؤں سے ماپ رہے تھے
پیاس یہ ریگستانی ہم تم
صحرا صحرا خاک اڑائیں
عشق ہمارا دھانی ہم تم
کتنی مدت بعد ملے تھے
خاموشی حیرانی ہم تم
تتلی جگنو خواب جزیرہ
بہتا جھرنا پانی ہم تم
لکھے ہوتے لوح پر جینا
ملتے بہ آسانی ہم تم

جینا قریشی......

غزل

زنِ حسین تھی اور پھول چُن کے لاتی تھی
میں شعر کہتا تھا وہ داستان سناتی تھی
اسے پتہ تھا میں دنیا نہیں محبت ہوں
وہ میرے سامنے کچھ بھی نہیں چھپاتی تھی
منافقوں کو میرا نام زہر لگتا تھا
وہ جان بوجھ کے غصہ انہیں دلاتی تھی
عرب لہو تھا رگوں میں، بدن سنہرا تھا
وہ مسکراتی نہیں تھی دیئے جلاتی تھی
اسے کسی سے محبت تھی اور وہ میں نہیں تھا
یہ بات مجھ سے زیادہ اسے رلاتی تھی
یہ پھول دیکھ رہے ہو یہ اس کا لہجہ تھا
یہ جھیل دیکھ رہے ہو یہاں وہ آتی تھی
ہر ایک روپ انوکھا تھا اُس کی حیرت کا
مرے لئے وہ زمانے بدل کے آتی تھی
میں اُس کے بعد کبھی ٹھیک سے نہیں جاگا
وہ مجھ کو خواب نہیں، نیند سے جگاتی تھی!
علی یہ لوگ تمہیں جانتے نہیں ہیں ابھی
گلے لگا کے مرا حوصلہ بڑھاتی تھی
تم اُس سے دور رہو لوگ اُس سے کہتے تے
وہ میرا سچ ہے بہت چیخ کر بتاتی تھی!
اور اب میں خوش ہوں
کہ اُس رنگ کے حصار میں ہوں
وہ رنگ! جس کا پتا وہ مجھے بتاتی تھی
میں کچھ بتا نہیں سکتا وہ میری کیا تھی علی

کہ اس کو دیکھ کے بس اپنی یاد آتی تھی

علی زریون......

یادِ ماں

یاد ہے ماں
عید پہ شیشہ دیکھ رہی تھی
ہاتھ سے چھوٹا، ٹوٹ گیا
تو زرد ہوئی تھی
آج یہ جانا کیوں سہمی تھی

یاد ہے ماں
جب دور دیس کے شاہزادے پہ پہلی پہلی نظم لکھی تھی
تجھے سنائی
تو نے کہا تھا
لمبے بالوں والی وہ شاہزادی دنیا کے جنگل میں گم ہے
اتنا کہا اور چپ تانی
تو کھوسی گئی تھی
آج یہ جانا کیوں کھوئی تھی

یاد ہے ماں
اپنی سکھی کے گڈے سے جب اپنی گڑیا کی شادی طے
کر آئی
تجھے بتلایا
تو نے زور سے سینے میں بھینچا
اور رو دی تھی
آج یہ جانا کیوں روئی تھی

یاد ہے ماں
سرکار بری پر دیا جلاتے
تیری نیلگوں آنکھیں کھل کے روئی تھیں
تو نے سرگوشی میں جانے کیا کیا بولا
تیری خاموشی نے کتنی باتیں کی تھیں
تیز ہوا کا اک جھونکا جو کرایا تو وجد میں آئی
اور بولی
ہجر وجود میں بسا ہوا ہے
اس جملے کا مطلب کیا ہے
آج سمجھ میں آیا ہے
یاد ہے ماں سونے کے بالے
تیرے کانوں جھولتے کتنے پیارے لگتے
میری ایک خوشی کے صدقے
جانے کس کو دے آئی تھی
آج بھی ان کا عکس سنہری
آنکھیں خالی کر جاتا ہے
آج یہ جانا کہاں گئے وہ

یاد ہے ماں
سب کہتے تھے
چھوٹی والی تیرے جیسی لگتی ہے
تو تڑپ کے میرا ماتھا چوم کے یہ کہتی
میری پری، تیرا بخت ہمیشہ سبز رہے
اب بھی، کیوں کہتی تھی

رابعہ بصری......

غزل

دشتِ مجنوں میں کہاں خاک اُڑائی سے کیا
ہم نے آغازِ محبت بھی خدائی سے کیا
ہم وہ سادہ تھے کہ جب عشق کی توفیق ہوئی
دشتِ وحشت میں ظہور آبلہ پائی سے کیا
یہ جو ہر موڑ پہ آنکھوں میں بھنور بنتے ہیں
اِس کا مطلب ہے سفر گریہ کشائی سے کیا
کارِ مشکل تھا مگر یار پہ تہمت نہ دھری
دل نے یہ ہجر بڑی صنعِ صفائی سے کیا
چشمِ نم ناک میں ممنون رہوں گا تیرا
تُو نے اِس دشت کو شاداب ترائی سے کیا
بھیک میں پائی نہیں ہم نے یہ شہرت ساری
شعر آباد بھی زخموں کی کمائی سے کیا
عشق اَلحمد سے والناس تلک کا رستہ
دل نے آغاز تری حمد سرائی سے کیا

میثم علی آغا......

غزل

میں پیکرِ ملال ہوں پاگل کہو مجھے
میں برگِ پائمال ہوں پاگل کہو مجھے
مجنوں کا ہم خیال ہوں صحرا نواں ہوں
لیلیٰ کے دل کا حال ہوں پاگل کہو مجھے
تہذیب جس نے کر دیا انسان کو نڈھال
اس کے لیے وبال ہوں پاگل کہو مجھے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

فیشن پرستیوں کی ہے یا خار ہر طرف
اس کے لیے میں ڈھال ہوں پاگل کہو مجھے
تہذیب تو میں عظمت انسان کو کیا ہوا
میں پیکر سوال ہوں پاگل کہو مجھے
سچ کہہ کر میں نے ہاتھ میں زہراب لے لیا
سقراط کی مثال ہوں پاگل کہو مجھے
جس نے کیا ہے چاک گریباں رفو قمر
وہ صاحب کمال ہوں پاگل کہو مجھے
ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

ہاتھ پاؤں یہ بتاتے ہیں کہ مزدور ہوں میں
اور ملبوس بھی کہتا ہے کہ مجبور ہوں میں
فخر کرتا ہوں کہ کھاتا ہوں فقط رزق حلال
اپنے اس وصف قلندر پہ تو مغرور ہوں میں
سال تو سارا ہی گمنامی میں کٹ جاتا ہے
بس یکم مئی کو یہ لگتا ہے کہ مشہور ہوں میں
بات سنتا نہیں میری کوئی ایوانوں میں
سب کے منشور میں گو صاحب منشور ہوں میں
اپنے بچوں کو بچا سکتا نہیں فاقوں سے
ان کو تعلیم دلانے سے بھی معذور ہوں میں
پیٹ بھر دیتا ہے حاکم میرا تقریروں سے
اس کی اس طفل تسلی سے تو رنجور ہوں میں
یوم مزدور ہے چھٹی ہے میرا فاقہ ہے
پھر بھی یہ دن تو مناؤں گا کہ مزدور ہوں میں
مجھ کو پردیس لیے پھرتی ہے روزی واصف
اپنے بچوں سے بہت دور بہت دور ہوں میں
ملک جواد نواز......ڈی آئی خان

غزل

خوابوں کی تعبیر کو پانا چاہوں گی
میں تیری تصویر کو پانا چاہوں گی
تیری یادیں بھی ملکیت ہیں میری
میں ایسی جاگیر کو پانا چاہوں گی
ساری عمر گزاروں تیرے پہلو میں
پاؤں کی زنجیر کو پانا چاہوں گی
میرے جذبوں میں تم آتے رہتے ہو
جذبوں کی تحریر کو پانا چاہتا چاہوں گی
تیرے لفظوں میں ایسی کھو جاؤں
میں ایسی تاثیر کو پانا چاہوں گی
میر کے جیسی غزلیں کاش میں لکھ پاؤں
میں اس دور کے میر کو پانا چاہوں گی
فریدہ فری......لاہور

غزل

کیا خوب دن تھے جب تجھے دیکھا کرتے تھے ہم
ہر گھڑی تجھ سے لطف اٹھایا کرتے تھے ہم
حسین خوابوں میں جب سو جاتے تھے کبھی
بڑی مشکل سے دل کو جگایا کرتے تھے ہم
تیری آنکھوں کو بس تکتے ہی رہتے تھے
گھنٹوں نہ پلک جھپکایا کرتے تھے ہم
تیرے دل میں گھر تھا تیرے ہونٹوں پر عبور
تجھے خوابوں میں اپنے ہی سلایا کرتے تھے ہم
چپ چپ میں ہی ہزاروں باتیں ہو جاتیں
جب کبھی پل بھر آنکھ ملایا کرتے تھے ہم
تو بے چین ہوتا اور بے تاب رہ جاتا
جب کبھی رخ بدلایا کرتے تھے ہم
کلیاں بھی، پھول بھی اور بہاریں بھی ناز کرتیں
جب کبھی مل کر مسکرایا کرتے تھے ہم
پھولوں کی اوٹ میں جب چھپ کر بلاتے تھے
یونہی تجھے ستایا کرتے تھے ہم
کیسے اتراتا تھا چمن ہم کو دیکھ کر
جب پھولوں میں بیٹھ کر شرمایا کرتے تھے ہم
تیرا دیدار ہی کافی تھا ہمیں
کبھی ایسے ہی دل بہلایا کرتے تھے ہم
راتوں کو اٹھ کر تم ہمیں یاد کرتے چاند
جب تیرے خوابوں میں آیا کرتے تھے ہم
عامر خان چاند......کوٹ ادو

غزل

کسی سے خبر ہی نہیں پاتا
دل کہیں چین ہی نہیں پاتا
ہو گریباں چاک حسرت رہی
تار تار ہے سی نہیں پاتا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

رستگار ان سے نہیں ممکن
جا کہیں اور بھی نہیں پاتا
دھارتا ہوں روپ گداگر کا
اسے صدا دے ہی نہیں پاتا
دل لگی زشت رو بنا دے گی
رات بھر سو سہی نہیں پاتا
وہ زود رس اجابت تو دور
سامنے ٹھہر بھی نہیں پاتا
ہوں وصل کی بات پہ متذبذب
پر جدا ذرا جی تھیں پاتا
تیر مژگاں مضل پیام ژرف
اک دل سمجھ ہی نہیں پاتا
دیدار ایک پل دور سے ہی
میں اشک سکھا بھی نہیں پاتا
احتساب میرا وہ نہ چاہیں
صبر کا ثمر بھی نہیں پاتا
آس و یاس کا قضیہ رستخیز
کیف فرصت کبھی نہیں پاتا

خرم بیگ کیف......اسلام آباد

تم

تم صبح کی کرنوں جیسی ہو
میں شام کے تارے جیسا ہوں
تم نیلی جھیلوں جیسی ہو
میں سبز کناروں جیسا ہوں
تم برف کے گالوں جیسی ہو
میں ایک شرارے جیسا ہوں
تم اٹھتی لہروں جیسی ہو
میں گرتے دھارے جیسا ہوں
تم پھر بھی میرے جیسی ہو
میں پھر بھی تمہارے جیسا ہوں

شاعر: حسن عباس
انتخاب: پرنس افضل شاہین......بہاولنگر

غزل

نہ گنواؤ ناوک نیم کش، دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تن داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو، صف دشمناں کو خبر ہو
وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر، وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سر کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا
ادھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا سن کے اڑا دیا جو لکھا پڑھ کے مٹا دیا
جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

فیض احمد فیض

محمد احمد رضا انصاری......کوٹ ادو

غزل

ہر مرحلہ شوق سے لہرا کے گزر جا
آثار تلاطم ہوں تو بل کھا کے گزر جا
بہکی ہوئی مخمور گھٹاؤں کی صدا سن
فردوس کی تدبیر کو بہلا کے گزر جا
مایوس ہیں احساس کی الجھی ہوئی راہیں
پائل دل مجبور کی چھنکار کے گزر جا
یزداں دا ہرمن کی حکایات کے بدلے
انسان کی روایات کو دہرا کے گزر جا
کہتی ہیں تجھے میکدہ وقت کی راہیں
بگڑی ہوئی تقدیر کو سمجھا کے گزر جا
بجھتی ہی نہیں تشنگی دل کسی صورت
اے ابر کرم آگ ہی برسا کے گزر جا
کانٹے جو لگیں ہاتھ تو کچھ غم نہیں ساغر
کلیوں کو ہر اک گام پہ بکھرا کے گزر جا

ساغر صدیقی

عبدالجبار رومی انصاری......لاہور

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز

اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی

مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو اس کے کھلونے بنے

بد معاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر...... وہ کسی کا مرید ہوگیا......!!

شاہی محلے کا نمازی بد معاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وہ وہاں بیٹھا اپنی جذباتی ایڈجسٹمنٹ میں مصروف تھا کہ ساون اوپر چلا آیا۔
"جی ہاں......کون سی گتھی سلجھائی جا رہی ہے یہاں بیٹھ کر؟" وہ سامنے والی چارپائی پر آ بیٹھا۔
"ساون میں نے حجاب کی اماں اور بھائی کا ذکر کیا تھا کہ وہ کہیں روپوش ہیں؟" مرشد ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"تو؟"
"تو...... یہ کہ ان دونوں کا کھوج کھرا نکالنا ہے؟"
"کہاں سے؟"
"جہاں سے اور جیسے بھی ہو سکے......اس کے بھائی اسرار اور اسرار کے باقی یاروں سجنوں کے بارے میں جیدے سے معلومات مل جائیں گی۔ رہی بات اس کی اماں کی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تا حال گاؤں ہی میں کہیں روپوش ہو اور اگر گاؤں سے کہیں باہر...... کہیں دور ہے تو اس بارے میں بھی گاؤں ہی سے کوئی کھرا مل سکتا ہے۔"
"ٹھیک ہے...... اسرار پر صبح ہی کام شروع کراتا ہوں البتہ گاؤں کے لیے ایک دو دن لگیں گے۔ کوئی تعلق کوئی رستہ نکالتے ہیں...... کھوج کھرا بھی مل ہی جائے گا، پھر اس کے بعد؟"
"اس کے بعد مجھے ان کی ضرورت پڑے گی۔" مرشد نے سنجیدگی سے کہا۔ ساون نے کندھے اچکا دیئے۔
"ٹھیک ہے......سمجھ گیا۔ کرتے ہیں کوشش۔" چند لمحے مرشد کی سنجیدہ صورت دیکھتے رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔
"اور کچھ؟"
"اور یہ کہ دو دن بعد میں حجاب کے ساتھ بلوچستان جا رہا ہوں۔ اسے اس کی پھوپھی کے ہاں چھوڑنے۔ پیچھے دو دن اماں کی خیر خیریت کی ذمہ داری تیری ہوگی۔"
ساون اس اطلاع پر چونک پڑا۔ مرشد کے خراب موڈ کی وجہ فوراً ہی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی گو کہ مرشد نے ابھی تک حجاب کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اپنی زبان سے کچھ بھی تسلیم نہیں کیا تھا لیکن گزشتہ چند دن میں اس کے طور اطوار چیخ چیخ کر سب کو سمجھا بتا چکے تھے کہ وہ گردن گردن اس لڑکی حجاب کی محبت میں دھنس چکا ہے۔ ہر ہر لمحہ وہ اس کے عشق کے خمار میں مہکتا رہا تھا۔ مسکراتا رہا تھا۔ وہ مہک، وہ مسکراہٹ سبھی سونگھتے دیکھتے رہے تھے۔
"یہ دو دن بعد جانا ضروری ہے کیا؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ساون نے استفسار کیا۔
"ہاں میں نے اسے وہاں تک پہنچانے کا وعدہ کر رکھا ہے اس سے۔"
"تو کیا ہوا......وعدہ کچھ دن بعد نبھا لینا۔ ابھی کچھ دن اسے یہاں آرام کرنے دو۔ اس کے دشمن بھی مکمل طور پر خاموش ہیں۔ چند دن مزید ان کے ردعمل کا انتظار کر لیا جائے تو بہتر ہوگا۔"
"چند دن بعد بھی تو یہی کرنا ہے۔ پھر چند دن کا انتظار کیوں؟" مرشد کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ وہ جیسے ساون کو جواب نہیں، خود کو جواز دے رہا تھا۔ قائل کر رہا تھا کہ خود کو۔
"نظر آ رہا ہے کہ تمہیں اس سفر کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونے میں کچھ دن لگیں گے۔" ساون کی اس خیال آرائی پر مرشد نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور ہلکے سے مسکرا دیا۔
"اماں کا آرڈر ہے۔ دو دن...... مجھے ہر صورت نکلنا ہوگا۔" اماں کا ذکر آتے ہی ساون کو چپ لگ گئی۔
دوسرے روز صبح صبح اس کی ملاقات لالا رستم سے ہوئی۔ وہ خود ہی بیٹھک پر آیا تھا۔ ایسے ہی دس پندرہ منٹ کے لیے۔ اسی سے مرشد کو معلوم ہوا کہ وہ باری باری رانا سرفراز اور چوہدری اکبر علی کو مل چکا ہے۔ کچھ بارسوخ شخصیات کو ملوث کر کے لالا نے ان دونوں کے ساتھ جس طرح معاملات طے کیے تھے۔ اس سے لالا کو کافی حد تک اس بات کا اعتبار تھا کہ اب ان میں سے کوئی براہ راست تو مرشد سے نہیں الجھے گا۔ ساتھ ہی اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ وہ دونوں کمینہ خصلت انسان ہیں۔ اس لیے پس پردہ رہتے ہوئے نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ وہ مرشد کو یہی مشورہ دینے آیا تھا کہ وہ فی الوقت محتاط رہے۔ مرشد پہلے ہی محتاط تھا۔ پسٹل ہر وقت اس کی ڈب میں رہتا تھا۔ آٹھ دس مسلح افراد ہر وقت ادھر ادھر موجود رہتے تھے۔ جعفر اور دلشاد مستقل طور پر مکان کے دالان میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ سب اپنی اپنی جگہ محتاط اور چوکنے رہ کر ہی وقت گزار رہے تھے۔ کل شام تک وقت گزرتا بھی بہت

اچھے سے رہا تھا۔ لیکن اب.....اب وقت گزارنا مرشد کے لیے تو دوبھر ہو چکا تھا۔ اس نے اماں کے حکم پر سر تسلیم خم کر لیا تھا۔ روانہ ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی ہو گیا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے رگ و پے میں ایک شدید اضطراب کھول اٹھا تھا۔ اس کے پاس پرسوں صبح تک کا وقت تھا اور جیسے جیسے وقت سرکتا گیا۔ مرشد کے اس اضطراب میں مزید شدت آتی گئی۔ کوئی تھا جو اس کے اندر اس کی روانگی کے فیصلے سے اختلاف برت رہا تھا۔ اس دو دن والے پروگرام کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔ اماں نے جس دوٹوک اور حتمی لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا اس کے بعد مرشد مزید کسی بات کی گنجائش نہیں سمجھتا تھا۔ اسے کچھ کچھ یہ شبہ بھی تھا کہ ہو نہ ہو دوسرے دوست ساتھیوں کی طرح اماں کو بھی اس کی جذباتی حالت کا اندازہ ہو گیا ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ یہ سلسلہ مزید طوالت اختیار کرے۔ لہٰذا اب وہ فوری طور پر حجاب کو اس کے وارثوں تک پہنچا دینا چاہتی ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اماں کا یہ فیصلہ، یہ حکم کوئی ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ اب نہیں تو چند دن بعد وہ خود بھی ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا مگر اس کا دل سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔

اگلے روز شام تک مرشد صحیح معنوں میں اس مصرعے کی تفسیر بن چکا تھا۔

"الٹی پڑ گئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔"

حجاب اور اس سے ہمیشہ کے لیے جدائی کے خیال کو وہ لمحہ بھر کے لیے بھی نظر انداز نہیں کر پایا تھا۔ کل شام کے بعد سے وہ دوبارہ اماں کی طرف بھی نہیں گیا تھا۔ حالانکہ اس کے اندر ایک بھونچال کی کیفیت تھی۔ اس کا دل بار بار چیختا رہا تھا کہ جا کے صاف صاف حجاب اور اماں دونوں سے کہہ دے کہ وہ اسے کہیں چھوڑنے نہیں جائے گا۔ نہ ہی اسے کہیں جانے کی ضرورت ہے۔ اس کے ہر اچھے برے نفع نقصان اور دکھ سکھ کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ ہمیشہ کی بنیادوں پر۔ ہر دم، ہر قدم خیال رکھوں گا۔ کہیں جانے کی بجائے یہ بس یہیں رہ جائے۔ پورے مان اعتماد اور یقین و بھروسے کے ساتھ...... مستقل بنیادوں پر۔"

ایسا کر گزرنے کی شدید خواہش کے باوجود اس نے خود پر قابو رکھا تھا۔ نہیں گیا تھا اماں کی طرف اور آج بھی اس کا ادھر جانے کا ارادہ نہیں تھا کہ مبادا جذبات کی اس یورش میں بے خود ہو کر ایسی کوئی بے ہودہ گوئی کر ہی نہ گزرے۔

اگلے روز ان سب کے زخموں سے ٹانکے کھل گئے۔ حجاب کے سر سے بھی اور مرشد کے سینے سے بھی ٹانکے کھل گئے تھے۔ مگر مرشد کے اس زخم میں ایک جلن سی بیدار ہو آئی تھی۔ دل کے قریب.....سینے کے جس حصے پر وہ زخم موجود تھا۔ وہاں صبح سے ایک آنچ اندر اس کے سینے میں اتر رہی تھی لمحہ بہ لمحہ اس کے سینے میں ایک حبس کا احساس جگا رہی تھی۔

وہ رات مرشد نے چھت پر بیٹھ کر اکیلے شراب پیتے ہوئے گزاری۔ ساون اور مراد لوگوں نے اس کی تنہائی میں مخل ہونا چاہا تو مرشد نے انہیں واپس نیچے بھیج دیا۔

ساری رات شراب نوشی کے بعد وہ اگلے روز دن چڑھے بے سدھ ہو کر بے ہوشی جیسی نیند سو گیا۔ وہ جو جاگتے میں ہر پل دکھائی دیتی تھی بے ہوشی جیسی نیند میں بھی رہ رہ کر اپنی جھلک دکھاتی رہی۔

اماں کے کمرے میں جائے نماز پر بیٹھی تھی کہ اچانک کھیتوں کی ایک پگڈنڈی پر بے سدھ پڑی دکھائی دی۔ مرشد نے جھک کر اس کے ریشم جیسے وجود کو بازوؤں میں اٹھایا ہی تھا کہ وہ دوبارہ سے اماں کے کمرے میں دکھائی دی۔ ڈری سہمی وحشت زدہ۔ آنکھوں میں خوف کا ایک جہان لیے اس کی بائیں آنکھ کے قریب ایک نیلگوں نشان تھا اور اس کے انگور جیسے ہونٹوں کا ایک گوشہ بھی ورم زدہ تھا۔ اس کی اس ہیئت و حالت پر گہری نیند میں بھی اس نے اپنے دل میں دکھ کی لہر سی اترتی محسوس کی.....وہ اس کے سر کا زخم صاف کر رہی تھی.....اس کا ہاتھ تھامے دوڑ رہی تھی۔ اس کا سر اور چہرہ خون میں لت پت تھا اور مرشد اسے بازوؤں میں اٹھائے اماں کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ چہرے کے گرد دوپٹہ لپیٹے بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی۔ اپنی شفاف چمکدار آنکھوں میں نمی لیے اسے تک رہی تھی..... وہ ایک آنسو تھا۔ اس کی پلکوں سے ٹوٹنے والا موتی، جو اس کے گال پر روشنی نچھاور کرتا ہوا اس کی خوب صورت ٹھوڑی کی طرف اتر گیا تھا۔

اس روز اس نے کوئی نماز بھی نہیں پڑھی۔ عصر کے بعد

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بیدار ہوا اور یونہی اٹھ کر باہر نکل گیا۔ بہت دیر تک یونہی بے مقصد ادھر ادھر پھرتا رہا۔ اندر کی بے چینی اور اضطراب کو فریب دینے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ مغرب کے بعد واپس پلٹا اور پھر سے شراب کی بوتل اٹھا کر چھت پر جا پہنچا۔

اس کے ساتھی کل سے اس کی یہ حالت دیکھ رہے تھے لیکن چونکہ مزاج آشنا تھے، تیور سمجھتے تھے اس لیے سبھی محتاط تھے۔ حسن آرا کے دیئے گئے وقت کے مطابق صرف کل صبح تک کا وقت باقی تھا۔ کل انہیں ادھر سے روانہ ہونا تھا۔ یعنی حجاب کی آج یہاں آخری رات تھی۔ اس کے بعد اسے دوبارہ پھر کبھی بھی یہاں نہیں ہونا تھا آج کے بعد یہاں کی فضا نے اس کی سانسوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جانا تھا۔ آگے آنے والی کوئی بھی رات آج سی نہیں رہنی تھی۔ ہر آنے والی رات میں ایک کمی ایک ادھورا پن رہنا تھا...... ہمیشہ۔

وہ چھت پر بیٹھا گھونٹ گھونٹ آتشیں سیال اپنے حلق میں انڈیلتا رہا۔ عشاء کی اذانیں ہو گزریں۔ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اردگرد معمول کی آوازیں بے دار ہونا شروع ہو گئیں۔ حجاب کا خیال دھندلایا نہ شراب نے ڈھنگ سے اپنا اثر دکھایا۔

حجاب کو پہلی بار اماں کے کمرے میں جائے نماز پر بیٹھا ہوا دیکھنے کے بعد روز بہ روز وہ اس کے اعصاب پر حاوی ہوتی چلی گئی تھی۔ کچھ نئے اور منہ زور جذبات بتدریج نمودار ہوئے تھے اور مرشد نے ان کے سامنے چند دن کی شدید مزاحمت کے بعد پوری دیانت داری سے ان کی ناقابل تسخیر قوت کو تسلیم کرتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ پھر جو وقت ان کا دھوپ سڑی کی ہنگامہ خیزیوں میں گزرا اس نے مرشد کے سینے میں اس معصوم اور من موہنی لڑکی کے لیے اپنائیت کا ایک سمندر بیدار کر دیا۔ وہ اس کے لیے اس قدر اپنائیت محسوس کرنے لگا تھا کہ اب وہ اسے اپنے ہی وجود کا ایک حصہ محسوس ہونے لگی تھی۔ چند روز کی ادھوری واقفیت کے پس پردہ صدیوں کی آشنائی محسوس ہوتی تھی۔ ایک ایسی پراسرار آشنائی جس نے آشکار ہوتے ہی ایک سحر پھونک دیا تھا۔ محلے کے مکانوں چوباروں اور جھروکوں پر اترنے والی سورج کی روشنی کچھ اور چمک دار اور نکھری نکھری دکھائی دینے لگی تھی۔ گلیوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے لوگ کچھ اور زندہ اور جان دار ہو گئے تھے۔ ہواؤں کے لمس میں بھی ایک بھرپور آشنائی گھل آئی تھی۔ فضا ایک خوشبو میں ڈھل گئی تھی۔ ہر آواز میں ایک موسیقی، ایک دلکشی تھی۔ وہ اپنی رگوں میں دوڑتے لہو کے ارتعاش سے پھوٹتے خمار کو محسوس کرنے لگا تھا آسمان کچھ مزید روشن مزید کشادہ اور کچھ مزید مہربان لگنے لگا تھا۔

اس چند روزہ مست آسودہ حالی کے بعد اب ایک نئی اندرونی تبدیلی اسے اپنا تعارف دے رہی تھی..... شاید وہی اطمینان و آسودگی ایک گہری بے قراری اور کرب میں تبدیل ہو آئی تھی۔ حجاب کو خود سے جدا کرنے، دور کر دینے کا خیال غیر متوقع طور پر اسے زیادہ ہی دکھ اور تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔

سیڑھیوں کی طرف سے سنائی دینے والی آوازوں پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ساون اور مراد اوپر آ رہے تھے۔ دونوں کسی بات پر آپس میں بحث کر رہے تھے۔ اوپر آ کر وہ مرشد پر کوئی خاص توجہ دیئے بغیر دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے۔ دو گلاس اور دیسی شراب کی بوتل ان کے پاس تھی۔

”ابھی میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی ساونے! لیکن تو دیکھ لینا، ایک دن تو خود مانے گا کہ میں ٹھیک کہتا تھا۔“

”چل اب بک بک بند کر اور بوتل کھول۔“

”اتنی تکلیف کیوں ہو رہی ہے تجھے۔ تو نے کیا اس سے شادی کرنی ہے۔ ایسے خوامخواہ کا ٹوپی ڈرامہ۔“ مراد نے سر جھٹکا اور بوتل گلاس تپائی پر سجاتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بظاہر وہ مرشد کی طرف سے بے پروائی کا مظاہرہ کر رہے تھے لیکن مرشد جانتا تھا کہ وہ دراصل اوپر آئے ہی اس کی وجہ سے ہیں۔

”مجھے تکلیف ہو رہی ہے یا نہیں۔ تجھے کس بات کی اتنی پریشانی ہے تو نے بہن کو جہیز تیار کر کے دینا ہے کیا؟“

”اوئے لمب دین! مجھے تیری طرف سے پریشانی ہوتی ہے..... تو اگر اس گلابو کے دوپٹے کے نیچے آ گیا تو تیرا حال بھی موالی ملنگ جیسا ہو جانا ہے۔ مارا مارا پھرے گا روڑیوں اور سڑکوں پر۔“

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''اور تجھے پریشانی ہے کہ اس سے تیرا رستہ کھوٹا ہوگا۔ لعنتی نہ ہو تو..... مرشد صحیح تجھے مردار خان کہتا ہے۔''

''مرشد کی بات چھوڑ۔ اسے نہ درمیان میں لا..... ویسے بھی آج کل اس کے پاس وقت نہیں ہے کسی فضول قصے میں پڑنے کا۔ اس کا کام پہلے ہی ہو چکا ہے۔'' مراد نے دزدیدہ نظروں سے مرشد کی طرف دیکھتے ہوئے ایک گلاس اٹھا کر ساون کو تھمایا اور دوسرا خود اٹھا لیا۔

''ساون میں نے تمہارے ذمے کچھ کام لگایا تھا؟'' مرشد کی سنجیدہ آواز پر وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''وہ اسرار اور اس کی اماں والا..... چھیڑ چھاڑ تو کی ہے مگر ابھی تک کوئی تسلی بخش بات سامنے نہیں آ گئی۔ فی الحال جتنے لوگوں تک رسائی ہوئی ہے وہ سب مکمل طور پر ان دونوں کی طرف سے بے خبر ہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ دونوں کہاں اور کس حال میں ہیں۔ ہیں بھی یا نہیں؟''

''ان کے پڑوسیوں کو خصوصاً چیک کرو اور کسی وقت خالہ اقبال سے پتا معلوم کرو..... ڈسکہ میں ان کے رشتے دار رہتے ہیں۔ ان کو بھی اچھی طرح ٹٹولو۔ اس کے علاوہ کل حاجی والی جیپ تیار کر لو۔ میں کل رات حجاب کے ساتھ ادھر سے بلوچستان کے لیے نکلوں گا۔''

''اور کون ہوگا ساتھ؟'' ساون نے بغور اس کی صورت دیکھی۔

''وہ کل دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو دن میں تم جیپ تیار کرو پہلے۔''

''جیپ تیار'' کرنے سے مرشد کی کیا مراد تھی یہ ساون اور جعفر دونوں بخوبی جانتے تھے دو چار بار وہ رستم لہوری کے اراضی قبضوں کے جھگڑوں کے لیے نکلے تھے اور ایسے میں جیپ پہلے سے تیار کی جاتی تھی۔ اس میں اسلحہ اور ہتھیار چھپائے جاتے تھے۔

''میں تو کہتا ہوں بلوچستان نہ ہی جاؤ۔'' مراد نے شراب کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے مرشد کی طرف دیکھا۔

''اس لڑکی کو وہاں پہنچانے کے بجائے یہیں خالہ ہی کے پاس رہنے دو تو بہتر ہوگا۔'' مراد نے اس کے دل کی بات کہی تھی۔ لیکن یہ مرشد کے لیے قابل عمل نہیں تھی۔ اس نے گلاس خالی کرتے ہوئے سامنے بیچ پر رکھا اور بولا۔

''نہیں مراد وہ کسی اور دنیا کی رہنے والی ہے۔ اس دلدل میں تو حادثاتی طور پر آ گری ہے۔ یہ جگہ اس کے رہنے کی نہیں ہے اور وہ یہاں رہ بھی نہیں سکے گی۔''

''اور اگر وہ وہاں..... بلوچستان میں بھی نہ رہ سکی تو؟''

''مطلب؟'' مرشد نے بھویں اچکا کر اسے دیکھا۔

''مہینہ ہونے والا ہے اسے غائب ہوئے۔ وہ لوگ اس کے قریبی سگے والے تو ہیں نہیں۔ اگر انہوں نے اسے قبول ہی نہ کیا تو..... اور بالفرض قبول کر لیا تو آنے والے وقتوں میں اس کے ساتھ ان کا رویہ کیا ہوگا۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ یہ اب اس گھرانے میں کھپ سکے گی۔'' مرشد خاموشی سے اس کی صورت دیکھے گیا۔ اسے یاد آیا کہ اماں نے ذکر کیا تھا کہ وہ حجاب کا ہونے والا سسرال بھی ہے۔ ایسے میں حجاب کا اتنے روز تک مسلسل لاپتہ رہنے والا پہلو کچھ مزید حساس نوعیت اختیار کر جاتا تھا۔

''میرا تو خیال ہے کہ اس حوالے سے تجھے خالہ کے ساتھ بات کرنی چاہیے۔ اس کے جو اصل اپنے ہیں ان میں سے اس کا ایک بھائی اور اماں تو زندہ ہیں نا! ہم مزید شدومد سے ان دونوں کو تلاش کرتے ہیں۔ تب تک یہ لڑکی خالہ کے پاس رہے۔ بھائی اور اماں کے مل جانے کے بعد یہیں کہیں ان کو آباد کر دیں گے..... اپنی حفاظت اور نگرانی میں۔'' مراد نے اپنے تئیں اس کی تمام الجھنوں اور اذیتوں کا ایک سیدھا سادہ ساحل پیش کر دیا تھا لیکن مرشد کو اماں کا انداز اس کے تیور یاد تھے۔

''نہیں..... اماں نہیں مانیں گی اور ویسے بھی میں اماں کے حکم کے سامنے زبان نہیں چلانا چاہتا۔ انہوں نے آج تک صرف اذیت اور دکھ ہی تو جیا ہے۔ میں ان کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔'' اس کے لہجے میں بے بسی اور اضطراب کی ہلچل سی کسمسائی۔ وہ پھر سے بوتل اور گلاس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اس صورت میں پھر ہمارا مرشد تو شراب پی پی کر ہی ختم ہو جائے گا۔'' مراد کے معنی خیز جملے پر مرشد خاموش رہا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔

''اور آج پہلی دفعہ صاحب بہادر نے ایک بھی نماز نہیں پڑی۔ دونوں باتیں ہی تشویش ناک ہیں۔'' ساون

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے کہا۔

مرشد کی رگوں میں دوڑتی بے چینی میں کچھ مزید شدت آ گئی۔ آج واقعی پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے ایک بھی نماز ادا نہیں کی تھی۔ ادا کر ہی نہیں پایا تھا۔ فجر کی نماز کے لیے وہ مصلے پر کھڑا ہوا تھا اور کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کے اندر حجاب کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

''اللہ اکبر۔'' اس نے تکبیر پڑھ کر ہاتھ باندھے تھے کہ کسی طرف سے اسے حجاب نے پکارا۔

''مرشد جی!'' اس کا دل دھڑکنے کی تمیز بھول گیا تھا۔ مصلے پر سجدے کی جگہ دوپٹے کے ہالے میں گھرا حجاب کا روشن چہرہ چمک رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو وہ سراپا اس کی آنکھوں کے اندر آ بیٹھی۔ ڈری گھبرائی سی سکڑی سمٹی ہوئی۔

''وہ...... وہ آپ مجھے دیکھتے ایسے ہیں کہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔'' اس نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں اور کھڑے پاؤں مصلے سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ اس انکشاف پر پریشان ہو کر رہ گیا تھا کہ وہ حجاب کو نظر انداز کر کے نماز تک ادا نہیں کر سکتا۔ مراد ساون کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ اب کسی اور نماز کی تیاری میں ہے۔ مصلے والی نمازیں پوری ہو چکیں۔ اب ادھر یار جی والی نمازوں کی تیاری چل رہی ہے۔''

''میں نماز کا رہا نہیں۔'' مرشد نے خالی خالی نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''یہ تو سامنے ہی کی بات ہے۔ ہم سب کو یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ اگر تیری صورت حال آگے بھی ایسی ہی رہی تو تو کسی کام کا بھی نہیں رہے گا۔''

''مرشد! کیا تمہیں نہیں لگتا کہ تم کچھ زیادہ ہی سنجیدگی سے ملوث ہو رہے ہو اس سب میں؟'' ساون نے بغور اس کے وحشت زدہ سے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے محتاط انداز میں سوال کیا۔ مرشد اسی طرح خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''پتہ نہیں۔''

''اور تمہاری یہ بات اور بھی زیادہ تشویش ناک ہے۔''

''ہاں شاید۔''

''تو پھر کیا حل سوچا ہے اس سب کا؟''

''کچھ نہیں۔''

''وجہ؟''

مرشد خاموش رہا۔ ساون اور مراد دونوں سنجیدہ اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مرشد چونکہ اب تک اپنی ان نئی جذباتی الجھنوں اور اذیتوں کے حوالے سے بات چیت کرنے سے سخت گریز برتتا آیا تھا۔ لہٰذا اس وقت بھی وہ بات کرنے میں قدرے احتیاط برت رہے تھے۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ اردگرد کی فضا میں سازو آواز کی مخصوص آوازیں لہرا رہی تھیں۔ ڈوب ابھر رہی تھیں۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد مرشد نے شراب کا ایک اور تلخ گھونٹ حلق میں انڈیلا اور قدرے سیدھا ہو بیٹھا۔ شراب کی حدت نے اس کا چہرہ دہکا رکھا تھا۔ شام ہی سے تو پی رہا تھا، البتہ ابھی تک اس کی زبان میں لڑکھڑاہٹ نہیں آئی تھی۔

''میں کچھ انوکھے تجربوں سے آشنا ہوا ہوں۔ بہت تھوڑے سے وقت میں زندگی بہت مختلف انداز میں کھلی ہے مجھ پر...... ہم دو دنیاؤں کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک دنیا میں ہم زندگی بھر بہت کچھ کرتے ہیں اور دوسری دنیا میں زندگی بھر ہمارے ساتھ بہت کچھ ہوتا ہے۔ خود بخود قدرتی طور پر...... ہمارا وہاں کوئی زور، کوئی بس نہیں چلتا۔ ہمیں بس چپ چاپ خاموشی سے وہ سب جینا ہوتا ہے۔ بھوگنا ہوتا ہے۔'' ساون اور مراد حیران نظروں سے ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر رہ گئے۔

''جو ہوا خود بخود ہوا، جو ہو رہا ہے خود بخود ہو رہا ہے۔ میری کسی خواہش یا کوشش کا تو کوئی عمل دخل ہی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے میرے جہان احساس میں قدرت کوئی کھیل کھیل رہی ہے۔ پتا نہیں کیوں!'' چند لمحے سر جھکائے بیٹھے رہنے کے بعد وہ ساون اور مراد کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

''ساون...... مراد! حجاب چند ہی روز میں اماں کو از حد عزیز ہو گئی تھی...... میں سمجھتا ہوں کہ ان لمحوں مجھے وہ اماں سے بھی کئی گنا بڑھ کر عزیز ہے۔ پتا نہیں کیا ہے اس میں ایسا، لیکن یہ حقیقت واضح جان لو کہ میں اس کے لیے ایسی اپنائیت محسوس کرتا ہوں کہ جیسے وہ میری اپنی ہی ذات کا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دوسرا حصہ ہو۔ میں نہیں جانتا کہ آگے کیا ہوگا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے خود سے دور کردینے کے بعد میں آدھا رہ جاؤں گا..... شاید ہمیشہ کے لیے.....“

اس کے لہجے میں سمٹ آنے والے کرب نے ان دونوں کو مزید فکر و پریشانی میں مبتلا کردیا۔ مرشد کے لب و لہجے کے پیچھے جس منہ زور جذبے کی موجودگی کا احساس انہیں اب ہو رہا تھا۔ وہ ان کی توقع سے زیادہ طاقت ور اور مضبوط تھا۔ اس جذبے کی اصل منہ زوری اور طاقت تو صرف مرشد پر ہی آشکار تھی۔ اسی کے حواس اور اعصاب تھے جو مسلسل ایک شکست ریخت کا شکار تھے۔ ایک جان لیوا کشمکش، رگیں چٹخا دینے والا اضطراب اور حجاب کے تصور کی طرف ہمک ہمک کر پھڑ پھڑاتا ہوا دل۔ جیسے جیسے رات گزرتی گئی اس کے دل کی پھڑ پھڑاہٹیں بڑھتی گئیں۔

سحری کے وقت وہ چھت سے اتر کر باہر گلی میں آ گیا۔ پوری گلی میں خاموشی تھی۔ سناٹا تھا۔ بس ایک طرف موالی ملنگ ایک بند دوکان کے سامنے ٹہل رہا تھا اور کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ مرشد قصائی والے پھٹے پر جا بیٹھا۔ یہاں سے سامنے ہی چوبارے کی سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں پر قادرا اور جمشیدا بیٹھے دکھائی دے رہے تھے اور چوبارے پر اماں کا کمرہ تھا اور اس کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اندر اندھیرا تھا۔ مرشد وہیں بیٹھے بیٹھے دیکھ سن رہا تھا کہ اندر کمرے کے اندھیرے میں چھت والے پنکھے کی گھڑ گھڑ گونج رہی ہے۔ اماں فرشی بستر پر پڑی سو رہی ہے اور پلنگ پر حجاب مدہوش پڑی ہے۔ اس کی بے چینیوں اور بے قراریوں سے مکمل طور پر بے خبر..... غافل۔ مرشد کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مضمحل سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”الو کی دم..... پینڈو لڑکی۔“

وہ لاڈ بھرے لہجے میں بڑبڑایا تھا۔ دن چڑھے تک وہ جیسے پل صراط پر ٹہلتا رہا۔ دن تقریباً نو بجے کے قریب اس کے اندر کا انتشار سمٹنا شروع ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ اس کی اماں اپنے کہے کی لاج میں حجاب کو لے کر یہاں سے نکلتی مرشد کو اس کے حضور پیش ہونا تھا۔ پھر دس بجے کے قریب جب وہ نہا دھو کر اماں کی طرف جانے کے لیے نکلا تو اس وقت تک اس کا تمام ذہنی انتشار ایک کنارے لگ چکا تھا۔ امکانات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے کچھ حتمی فیصلے کر لیے تھے اور اب بڑی حد تک ان فیصلوں کی بناء پر مطمئن بھی تھا۔

وہ ایک شیشے کی طرح چمکیلا دن تھا۔ دھوپ میں خاصی تپش محسوس ہوتی تھی۔ مرشد چوبارے پر پہنچ کر پانچ سات منٹ دالان میں جعفر اور دلشاد کے ساتھ بیٹھا رہا پھر اٹھ کر اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جس وقت وہ دروازے سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت کمرے میں صرف حجاب موجود تھی۔ اس نے مرشد ہی کا لایا ہوا ایک ریڈی میڈ سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ سفید اور سبز دھاریوں والا یہ ریشمی سوٹ اور سفید دوپٹہ مرشد نے ایک نظر دیکھ کر ہی پسند کر لیا تھا اور اس وقت اس کی یہی پسند حجاب کے بدن پر تھی۔

حجاب کی دروازے کی طرف پشت تھی۔ وہ سامنے ہی گھٹنے فرش پر ٹکائے بیٹھی اماں کے بستر کی چادر درست کر رہی تھی۔ غالباً ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس نے غسل کیا تھا۔ دوپٹے کے نیچے اس کی کمر پر پھیلے ہوئے اس کے ریشمی بالوں میں نمی تھی۔ اس نمی نے کمر سے اس کی قمیص کو بھی نم کر رکھا تھا۔ مرشد کو یکایک محسوس ہوا کہ پورے کمرے کی فضا بھیگی عود کی مسحور کن خوشبو سے بھری ہوئی ہے۔

اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کے احساس پر ہی اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ مرشد کے مخصوص بے باک اور والہانہ انداز نظر کو اپنی ہی جانب مائل پا کر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ دل میں اچانک ہی ایک حیا انگیز گھبراہٹ دھڑک اٹھی تھی۔

”اماں کدھر ہیں؟“

”وہ نہا رہی ہیں۔“

مرشد کے سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ پیچھے ہٹ کر پلنگ پر ٹک گئی۔ مرشد کی نظروں کا نرم لمس بدستور اسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہا تھا۔ پلنگ کی پائنتی کے قریب ایک ٹرنک اور دو بیگ پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ دو فٹ کا وہ ٹرنک جس پر ہرا رنگ پھرا ہوا تھا خاصا پرانا تھا مگر مضبوط ہونے کے باعث ابھی تک ٹھیک ٹھاک حالت میں تھا۔ اماں نے شاید اسے خالی کر کے اس میں حجاب کا سامان، اس کی ضرورت کی چیزیں بھر دی تھیں یعنی وہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پیکنگ مکمل کر چکی تھیں۔

چند لمحے دروازے میں کھڑے رہنے کے بعد وہ بائیں طرف کونے میں موجود سنگھار میز کے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"اچھا تو پھر اب کیا پروگرام ہے تیرا؟" وہ متفسر ہوا تھا۔

"وہ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ مجھے خالہ نے کہا ہے کہ آج آپ مجھے پھوپھو کے ہاں چھوڑ آئیں گے۔"

"تو سچ میں ادھر جانا چاہتی ہے؟"

"جی جانا تو چاہتی ہوں۔ میرے لیے اب وہی ایک جگہ بچی ہے۔"

"اور اگر ادھر نہ جائے تو کیا نقصان ہوگا تیرا؟"

"ماموں خالہ کے ہاں نہیں جا سکتی۔ وہ مجھے پناہ دے بھی نہیں سکتے۔ ان کے بعد بس پھوپھو ہی کا گھر بچ جاتا ہے اور شاید..... اسرار بھی وہیں ہو۔" وہ اس طرح نظریں جھکائے جھکائے بولی۔ ایک دکھ، ایک حسرت ویاس کی تحریر تو مرشد شروع دن سے ہی اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ البتہ چند روز پہلے والی نقاہت اب اس کے چہرے سے رخصت ہو چکی تھی۔

"وہاں تو سکون سے رہ تو لے گی نا...... پریشان تو نہیں ہوگی ادھر؟" اسے خود ٹھیک سے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا جاننا چاہتا ہے۔ حجاب کو بھی اس کا سوال تھوڑا عجیب محسوس ہوا۔ سکون کا لفظ اس کے نزدیک اتنا ہی بے معنی اور کھوکھلا تھا۔ اس کے لیے سکون کا کوئی آسرا رہا ہی کب تھا۔ زندگی کے دامن میں بھی پریشانیوں کے سوا اور کیا ہونا تھا اب..... لیکن اس کا جواب اثبات میں تھا۔

"جی۔"

مرشد کچھ کہنے لگا کہ اسی وقت کمرے کے کونے میں موجود دیوار گیر پردے میں حرکت ہوئی اور حسن آرا کمرے میں آ گئی۔ گیلے بال اس نے تولیے میں لپیٹ رکھے تھے۔ اس نے بس ایک نظر مرشد پر ڈالی، جب کہ مرشد بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ حسن آرا کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ آگے آ کر اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

"کس وقت روانہ ہو رہے ہو؟" اس کا لہجہ بالکل ہموار اور بے تاثر تھا۔

"کیا..... کدھر کو؟" اس کے متعجب انداز پر حسن آرا نے تیز نظروں سے اس کی طرف گھورا۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔

"تم کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ نہیں ہوتے جا رہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ہی دن بدن کچھ چڑچڑی اور ضدی ہوتی جا رہی ہیں۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"میرے سٹھیانے میں ابھی بڑی دیر ہے۔ تم چڑاتے ہو تو چڑتی ہوں۔" اس نے تولیہ بالوں سے ہٹا کر کندھے پر ڈالا اور پلنگ کے پائے کے ساتھ دھری تیل کی شیشی اٹھالی۔

"آرام سکون سے کہی ہوئی بات مان لیا کرو تو مجھے کیا ضرورت ہے چڑنے یا ضد کرنے کی..... لیکن تم تو اب جنے جوان ہو چکے ہو۔ ماں کا حکم مانتے ہوئے عزت گھٹتی ہے اب تمہاری۔"

"یہ جھوٹ آپ کس سے بول رہی ہیں؟" حسن آرا نے ہتھیلی پر تیل انڈیلتے ہوئے ناراض نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں تو اور پھر کس لیے اتنے دنوں سے ایک بات کو ٹالتے آ رہے ہو۔ الٹا پچھلے دو دنوں سے شکل گم کر رکھی ہے۔ پلٹ کر دیکھا تک نہیں کہ پیچھے ماں بھی ہے۔" حسن آرا کے لہجے کا قلق بتا رہا تھا کہ اس نے گزشتہ دو دن مرشد کی غیر حاضری کو کتنی شدت سے محسوس کیا ہے۔ دو دن پہلے اس کا اپنا رویہ مرشد کے ساتھ خاصا سخت ہو گیا تھا۔ اسے بعد میں خود بھی تھوڑا سا رنج ہوا تھا۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ مرشد دو دن شکل ہی نہ دکھاتا۔ پہلے تو کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس روز پہلے حسن آرا مرشد کی جذباتی نوعیت کا اندازہ کر کے گھبرا گئی تھی۔ پھر مرشد کا ان دو دنوں پلٹ کر ادھر نہ آنا اسے مزید الجھن اور پریشانی میں مبتلا کر گیا تھا۔ اس کی اس غیر حاضری نے ہی حسن آرا کو احساس دلایا تھا کہ ہو نہ ہو مرشد کے ساتھ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہے۔ وہ تیل سر میں لگاتے ہوئے مرشد ہی کی صورت تک رہی تھی۔ شاید اس کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے اس کے جذبات وخیالات کے متعلق اندازہ کرنا چاہ رہی تھی۔ مرشد اس سے نظریں چرا کر کنپٹی کھجاتے ہوئے بولا۔

"آپ کی پریشانی نے ہی نہیں آنے دیا..... اپنی اس

لاڈورانی کی جتنی فکر ہے آپ کو اس نے مجھے بھی پریشان کر رکھا ہے اماں! مجھے...... مجھے خود بہت فکر ہونے لگی ہے اس کی۔ اگر خدانخواستہ یہ کسی مشکل کا شکار ہوگئی تو؟"

"مشکل بس منزل تک پہنچنے کے وقت تک رہے گی۔ جب ایک بار یہ اپنوں میں پہنچ گئیں تو مشکلوں سے خود ہی آزاد ہو جائیں گی۔"

"اور...... اگر یہ اپنوں میں پہنچنے کے بعد کسی مشکل کسی مصیبت میں پھنس گئی تو؟"

"پاگلوں والی باتیں مت کرو۔ ایسا ویسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم بس اپنی ذمہ داری نبھاؤ۔"

"مجھے میری ذمہ داری ایک بار پھر یاد دلا دیں۔"

"ان کو پوری حفاظت کے ساتھ بلوچستان ان کی پھوپھی کے ہاں چھوڑ کر آنا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"یہ کیسی ذمہ داری ہوئی بھلا۔"

"تو اور کیسی ہونی چاہیے؟"

"حفاظت کی بات کر رہی ہیں تو پھر مکمل ذمہ داری دیں۔ میں اسے وہاں چھوڑ کر یہاں آ جاؤں اور وہاں اس کے ساتھ کوئی مصیبت بن جائے تو مجھے یا آپ کو کیسے پتا چلے گا۔ ہم کیسے اس کے لیے کچھ کر سکیں گے۔" مرشد کی بے قراری اور فکرمندی اس کے دل کا حال بتا رہی تھی۔ حسن آرا کی پیشانی پر ایک رگ ابھرائی۔

"ہمیں پتا چلنا اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔ ہمیں ان کے لیے جو کرنا ہے وہ اتنا ہی ہے جتنا میں تم سے کہہ چکی ہوں۔ اس کے بعد ان کے لیے جو بھی کرنا ہوا وہ ان کے وہاں والے بزرگ کریں گے۔ تمہیں اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" دو روز پہلے کی طرح حسن آرا کا لہجہ ایک بار پھر یک لخت خشک ہو گیا۔ حجاب کے حوالے سے مرشد کی جذباتی بے قراری حسن آرا کے نزدیک گستاخانہ جسارت تھی۔ اسے پھر سے پریشانی ہونے لگی۔

"ضرورت کا تو پتا نہیں اماں! لیکن مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا۔ ایک طرف آپ اس کے لیے اتنی فکرمند ہیں۔ زمانے کے گندے ترین لوگوں کے ساتھ دشمنی تک ڈال لی ہے آپ نے۔ دوسری طرف چاہتی ہیں کہ میں اس کو سیکڑوں میل دور پہاڑوں میں چھوڑ آؤں اور پھر ہم سب اس کی طرف سے مکمل طور پر لاتعلق اور غافل ہو جائیں...... یعنی پھر اس کے ساتھ جو مرضی ہو جائے خیر ہے۔" مرشد کے لہجے میں بھی سنجیدگی اتر آئی۔

"وہاں ان کے ساتھ کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کے پھوپھا خود وہاں کی ایک با اثر اور طاقت ور شخصیت ہیں۔ وہ بخوبی جاگیردار لوگوں کو لگام ڈال لیں گے۔"

"اور ایک ذرا آپ فرض کریں کہ اگر وہ لگام ڈالنے میں ناکام رہے تو...... یا بالفرض ان کے گھر میں رہنا ہی اس کے لیے عذاب اور وبال بن گیا تو کیا ہوگا؟"

"کیوں اول فول بولے جا رہے ہو۔ میرے ساتھ فضول بحث مت کرو۔" حسن آرا نے ناگواری سے کہا۔ وہ مرشد کے لہجے اور تیوروں سے پریشان ہو رہی تھی۔ اس کے اعتراضات اختلاف اور حجاب کے حوالے سے فکر مندی حسن آرا کو عجیب خوف آمیز گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ اسے وہ باتیں بھی سمجھ آ رہی تھیں جو ابھی صرف بے چینی کی صورت مرشد کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھیں۔ ان کے لب و لہجے کے عقب میں سرسرا رہی تھیں۔ حجاب اپنی جگہ خاموش بیٹھی گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ کمرے کی فضا میں پیدا ہوتا تناؤ اسے بے چین کر رہا تھا۔

"چوہدریوں کی یہ خاموشی عارضی ہے اماں! وہ خبیث لوگ بلوچستان تک اس کا پیچھا کریں گے۔ اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔"

"اچھا مزید؟" حسن آرا نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔

"مزید...... یہ کہ وہاں پھوپھی کے گھر بھی پتا نہیں کیسے حالات پیش آئیں اسے...... ان لوگوں کا رویہ اس کے ساتھ پتا نہیں کیسا ہوگا یہ اتنے دن سے لاپتہ ہے۔"

"اور......"

"اور کیا اب......"

وہ اماں کی مسلسل گھورتی ہوئی نظروں سے قدرے گڑبڑا گیا۔ اسے اچانک یوں لگا تھا کہ جیسے اماں کی آنکھیں اس کے دل و دماغ کے ان نہاں خانوں تک جھانک کر دیکھ رہی ہیں۔ جہاں حجاب کے خوابوں اور خیالوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

"پھر تم ہی مشورہ دو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" وہ جیسے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اسے اصل نکتے پر لے آئی تھیں۔ چند لمحوں کے لیے مرشد کو چپ لگ گئی پھر وہ گلا کھنکارتے ہوئے بولا۔

''میں نے اس کی اماں اور بھائی کی تلاش میں بندے دوڑا رکھے ہیں۔ میرا خیال ہے ان کے ملنے تک یہ یہیں رہے۔ اس کے بعد انہیں کہیں کوئی مکان کرائے پر لے دیں گے۔ اپنی زندگی سکون سے گزاریں۔ چوہدریوں کو میں خود سمجھا لوں گا۔''

''بہتر تو یہ رہے گا کہ تم خود کو سنبھالو..... تم جو کچھ چاہ رہے ہو ویسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اپنے دماغ سے ہر بات، ہر فضول خیال نکال دو۔'' حسن آرا نے اس قدر سرد لہجے میں کہا کہ مرشد بس اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ وہ بخوبی سمجھ گیا تھا کہ اماں کا اشارہ کس سمت ہے اور وہ کیا کہہ رہی ہے۔ حجاب بھی اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی۔ اسے بھی حسن آرا کے انداز سے محسوس ہو گیا تھا کہ بات کس رخ پر آ گئی ہے۔

''اپنے دماغ سے ہر بات، ہر فضول خیال نکال دو۔''

اماں کے یہ الفاظ کسی سرد نشتر کی طرح اس کے دل میں جا کر چبھے تھے۔ دل میں ایک بے کلی دکھن کا احساس اتر گیا تھا۔

''ہر فضول خیال فضول خیال...... فضول......''

کچھ دیر تک تو مرشد بول ہی نہیں پایا۔ کمرے میں ایک بوجھل اور بے ڈھنگ سی خاموشی پھیلی رہی۔ پھر اس نے اپنے ذہن میں تعجب بیدار ہوتے محسوس کیا۔ حسن آرا کی اس درجہ سرد مہری اور ناگواری تعجب کی بات تو تھی۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ اماں کوئی غلط اندازہ قائم کیے ہوئے ہے۔ وہ اس کے جذبہ و احساس کے حوالے سے کوئی نامناسب نتیجہ اخذ کر رہی ہے، کوئی غلط تعبیر تصور کیے ہوئے ہے۔

''فضول خیال...... فضول خیال۔''

مرشد کے دل و دماغ کو دھچکا سا لگا۔ یہ الفاظ اس کی اماں کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ حجاب کی ذات سے جڑے اپنے جذبوں اور خیالوں کے حوالے سے ایک ذرا تو وہ خود بھی بے یقینی کا شکار ہو گیا۔ اماں کے لہجے اور انداز نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ لیکن فوراً ہی ایک یقین اس کے قلب و جان کی گہرائیوں سے ابھر کر اسے مطمئن کر گیا۔

اس نے بے اختیار نظروں کا زاویہ بدل کر حجاب کی طرف دیکھا۔ سفید دودھیا دوپٹے کی اوٹ سے اس کے چہرے کا وہی آدھا رخ دکھائی دے رہا تھا جو اس کے نزدیک اس کے لیے زندگی کا پہلا منظر تھا۔ زندگی سے پہلا تعارف تھا۔ کچھ روز پہلے جب اس نے پہلی بار حجاب کو یہیں جائے نماز پر بیٹھے دیکھا تھا اس وقت حجاب کے ہونٹ اور آنکھ کی ہڈی پر معمولی چوٹوں کے نشان تھے جو اب مٹ چکے تھے اس روز اس ایک پہلی نظر کے ساتھ ہی مرشد کے دل و دماغ میں ایک عجیب پراسراری لہر سرائیت کر گئی تھی۔ اس کے رگ و پے میں اتر گئی تھی۔ آئندہ دنوں لمحہ بہ لمحہ مرشد کے اندر بہت کچھ تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اندر بھی اور باہر بھی۔ اس کے اطراف میں پھیلی زندگی کی تصویر کے سارے رنگ کسمسا کر بیدار ہو آئے تھے۔ یہ زندہ تصویر کچھ مزید زندہ اور بھرپور ہو گئی تھی۔ اس اولین پل سے آج اس موجودہ پل تک مرشد کے دل و دماغ میں حجاب کی ذات کے حوالے سے کوئی بھی سستا یا بازاری خیال پیدا نہیں ہوا تھا۔ مرشد نے بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ سر جھکائے ہنوز خاموش بیٹھی تھی۔ پتا نہیں یہ اس کے سر پر موجود نئے نکور سفید دودھیا دوپٹے کی وجہ سے تھا کہ کیا' مرشد کو اس کے گرد ایک خفیف سا روشن ہالہ محسوس ہوا۔ ایک مہین سی روشن لکیر تھی جو اس کی کمر سر اور چہرے کے گرد اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اس نے پوری دیانت داری سے اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں سب کچھ بہت واضح اور روشن تھا۔ حجاب کے لیے اسے اپنے سینے میں لاڈ بھرے جذبات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر محسوس ہوا۔ اس سمندر کے شفاف پانیوں میں موتیوں کی سی چمک تھی۔ زمانے سے جدا ایک آسمانی نوعیت کی مسحور کن خوشبو تھی۔ مرشد کو وہ اس دنیا اس زمین کی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس سے تعلق رکھنے والے احساسات بھی اسے کسی آسمانی جہان کی مقدس خلوتوں سے اترے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اسے یہ سب خود پر قدرت کی کرم نوازی، قدرت کی مہربانی محسوس ہو رہا تھا۔ اس سب کا وسیلہ یا بہانہ بنی تھی حجاب کی معصوم اور مظلوم ذات۔

اس نازک جان پر جو قیامت ٹوٹی تھی اور وہ مسلسل کئی روز تک جن عذاب ناک حالات کا شکار رہی تھی۔ وہ سارا

دکھ، سارا کرب کسی خودکار طریقے سے خود بخود مرشد کے دل کی اتھاہ گہرائیوں تک اترتا چلا گیا تھا۔ اس کے سینے میں حیرت انگیز طور پر آناً فاناً ایک ایسا شدید گداز پیدا ہوا آیا تھا کہ حجاب کا درد اسے اپنا درد محسوس ہونے لگا تھا۔ حجاب کے جان کا وہ دکھ کے تصور سے اس کے اپنے کلیجے پر دکھ کی ایک بھاری سل آن پڑی تھی۔ اس کے ذہن میں صرف حجاب کے تحفظ وسلامتی، اس کے سکھ وسکون اور اس کی خوشی سے متعلقہ خیالات تھے۔ اسے صرف اس کی بہتری اور بھلائی مقصود تھی۔ ہرصورت...... اور اس سب کے ساتھ اس کے دل میں صرف ایک خواہش تھی۔ ایک بے ضرر اور معصوم سی خواہش۔ حجاب کو ہمیشہ اپنی نظروں کے آس پاس رکھنے کی خواہش۔ ہر پل اس کی خیروعافیت سے باخبر رہتے ہوئے اس کے اردگرد رہنے کی خواہش اور یہ خواہش بے پناہ طور پر توانا اور بلاخیز تھی۔

مرشد نے حسن آرا کی طرف دیکھا۔ وہ تیل کی شیشی پر ڈھکن چڑھا رہی تھی۔ ذہنی دباؤ اس کی پیشانی پر رگ ابھارے ہوئے تھا۔

''آپ کے ساتھ اصل مسئلہ کیا ہے اماں؟ یکایک ہم اتنے اجنبی کیسے ہوگئے!''

وہ بولا تو اس کے لہجے میں دکھ اور تاسف کی آمیزش تھی۔ اسے سچ میں دکھ پہنچا تھا۔ اماں کا انداز فکر اس کے لیے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اماں ......اماں اسے سمجھنے میں غلطی کرسکتی ہے۔ اس کے متعلق کوئی سستی اور ہلکی رائے قائم کرسکتی ہے۔ حسن آرا نے شیشی رکھ کر کندھے پر موجود تولیے سے ہاتھ صاف کئے اور تکیے کے غلاف میں سے دو ٹکٹیں نکال کر تکیے پر ڈال دیں۔

''یہ دو ٹکٹیں ہیں۔ آج رات دس بجے گاڑی نکلے گی۔'' اس کا انداز ایسا تھا جیسے کمرے میں موجود کسی نادیدہ ہستی سے مخاطب ہو۔ مرشد کا لہجہ اس کے دل پر اثر انداز ہوا تھا مگر اس نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیا۔ وہ کوئی وضاحت نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے اسے یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ ہم اجنبی نہیں ہوئے بلکہ تم ان پاک بی بی کی اصل حیثیت سے واقف نہیں ہو۔ اس کی خواہش تھی کہ جو پاک نسبتیں اور مقدس حوالے ابھی تک پردے میں ہیں وہ اب پردے میں ہی رہیں تو بہتر ہے۔

کچھ دیر تک کمرے میں وہی بے ڈھنگی خاموشی بھری رہی۔ پھر مرشد کی گمبھیر آواز ابھری۔

''اماں ایسا تو ابھی اسے یہیں اپنے پاس ٹھہرائیں یا پھر آپ بھی تیاری کریں۔ اکٹھے چلتے ہیں۔ اس کو وہاں پہنچا کر کچھ وقت ہم بھی وہیں ڈیرے ڈال لیں گے۔ پھر جب سب ٹھیک ہوچکنے کی تسلی ہوجائے گی تو ہم واپس لوٹ آئیں گے۔ کیوں حجاب! تو کیا کہتی ہے؟'' مرشد آخری جملے پر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے اس بے ادب انداز تخاطب پر حسن آرا کسمسا کر رہ گئی۔

''خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ وہاں میرے لیے کوئی پریشانی یا خطرہ نہیں ہوگا۔ آپ بس مجھے وہاں تک پہنچادیں یا پھر مجھے بس گاڑی پر بٹھادیں۔'' اس نے ایک سرسری سی نظر مرشد کی طرف دیکھا اور جھجک کر فوراً دوبارہ نظریں جھکالیں۔ مرشد کی آنکھوں میں وہی پر اشتیاق چمک تھی جو اسے گھبراہٹ میں مبتلا کرتی تھی۔

''اور جو بات میں نے کہی ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تیرے بھائی اور اماں کو ڈھونڈتے ہیں پھر تو انہی کے ساتھ رہنا۔''

''کیا پتا وہ دونوں پہلے سے وہیں ہوں۔'' حجاب کے دل میں موہوم سی امید تو تھی کہ شاید اسرار اور ماں جی کسی نہ کسی طرح پھوپھو کے ہاں جا پہنچے ہوں اور اب وہ سب خود اس کے لیے پریشان ہوں۔ اسے تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔ اچانک دروازے میں جعفر کی شکل دکھائی دی۔ اس کی صورت پر لکھا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ مرشد نے مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا؟''

''ذرا ایک منٹ کے لیے۔'' اس کی ہچکچاہٹ اور بے چینی دیکھتے ہوئے مرشد اٹھ کر باہر چلا آیا۔

''ہاں کیا پنگا ہے؟''

''تھانے سے اطلاع آئی ہے کہ یہاں چھاپہ پڑنے والا ہے۔''

''کس چکر میں؟''

''اس لڑکی کے لیے ڈپٹی اصغر اعوان خود نفری کے

ساتھ آرہا تھا۔ مرشد کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔

"پولیس کو تو کافی پہلے آجانا چاہئے تھا۔ بہرحال تم لوگ اسلحہ وغیرہ غائب کرو میں حجاب کو غائب کرتا ہوں۔" مرشد کی بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ بیرونی طرف کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور قادرے کی گھبرائی ہوئی سی صورت دکھائی دی۔

"پولیس آگئی۔ چار پانچ گاڑیاں ہیں اور پندرہ بیس پولیس والے ہیں۔" جعفر تڑپ کر دالان کی طرف لپکا جہاں دلشاد رائفل لیے بیٹھا تھا۔ لیکن پولیس پارٹی کچھ زیادہ ہی غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ تھی۔ اچانک سیڑھیوں پر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور پھر آگے پیچھے بعد دیگرے چھ سات پولیس والے اندر گھستے چلے آئے۔ سب سے آگے ایک اونچا لمبا چالیس پینتالیس سالہ کرخت صورت شخص تھا۔ اس کے جسم پر پولیس یونیفارم کی بجائے سفید کلف لگی شلوار قمیص تھی۔ توند قدرے نکلی ہوئی پیشانی پر بال کم تھے البتہ داڑھی گھنی تھی جس میں کہیں کہیں سفید بال چمک رہے تھے۔ اس کے عقب میں آنے والے پولیس والوں میں ایک تو تھانے کا سب انسپکٹر ادریس منج تھا۔ دوسرا اے ایس آئی حق نواز تھا اور ان کے عقب میں چار کانسٹیبل تھے۔ اس سفید پوش کے علاوہ باقی سب جس طرح مستعد اور محتاط دکھائی دیتے تھے اس سے مرشد نے اندازہ لگایا کہ یہی سفید پوش ڈپٹی اصغر اعوان ہے۔ اندر داخل ہوتے وقت منج نے ڈپٹی سے کچھ کہتے ہوئے مرشد کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ وہ سیدھا مرشد کے سامنے آرکا۔

"ہیلو مسٹر مرشد!!" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے مرشد کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا۔

"میں ڈی ایس پی اصغر علی اعوان ...... چھوٹی بی بی کہاں ہیں؟"

"چھوٹی بی بی! کون چھوٹی بی بی؟" مرشد متعجب ہوا۔

"نندی پور کے شاہ صاحب سید صلاح الدین کی صاحب زادی...... سیدہ حجاب بی بی کدھر ہیں؟"

ڈپٹی اعوان نے اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ اس کے الفاظ مرشد کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگے تھے۔

چھوٹی بی بی...... نندی پور کے شاہ صاحب سید صلاح الدین کی صاحب زادی...... سیدہ حجاب بی بی...... سیدہ ...... سیدہ! اس کے لیے یہ ایک انکشاف تھا۔ حجاب کی ذات کے جس پہلو سے وہ ابھی تک نہ آشنا تھا وہ اب اچانک ہی اس پر آشکار ہوگیا تھا۔ اس کا رواں رواں سنسنا اٹھا۔

"وہ...... کیا وہ سیدزادی ہے؟"

اس سوال کی ادائیگی میں اس کے ارادے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ الفاظ خود بخود اس کی زبان سے پھسل پڑے تھے۔ وہ عجیب حیرت و بے یقینی سے ڈپٹی کی صورت تک رہا تھا۔

"رائفل نیچے رکھ دو۔"

"ادھر ادھر بیٹھ جاؤ دونوں۔" دالان والی سائیڈ پر پولیس والوں نے جعفر اور دلشاد کو دبوچ لیا تھا۔ ڈپٹی اعوان مرشد کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اندرونی راہداری کی طرف بڑھا تو منج اور حق نواز فوراً اس کے پیچھے لپکے۔ منج نے نہایت خشمگیں نظروں سے مرشد کو گھورا تھا۔ مرشد چند لمحے تو اسی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر یکا یک جیسے اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ فوراً ان کے پیچھے لپکا۔ ڈپٹی اعوان اماں والے کمرے کے دروازے پر جا پہنچا تھا۔

ان لوگوں کے اچانک اندر داخل ہونے پر حسن آرا اور حجاب دونوں ہی بری طرح چونک پڑیں۔ ڈپٹی نے اندر داخل ہو کر سامنے کی جیب سے حجاب کی تصویر نکال کر تسلی کی اور پھر مطمئن انداز میں حجاب سے مخاطب ہوا۔

"السلام علیکم چھوٹی بی بی! میں ڈی ایس پی اصغر علی اعوان۔ پچھلے کئی دنوں سے آپ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ صحیح سلامت مل گئی ہیں۔"

"اماں یہ ڈپٹی صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟" مرشد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی عجیب الجھن زدہ لہجے میں حسن آرا کو مخاطب کیا۔

"یہ بتا رہے ہیں کہ یہ...... یہ حج...... حجاب سیدزادی ہیں۔" وہ پہلی بار اس کا نام لیتے ہوئے جھجک گیا تھا۔ حسن آرا اور حجاب دونوں ہی حیران پریشان دکھائی دے رہی

تھیں۔

حق نواز اور منج مستعد انداز میں دروازے کے قریب ہی ٹھہر گئے تھے۔ ڈپٹی نے باری باری بغور حسن آرا اور مرشد کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ پھر مرشد سے مخاطب ہوا۔

"ہاں، یہ ایک نجیب الطرفین سیدزادی ہیں۔ ان کے گھرانے میں کئی بزرگ گزرے ہیں۔ خود ان کے والد ایک صالح اور صاحب شریعت شخص تھے۔ ان کے گھرانے پر جو گزری ہے وہ کیس میں ہی ہینڈل کر رہا ہوں۔" پھر وہ حجاب کی طرف پلٹا۔

"بی بی! آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔" اس کی صورت ہی کی طرح اس کا لہجہ بھی کرخت تھا لیکن حجاب سے بات کرتے ہوئے اس میں ایک نرمی در آئی تھی۔

"کک...... کہاں؟" حجاب ہکلائی۔ حسن آرا فوراً ڈپٹی سے مخاطب ہوئی۔

"ڈپٹی صاحب! آپ انہیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ پچھلے کچھ دنوں میں انہوں نے بہت مصیبت اور رنج اٹھایا ہے۔ ہم لوگ آج انہیں ان کے پھوپھا کے ہاں بلوچستان پہنچانے والے ہیں۔ یہ وہاں محفوظ رہیں گی۔"

"یہ اب بالکل محفوظ ہیں۔ ان کے پھوپھا جی کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور انہیں ان کے حوالے کرنا اب میری ذمہ داری ہے۔ لیکن اس سے پہلے کچھ دیگر معاملات نمٹانے ہیں ہم نے۔"

"کیسے معاملات؟"

"کچھ قانونی تقاضے ہیں۔ ان کے گاؤں سے چوہدریوں کے خلاف کوئی ایک بھی گواہ نہیں مل سکا مجھے۔ اب...... اب دیکھوں گا میں اکبر علی اور فرزند علی کتنے پانی میں ہیں۔ دونوں کو پھانسی کے پھندے تک گھسیٹوں گا میں۔" اس نے ایک بار پھر حجاب کی طرف رخ پھیرا۔

"چلیں بی بی اٹھیں...... کوئی چیز، سامان ہے تو ساتھ لے لیں۔"

"مم...... میں کہیں نہیں جانا چاہتی۔" حجاب کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ خوف زدہ ہوگئی تھی۔ دھوپ سڑی میں اس نے دیکھا تھا کہ پولیس غنڈوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک ساتھ کئی اندیشے بیدار ہوا آئے۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ پولیس والے دھوکے سے اسے یہاں سے لے جائیں گے اور لے جا کر چوہدریوں کے حوالے کر دیں گے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بی بی! آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ کی تلاش میں کتنی کوششیں کی گئی ہیں۔ آپ کے پھوپھا اور پھوپھی آپ کے لیے کس قدر پریشان ہیں۔"

"یہ خود بہت پریشان ہیں ڈپٹی صاحب! ان کے دشمن بھی آپ کو پتا ہے کہ کتنے بااثر اور ظالم لوگ ہیں۔ ابھی چند دن پہلے وہ انہیں یہاں سے اغواء کر کے لے گئے تھے۔ میرا بیٹا بڑی مشکل سے انہیں ان کے چنگل سے نکال کر لایا ہے۔" حسن آرا نے کہا۔

"میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ ان کے دشمن جتنے بھی بااثر ہوں قانون سے زیادہ بااثر نہیں ہیں۔ ان کا بیان ان سب کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ میں خود ہتھکڑیاں پہناؤں گا انہیں۔"

"لیکن میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے خالہ کے پاس رہنا ہے۔ جیسے یہ چاہتی ہیں میں ویسے ہی کروں گی۔" حجاب نے پریشان لہجے میں کہا اور پلنگ سے سرک کر نیچے حسن آرا کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔ یوں جیسے حسن آرا کی ذات میں پناہ لے رہی ہو۔ ڈپٹی اعوان حسن آرا کی طرف متوجہ ہوا۔

"اور...... آپ بھلا کیا چاہتی ہیں؟"

"میں نے عرض کی ہے کہ ہم انہیں آج ان کے پھوپھا کے ہاں بھیجنے والے ہیں۔" ڈپٹی اعوان چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر پلٹ کر منج اور حق نواز سے مخاطب ہوا۔

"تم لوگ باہر دالان میں ٹھہرو۔"

وہ دونوں فوراً پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ ڈپٹی نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا اور پھر اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ان کے پھوپھا جی سے میں نے بھی یہی وعدہ کر رکھا ہے کہ اگر یہ زندہ سلامت ہیں تو میں انہیں بحفاظت ان کے حوالے کروں گا اور ان کے باپ بھائیوں کے قاتلوں کو قرار واقعی سزا بھی دلواؤں گا۔ اب ان دونوں کاموں کے لیے ان کا میرے ساتھ چلنا ناگزیر ہے۔"

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔" حجاب نے جلدی سے انکار کیا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بی بی! کیا آپ کو اندازہ

نہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ آپ کہاں بیٹھی ہیں؟ اگر آپ کے پھوپھا، پھوپھی کو پتا چل گیا کہ آپ ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے پر بیٹھی ہیں اور یہیں رہنا چاہتی ہیں تو سوچیں ان پر کیا گزرے گی...... جیتے جی مر جائیں گے وہ لوگ۔ مجھ پر شاہ صاحب کے بے انتہا احسانات ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی یہاں موجودگی کی ان کو خبر ہو۔ لہٰذا آپ اٹھیں اور چلیں ہمارے ساتھ۔"

"آپ بے شک انہیں خبر دے دیں۔ وہ آئیں گے تو میں ان کے ساتھ چلوں گی یا پھر مرشد جی مجھے ان کے ہاں چھوڑ آئیں گے۔" اس نے پُر امید نظروں سے مرشد کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ گم صم سا کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ یوں جیسے اسے آج پہلی بار دیکھ رہا ہو..... جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"بی بی! ایسے بے وجہ کی ضد نہ کریں۔ چلنا تو پڑے گا آپ کو۔ بہتر ہوگا کہ آپ نہ ہمارے لیے پریشانی پیدا کریں نہ اپنے لیے۔" اسی وقت باہر کچھ آوازیں اور ہلچل محسوس ہوئی۔ ڈپٹی اعوان، حسن آرا اور مرشد سے مخاطب ہوا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں نے بی بی کی مدد اور حفاظت میں کافی کوششیں کی ہیں...... بی بی تم لوگوں پر بھروسا رکھتی ہیں۔ تم لوگ ہی سمجھاؤ انہیں۔ تم لوگوں کی خلاف قانون حرکتیں نظر انداز کرتے ہوئے میں رعایت برتوں گا لیکن سوچ سمجھ لو۔" اسی وقت کمرے کے دروازے کے قریب کچھ آوازیں سنائی دیں اور اگلے ہی پل خالہ اقبال، چمکیلی اور فیروزہ اندر داخل ہو آئے۔ منج غالباً انہیں روکنے کی کوشش ہی کرتا رہ گیا تھا۔ ڈپٹی اعوان اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں یہاں کے دوسرے لوگوں کے بیان محفوظ کرلوں۔ اتنے میں تم لوگ سوچ لو اور بی بی کو بھی سمجھا لو۔ ان کا مزید یہاں رہنا ان کے اپنے حق میں ٹھیک نہیں ہوگا۔" وہ اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ خالہ اقبال فیروزہ اور چمکیلی آگے بڑھ کر حسن آرا کے قریب بیٹھ گئیں۔

"کیا کہہ رہے ہیں یہ ٹھلے؟"

"یہ بھی کوئی پولیس کا افسر تھا کیا؟"

"باہر بھی اچھی خاصی نفری موجود ہے۔ کس چکر میں آئی ہے پولیس؟" ان تینوں کے چہروں پر تشویش اور فکر مندی کے آثار تھے۔ مرشد اور حسن آرا کو بخوبی اندازہ تھا کہ باہر گلی اور بازار میں اچھا خاصا سنسنی کا ماحول بن چکا ہوگا۔

"حجاب بی بی! کیا یہ ڈپٹی سچ کہہ رہا تھا..... آپ سید گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں؟"

مرشد کی گمبھیر آواز پر خالہ اقبال کے ساتھ ساتھ فیروزہ اور چمکیلی نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ خالہ تو یہ بات پہلے ہی جانتا تھا البتہ فیروزہ اور چمکیلی کے چہروں اور آنکھوں میں امڈ آنے والا تعجب گواہ تھا کہ انہیں بھی اس حقیقت کا علم نہیں ہے۔ حجاب متذبذب سے انداز میں بولی۔

"جج...... جی! مگر میں ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔" مرشد نے عجیب شکوہ کناں اور آزردہ نظروں سے حسن آرا کی طرف دیکھا۔

"کیوں اماں..... آپ نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی؟"

"ادب و احترام کا تقاضا یہی تھا مرشد بیٹا! میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات کھلے اور یہاں کے غلیظ ذہنوں اور ناپاک زبانوں پر سادات کا ذکر کسی تماشے کی صورت آئے۔ لوگ سادات گھرانے اور ایک سیدزادی کے متعلق فضول تبصرے کریں۔ ان کی اور بزرگوں کی بے حرمتی کا پہلو نکلے۔" حسن آرا کی آواز بھیگ گئی۔ مرشد پر اماں کے رویے کے حوالے سے بہت سی گرہیں خود بخود کھلتی چلی گئیں۔ اسے یہ بات بھی اب سمجھ آ رہی تھی کہ جب سے حجاب اس کمرے میں دکھائی دے رہی ہے تب سے اماں کا بستر فرش پر کیوں ہے۔ اس سے بات چیت کرتے وقت، یا اس کا ذکر کرتے ہوئے اماں کے لب و لہجے میں احترام و عزت کا رنگ کیوں چھلک آتا ہے۔ کیوں وہ حجاب کے حوالے سے اس درجہ فکر مند اور حساس رہی ہیں!

وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے دیکھتا آ رہا تھا کہ یہاں کے مکروہ اور گھناؤنے معمولات میں عید تو کیا رمضان المبارک جیسے مقدس اور بابرکت مہینے میں بھی کوئی تعطل نہیں آتا تھا۔ کوئی ناغہ یا

چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ البتہ محرم الحرام کے دنوں میں یہ بازار اور یہ کاروبار مکمل طور پر بند کر دیا جاتا تھا۔ اس مہینے کو سادات سے...... اہل بیت سے نسبت تھی اور اسی نسبت کے احترام میں عاشورہ کے دس دن یہاں مکمل چھٹی ہوا کرتی تھی۔ تمام طوائفیں، کسبیاں بلاتخصیص پیر فقیر مناتی تھیں۔ نذر نیاز دیتی تھیں۔ مزاروں خانقاہوں کے سلام کو جاتی تھیں۔ عاشورہ کے دنوں میں ماتم کیا جاتا۔ تعزیے نکالے جاتے اور علم اٹھائے جاتے تھے۔

عقیدے کے لحاظ سے تمام طوائفیں فقہ جعفریہ سے تعلق رکھتی تھیں اور پیروں فقیروں اور سادات کی از حد عزت و قدر کرتی تھیں۔ پنج تن پاک کے نام پر معذوروں گداگروں اور ملنگوں وغیرہ کو خیرات سے نوازتی تھیں۔ بیشتر طوائفیں ہر جمعرات کو بی بی پاک دامناں پر حاضری دیتیں، صابر شاہ کے مزار پر منتیں مانگنے جاتیں۔ نو گزے کی قبر، دربار قاسم شاہ اور داتا صاحب کے ہاں دیگیں اور چادریں چڑھانے کی رسم تو خود مرشد بھی کئی برسوں سے نبھاتا آ رہا تھا۔ رجب کے کونڈوں کے ختم کا وہ ہر سال ایسا اہتمام کرتا تھا کہ محلے کے ہر گھر ہر چوبارے پر مرشد کی طرف سے حلوہ پوری اور کھیر کی نیاز پہنچائی جاتی تھی۔ رسمی و روایتی طرز پر ہی سہی لیکن خود مرشد سادات اور پیروں و فقیروں کا معتقد تھا اور اسے یہ عقیدت اپنی ماں سے وارثت میں ملی تھی۔ بچپن میں جب بھی وہ اسے کچھ کھلانے لگتی تو بسم اللہ کے ساتھ ہی نذر اللہ نیاز حسین کے الفاظ دہرایا کرتی تھی۔ دوسری طوائفوں کی نسبت حسن آرا سادات کے لیے کچھ زیادہ ہی غیر معمولی عقیدت کے جذبات رکھتی تھی اور یہی عقیدت اس سے مرشد کی ذات میں بھی منتقل ہوئی تھی۔ مرشد نے خود بھی پڑھا تھا اور عاشورہ کے دنوں میں ذاکرین کے منہ سے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ایک آیت پوری شدت سے اس کے ذہن میں گردش کرنے لگی۔

''إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهيرا''

''پس اللہ کا ارادہ یہ ہے اے اہل بیت کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔''

پھر اس کے ذہن میں درود شریف کے الفاظ گونجے۔

اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد ﷺ

''یا اللہ! تو محمد ﷺ کو سلامتی دے اور محمد ﷺ کی آل کو سلامتی دے۔''

''وہ جن کا ذکر بھی خدا نے عبادت و ثواب ٹھہرایا تھا۔ حجاب بی بی انہی کی آل اولاد میں سے تھیں۔ وہ خود امتیوں میں سے تھا اور حجاب بی بی سرکار دو عالم ﷺ، سرور کائنات کی آل میں سے تھی۔ ان کے ساتھ اس کا خون کا رشتہ بنتا تھا۔ وہ بہت عالی مقام اور مقدس و پاک ہستی تھی۔

مرشد کے وجود میں ایک تیز سنسناہٹ جاگ اٹھی۔ ایک لہر اس کے روئیں روئیں کو جھنجوڑ گئی تھی۔ وہ بے اختیار جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ اس کی نظریں اور گردن خودکار انداز میں جھک گئی۔ یکایک ہی حجاب جیسے اس سے صدیوں کے فاصلے پر جا ٹھہری تھی۔ بہت اونچے اور بلند مقام پر جا بیٹھی تھی۔ مرشد کے سینے میں ایک ہلچل ایک شور برپا ہو گیا۔ متضاد جذبوں کی ایسی شدید یورش تھی کہ اس کے لیے وہاں حجاب کے سامنے کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پلٹا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اگلے ایک گھنٹے تک ڈپٹی نے دالان میں کچہری لگائے رکھی۔ ان سب کے بیانات محفوظ کیے گئے۔ نزہت بیگم عشرت جہاں اور سندس جہاں بھی دست بستہ حاضر ہوئیں۔ حسن آرا اور مرشد کا بیان بھی لیا گیا۔ مرشد پر ایک عجیب سکوت اور بے حسی کی سی کیفیت طاری رہی۔ وہ بظاہر پتھرایا ہوا سا دکھائی دیتا رہا اور اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان، ایک ہنگامہ برپا رہا۔

حجاب پولیس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ شاید کوئی کشیدگی یا بدمزگی پیدا ہو جاتی لیکن عین وقت پر رستم لہوری نے پہنچ کر خود اس سارے معاملے کو سنبھال لیا۔ اس نے حسن آرا کو بھی تسلی دی اور حجاب کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بھی دلاسا دیا۔ وہ سب جانتے تھے کہ پولیس سے الجھنا کسی صورت بھی درست نہیں ہو گا۔ قانونی کارروائی میں رخنہ اندازی ان سب کے لیے مشکلات اور پیچیدگی کا باعث بن جاتی۔ ڈپٹی اصغر علی اعوان اور رستم لہوری ذاتی طور پر ایک دوسرے کے شناسا بھی تھے۔ وہ ایک معتبر اور ذمہ دار آفیسر تھا۔ رستم نے حسن آرا اور حجاب دونوں کو یقین دلایا کہ حجاب کو یہاں سے براہ راست اس کے پھوپھا کے ہاں پہنچانے کی بجائے یہ زیادہ بہتر ہے کہ تمام قانونی معاملات

نمٹا کر اسے اس کے وارثوں کے حوالے کرنے والا کام خود ڈپٹی اعوان ہی انجام دے۔

رستم لہوری، مرشد اور ڈپٹی اعوان کے درمیان الگ سے ایک مختصر سی میٹنگ بھی ہوئی۔ جعفر اور دلشاد سے اسلحہ تو ضبط کر لیا گیا البتہ رستم لہوری کی سفارش اور حجاب کی مدد اور حفاظت کی بے لوث ذمہ داری نبھانے کی رعایت میں ان میں سے کسی کو بھی نہ تو گرفتار کیا گیا اور نہ ہی خطرناک اسلحے کی برآمدگی کا کوئی کیس بنایا گیا۔ پولیس کے ہمراہ رخصت ہونے سے پہلے حجاب حسن آرا کے گلے لگ کر بلک بلک کر روئی تھی۔ چند ہی روز میں حسن آرا کے ساتھ اس کا کچھ ایسا ہی مضبوط جذباتی تعلق بن گیا تھا جیسے برسوں کی گہری شناسائی ہو۔ بازار میں اچھا خاصا رش جمع ہو چکا تھا۔ ہر چہرے پر تجسس اور سنسنی کا منظر تھا۔ ڈپٹی اعوان نے حجاب کو عزت و احترام سے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور مرشد لوگوں کو پابند کیا کہ بوقت ضرورت ان کو جب بھی تھانے یا گواہی کی غرض سے عدالت طلب کیا جائے تو وہ لازمی پیش ہوں۔ مرشد مسلسل خاموش تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ گلی میں بازار اور محلے والوں کا ہجوم تھا۔ کچھ چہرے چوباروں کی کھڑکیوں اور جھروکوں سے لگے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

مرشد حجاب کے ساتھ ڈپٹی کی گاڑی تک گیا۔ لیکن چپ رہا..... اس کے ہونٹ سختی سے بند رہے..... حجاب سر جھکائے مسلسل آنسو بہاتی رہی۔ اس کی ذہنی و جذباتی حالت خاصی دگرگوں دکھائی دیتی تھی۔ اس وقت اس نے مرشد کی لائی ہوئی ایک چادر ہی میں خود کو چھپا رکھا تھا۔ جس وقت گاڑی اسٹارٹ ہو کر حرکت میں آئی اس وقت اس نے سر اٹھاتے ہوئے اپنی بھیگی ہوئی سرخ آنکھوں سے مرشد کی طرف دیکھا تھا اور وہ ایک آخری نظر مرشد کے دل و جان کو چیرتی ہوئی اس کی روح کی گہرائیوں تک جا اتری۔

اس ایک خاموش نظر میں یکبارگی کئی طرح کے جذبات سسک کر رہ گئے تھے۔ بے بسی، شکر گزاری، ممنونیت، احسان مندی اور الوداع..... خدا حافظ۔ وہ اس ایک نظر سے بہت کچھ کہہ گئی تھی۔ مرشد بے حس و حرکت ساکت کھڑا پولیس گاڑیوں کے اس قافلے کو لمحہ بہ لمحہ دور جاتے دیکھتا رہا۔

❁......❁......❁......❁

خواب تو خواب ہوتے ہیں۔ خود بہ خود آنکھوں میں آ براجتے ہیں۔ بن بلائے مہمانوں کی طرح۔ شاید یہ انسانی خمیر کی ترکیب کا حصہ ہوتے ہیں۔ انسان کے خون سے جنم لیتے ہیں اور آنکھوں میں آ چمکتے ہیں۔ بچپن، نوجوانی اور بڑھاپے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ انسانی ترجیحات کے ساتھ ساتھ خوابوں کی شکل بھی بدلتی رہتی ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ترجیحات اور خواب آپس میں لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ ان کی ترجیحات میں کوئی کمی بیشی ہوتی ہے نہ خوابوں میں۔ بعض اوقات کوئی ایک ہی خواب انسان کی پوری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے۔ انسان تا زندگی اس کے اثر سے نکل نہیں پاتا۔ ساری زندگی کسی ایک خواب کی اسیری میں گزار دیتا ہے۔ ایسے خواب انسان کو بنا سنوار بھی دیتے ہیں اور بگاڑ بھی دیتے ہیں۔ اندر ہی اندر انسان کو چاٹ لیتے ہیں۔ نگل جاتے ہیں۔ حسن آرا کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا تھا۔ اس کے بے شکل خواب کو میر ارشد اللہ نے اپنی شکل دی تھی اور پھر خود نجانے وقت کے منظر نامے سے اوجھل ہو کر کہاں گم ہو گئے تھے۔ کدھر کھو گئے تھے۔ اس کے بعد حسن آرا کے خواب کدوں میں کبھی کوئی اور خواب روشن نہیں ہوا۔ مقفل کواڑ ہمیشہ کسی آہٹ کسی دستک کے منتظر ہی رہے۔

بقول شاعر

آسیب زدہ گھر کا میں وہ در ہوں دوستو!
دیمک کی طرح کھا گئی دستک کی جس کو آس

اس کی خلوت صرف ایک رات کے لیے آباد ہوئی تھی۔ وصل و نشاط کی ایک ہی شب نصیب ہوئی تھی اسے۔ اس کے اگلے دو دن وہ بخار کی حدت میں پھنکتی رہی۔ دوسری ملاقات میں قطعی غیر متوقع طور پر میر صاحب نے اس سے نکاح کرنے کی خواہش کا اظہار کر کے اسے ششدر کر دیا تھا۔ ہفتہ دس دن میں ان کے درمیان تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ خود تو پہلی ہی نظر میں اپنا سب کچھ میر صاحب پر وار چکی تھی۔ ان ملاقاتوں میں میر صاحب

نے بھی واشگاف الفاظ میں اس بات کا اظہار کردیا کہ ان کی اپنی جذباتی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ شدید محبت کے منہ زور جذبے نے انتہائی برق رفتاری سے ان دونوں کو یوں لپیٹ میں لے لیا تھا کہ معاشرے کی تمام کھوکھلی دیواریں بھربھری مٹی کی طرح ڈھیر ہوگئیں۔ دونوں نے ہی پورے خلوص اور دیانت داری سے اپنی اپنی ذات کی اس سچائی کو تسلیم کرلیا تھا کہ ایک دوسرے کے بغیر جینا زندگی بھر ایک نا ختم ہونے والی سزا کے جیسا ہوگا۔ اس کے باوجود حسن آرا کا کہنا ماننا یہ تھا کہ میر صاحب اسے اتنا بلند اور معتبر مقام دینے کے بجائے اسے صرف اپنی کنیز اپنی داسی کے طور پر اپنے قدموں میں جگہ دیئے رکھیں اور بس...... ان کا خاندانی جاہ و حشم اور نجابت و شرافت کا سلسلہ حسن آرا کے نزدیک اتنا عظیم اور مقدس تھا کہ وہ اس کا حصہ بننے کا تصور بھی اپنے لیے گناہ سمجھتی تھی مگر میر صاحب اس کے خیالات سے متفق نہیں تھے۔ اس روز وہ اسی سلسلے میں نزہت بیگم سے بات کرنے پہنچے تھے۔ تینوں حسن آرا ہی کے کمرے میں موجود تھے۔ ان کا مدعا سننے کے بعد نزہت بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ تو موری کی اینٹ کو محل کی پیشانی پر سجانے کی بات کررہے ہیں میر صاحب! بھلا روڑی کو مسجد سے کیا نسبت۔ خاک پاپوش پاؤں میں ہی ٹھیک رہتی ہے۔ آپ اسے دستار پر اٹھانے کی بات کررہے ہیں۔''

''ہم کچھ ایسا غلط نہیں کہہ رہے۔ وہی بات کہہ رہے ہیں جو ہمارے دل میں ہے۔'' میر صاحب سامنے والی مسہری پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

''ان گلی کوچوں میں دل والوں کے لاتعداد قصے سکتے ہیں۔ بہت سی دل والی طوائفیں آنکھوں میں شرافت کے خواب سجائے دل والوں کے گھروں کو رخصت بھی ہوتی ہیں مگر چند ماہ یا سال ڈیڑھ سال بعد ہی پھر ذلیل و خوار ہو کر یہیں مرنے سڑنے لوٹ آتی ہیں۔ جوہڑ کی مٹی جوہڑ ہی میں سکون پاتی ہے۔ آپ ہمارے حال پر رحم کریں میر صاحب! ایسی فرمائش مت کریں جو ہم ابھاگنیں پوری کرسکنے کی بساط نہیں رکھتیں۔''

''ہم مان لیتے ہیں کہ آپ کی پریشانی اور اندیشے بجا ہیں۔ آپ ہمیں بتادیں کہ ہم آپ کے اطمینان و تسلی کے لیے کیا کرسکتے ہیں۔ ہم ہر طرح کی ضمانت دینے کو تیار ہیں۔''

نزہت بیگم تذبذب کا شکار ہوئی۔ میر صاحب کی سنجیدگی اسے سمجھا رہی تھی کہ پنچھی پوری طرح جال میں پھنسا ہوا ہے۔ لیکن جو تقاضا میر صاحب کررہے تھے وہ نزہت بیگم کے خیال میں خاصا ٹیڑھا معاملہ تھا۔ یہ پنچھی تو جال ہی لے اڑنے کے چکر میں تھا اور اس جال میں تو میر صاحب جیسے اور بھی کچھ پنچھی پھیر و بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ ایک دو کے ساتھ تو اس نے اپنے طور پر کچھ معاملات بھی طے کررکھے تھے۔ ایسے میں اگر وہ میر صاحب کی بات مان لیتی تو دوسرے شیدائی اس کے لیے مسائل کھڑے کرسکتے تھے۔ وہ بے اختیار سرنفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔

''نہیں میر صاحب! ہمیں کوئی ضمانت درکار نہیں۔ ہم لوگ تو بازار میں سجے کھلونے ہیں۔ کھیل اور دل بہلاوے کا سامان۔ آپ ہمیں ہماری اسی حیثیت اور حقیقت کے ساتھ جینے دیں۔ باقی آپ جب جی چاہے تشریف لائیں۔ ہم دل جان سے آپ کی ہر طرح کی سیوا خاطر کے لیے چوبیں گھنٹے حاضر ہیں۔ ہمیشہ سرآنکھوں پر بٹھائیں گے حضور کو، بس ہمیں ایسے کسی مشکل امتحان میں مت ڈالیں۔ ہماری جگہ اپنی جوتیوں ہی میں رہنے دیں۔ آپ جیسی ہستی کے ساتھ رشتے داری کا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''رشتہ تو بن چکا ہے نزہت بیگم! اب تو ہم صرف اس رشتے کو حلال اور شرعی شکل دینا چاہتے ہیں۔ آخر اس میں قباحت ہی کیا ہے؟'' نزہت بیگم کی آنکھوں کے سامنے فوراً ہی چوہدری اکبر کی کرخت صورت لہرا گئی۔

''قباحتیں تو بہت ساری ہیں لیکن آپ ٹھیک سے ان کا اندازہ نہیں کرسکتے، نہیں سمجھ سکتے آپ۔''

''ہم سمجھنے کو تیار ہیں۔ آپ سمجھائیں ہمیں۔''

نزہت بیگم پہلو بدل کر رہ گئی۔ میر صاحب جیسی اسامی کو وہ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ یہاں سے وہ من چاہا اور منہ مانگا فائدہ حاصل کرسکتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی چوہدری اکبر کا خیال اسے بری طرح پریشان کرجاتا تھا۔ یہ کہنا کچھ ایسا غلط نہیں ہوگا کہ وہ کسی حد تک چوہدری اکبر کی طرف سے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خائف تھی۔

"آپ کیوں اپنے اجلے دامن کو داغ دار کرنے پر تلے ہیں۔آپ کے بیوی بچے والدین خاندان والے بھی اسے قبول نہیں کریں گے۔"

نزہت بیگم نے اپنے پہلو میں خاموش بیٹھی حسن آرا کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کا ماضی ہمیشہ ایک طعنے ایک گالی کی صورت اس کا تعاقب کرے گا۔ نہ یہ چین سے جی پائے گی نہ آپ سکون سے رہ پائیں گے۔میری آپ سے درخواست ہے کہ اپنے اور اس بے چاری کے لیے مصیبت و اذیت کا سامان مت کیجئے۔اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔

"ٹھیک ہے مزید جو قباحتیں ہیں وہ بھی بیان کردیجئے۔" میر صاحب کے اطمینان و سکون میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی [illegible] ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

"یہ جذبات صرف آپ ہی نہیں رکھتے۔شوکیس میں سجے کھلونے کسی ایک گاہک کے لیے مخصوص نہیں ہوتے۔ یہ ایک گڑیا ہے۔شوکیس میں رہے گی تو سبھی کے دل ونظر کی تفریح کا سامان بنی رہے گی۔میں اسے کسی ایک کے سپرد کردوں، کسی مخصوص فرد کو سونپ دوں تو باقیوں کو کیا جواب دوں گی۔یہاں بڑے بڑے بددماغ اور مزاج کے ٹیڑھے لوگ اس کی خاطر آپس میں ضد ڈالے بیٹھے ہیں۔میرا تو جینا حرام کردیں گے وہ۔"

"مثلاً کن کی بات کررہی ہیں آپ؟"

میر صاحب نے بغور نزہت بیگم کی صورت دیکھتے ہوئے سوال کیا۔وہ کسی حد تک سمجھ گئے تھے کہ نزہت بیگم کا اشارہ کس سمت ہے۔

"کئی لوگ ہیں کس کس کا بتاؤں آپ کو اور بتانے سے حاصل بھی کیا ہوگا؟"

"پھر بھی؟"

"سب سے پہلے تو چوہدری اکبر ہے۔آپ بھی جانتے ہیں اسے۔ایک دم پاگل ہے وہ حسن آرا کے لیے۔ بالکل جنونی......وہ کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔ہم غریب فنکار لوگ ہیں۔دشمنیاں اور مخالفتیں مول نہیں لے سکتے۔سب کی خوشی کا خیال رکھنا پڑتا ہے ہمیں۔"

چوہدری اکبر کے ذکر پر حسن آرا نے ناگواری کی ایک تند لہر اپنے لہو میں پھیلتی ہوئی محسوس کی۔میر صاحب کو بھی ایک ذرا چپ لگ گئی تھی۔

"میں کوئی اس کی زرخرید تو نہیں ہوں اماں۔"

حسن آرا سے چپ نہیں رہا گیا تھا۔نزہت بیگم اس کی طرف دیکھتے ہوئے ناصحانہ انداز میں بولی۔

"طوائف سب زروالوں کی ہوتی ہے اور پھر بھی کسی کی نہیں ہوتی۔اپنی اس ناگواری کو اپنے کلیجے کا خون پلا۔ قابو میں رکھ اسے۔زیادہ تلملانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی بہت کچھ سیکھنا سمجھنا ہے تجھے۔" حسن آرا شاید مزید کچھ کہتی مگر میر صاحب کی بھاری آواز نے اسے چپ رہنے پر مجبور کردیا۔

"ٹھیک ہے نزہت بیگم!ہم نے یہ ساری قباحتیں جان لیں۔جہاں تک بات ہمارے [illegible] کی ہے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو [illegible] ہمارے دامن پر لگ چکا ہے وہ حسن آرا سے نکاح کی صورت ہی میں دھل سکتا ہے۔رہی بات بیوی بچوں یا خاندان کی تو انہیں بھی حسن آرا کو قبول کرنا ہی پڑے گا اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔زندگی ہم نے گزارنی ہے۔حسن آرا دنیا کے جس کونے میں چاہیں گی ہم وہیں حسن آرا کے لیے الگ سے ایک چھوٹی سی جنت تعمیر کردیں گے اور رہی بات اکبر علی کی تو......"

میر صاحب اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اکبر علی کی طرف سے بھی آپ اپنے ہر اندیشے اور پریشانی کو ذہن سے جھٹک دیں۔اسے ہم خود سنبھالیں گے۔ابھی اجازت چاہتے ہیں۔سب سے پہلے آپ کی یہ اکبر علی والی پریشانی ہی کا سدباب کرلیں۔پھر ملتے ہیں۔فی امان اللہ۔" اس کے بعد وہ رکے نہیں چلے گئے۔

حسن آرا کو پورا یقین تھا کہ میر صاحب بہ احسن وخوبی چوہدری اکبر علی کو سنبھال لیں گے،لیکن دوسرے روز صبح جو واقع پیش آیا وہ حسن آرا کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا!

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)